خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماهنامه

# سسپنس ڈائجسٹ

دسمبر 2013

نگران اعلیٰ

معراج رسول



ماروی

پہلی قسط

کے صفحات پر
















جلد43 • شمارہ12 دسمبر2013 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی74200 • فون:35895313(021) فیکس35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

# نظر آنا

جون ایلیا

اس دور کا سب سے نمایاں رجحان یہ ہے کہ جو تم ہو وہ نظر نہ آؤ۔ یہ معاشرے کا دباؤ ہے جو ہمیں اس بے معنی اداکاری پر مجبور کرتا ہے۔ ہم باہر سے بہت ثابت و سالم اور ہشاش بشاش نظر آتے ہیں لیکن اندر سے ریزہ ریزہ اور اذیت زدہ ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ہم نے معاشرے کے اس ظالمانہ دباؤ کو کیوں قبول کر رکھا ہے۔

آپ ہرگز خوش حال نہیں ہیں مگر آپ کی یہ مجال نہیں کہ خوش حال نظر نہ آئیں۔ تین مہینے سے آپ نے گھر کا کرایہ ادا نہیں کیا، قرض پر آپ کا مدار ہے لیکن آپ کے خیالات اور نظریات اور ایک خوش حال آدمی کے خیالات اور نظریات میں کوئی فرق نہیں۔ آپ کا سیاسی نقطۂ نظر بالکل وہی ہے جو دولت مند لوگوں کا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ آپ اتنے محروم آدمی ہیں کہ احساسِ محرومی سے بھی محروم ہیں۔ حقیقتِ حال سے اس درجہ انکار! ذات اور ذہن پر معاشرے کا اتنا دباؤ۔

آپ اور آپ کی بیوی، جنھیں آپ خود اپنی زبان سے بیگم کہتے ہیں۔ جبکہ آپ کا اپنی بیوی کو بیگم کہنا آدابِ گفتگو کے قطعاً خلاف ہے اور ایک غیر مہذبانہ حرکت ہے۔ یہ دوسروں کا فرض ہے کہ وہ آپ کی بیوی کو بیگم کہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد خوش نظر آ رہے ہیں جبکہ دونوں ایک دوسرے سے بری طرح تپے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں کا بس نہیں چل رہا کہ ایک دوسرے کا منہ نوچ لیں مگر نہ جانے آپ کو دوسروں کا اتنا خیال کیوں ہے کہ مثالی شوہر اور بیوی نظر آنا چاہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہر حال میں مثالی شوہر اور مثالی بیوی نظر آنا آخر کس نظامِ اخلاق اور کس نظامِ تہذیب کی رو سے لازمی اور ضروری ہے جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر آپ بالکل بجا طور پر اپنی بیگم کی چٹیا کھینچ لیں اور وہ آپ کا گریبان، تو کیا قیامت آجائے گی۔

''مگر لوگ کیا کہیں گے!''

لوگ کیا کہیں گے؟ کچھ بھی کہیں، انہیں کہنے دیجیے۔ حد سے حد یہی تو کہیں گے کہ دونوں نے شادی کی تھی جو نا کام ہو گئی۔ چلیے قصہ پاک ہوا مگر آپ ہیں کہ معاشرے سے بے تکان جھوٹ بولے چلے جا رہے ہیں۔

جناب آپ کل سے جس بددلی اور بیزاری میں مبتلا ہیں کیا اس کے ہوتے ہوئے آج آپ کو داڑھی بنانا زیب دیتا تھا اور آپ نے داڑھی ہی نہیں بنائی بال بھی سنوارے ہیں اور خوشبو بھی لگائی ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ یہ سب کچھ آپ نے اپنی خاطر اور اپنی بددلی اور بیزاری کو دور کرنے کے لیے کیا ہو مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ آپ نے یہ سب کچھ لوگوں کے لحاظ میں کیا ہے تاکہ وہ آپ کو ایک شائستہ اور نستعلیق آدمی سمجھیں۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر آپ بددل اور بیزار ہیں اور بددل اور بیزار نظر بھی آرہے ہیں تو اس میں عیب کی کیا بات ہے؟ شاید آپ یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرہ آپ کا بددل اور بیزار نظر آنا پسند نہیں کرے گا۔ یقیناً ایسا ہی ہے اور جب ایسا ہی ہے تو اس بے حس اور ناہنجار معاشرے پر لعنت کیوں نہیں بھیجتے جس نے آپ کو ایک اداکار بنا کر رکھ دیا ہے۔

آپ مجھ پر شبہ نہ کریں۔ میں آپ کو بہکانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ میں خود پیچ و تاب میں مبتلا ہوں۔ خود میں بھی اسی صورتِ حال سے دوچار ہوں جس سے آپ دوچار ہیں۔ ہوسکتا ہے میری کیفیت آپ سے زیادہ اذیت ناک ہو اور مجھ میں آپ سے زیادہ دوغلاپن پایا جاتا ہو۔ یہ دوغلاپن ہی تو ہے کہ ہماری کیفیت ہو کچھ اور ہم ظاہر کچھ اور کریں۔

یہ ساری حرکتیں محض اس لیے کی جاتی ہیں کہ آدمی شائستہ اور بردبار نظر آئے۔ گویا شائستگی اور بردباری کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر لمحہ اپنے آپ سے جھوٹ بولے اور ایسا نظر آئے جیسا وہ نہیں۔ اگر شائستگی یہی ہے تو کیا اس کے ایک انتہائی بے ہودہ شے ہونے میں کوئی شبہ کیا جاسکتا ہے۔

میں شاید یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اصل اور بے ساختہ آدمی کی اس معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں۔ وہ اپنی اصل حالتوں اور کیفیتوں کے اظہار کے ساتھ اس معاشرے میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ میرے خیال میں پہلے صورتِ حال اتنی شدید نہیں تھی اور شائستگی کے فروغ کے ساتھ ساتھ بے ساختگی کے ساتھ زندگی گزارنے کا امکان بہت کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ معاشرے کی خاطر ہم ویسے نظر آئیں جیسے ہوں نہیں۔ وہی نظر آنا، نظر آنا، نظر آنا۔ لعنت ہے اس نظر آنے پر۔

# آپ کا خط

عزیز قارئین

السلام علیکم!

دسمبر 2013ء...... یعنی بچھڑتے ہوئے سال کا آخری شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ دن، ہفتے اور مہینے آتے اور گزر جاتے ہیں مگر...... ہمیشہ سے جانے کیوں دسمبر میں ہی گزرے ہوئے کچھ یادگار دنوں کی ایک فلم سی ذہن کے پردے پر چل جاتی ہے۔ جہاں ملکی سیاسی حالات وواقعات کے اعتبار سے یہ سال بہت اہم رہا، جس میں ناگہانی سانحات اور آفات کا تناسب زیادہ رہا اور خوشگوار تبدیلی تقریباً نہ ہونے کے برابر نظر آئی، عوام بھی مایوس کن حالات کا شکار رہے...... وہاں آپ کے اس محبوب پرچے کی ترتیب میں بھی کچھ فرق آیا، مثلاً...... گزشتہ ماہ آپ کے پسندیدہ سلسلے ''مسافر'' کا اختتام ہوا اور اب دسمبر کا یہ شمارہ آپ کو محی الدین نواب کے قلم سے ایک نئی داستان ''ماروی'' کا تحفہ دے کر رخصت ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ ملکی صورت حال کے برعکس قارئین پر اس تبدیلی کا خوشگوار اثر پڑے گا اور اس کی پسندیدگی اور مقبولیت میں اضافہ ہوگا...... عجیب سنگم ہے عیسوی سال جدا ہو رہا ہے مگر اس سے قبل ہی اسلامی سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ یہ سال اپنے آغاز سے اختتام تک ہم سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لائے...... ہمارے دلوں سے مایوسی، عداوت اور بغاوتوں کو مٹا کر ایک دوسرے کے لیے پیار اور ایثار کے جذبات قائم کر دے...... اور ہمارے حکمرانوں کے دلوں میں عوام کی بے چارگی اور مشکلات کا احساس اجاگر کر دے (الٰہی آمین) دسمبر ہمیشہ گزشتہ دنوں کی یاد دلاتا ہے اور...... یادیں انسان کو احتساب کی طرف مائل کرتی ہیں...... کاش ہمارے اور آپ کے ساتھ ساتھ ذمہ داران کو بھی خود احتسابی کا خیال آجائے تو ممکن ہے آنے والے دنوں میں جانے والے دنوں کی کسک اور شرمندگی نہ رہے۔ انہی دعاؤں اور احساسات کے ساتھ ہم چلتے ہیں اپنی نٹ کھٹ محفل کی جانب جو 2013ء کی آخری محفل ہے۔

✠ **قیصر اقبال گچھ**، بکول، ضلع بھکر سے بھرپور تبصرے کے ساتھ محفل میں حاضر ہیں ''آج سے ٹھیک ایک سال پہلے انہی دنوں میں ہم نے اپنے پیارے سسپنس میں پہلا خط لکھا تھا۔ سسپنس کی سنگت میں سال گزرنے کا پتا بھی نہ چلا اور یہ خط سسپنس کے نام کر کے ہم اپنے پیارے سسپنس میں اپنی پہلی سالگرہ کا کیک ضرور کاٹیں گے۔ (بہت خوب تو لیجیے کیک حاضر ہے کاٹیں) خوب صورت سرورق، ہاتھوں پر مہندی کا ڈیزائن اور دوپٹے اور کپڑوں سے میچ کرتی چوڑیاں اور ساتھ میں ڈھولکی کی تھاپ، بہت زبردست اور دلکش۔ کاش جون ایلیا کا انشائیہ بنیادی مسئلہ سوئے ہوئے ضمیر کو جھنجوڑ دے اور ہماری دعا ہے کہ ہمارے حکمران لفنن، نشستن اور برخاستن سے نکل کر عملی طور پر کچھ کریں۔ خطوط کی محفل میں عروہ خان جامع تبصرے کے ساتھ، کرسی صدارت، مبارکباد۔ طاہرہ گلزار، خط دھیان سے پڑھا کرو۔ بابر عباس خود اپنے آپ کو 70 سال کا کہہ گئے ہیں۔ کاظمی بھیا! آپ کا تبصرہ زویا اعجاز کے تبصرے کے گہرے مشاہدے کی عکاسی کرتا ہے۔ حکیم خان سلامت پوری، سرکاراں ذرا ہتھ ہولا رکھو۔ گل مروت محفل میں آتی رہا کرو اور ہم باز آئے نازلی بی کے وزیراعظم بننے سے۔ آغا جی! اشیانہ کے اتنے بہترین خط کو آپ نے بونگیاں مارنا لکھ کر حقیقت میں خود بہت بڑی بونگی ماری ہے۔ نیازی بھیا! آپ نے تو تفسیر عباس کا کچا چٹھا پوری محفل میں کھول دیا۔ یار یہ بات اس کے کان میں بتانی تھی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر کو انجام تک لے گئے۔ جہاں میڈم شکیلہ کے سارے دشمن کیفر کردار کو پہنچے وہاں غزالہ کی موت افسردہ کر گئی اور شہریار شاید اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا تھا۔ کشکول کی اس قسط میں پرتاب بھوشن اپنے انجام کو پہنچا تو دوسری طرف اورنگ زیب اپنا جال پھیلانے میں مصروف ہے۔ ابتدائی صفحات پر الیاس سیتاپوری کی یہ دشت بے ٹھگوں کا سے تاریخ کا آئینہ سامنے آیا۔ جہاں عبداللہ خان اپنے انجام کو پہنچا وہاں مہرن کے ساتھ روا رکھا گیا سلوک افسردہ کر گیا۔ ساتھ ہی مغیث کا کردار پسند آیا۔ نشور ہادی کے قلم کا شاہکار آخری صفحات کی کہانی کلید نجات ایک بہترین کہانی تھی۔ اپنی محبت کا گلا گھونٹ کر ثمرین نے جہاں فاران کو راستے سے ہٹایا وہیں شمعون اور ساحرہ کے ملن کی ساری راہیں ہموار کر دیں۔ بیگ صاحب کی بازی گر جس میں بیگ صاحب نے نہ صرف ڈاکٹر عرفان کو ناہید کے قتل سے بری کرایا بلکہ اصلی قاتل صفدر عباس کو قانون کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی محیط عالم میں اللہ کے ولی عبداللہ کے ایمان افروز واقعات لے کر آئیں اور ہمارے ایمان کو جلا بخشی۔ کاشف زبیر کی سوچ کی نسل، جس میں جیکو میس، مارکس اور میریا اپنے انجام سے دوچار ہوئے تو ماریا اور جمی کا خوشگوار ملاپ بیرخا میں کریمو جیسے سیر کو سوا سیر ملا۔ وہ بھی دو لڑکیوں کی شکل میں۔ تصویر کی گواہی، جس میں جم کی غلطی اور فوٹوگرافری فوٹوگرافی کام دکھا گئی۔ حالات حاضرہ کی عکاسی کرتی کہانی آلودگی بھی پسند آئی۔ تنویر ریاض کی تلاش میں فریڈرک کی تلاش ختم ہوئی مگر ہاتھ کچھ نہ آیا۔ محفل شعر وسخن بھی زبردست تھی مگر اس دفعہ کترنیں بہت ہی کم، مجموعی طور پر سسپنس کا شمارہ زبردست رہا۔'' (بہترین تبصرے کا شکریہ)

✠ **بابر عباس، مسز عباس**، گلیانہ روڈ کھاریاں سے محفل میں شامل...... ہوتے ہیں ''سر جی، خدا کے حضور دعا گو ہوں خدا آپ سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے (آمین) سسپنس کا نیا شمارہ جو ماہ نومبر کی شکل میں تھا بڑے جاں گسل انتظار کے بعد لذت آفریں لمحات کو مزید خوب صورت بناتا ہوا 21 اکتوبر کو ملا۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی عمر کے اس حصے میں بھی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ پہلی نظر میں یہی لگا کہ اس بار ذاکر صاحب نے سرورق پر زردے کی دیگ بنا دی ہے مگر جب غور سے دیکھا تو اس کا تعلق صنف نازک سے ثابت ہوا۔ بہرحال سرورق محفل کی خواتین کی وجہ سے خوب جما ہے۔ جون ایلیا صاحب کے انشائیے نے اس طرح متاثر کیا جس طرح حکومت آج کل عوام کو متاثر کر رہی ہے۔ اس بار کرسی صدارت پر کراچی کی عروہ خان بیٹھی ہوئی مکھی کھی کرتی نظر آئیں۔ راجا ثاقب محمود جنجوعہ صاحب نام کو ذرا چھوٹا کریں۔ ذیشان بدر منیر صاحب جناب عالی دو سال کہاں غائب رہے۔ طاہرہ گل زارا آنٹی یہ اچھی بات نہیں، میری عمر کو مسئلہ نہ بنائیں۔ سید



شکیل حسین کاظمی صاحب ایک بار پھر اپنی خوب صورت اور پیاری سی محفل میں ہم سب آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ رانا حبیب الرحمٰن بھیا خدا آپ کو اور آپ جیسے دوسرے بھائیوں کو اس قید سے رہائی دلائے۔ آمین۔ رمضان پاشا بھائی آنٹی بشریٰ افضل ہمیشہ سے ادھوری بات کرتی ہیں آپ بھلا کیوں دل جلاتے ہیں۔ واہ جی واہ اس بار تو ہمارے بہت ہی پیارے راج دلارے بھیا آغا فرید احمد خان صاحب بھی سکھر سے تشریف لائے ہیں، بھایا جی ویلکم ٹو بیک، خوشی ہوئی۔ قدرت اللہ نیازی بھائی میں آپ کی بات سے سو فیصد ایگری کرتا ہوں، اقلیم علیم صاحب کو موت کے سوداگر کے علاوہ بھی کچھ لکھنا چاہیے۔ ان کے ہم عصر محی الدین نواب صاحب، احمد اقبال، ایم اے راحت صاحب کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی جس کی اس بار آخری قسط تھی اختتام پڑھ کر دکھ ہوا۔ شہریار کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا نہ میڈم شکیلہ کا پیار اور نہ ہی غزالہ کی محبت، دیکھا جائے تو مسافر کی کہانی آگے بڑھ سکتی تھی۔ دوسرے نمبر پر کشکول پڑھی، پتا نہیں اپنی اس تحریر کے ذریعے انوار صدیقی صاحب کیا بتانا چاہتے ہیں۔ آخری صفحات پر اس بار نشور ہادی صاحب کلید نجات لیے حاضر تھے بس سو سو تھی۔ دیکھا جائے تو اس بار مرزا امجد بیگ صاحب کے کیس نے بھی مزہ نہیں دیا یہ بھی ہو سکتا ہے حسام بٹ صاحب تھک گئے ہیں۔ تاریخ کی سیر کراتی ہوئی الیاس سیتاپوری مرحوم کی ایک خوب صورت تحریر یہ دشت بے ٹھگوں کا زبردست اور خوب صورت تحریر دل کو بہت پسند آئی۔ باقی کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔'' (آپ نے شہباز احمد کے خط کے بارے میں لکھا اگر ملتا تو ضرور شائع ہوتا، پھر سے لکھیے)

✠ **راجا راحیل**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے تبصرہ کر رہے ہیں ''مجھے میرے مخالفین نے بے گناہ ڈکیتی وقتل کے مقدمہ میں ملوث کیا ہے، جیل میں مجھے تقریباً تین سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اسی عرصہ میں میں نے سسپنس ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے ایک قیدی سزائے موت جس کا نام عمران بلوچ تھا اور ماہنامہ سسپنس کا مستقل قاری تھا۔ عمران بلوچ گردوں کے مرض میں مبتلا تھا۔ قضائے الٰہی سے وفات پا چکا ہے۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون) رب کی ذات اسے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین) نومبر 2013ء کا شمارہ 21 اکتوبر کو موصول ہوا۔ سرورق پر حسینہ کی تصویر جلوہ گر تھی۔ پیلا جوڑا، پیلی چوڑیاں اور مہندی لگے ہاتھ، واہ کیا جاندار تصویر بنائی۔ مسافر کہانی کا اینڈ اچھا نہیں لگا۔ مسافر کے رائٹر ناصر ملک سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کو مزید لمبا کھینچتے۔ صرف اکیس اقساط پر کہانی کا خاتمہ اور وہ بھی غم زدہ۔ پیار میں اس طرح بھی ہوتا ہے۔ میڈم شکیلہ نے ثابت کر دیا کہ پیار ایک سے نہیں ہوتا بار بار ہوتا ہے۔ مصنف ناصر ملک سے گزارش ہے کہ مسافر کا پارٹ 2 بھی لکھیں۔ خطوط کی محفل ہمیشہ سے ہی میری پسندیدہ رہی ہے۔ محمد قدرت اللہ نیازی خانیوال کا تبصرہ پسند آیا۔ ماریہ فاروق۔ ایف ایس سی میں فرسٹ ڈویژن پر مبارکباد قبول ہو۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں میٹرک کا طالب علم تھا اور ضلع سرگودھا شہر کے اسکول چغتائی اسکول سسٹم کا طالب علم تھا۔ میری 2 کلاس فیلوز بہنا اقصیٰ نصیر اور سندس قدیر اس وقت سسپنس ڈائجسٹ باقاعدگی سے پڑھتی تھیں اور اکثر ان کے اسکول بیگ میں سسپنس ڈائجسٹ ہوتا تھا اور میں اکثر انہیں چھیڑتا تھا کہ یہ کیا تم ہر وقت کہانیاں پڑھتی رہتی ہو۔ بہنا اقصیٰ اور سندس مجھے یقین ہے کہ آپ اب بھی سسپنس ڈائجسٹ باقاعدگی سے پڑھتی ہوں گی۔ آپ سے گزارش ہے کہ سسپنس ڈائجسٹ میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری کریں تاکہ آپ سے رابطہ ہو سکے۔''

✠ **احمد خان توحیدی**، اسٹیل ٹاؤن، کراچی سے تشریف لائے ہیں ''کراچی میں کلاشنکوف کی دھڑا دھڑ۔ بم دھماکوں کے بارود سے بچنے کے لیے حسینہ نائٹل ایک ہاتھ سے ایک آنکھ کو ڈھانپتی نظر آئی یا اس آڑ مختصر محجوب ہو۔ انشائیہ، جون ایلیا، بنیادی مسئلہ۔ وطن کے کرتا دھرتا بیرون ملک سیر سپاٹے ناشتے ڈنر میں مگن، وطن میں بیٹھ کر عملی کام کریں تو کوئی مسئلہ باقی نہ رہے۔ محفل خطوط میں خود کو مکمل غائب پایا پھر بھی شکریہ۔ عروہ خان کو کرسی صدارت پر آٹھ چاند لگ گئے۔ تبصرہ گڈ، مبارکباد۔ محی الدین نواب کی آنے والی ماروی شاید تشنہ طلب پوری کر دے، بے چینی سے منتظر ہیں، ماریہ فاروق، چمن۔ آپ کی کامیابی کی خصوصی دعا کی تھی بفضل خدا کامیاب ہو گئیں۔ مبارکباد کے ساتھ چمن کے بادام، سیب اور پھلوں کے منتظر ہیں۔ جلد بھیج کر قربانی کا گوشت لے جائیں۔ (آپ کا انداز تحریر مشکل ہے، آسان بنائیے) بھائی اعجاز راحیل، ایک آپ ہی نہیں اس محفل میں ردی کی ٹوکری میں ہم بھی ہیں۔ محفل کے ساتھیوں کو سسٹرز سے چھیڑ خانی سے منع کرتا ہوں۔ حکیم سلامت پوری لاہور، آپ کا فرمان آخری کہانی لاجواب ہوتی ہے۔ مطلب یہ پہلے بھی پڑھتے ہیں۔ فوزیہ مسکین مانسہرہ، ملک اور محفل میں خالص جمہوریت نہ ہونے سے ساتھیوں کے طویل تبصرے۔ ہم بھی آپ کی طرح مسکین ہیں۔ حافظ آباد میں بڑی اماں کہاں ہیں؟ وہاں پنجاب کی بے بی گڑیا ماہا ایمان گندے گڑیا کی محفل نکاح میں آپ جیسے لاٹھی کا سہارا لے کر چلنے والے بزرگوں میں نکاح کے چھوارے بانٹ رہی تھیں۔ سیتاپوری، دشت بے ٹھگوں کا تاریخی کہانی لائے۔ میرے بیٹے بیٹیاں، بہو پوتے نواسے سب شوق سے پڑھنے کے ساتھ قریبی تاریخی تحریر کا اصرار کرتے ہیں۔ کشکول، یہ آکٹوپس ہے کیا بلا۔ جواونٹ کسی کروٹ بیٹھ نہیں رہا۔ محفل وشعر وسخن، نور احمد، مہرین ناز، غفور ساگری، جنید احمد ملک، قاضی عرفان کے اچھے اشعار ہیں۔ مسافر، شہریار کب تک مار دھاڑ کرتا رہے گا۔ اب جبکہ ازلی دشمن سردار حیدر، یارن خان، دلبر میاں ختم ہو چکے۔ میڈم شکیلہ اور غزالہ سے بھی جدائی ہو گئی۔ کلید نجات، ساحرہ کے والد کا شادی کے بعد بیوی بچوں سے الگ۔ بے توجہی نشاط کا ذہن متاثر ہوا۔ منظور اپنی پٹائی کا انتقام ہیجڑا کے روپ میں قتل ہوا۔''

✠ **حافظ محمد عرفان**، سرگودھا سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ''جونہی سسپنس میرے ہاتھوں میں آیا سب سے پہلے سلسلے وار اسٹوری مسافر پڑھی۔ سسپنس کا یہ پہلا سلسلہ ہے جو صرف 21 اقساط پر مشتمل تھا۔ اس کی تمام قسطیں میں نے پڑھیں اور آخری قسط بھی انتہائی شاندار رہی، مجھے یہ کہانی اتنی پسند آئی، اتنی پسند آئی کہ ناصر ملک کا میں جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ جناب ناصر ملک یہ آپ نے کیا کیا۔ اتنا دردناک اینڈ تو نہ کرتے۔ کم از کم شہریار کو غزالہ یا میڈم شکیلہ میں سے کوئی ایک تو دے دیتے۔ سب سے زیادہ میڈم شکیلہ عرف چندو ماہی کا کردار پسند آیا۔ بے چاری کی زندگی میں چار مرد آئے لیکن سچی محبت پھر بھی نہ مل سکی۔ انکل طاہر جاوید مغل آپ کہاں ہیں، عرصہ ہو گیا انتظامیہ سسپنس نے ان سے آخری صفحات نہیں لکھوائے۔ ہم بڑی شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ (بہت جلد انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں) اگلے ڈائجسٹ میں دیکھتے ہیں محی الدین نواب کی ''ماروی'' کیسی رہتی ہے۔ اولین صفحات پر الیاس سیتاپوری کی



آمد عرصہ بعد ہوئی اور بہت اچھی ہوئی ان کی "یہ دشت ہے ٹھگوں کا" بہت پسند آئی، برے کام کا انجام برا ہوتا ہے۔ آخر میں، قیصر اعوان، طاہرہ یاسمین اور تفسیر عباس بابر کو سلام و دعا اور تمام قارئین کو بھی۔ اللہ تعالیٰ اس ادارے کو آباد رکھے۔ آمین۔"

✠ **مرزا طاہر الدین بیگ**، میرپور خاص سے چلے آرہے ہیں "نشور ہادی کی کہانی کلید نجات بالکل صحیح لکھا ہے آپ نے خوب صورت رشتوں کی آزمائش اور مہکتے جذبوں کا عجیب سنگم، زبردست! ایک اچھوتی کہانی، ایسی ہی کہانی سسپنس کے معیار کو بلند سے بلند کرتی ہے۔ کہانی کا انجام مجھے ہی نہیں بہتوں کو رلا رہا ہوگا۔ شمعون، ساحرہ اور ثمرین، درمیان میں فاران کا کردار یہ کہانی مدتوں یاد آئے گی، مدتوں۔ کہانیاں اور بھی ہیں جیسے آلودگی افغانستان کے پس منظر میں لکھی ہوئی خوب صورت کہانی جیسے اچھے اور سبق آموز انداز میں خاص طور پر آخری لائن بہت عمدہ رہیں۔ بیگ صاحب بازی گر لے کر آئے اور خوب آئے، بیگ صاحب کا ایک اور زبردست کارنامہ۔"

✠ **سید ظفر علی**، حیدرآباد سے محفل میں تشریف لائے ہیں "اس وقت میرے ہاتھ میں نومبر کا شمارہ ہے جو نصف پڑھ لیا ہے۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی، اس دفعہ آخری قسط تھی۔ یہ کہانی بہت اچھی تھی۔ اس کہانی کا جب میں نے نام پڑھا تھا اس وقت ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہیرو ہیروئن کو ملا یا جائے گا۔ کہانی کا اختتام بہت جلد بازی میں کیا۔ حالانکہ اگر میڈم شکیلہ اس سے محبت کرتی تھی تو اس کو اس کی غلطی معاف کر دینی چاہیے تھی اور پھر اس کی منگیتر کو بلاوجہ ہی مار دیا جس کا مجھے افسوس ہے۔ اس کہانی کو میں ایسے ہی پڑھ رہا تھا جیسے کوئی اپنے دوست کا خط پڑھ رہا ہو۔ اس لیے مجھے یہ بہت اچھی لگی تھی اور میں جذب ہو کر پڑھتا تھا اس لیے اعتراض کر رہا ہوں۔"

✠ **بشریٰ افضل**، بہاولپور سے آئی ہیں "20 اکتوبر کو سسپنس ہمارے خوب صورت ہاتھوں میں جگ مگ کر رہا تھا۔ واہ جی واہ ٹائٹل پر تو مہندی کی رسم دکھائی جا رہی ہے۔ مہندی لگے ہاتھ ڈھولک کی تھاپ پر سکھیاں گانے گا رہی ہیں۔ جون ایلیا مرحوم کی حقیقت پر مبنی باتیں دل کو لگتی ہیں، اپنی محفل میں داخل ہوئے تو عروہ خان کو کرسی صدارت پر بڑے کروفر سے بیٹھے دیکھا۔ ویسے تبصرہ قابل ستائش تھا۔ مبارکاں، ذیشان بدر کیوں بھئی ہمارے رائٹر کو کچھ نہ کہا جائے۔ جانے مانے رائٹر ہیں، ہے کوئی ان جیسا۔ طاہر الدین بیگ خدا آپ کو جنت کا صلہ عطا فرمائے۔ تبصرہ پسندیدگی کا شکریہ۔ حکیم خان سلامت پوری ہر ایک کو اپنے جیسا سمجھا ہے، سوچ کر بولا کریں۔ اریشہ بخاری اور باقی ساتھی خواتین سب غائب ہیں۔ بھئی واپس آجائیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ شعر تو بہت اچھے تھے ذرا کہانیوں کا نظارہ کر لیں۔ فریڈرک کے ساتھ الیہ ہی تھا، اس عورت کی (تلاش) میں اتنے پاپڑ بیلے، ملاقات ہوئی تو کہاں؟ تصویر کی گواہی میں جم نے اپنی طرف سے کوشش کی کہ پتا نہ چل سکے مگر یہ بھول گیا کہ فوٹوگرافر اس سے زیادہ ہوشیاری دکھا گیا اور اس کو بے نقاب کر دیا۔ کریموں جو دوسروں کو (مرغا) بناتا تھا خود دو دھان پان لڑکیوں کے ہاتھوں مرغا بن گیا۔ محیط عالم پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ کلید نجات میں ساحرہ جو بہن کے لیے قتل کیا تو بہن نے بھی بدلے میں قربانی دی اور آخر تک شمعون کو بے خبر رکھا کہ ساحرہ پر کیا گزری۔ منظور تو اپنے انجام کو پہنچا۔ ثمرین نے ساحرہ اور شمعون کی شادی کے لیے منظم طریقے سے فاران کو ہینڈل کیا، اس کہانی میں خاصا تیز ٹیمپو تھا آخری صفحات پڑھ کر مزہ آگیا۔"

✠ **علی ڈوگر**، ساہیوال سے محفل کی زینت بنے ہیں "یہ میرا سسپنس ڈائجسٹ کے لیے پہلا خط ہے۔ (خوش آمدید) ماہ نومبر کا خوب صورت شمارہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ ٹائٹل گرل پر اس دفعہ خصوصی محنت کی گئی ہے۔ جون ایلیا کا بنیادی مسئلہ پڑھا۔ یقیناً اس کے سامنے تمام مسئلے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اداریہ میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں کیونکہ آپ کی باتیں سچی اور کھری ہوتی ہیں۔ محفل میں حاضر ہونے سے پہلے کچھ اپنا تعارف کروانا چاہتا ہوں۔ میں اعجاز احمد راحیل عرف جگا ڈوگر کا چھوٹا بھائی ہوں اور سسپنس میں انہی کی وجہ سے پڑھتا ہوں۔ عروہ خان فرام کراچی ویلکم، اینڈ مبارک باد۔ ذیشان بدر منیر صاحب اپنوں سے اتنی شکایتیں؟ آنٹی بشریٰ افضل آپ ہمایوں سعید کے چکر میں کیوں پڑ گئی ہیں؟ ویسے آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ سعدیہ بخاری صاحبہ میں آپ کا تبصرہ بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ حکیم خان سلامت پوری آپ ہمایوں سعید کا بھی کچھ علاج کریں نا...... گل مروت صاحب آپ کا اختصار یہ اچھا لگا، شبانہ فرام لاہور کیا ہمایوں سعید نجومی بھی ہیں؟ آغا فرید احمد خان آپ کے شبانہ کے بارے میں لکھے گئے الفاظ پڑھ کر لگا آپ بھی جل ککڑ ٹائپ کی کوئی چیز ہو۔ سب سے پہلے نشور ہادی کی کلید نجات پڑھی۔ رشتوں جذبوں کو اجاگر کرتی یہ تحریر بہت اچھی لگی۔ ناصر ملک کا مسافر بھی اپنی منزل پر نہ پہنچ سکا۔ محبتوں میں انسان کو بہت سی آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بلاشبہ دو کشتیوں کے سوار کبھی کنارے نہیں لگتے۔ شہریار کے ساتھ جو کچھ ہوا یہ اس کی اپنی ہی خطا ہے۔ امید ہے ناصر ملک صاحب پھر بھی ہمارے لیے ایسی لازوال تحریریں لکھیں گے۔ کشکول بھی اس دفعہ سنسنی خیز اور پرتجسس رہی۔ اورنگ زیب، سراج و جگا وغیرہ شیخ حامد کے گرد جال پھیلا چکے ہیں۔ لیاقت حسین کا کردار بہت ہی عمدہ ہے۔ مرزا امجد بیگ کی بازی گر بہت عمدہ تحریر ثابت ہوئی۔ محبتوں کا سودا کرنے والے ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔ آلودگی بہت ہی پراثر تحریر ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید نے ہمیشہ معاشرے کے دکھتے ہوئے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ دشت ہے ٹھگوں کا، لازوال تحریر ہے۔ اس دفعہ کترنیں بھی اچھی تھیں۔ خاص طور پر مہرین ناز فرام حیدرآباد کے چٹکلے پسند آئے۔ محفل شعر و سخن میں مہرین ناز، مریم کائنات، عائشہ ثانی، ثمینہ حبیب کے اشعار پسند آئے۔"
(تبصرے کا شکریہ)

✠ **سید اکبر شاہ**، اوگی مانسہرہ سے محفل کی زینت بنے ہیں "سسپنس کے اعصاب شکن اور جاں گسل انتظار کا اختتام 21 تاریخ کو ہوا۔ ٹائٹل گرل چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ سجائے نظر آئی۔ سرخ ہونٹ اور ہاتھوں پر مہندی کی ڈیزائننگ دل کو بھا گئی۔ جون ایلیا صاحب کی پرحکمت باتیں پڑھیں۔ انہوں نے ملک پاکستان میں موجود بنیادی مسائل کو اجاگر کرنے کی بہترین کوشش کی۔ یاروں کے محفل میں پہنچے۔ اس بار انعام کی حقدار عروہ خان ٹھہریں۔ بہت بہت مبارک، آتے ہی زوردار چھکا۔ اسے اپنی خوش قسمتی ہی سمجھیں۔ یاجی گل یعنی طاہرہ گلزار صاحبہ کا محبت نامہ ہو اور ہم نہ پڑھیں یہ ہو نہیں سکتا۔ اعجاز احمد راحیل، آپ تو جذبات میں جگہ کا نام لکھنا ہی بھول گئے۔ البتہ تبصرہ شاندار تھا۔ سعدیہ بخاری صاحبہ، ہمایوں سعید تو ابھی میٹرک میں ہیں۔ قیصر اقبال صاحب، آپ کی بات





سسپنس نے ہمیں بہت سے ان دیکھے پرخلوص دوست عطا کیے ہیں، سے اگری کرتے ہیں کیونکہ ہمیں بھی آپ جیسے قابل فخر دوست ملے ہیں اور ہاں ہماری تصاویر بھی آپ تک جلد از جلد پہنچ جائیں گی بذریعہ پوسٹ۔ تفسیر عباس بابر کا تبصرہ بھی عمدہ تھا اور ان کے شعری مجموعے کی اشاعت کا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ مسافر کی آخری قسط کا مطالعہ کیا۔ شہریار کی بے بسی اور مظلومی پر کافی غمگین ہوئے اور کچھ ناصر ملک صاحب کے جادوئی قلم کے شعلے اگلتے الفاظ سے تو رونا آگیا۔ اسٹوری کا اینڈ خاصا غمزدہ کر گیا۔ بہرحال مسافر ایک زبردست اسٹوری ثابت ہوئی۔ مرزا امجد بیگ کی بازی گر پڑھی۔ ہمیشہ کی طرح ان کا یہ مقدمہ بھی سلجھ گیا۔ بالخصوص ان کی جرح کا دلچسپ انداز ہمیں بہت پسند ہے۔ اختتامی صفحات پر موجود نشور ہادی کی تحریر کلید نجات پڑھی۔ غیر ضروری طوالت کی وجہ سے کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ البتہ ثمرین کی قربانیاں قابل ستائش تھیں۔ شوکت علی ظفر کا فن پارہ مرغا پڑھ کر بے اختیار ہنس پڑے۔ اس کے لیے یہ محاورہ مناسب تھا کہ مفت مال دل بے رحم۔ اوروں کو مرغا بنانے والا خود ہی مرغا بن گیا۔ تصویر کی گواہی اور ایماندار بھی عمدہ تحاریر تھیں۔"

✠ **انعم ریاض**، نیول کالونی، ڈالیاں، کراچی سے "پچھلے رسالے میں پہلی بار خط لکھا جو کہ محفل کی زینت بننے کے بجائے ردی کی ٹوکری میں جا پہنچا۔ جس کا ہمیں افسوس تو ہوا لیکن یہ سوچ کر دوبارہ قلم اٹھایا کہ کوشش کامیابی کا دوسرا نام ہے۔ (خوش آمدید...... ہم آپ کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں) جون ایلیا صاحب کا انشائیہ پڑھتے ہوئے پتا ہی نہیں چلتا کہ ہم کب آخری سطور پر جا پہنچے۔ سسپنس ڈائجسٹ ایک منفرد اور سسپنس سے بھرپور شمارہ ہے۔ جس میں کہانیوں کا انتخاب ہمیشہ لاجواب ہوتا ہے۔ اس ماہ مسافر کی آخری قسط پڑھی۔ جیسے جیسے ہم کہانی کے اختتام کی طرف آرہے تھے۔ ویسے ہی شہریار کی اذیتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میڈم شکیلہ کا اس طرح گینگ ختم کرنا اور شہریار کو چھوڑ کر جانا نہ صرف شہریار کو بلکہ ہمیں بھی دکھی کر گیا۔ ناصر ملک صاحب ہم تو اس کا اختتام خوشیوں سے بھرپور سوچ کر بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ نشور ہادی کی تحریر بہت پسند آئی۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ آخر میں گزارش ہے کہ طاہر جاوید مغل کی کوئی قسط وار کہانی شامل کریں۔" (آپ کی خواہش جلد پوری ہونے والی ہے)

✠ **امین مراد انصاری**، نیو کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "نومبر 2013ء کا شمارہ 22 اکتوبر کو مل گیا۔ اپنا خط پا کر دلی خوشی ہوئی۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی تحریر وقت کی آواز ثابت ہوئی۔ میں اپنی معلومات کے لیے یہ جاننے کی کوشش کروں گا کہ یہ جون ایلیا کون صاحب ہیں۔ کہیں محترم معراج رسول صاحب تو نہیں...... (جی نہیں) اداریہ میں سچ کہا ہے کہ 72 فیصد سے زیادہ لوگوں کے پاس رہنے کے لیے مکان، پہننے کے لیے کپڑے اور کھانے کے لیے روٹی نہیں ہے۔ اس کے باوجود حکمران اپنی عیاشیوں میں مصروف ہیں۔ میں جون ایلیا کو اتنی گہری سوچ رکھنے پر سلام پیش کرتا ہوں۔ باقی تبصرہ بعد میں۔"

✠ **اعجاز احمد راحیل**، ساہیوال سے چلے آرہے ہیں "میں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی میں مجھے کوئی اتنی خوشیاں دے گا جتنی سسپنس کی بدولت ملی ہیں۔ نومبر 2013ء کا دلکش شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے شادیوں کا سیزن اپنے عروج پہ ہے جبھی تو سرورق پر حنائی ہاتھوں والی محبوبہ دلنواز کو اتنا سجایا سنوارا گیا ہے۔ صاحب قلم جون ایلیا صاحب نے اس دفعہ ہمارے سامنے بنیادی مسئلہ رکھا جو کہ مبنی برحقیقت ہے اور اس کا حل بھی ضروری ہے۔ اداریہ میں آپ کی اثر انگیز باتیں عمدہ و لاجواب ہیں مگر ساتھ ہی آپ نے مسافر کی آخری قسط کا بتا کر دل کو غمگین کیا نہ جانے کیوں اپنے اتنی جلدی کیوں بچھڑ جاتے ہیں؟ عروہ خان فرام کراچی کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ پشاور سے طاہرہ بی بی میں اچھا ہوں یا برا اللہ جانتا ہے۔ بہاولپور سے بشریٰ افضل صاحبہ کا انداز تحریر اچھا لگا۔ سعدیہ بخاری صاحبہ اتنی جیلسی اچھی نہیں ہوتی۔ آپ فوراً حکیم خان سلامت پوری سے رجوع کریں۔ حکیم خان سلامت پوری کی زندہ دلوں کے شہر لاہور سے آمد اور وکھرا سا انداز گفتگو اچھا لگا...... مظہر سلیم برادر بھی خود کو بیربل ثابت کرنے کی ناکام کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ لاہور سے شبانہ صاحبہ کی انٹری بھی خوب رہی۔ شبانہ بی بی کیا کریں مطلبی ہیں لوگ یہاں پہ مطلبی زمانہ۔ انمول لفظوں سے سجا ہوا اپنے سوہنے بھائی تفسیر عباس بابر کا انداز بیاں بہت اچھا لگا۔ ویسے تفسیر بھائی آپ کا خواتین کی جانب جھکاؤ کسی خطرے کا الارم ہے۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی جس کے سفر کی کوئی سمت نہ منزل ہو نہ زاد سفر تو ایسے مسافر کا بھلا کون ساتھ دے گا؟ شہریار کے جہاں تمام دشمن ختم ہوئے وہیں غزالہ کی موت بھی افسردہ کر گئی۔ بے شک جو کسی کی بے لوث وفا، پرخلوص محبت کو ٹھکراتے ہیں ان کا انجام شہریار کی طرح ہی ہوتا ہے۔ چندو ماہی نے ثابت کیا کچھ عورتیں باوفا بھی ہوتی ہیں۔ اسٹوری کے اینڈ پہ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، واہ رے محبت ہائے رے قسمت...... کشکول میں پرتاب بھوشن اینڈ لیاقت حسین کے مقابلہ میں جیت خیر کی ہوئی۔ نگینہ بھی لوچن کی پناہ میں چلی گئی۔ ابتدائی صفحات پر موجود تاریخی کہانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا، عبداللہ خان کا مکروہ کردار اپنے ہاتھوں انجام کو پہنچا، کہانی کے اینڈ پہ مغیث اور مہرین کا رشتہ جان کر حیرت کا جھٹکا لگا۔ نشور ہادی کی کلید نجات آنکھوں میں سے خوابوں، دلوں میں مچلتے جذبات، زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اجاگر کرتی تحریر بیسٹ ثابت ہوئی۔ ثمرین نے اپنی عزت کی قربانی دے کر اپنی اعلیٰ محبت کا ثبوت دیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی انمول تحریر آلودگی بیسٹ رہی۔ یقیناً ہمیں چاہیے کہ پہلے دلوں کی آلودگی ختم کریں، تبھی معاشرے میں امن و سکون ہو سکتا ہے۔ نومبر کا شمارہ ہمیں بہت پسند آیا...... محفل شعر و سخن میں مہرین ناز، زینب حیدرآباد، مریم کائنات، عائشہ ملک، سید اکبر شاہ، رانا منشی حماد فرہاد کے اشعار پسند آئے۔"

✠ **مقصود علی** ملیر کینٹ، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "اس دفعہ ماہ نومبر کا شمارہ 18 تاریخ کو ملا۔ سرورق انتہائی دلکش تھا۔ سرورق کی حسینہ ہاتھوں پہ مہندی سجائے اپنے دولہا کے خیالوں میں کھوئی ہوئی نظر آئی۔ دوستوں کی محفل میں لوگ لڑائی جھگڑا کرتے اور بونگیاں مارتے نظر آئے۔ مگر کچھ لوگ عقل مندانہ گفتگو کرتے بھی نظر آئے۔ اس شمارے کی کہانیوں میں سب سے پہلے جناب الیاس سیتاپوری کی "یہ دشت ہے ٹھگوں کا" پڑھی۔ واقعی لاجواب کہانی لکھی ہے اور اس کہانی کو پڑھ کر تاریخ سے آگاہی کے ساتھ ساتھ سید برادران کا انجام بھی پڑھنے کو ملا۔ کاشف زبیر صاحب کی "سوچ کی نسل" پڑھی۔ کہانی تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ کافی حد تک خوفناک بھی تھی۔ اس کے بعد سیدھا پہنچے، ناصر ملک صاحب کے پاس اور اپنی پسندیدہ کہانی مسافر پڑھی جو کہ آخری قسط کی شکل میں تھی، اتنی عمدہ کہانی لکھنے پر ملک صاحب کو ہماری طرف سے مبارک باد۔ امید ہے کہ جلد ہی کسی نئی تحریر کے ساتھ پھر آئیں گے۔ کلید نجات، نشور ہادی صاحب کی تحریر



سسپنس کے آخری صفحات کی زینت بنی، بہترین کہانی تھی۔ اسلوب بھی بہت اچھا تھا، مگر فاران کا کردار مایوس کن بلکہ قابل نفرت رہا۔ امجد بیگ صاحب نے اس دفعہ بھی اچھا کھیل کھیلا اور اچھی بازی گری دکھائی اور ایک پیچیدہ مسئلے کو آسانی سے عدالت میں بیان کر کے اپنی موکلہ کو پریشانیوں سے نجات دلائی۔ محیط عالم جیسی کہانیاں اور ایلیا صاحب کا انشائیہ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جنہیں آدمی دل کی آنکھوں سے پڑھتا ہے۔ اللہ کے دلیوں کے حالات زندگی ہماری روحوں کو سیراب کرتے ہیں۔ مختصر کہانی ایماندار اچھی رہی۔ جس میں فلوریٹ نے اپنی ایمانداری کو اچھوتے اور منفرد انداز میں کیش کروایا۔ تنویر ریاض کی تلاش اچھی رہی مگر افسوسناک انجام ہمیں افسردہ کر گیا۔ اس کے علاوہ مرغا میں ایک انتہائی چالاک شکاری کو خود مرغا بنتے دیکھا تو مزہ دوبالا ہو گیا۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ہر سیر کے لیے سوا سیر ہوتا ہے۔ آلودگی ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر اس دفعہ ہلکی رہی۔ تمام اشعار اچھے تھے، خاص طور پر کترنیں تو بہت ہی اچھی تھیں۔ مجموعی طور پر نومبر کا پرچہ بہت ہی اچھا تھا۔"

✠ **راجا ثاقب محمود جنجوعہ**، پنڈدادن خان سے محفل میں رونق افروز ہیں "نومبر کے سسپنس ڈائجسٹ کا ٹائٹل ہمارے دل و دماغ پر چھا گیا۔ جون ایلیا کے انشائیے بنیادی مسئلہ نے ہمارے ضمیروں کو خوب جھنجوڑا اور اس پر عمل کرنے کے لیے ابھارا۔ الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا میں سادات بارہہ کا انجام پڑھ کر بہت عبرت حاصل ہوئی۔ واقعی وہ اسی انجام کے مستحق تھے۔ کاشف زبیر کی سوچ کی نسل مختلف تہذیبوں اور روایات کی بہت ہی دلچسپ اور انوکھی معلومات سے بھرپور تحریر تھی۔ مرزا امجد بیگ محبتوں کا سودا کرنے والے ایک بازی گر کا قصہ، اپنے مخصوص دلچسپ انداز کے ساتھ تشریف لائے۔ نشور بادی کی کلید نجات زندگی کے معنی بدلنے والی اچھوتی داستان تھی۔ کشکول اور مسافر کی اقساط بہت دلچسپ اور تجسس سے بھرپور تھیں۔ محفل شعر و سخن کے تمام اشعار دل کو چھو لینے والے تھے۔ کترنیں بہت شاندار تھیں۔"

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "نومبر کا سسپنس عید کی چھٹیوں کے سبب کچھ تاخیر سے ملا۔ دیدہ زیب رنگوں سے سجا اور ٹائٹل گرل کے مسکراتے ہونٹ، شرمگیں آنکھیں، حنائی ہاتھوں کے ساتھ بہت اچھا لگا۔ انشائیہ میں بنیادی مسئلے کا تذکرہ ہو رہا ہے جو یقیناً عوام کا مسئلہ ہے بلکہ اب تو مسئلے ہو گئے ہیں۔ شاید کبھی دنیا امن و امان کا گہوارہ بن جائے۔ اے کاش شاید ایسا ہو جائے، آمین۔ اداریہ سے مستفیض ہوئے عروہ خان کو مبارکباد کہ اعزاز ان کو ملا۔ بہرحال آگے چلتے ہیں جہاں سب سے پہلے مسافر میں ہم قدم چلتے ہوئے منزل سے ہمکنار ہوئے۔ ناصر ملک کی ایک بہترین کہانی بہت اچھی لگی۔ زیادہ طوالت بھی نہیں تھی کہ لمبی لمبی تمہیدیں کرنے میں صفحے کے صفحے کالے کر دیے جائیں۔ دوسرا سلسلہ کشکول تھا۔ وہ بھی اختتامی مراحل میں ہے۔ تیسری خوب صورت تحریر یہ دشت ہے ٹھگوں کا، کہنہ مشق مصنف الیاس سیتاپوری کی تحریر تھی۔ ماضی کے اوراق بہت سے دریچے وا کر دیتے ہیں۔ جن میں عبرت کا زیادہ سامان ہوتا ہے۔ مگر سدا رہے نام اللہ کا۔ کیسے کیسے لوگ ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ کاشف زبیر کی سوچ کی نسل بھی اچھی تھی۔ ماریا اور مارکس کی محبت نے معرکہ جیت لیا۔ تصویر کی گواہی میں ایک چھوٹی سی غلطی نے پھانسی کا پھندا گلے میں فٹ کر دیا۔ مرغا بنانے والا خود مرغا بن گیا۔ دلچسپ تحریر تھی۔ تلاش بھی اچھی لگی۔ اولیا اللہ کے تذکرے میں ایمان کی روشنی کو منور کیا۔ کلید نجات آخری صفحات کی خوب صورت تحریر تھی۔ بہن کی خاطر اپنی عزت بھی گنوا دی۔"

✠ **حسیب احمد چناے**، الگڈی کرک سے ماہ اکتوبر کے شمارے پر تبصرہ کر رہے ہیں "مدیر اعلیٰ صاحب ہمارے ضلع کرک میں سسپنس ہمیشہ لیٹ ملتا ہے میں نے آپ کو شکایت بھیجی تھی۔ سسپنس اکیس ستمبر کو ملا، سرورق پردیسی گرل کو دیکھ کر من خوش ہوا۔ اگر اسے ٹائٹل آف دی ایئر کہا جائے تو یقیناً غلط نہیں ہو گا۔ جون ایلیا کی سیلاب پڑھی بہت ہی اچھی کاوش تھی۔ محی الدین نواب صاحب کی ماروی کے لیے دل بے قرار ہو گیا ہے نہ جانے کب یہ سسپنس کی زینت بنے گی۔ مہرین ناز نے بھی ہار نہیں مانی۔ مسلسل پانچ مرتبہ بلیک لسٹ ہونے کے بعد صدارت کی کرسی پر براجمان ہو گئیں۔ مبارک ہو، واقعی میں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور ہاں تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ اکثر دوست کہتے ہیں کہ زویا اعجاز نے میٹرک کب کیا؟ کبھی وہ میٹرک سے ڈائجسٹ پڑھ رہی ہیں اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ تیرہ سال سے ڈائجسٹ پڑھ رہی ہیں تو اب 2013ء ہے تیرہ سال پہلے 2000 تھا تو اس کا مطلب ہے کہ موصوفہ نے 2000ء میں میٹرک کیا تھا۔ ہے ناں زویا؟ کہانیوں میں منظر امام کی مبارک باد پڑھی۔ اگر ندیم کی جگہ میں ہوتا تو کب کا خودکشی کر چکا ہوتا۔ مسافر لاسٹ میں اچھی نہیں رہی میں تو سمجھا تھا کہ ایک خون ریز مقابلے کے ساتھ ہی وہ پروین کو حاصل کرے گا مگر وہ اسے اتنی آسان طریقے سے ملے گی یہ نہیں سوچا تھا۔ کشکول اور مسافر دونوں ہی اینڈ کی طرف جا رہے ہیں۔ نک ولیٹ نے بڑے شاطر انداز سے صابن کی چوری کر دی۔"

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، خانیوال سے "نومبر کا شمارہ عید کے بعد 19 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق کی حسینہ ہمایوں کی منگنی کے غم میں افسردہ نظر آئی پس منظر میں ڈھول باجے والے بھی پریشان کھڑے تھے۔ جون ایلیا ملک کی تعمیر و ترقی میں تعلیم کی اہمیت اجاگر کرتے نظر آئے، اداریہ میں کچھ سانحات و واقعات کا ذکر رہا اور ان سانحات میں ہمارا جو کردار ہوتا ہے وہ بھی نہایت خراب ہوتا ہے۔ حادثات میں حادثے کے شکار افراد کی جیبیں خالی کرنا، امداد مستحقین تک پہنچانے کے بجائے آپس میں ہی بانٹ لینا عام چلن بن گیا ہے۔ کرسی صدارت اس بار عروہ خان کے بوجھ سے لرزہ اندام رہی۔ محترمہ کا تبصرہ چوں چوں کا مربہ تھا تاہم مبارک باد تو دینا ہی ہے ناں؟ بس عروہ جی مبارک باد قبول فرمائیں۔ ذیشان بدر منیر آپ تو واقعی بدر منیر لگے بھائی۔ اتنا غصہ اور مار دھاڑ بیٹے کی نعمت پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ سید شکیل کاظمی سسپنس میں خوش آمدید! آپ کو زویا کے گہرے مشاہدے کا اور اک کیسے ہو گیا۔ اعجاز احمد راحیل، سعدیہ بخاری کے بارے میں آپ کی سوچ جہاں ختم ہوئی ہے وہاں سے سعدیہ کی تخریب کاری شروع ہوتی ہے۔ حکیم خان سلامت پوری کچھ کشٹ زہن صفا ہمارے حکمرانوں کو بھی بھجوا دیں تو احسان ہو گا قوم پر۔ گل مروت بھی آپ نے کہا تھا کہ میں اپنے خط میں نیازی بھیا کو ٹارگٹ کروں گی شاید آپ کا نشانہ خطا ہو گیا ہے ناں۔ آغا فرید آپ اب بھی محفل کی جان ہیں بھائی اور بابر بھائی کے دور کے ہی ہیں ناں وہ تو اپنی ستر ہویں سالگرہ منا چکے، آپ کی کون سی تھی سالگرہ؟ مسافر کی آخری قسط جان کر





سب سے پہلے مسافر پڑھی چندو ماہی اور شہریار کے سب دشمن اکٹھے کر کے ختم کر دیے گئے تاہم چندو ماہی اور شہریار کی جدائی افسردہ کر گئی۔ ہمارا ذاتی خیال یہی ہے کہ کوئی بھی سلسلے وار کہانی دو سال سے زیادہ نہیں چلانی چاہیے۔ کشکول میں پرتاب بھوشن کی ہلاکت پر دل خوش ہو گیا۔ آکٹوپس ابھی تک گرفت سے باہر ہی ہے۔ تصویر کی گواہی میں مجرم کی چالاکی اس کے کسی کام نہ آسکی۔ کلید نجات، نشور بادی کی بہت بورنگ ثابت ہوئی۔ نشاط کے حالات پر افسوس ہوا۔ ثمرین نے فاران کو جس طرح ہینڈل کیا وہ اس کے اخلاص و محبت کی گواہی ہے۔ امجد بیگ کی بازیگر بھی خوب رہی۔"

✠ **عبدالغفور خان ساغری خٹک**، اٹک سے ماہ اکتوبر کے شمارے پر تبصرہ کر رہے ہیں "اس ماہ کا سسپنس 19 کا ملا جس نے اس دفعہ متاثر کیا۔ میرے خیال میں سسپنس اس ماہ تک میں یہ ٹاپ ٹائٹل لگا ہے۔ کہانیوں میں جیسا کہ سب سے پہلے مسافر پڑھی جس میں ناصر صاحب نے آخر کو اچانک اپنی بہن سے اور ڈاکٹر شاہ سے ملا ہی دیا۔ کہانی کے دو کردار میڈم اور شہریار آپس کی گفت و شنید کے ساتھ اس کہانی کا مزہ دے گئی اس کے بعد کشکول کے جو اوراق کھولے تو پڑھتے پڑھتے رات کے دو بج گئے۔ ایس پی اور تنگ زیب اور کرنل صاحب آکٹوپس کے گرد گھیرا تنگ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ خطوط کے محفل میں جناب بی بی مہرین کو صدارت مبارک باد ہو۔ ماریہ فاروق آپ کو ایف ایس سی پاس ہونے کی مبارک باد۔ احمد خان توحیدی آپ کی اطلاع کے لیے کہ اٹک میں سیلاب نہیں آتا ہے کیونکہ یہ پہاڑی ہے۔ خطوط کی محفل میں اس ماہ کچھ نئے لوگ بھی شامل تھے اور کچھ پرانے تھے۔"

✠ **ماریہ فاروق**، چمن سے "امید ہے آپ سب ٹھیک ٹھاک ہوں گے میں کچھ غائب رہتی ہوں کیونکہ مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ صبح نماز کے بعد سے لے کر مغرب کے بعد ہی مجھے سکون کی سانس لینے کا وقت ملتا ہے۔ آج کل میں ٹیچنگ کر رہی ہوں اس لیے اپنے پیارے سسپنس کے لیے وقت اتنا نہیں مل پاتا۔ سردیاں بھی عروج پر ہیں اور میں لوڈشیڈنگ کو نظر انداز کر کے اپنے پیارے سسپنس کو ٹارچ کی روشنی میں خط لکھ رہی ہوں۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت ہے اور اس کے تخلیق کار نے واقعی اپنی تخلیق رقم کروائی ہے۔ صرف کاشف زبیر کی کہانی پڑھی ہے وہ واقعی بہت زبردست رائٹر ہیں ان کی ہر کہانی میں عجب سوز کا سماں پایا جاتا ہے۔ ستمبر کے شمارے میں ان کی لکھی گئی تحریر خون کا رشتہ بہت ہی اچھی لگی۔ مسافر اچھی جا رہی ہے، ناصر ملک صاحب نے محبت کی بے بسی کے لیے جو دائرہ کھینچا ہے وہ تو بے مثال ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب نے جب بھی لکھا۔ معاشرے کی کہانیوں میں ایسا رنگ و روپ ڈال دیتے ہیں کہ بے اختیار انسان تعریف کے لیے الفاظ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ قیصر اعوان بھائی آپ سزائے موت کے قیدی ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے تمام گناہ معاف فرمائے، آپ بھی ہر وقت استغفار پڑھا کریں۔ آپ نے میرے رزلٹ کا پوچھا تھا تو اللہ کے فضل و کرم سے میں فرسٹ ڈویژن میں 781 مارکس لے کر کامیابی حاصل کر چکی ہوں، ایف ایس سی کلیئر ہو گیا ہے۔ عمران حیدر بلوچ کا سن کر بہت دکھ ہوا کاش وہ ٹھیک ٹھاک ہوتے تو سزائے موت کی سزا کے ختم ہونے پر خوشی محسوس کرتے۔ محمد ہمایوں سعید صاحب آپ نے محبت کے بارے میں جو لکھا ہے کہ محبت کا کوئی موسم نہیں کوئی مذہب نہیں مگر میں اس بات کے خلاف ہوں۔ حسیب احمد چناے آپ نے مجھے کس خوشی میں مبارک باد دی تھی۔ خط شائع ہو یا نہ ہو میں سسپنس کو ہمیشہ خطوط بھجواتی رہتی ہوں، اینی وے خیر مبارک۔ رمضان پاشا صاحب آپ نے سسپنس سے جب بائیکاٹ کا اعلان کیا تھا واقعی مجھے بے حد افسوس ہوا مگر ٹھیک ہے لوٹ واپس سسپنس کو جوائن کیا۔"

✠ **حاجی احمد شیر ملک جاڑا**، خوشاب سے "کافی عرصے سے سسپنس سے ناتا جوڑا ہے۔ مسافر بہت اچھی جا رہی تھی پتا نہیں آپ کو اسے سمیٹنے کی کیوں جلدی ہوئی؟ دوسرے نمبر پر کشکول بھی بہت اچھی جا رہی ہے۔ مرزا امجد بیگ ہمیشہ کیس جیتتے ہیں کبھی ان کا ہارا ہوا کیس بھی لگا دیا کریں۔ الیاس سیتاپوری بادشاہوں اور ٹھگوں کے قصے سناتے ہوئے نظر آئے، نشو ہادی صاحب کی کہانی کلید نجات نے بھی کافی متاثر کیا خاص طور پر ثمرین نے بہت قربانی دی اور ساحرہ کی بہن ہونے کا حق ادا کر دیا۔ امجد رئیس کی تصویر کی گواہی بھی گزارہ لائق تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی کا نام آلودگی کچھ بچا نہیں، کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ کترنیں بھی اچھی تھیں۔ ہماری محفل یعنی آپ کے خط میں اعجاز احمد راحیل بھرپور شکوہ کرتے نظر آئے پلیز انہیں ضرور موقع دیا کریں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے تمام رسائل دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کریں اور ہمارے پیارے پیارے ساتھی ہمیشہ ان رسائل کی رونق بڑھاتے رہیں۔"

✠ **آسیہ مقبول چودھری**، احمد پور شرقیہ سے "نومبر کا جاسوسی بہت لیٹ ملا سرورق پر حنائی ہاتھ لیے ٹائٹل گرل عید کی نوید سنا رہی ہے۔ سب سے پہلے آپ سے ایک خوشی شیئر کرتی چلوں کہ درس نظامی میں درجۂ اول یعنی بی۔ اے کے امتحان میں، میں فرسٹ ڈویژن آئی ہوں۔ (بہت بہت مبارکاں) سب سے پہلے جون ایلیا مرحوم کا بنیادی مسئلہ پڑھا، اس کے بعد اپنی محفل میں جھانک کر جو دیکھا تو کراچی کی عروہ خان کو پہلے نمبر پر دیکھا۔ عروہ مبارک ہو اور اے ایم چودھری یعنی آسیہ مقبول چودھری لکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے مجھے جی۔ اس بار صدارت کی کرسی کے ساتھ ساتھ صنف نازک کے آٹھ خط شائع ہوئے تھے۔ یہی محنت رہی تو پھر صنف کرخت کہیں بھی نظر نہیں آئیں گے۔ سعدیہ سسٹر! آپ کی دعاؤں نے رنگ دکھا دیا، تھینکس۔ آغا بھائی! آپ تو طویل عرصے سے محفل میں آتے رہے ہیں، پھر آپ نے تصویر العین کو آنٹی کیوں کہا؟ قدرت اللہ بھائی اس میں پس منظر والی کون سی بات ہے، آپ نے پوچھا اور ہم نے بتا دیا۔ محفل کے تمام قیدی بھائیوں کے لیے دعا کہ اللہ انہیں جلد از جلد باعزت رہائی دلائے۔ محفل کے تمام بہنوں اور بھائیوں کے خط شاندار اور جاندار تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے (مسافر) پڑھی جس کا بھی اختتام ہو گیا۔ بہت ہی اچھا ہوتا اگر میڈم کی شہریار سے شادی ہوتی۔ نہ کھالے کا پتا چلا کہ کہاں ہے نہ حیدر خان اور یاور خان کی موت کو دکھایا گیا۔ کچھ کچھ ادھورا ادھورا لگا۔ کلید نجات نشور بادی کی شاندار تحریر تھی، ثمرین کی قربانی پر بہت پیار آیا۔ تلاش میں فریڈرک کی تلاش بھی اس خوب صورت عورت کی موت پر ختم ہوئی جس کو پوری عمر بس ڈھونڈتا ہی رہا تھا، اتفاق سے اس کی موت بھی اس کے سامنے ہی ہوئی۔ عمدہ تحریر دی گئی۔ ایماندار میں ترقی کا شارٹ کٹ سکھایا گیا ہے۔ مرغا میں نازک حسیناؤں نے لوگوں کو مرغا بنانے والے کو ہی مرغا بنا دیا، بازیگر دلکش تحریر تھی جس میں مرزا انکل نے میاں بیوی کے درمیاں خلیج دور کروانے کا کیس لیا جو بالآخر مرڈر کیس کی پیروی کرنے اور ملزم کو باعزت بری کروانے پر ختم ہوا۔ رسالہ لیٹ ملا اس لیے اتنا ہی پڑھ پائی ہوں، باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔"



☩ **زویا اعجاز**، لاہور سے ”نومبر کا سسپنس ڈائجسٹ انتہائی صبر آزما انتظار کے بعد ایک ہفتہ تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ حسینہ سسپنس حنائی ہاتھ، شرمیلی مسکان اور خمار آلود آنکھوں میں مستقبل کے خواب سموئے مشرقیت کی جیتی جاگتی تصویر نظر آئی۔ جون ایلیا کا بنیادی مسئلہ موجودہ حالات کے پیش نظر لاینحل نظر آتا ہے۔ خطوط کی محفل میں رونقیں اپنے عروج پر تھیں صد افسوس اس رونق کا حصہ اب کی بار ہم نہ تھے۔ مگر خیر گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔ شکیل حسین کاظمی، مظہر سلیم اور تفسیر عباس کا شکریہ۔ نیازی صاحب اور قیصر اقبال صاحب کے حسن نظر کے لیے بے انتہا ممنون ہوں۔ شبانہ جی کے نقطہ نظر سے میں بھی پوری طرح متفق ہوں مترجم کہانیوں کے اوریجنل رائٹرز اور عنوان ضرور دیے جانے چاہئیں جیسے نوے کی دہائی کے سسپنس میں دیے جاتے تھے۔ تاریخ کے جھروکے میں ٹھگوں کا دشت نظر آیا۔ مغیث اور مہرن کے کردار بہت جاندار تھے۔ کشکول میں پرتاب بھوشن کی موت کے علاوہ باقی واقعات نے انتہائی بور کیا۔ مسافر اپنی مسافت کے اختتام کو پہنچ گئی۔ بہت منطقی اور حقیقت کے قریب تر اختتام تھا تاہم عاشی کا انجام کچھ واضح نہ ہو سکا۔ مجموعی طور پر ناصر ملک صاحب کی یہ بہت عمدہ کاوش رہی۔ کردار نگاری، منظر کشی، جذبات، انتقام، محبت، نفرت، دوستی، دشمنی غرض یہ کہ ہر رنگ لاجواب تھا۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر طے کرتی محیط عالم بہت خوبصورت تحریر تھی۔ کلید نجات کے آغاز میں کہانی کی اٹھان اچھی تھی مگر کرداروں سے نشور بادی مکمل طور پر انصاف نہ کر پائے۔ ثمرین کی قربانی اور ساحرہ کا شمعون کے ساتھ دو رُخی رویہ کچھ غیر فطری سا لگا۔ مختصر کہانیوں میں ڈاکٹر شیر شاہ سید ایک بار پھر بہت المناک موضوع لے کر آئے۔ جنگی جنون نے انسانی ذہن کو جو آلودگی بخشی ہے۔ سوچ کی نسل بہت سحر انگیز ثابت ہوئی۔ بازی گر کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ شوکت علی ظفر کے مرغے نے بے اختیار لبوں پر ہنسی بکھیر دی۔ محفل شعر و سخن میں نوروز احمد، کائنات مریم اور محمد صفدر معاویہ کے منتخب اشعار بہت عمدہ تھے۔ آخر میں آپ سے ایک شکوہ کرنا چاہوں گی۔ نومبر کے سسپنس کی جھلک میں طاہر جاوید مغل کی کہانی ”تحفہ“ کا ذکر کیا گیا تھا مگر ڈائجسٹ میں اس کا کہیں نام و نشان نظر نہ آیا۔“ (اب آپ کی شکایت دور ہو گئی ہوگی...... کبھی کبھی حد درجہ مجبوری میں ایسا بھی کرنا پڑتا ہے)

☩ **عاصم اقبال جسپال قیدی سزائے موت** سرگودھا سے ”اس ماہ کا سسپنس سزائے موت کی کال کوٹھریوں میں بیس تاریخ کو ملا جس نے ہماری تاریک زندگی کو روشنیوں میں تبدیل کر دیا۔ جناب حسینہ اپنے گورے ہاتھوں پر مہندی لگائے ڈھول کی تھاپ پر شرما رہی تھی۔ محفل میں آتے ہی عروہ خان سامنے آئیں آپ نے بہت ہی شاندار تبصرہ کیا لیکن ایک بات نے سوچ میں ڈال دیا کہ پہلے چار چاند تو سنے تھے لیکن کراچی میں آٹھ چاند آ گئے یہ پہلی بار سنا ہے۔ تمام قارئین جو ہر بار عمران حیدر بلوچ کا پوچھتے تھے جو ہمارا قیدی بھائی تھا وہ ہم اور تم سب سے جدا ہو گیا ہے۔ وہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا ہے اللہ پاک اسے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ کہانیوں میں مسافر پڑھی بہت ہی اچھی لگی لیکن اس کا اختتام ہو گیا ہے ہمیں انتظار رہے گا کہ اب کون سی نئی کہانی آتی ہے۔ محیط عالم نے تو ایمان تازہ کر دیا بے شک عبداللہ پر اللہ پاک کی خاص مہربانی تھی کہ سانپ کو اس کی نگرانی کے لیے بٹھا دیا گیا جو اس کی نیند میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کرتا رہا، بے شک اللہ پاک بہت مہربان اور رحیم ہے۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ محفل اشعار میں بھی اچھے شعر تھے لیکن تفسیر عباس، مہرین ناز، محمد عقیل چھٹہ کا انتخاب پسند آیا۔“

☩ **ذیشان بدر منیر**، دینہ سے ”20 اکتوبر کی خوب صورت شام کو پیارا سسپنس ملا۔ ڈاکٹر انکل واہ کیا بات ہے جناب عید مبارک کہتی حسینہ پیلے رنگ کے کپڑے پہنے پیلے رنگ کی چوڑیاں کلائی میں سجائے ہاتھوں پر مہندی لگائے بڑی خوب صورتی سے اپنے ہونے والے شہزادے کی راہ تک رہی ہے۔ جون صاحب نے درست کہا، ہمارا بنیادی مسئلہ اچھے اسکول، کالج، یونیورسٹیاں اور معیار تعلیم ہے اور زراعت اور اچھے کارخانے ہیں۔ پاکستان میں محنت غریب لوگ کرتے ہیں اور دن رات ایک کر کے بچوں کو مشکل سے دو وقت کا کھانا کھلاتے ہیں وہ ناممکن ہوتا جا رہا ہے تعلیم مڈل کلاس مشکل سے اپنے بچوں کو دلوا رہی ہے اور نوکریوں کے لیے پھر بھی سفارش، رشوت کی تلاش جبکہ امیر طبقہ جو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتا ہے بڑا ہو کر ہمارا مال لوٹتا کھسوٹتا ہے اور عیاشی کر کے مرتا ہے۔ پاکستان کو کبھی بھارت سے جنگ لڑنا پڑتی ہے تو کبھی اپنے ملک میں ہی دشمنوں نے آگ لگا رکھی ہے باقی کبھی جرنیل تو کبھی سیاست دان ہمارا خون چوس کر پی جاتے ہیں۔ پاکستانیو ہم بجلی، پانی، روٹی کے چکر سے نکل کر ایک بار ہی اچھے اچھے لوگوں کو تیار کر کے بغاوت کیوں نہیں کر دیتے کیوں ان سیاست دانوں، جرنیلوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ ہمیں علم کے میدان سے محنت کر کے چھوٹی سی ملازمت سے بڑے عہدوں پر ترقی کر کے پاکستان کے سب لوگوں کو برابر کا مقام دلوانا ہوگا۔ ہم یہ کر سکتے ہیں۔ اپنے بچوں کو غیر ضروری سہولیات چھوڑ کر انہیں اچھی تعلیم دلوا کر انہیں کامیاب کروا سکتے ہیں۔ ویلکم عروہ خان جی، تبصرہ اچھا کیا اپنا آدھا خط پا کر خوشی نہیں ہوئی۔ رانا حبیب صاحب امید رکھیں اس ذات پاک سے جس کے ایک لفظ ادا کرنے سے دنیا ادھر ادھر ہو جاتی ہے وہ اللہ ضرور کرم کرے گا، انشاء اللہ۔ روشنی رشید جی بچوں کا پڑھا پڑھا کر ستیاناس کر رہی ہوں گی اور امین انجم ڈاکٹر بن کر ستی خان اپنے مست لینڈ میں شاید مست ہوں کہانیوں پر تبصرہ ہو جائے۔ شوکت علی کی مرغا پڑھ کر انجام کا اندازہ پہلے سے ہو گیا تھا اپنی وے آج کل کے لڑکے بھی کم نہیں لیکن لڑکیاں تو اللہ کی پناہ بہت چالاک لومڑیاں ہیں۔ ایمان دار بھی بہت اعلیٰ کاوش تھی۔ اس دور میں ایمان داری ایک طعنے سے کم نہیں۔ محفل شعر و سخن میں قیصر اعوان کا شعر بہت اعلیٰ تھا۔“

☩ **طاہرہ گلزار**، پشاور سے اپنا شکایت نامہ لے کر حاضر ہیں ”انکل معراج رسول اور آنٹی عذرا رسول، پہلے تو اللہ تعالیٰ سے آپ کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کے صدقے میں معراج انکل کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ ایک شکایت آپ تک پہنچانی مقصود ہے۔ انکل ہم تبصرہ نگار اتنے پیار اور شوق سے خط لکھتے ہیں لیکن آپ لوگ ہمارے بہت سے تبصرہ نگاروں کے خطوط بلیک لسٹ کر دیتے ہیں۔ انکل آپ سے گزارش ہے کہ آپ دو تین صفحات بڑھا دیں بے شک قیمت بڑھا دیں۔ میں امید رکھتی ہوں کہ آپ میری شکایت اور درخواست پر عمل درآمد ضرور کریں گے۔“ (آپ کی شکایت اور فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب یا تو آپ کا خط وقت پر نہ ملے یا بھی جگہ کی کمی...... تاکہ دوسروں کو بھی موقع ملے)





☩ **محمد ہمایوں سعید**، بنوں سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ”نومبر کے سسپنس کو عید سے پہلے پاکستان کے کونے کونے میں پہنچا کے ادارے نے قارئین سے اپنی محبت کا عملی ثبوت دیا۔ انکل جی ٹھیک فرماتے ہیں آپ کہ آوارن زلزلے پر پاکستانی عوام میں وہ جوش و جذبہ اور ہمدردی وایثار نظر نہیں آ رہا اور میڈیا بھی کوئی کردار ادا نہیں کر رہا۔ عروہ صاحبہ ہم تو اہل کراچی کے لیے پہلے سے دعا گو ہیں مگر آپ لوگ بھی تو کچھ کیجیے۔ ذیشان بدر منیر صاحب نے آتے ہی بلیک اینڈ وائٹ کے زمانے کے دوستوں کو پکارنا شروع کر دیا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ! آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ ہمایوں چکر لگانے والوں میں سے نہیں لگوانے والوں میں سے ہے۔ سعدیہ جی! ہمارے دعوے کی سچائی یہ ہے کہ اس بار آپ نے کسی کو بھی انکل نہیں کہا۔ مظہر صاحب! اگر آپ کی بات کو درست مانا جائے تو ہماری عمر 83 سال بنتی ہے۔ کاش ہماری عمر اتنی لمبی ہو۔ گل مروت کسی کے کہنے پر خط لکھنے کی زحمت مت فرمائیں۔ یہ دل والوں کی محفل ہے اور دل سے پڑھی جاتی ہے۔ تفسیر صاحب! ہم نے آج تک شاعری کی کوئی کتاب نہیں لی مگر آپ کی کتاب ضرور لیں گے۔ آخری صفحات پر بھی نشور بادی کے مخصوص انداز اور خوب صورت ترین جملوں کی کہانی کلید نجات نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ کاشف زبیر کی سوچ کی نسل کسی پالی وڈ موومی کی طرح سنسنی دوڑا گئی۔ میریا اور مارکس کے دہشت ناک انجام نے بہت دکھی کیا۔ تصویر کی گواہی شاندار رہی۔ جم کی پلاننگ بلاشبہ شاندار تھی۔ شاہ صاحب کی کہانی آلودگی، دل کو چھو لینے والی کہانی ثابت ہوئی۔ تحویر ریاض کی تلاش ایک بزدل عاشق کی نہ ختم ہونے والی تلاش کی دلچسپ کہانی تھی۔“

☩ **گل مروت**، لکی مروت سے شریک محفل ہیں ”عید کے دنوں میں بہت زیادہ مصروفیت تھی کیونکہ ہماری 5 فیملیوں کے کزن ایک ہی جگہ اکٹھے تھے۔ پھر بھی مجھے ہر دم سسپنس یاد آتا رہا اور جب اپنا خط دیکھا، اف! ایسا کیا ظلم کیا تھا میرے خط نے جو آپ لوگوں نے خط کے سارے ہاتھ پاؤں ہی توڑ دیے۔ عروہ خان! پشتو میں عروہ ”سنو“ کو کہتے ہیں تو سنو صاحبہ آپ کو مبارک باد۔ ذیشان لالا آپ کو بیٹے کی مبارک باد۔ راحیل لالا آپ ساہیوال کا سارا انکمن ادارے والوں کو لگا دیتے ہو۔ سعدیہ آپی! اب آپ میں وہ پہلے والا دم خم نہیں رہا۔ تفسیر لالا ہم تو آپ کو 29 کا سمجھ رہے تھے۔ مگر ڈائجسٹ میں آپ کی تصویر دیکھ کر...... اکبر شاہ بچے کو بلیک لسٹ کے جھولے میں قید رہتے دیکھا۔ کہانیوں میں مسافر کی آخری قسط میں جہاں میڈم شکیلہ کے دشمنوں کے خاتمے پر خوشی ہوئی وہیں غزالہ کی موت افسردہ کر گئی۔ کشکول میں سکندر شاہ کا ایک اور مہرہ پٹ گیا۔ نگینہ کی صورت میں اور پرتاب بھوشن جہنم واصل ہوا۔ کلید نجات میں ثمرین کا کردار پسند آیا۔ جس نے شمعون اور ساحرہ کو ملانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ دشت ہے ٹھگوں کا میں مہرن کا کردار اور آخر میں مغیث مہرن کا بھائی نکلا، پڑھ کر چونک اٹھے۔ بازی گر میں ہما کا کردار پسند آیا۔“

☩ **محمد جاوید**، تحصیل علی پور سے محفل میں شریک ہیں ”واللہ اگر ہم رجسٹرڈ شر میلے نہ ہوتے تو ہفت رنگ خیالوں کی کہکشاں کی سیر کرتی شرگیں سرگیں پاکیزہ حسن بے پناہ کو حسن دوست نگاہوں سے خوب گھور گھور کر دیکھتے۔ شمارے کا درشن چودہ تاریخ کو ہوا گویا عید سے پہلے عید ہو گئی۔ مرحوم جون ایلیا کی بات بجا لیکن اس قوم کی فی الحال جون نہیں بدلنے والی۔ صدر میکر انکل چونکہ اس بار بھی کچھ انوکھا کرنے کے موڈ میں تھے اسی لیے نومولود باد بہار عروہ خان کو یک ماہی صدارت سونپ دی، بہرحال پاکیزہ عروہ خان، ذیشان بدر، آغا فرید احمد کو مشترکہ مبارک باد۔ طاہرہ گلزار کا مسلسل دھرنا بھی کامیاب رہا اور محفل میں جگہ پانے میں کامیاب رہیں۔ سعدیہ بخاری آپ سے سوال عرض ہے سو جواب قرض ہے بتائیے ہم نے کون سے شمارے میں کیا افواہ پھیلائی تھی؟ جلدی جواب دیں ورنہ۔ رمضان پاشا حیرت ہوئی کہ آپ فرخ سیر کے بارے میں لاعلم تھے۔ رانا حبیب الرحمن آپ تو گھاگ ہیں آپ کو پتا ہونا چاہیے لفظ فنکر اچھے لوگوں کی اصطلاح کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ نیازی صاحب عقل بڑی یا ماہا ایمان؟ ارے بھائی ماہا صاحبہ کیا ہیں کیا نہیں مگر تفسیر عباس کوئی ڈراما نہیں کر رہے۔ فوزیہ مسکین سرورق کی لڑکی ظاہر ہے اپنے محبوب سے شرما رہی تھی۔ اب آپ سے تو شرمانے سے رہی۔ ہمایوں بھائی اپنے گلے میں اپنے نام کی پرچی لکھ کر ضرور ڈال لینا تاکہ ساہیوال والوں کو تلاش بسیار کی زیادہ زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ تلاطم خیز کہانی مسافر غیر متوقع اور قدرے درد انگیز انداز میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ کہانی کی 21 اقساط پڑھ کر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا مسافر ابھی حالت آغاز میں ہو لکھاری کی طرح ناصر ملک نے کہیں بھی قارئین کی سوچ کے عکس کے مطابق اسٹوری آگے نہیں بڑھائی، اٹھا کے پچھاڑ ہو یا مزاح ہر جگہ پر ناصر صاحب کا انداز تحریر زبردست رہا، رومانس حد درجہ دل میں کھلبلی سی مچا گیا۔ سب رو کشکول کے زبردست جادوئی کردار پرتاب خس کم جہاں پاک ہوا۔ اس کے بعد شیخ حامد کا دی اینڈ پر یقیناً انور صاحب کشکول کا چیپٹر کلوز کریں گے۔ بازی گر مرزا صاحب اس واری بھی بے گناہ موکل کو مکھن میں سے بال کی طرح نکال کر لے گئے۔ کلید نجات ثمرین کی قربانی نے حد درجہ دل گیر کیا۔ قانونی طور پر پوزیشن مستحکم ہونے کے باوجود ثمرین و ساحرہ غلطیوں پر غلطیاں کر کے لٹ جانے کا سامان کرتی رہیں۔ تفسیر عباس بابر بلاشبہ گہرے اور قد آور شاعر ہیں۔ شوکت علی ظفر چور کو پڑ گئے مور کی عملی تفسیر رہا۔ مرغا پھانسنے والا کریمو خود دو لڑکیوں کے ہاتھوں مرغا بن گیا۔ تصویر کی گواہی میں ایک بے حد چالاک منصوبہ ساز مجرم کو بے جان تصویر کی گواہی لے ڈوبی۔ روحانی تعلیمات کمالات سے لبالب لبریز محیط عالم ہمیشہ کی طرح من پسند تحریر رہی۔ سسپنس ڈائجسٹ کے روحانی اور دنیاوی تاریخی سلسلے علمی اور پسندیدہ سلسلے ہیں۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

شوکت شہریار، اوکاڑہ۔ سیف علی اعوان، نور پور اعوان۔ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی۔ ہارون رشید، مردان۔ سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ۔ محمد تقی عباس، عمران حیدر، سینٹرل جیل میانوالی۔ شفیق، لاہور۔ قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا۔ فضا خان، لاہور۔ مہرین ناز، حیدرآباد۔ اطہر حسین، کراچی۔ عبدالشکور شاہ، کورنگی، کراچی۔ ملک رحمت، میانوالی۔ ابرار وارث، سندیلیانوالی۔ احسان سحر، میانوالی۔ حکیم خان سلامت پوری لاہور۔ جی ایم آزاد، قائم پور ضلع بہاولپور۔ مظہر سلیم، رحیم یار خان۔ بشیر احمد خان، جنڈ ضلع اٹک۔ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

*



# لذّتِ آشنائی

الیاس سیتا پوری

سچ ہے کہ "عشق نہ پوچھے ذات" سازوں کی آوازوں پر تھرکنے والی ایک طوائف جانے کیسے ناچتے ناچتے اس تاجور کے دل میں گھر کر گئی... تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جب دنیا نے ذروں کو آفتاب بنتے دیکھا اور دانتوں تلے انگلیاں داب لیں... راجا رنجیت سنگھ بھی ایک ایسا ہی تاریخی کردار ہے جس کے نام سے رعایا ڈرتی تھی۔ اس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی مگر سلطنت کے معاملات اس نے بڑے سیدھے اصولوں پر چلائے... ایک آنکھ سے معذور تھا یعنی دنیا کو صرف ایک آنکھ سے دیکھا، پرکھا اور تختِ شاہی پر ایک لمبے عرصے تک حکومت کی مگر... تمام عمر ایک ناچنے والی کے اشاروں پر ناچتا رہا... ایسے معاملات خود بخود طے نہیں پاتے بلکہ اسے مقدر کا لکھا کہتے ہیں... یہی خدا کی قدرت ہے جو ایک طرف تو انسان کو اتنا طاقتور بنا دیتا ہے کہ تختِ شاہی پر بٹھا کر اس کے آگے ہاتھ باندھے دربار کھڑا کر دیتا ہے لیکن... اسی تصویر کا دوسرا رخ اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ یقین نہیں آتا... بہرحال اس کامیاب سلطان نے اپنی ہرجائی محبوبہ کا ہر وار بڑے طریقے سے دل پر سہہ لیا اور انتہائی پُروقار انداز میں اپنے اس اندھے عشق کا اختتام بھی کر دیا... کیونکہ عشق میں ہر ستم برداشت ہو جاتا ہے لیکن دغا برداشت ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی داغ قابلِ قبول... وہ عام انسان نہ تھا بلکہ ایک بادشاہ تھا پھر کیسے... اپنے ادنیٰ غلام کو ایک رقیب کے طور پر قبول کر لیتا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

شالامار باغ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ چراغوں اور مشعلوں کی روشنی نے رات کو دن بنا دیا تھا، سرو کی قطاریں دم بخود کھڑی جشن کے بسنت بہار سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ستائیس سالہ سکھ فرماں روا مہاراجا رنجیت سنگھ بسنتی لباس میں ملبوس رقص و موسیقی کی جان بنا بیٹھا تھا، اس کے گلے میں قیمتی جواہرات اور موتیوں کی لڑیاں پڑی تھیں اور پشت ایک ریشمی گاؤ تکیے سے لگی ہوئی تھی۔ دونوں طرف پہلوؤں میں بھی تکیے دبے ہوئے تھے۔ پیچھے مورچھل بردار مگس رانی کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ سامنے ذرا فاصلے پر دائیں بائیں قدرے بے تکلف امرا اور مصاحبین بسنتی لباسوں میں ملبوس نگاہ روبرو کیے بیٹھے تھے، ان میں مسلمان بھی تھے، سکھ اور ہندو بھی، اور انہیں ان کے لباسوں سے پہچانا جا سکتا تھا۔ مہاراجا کے سامنے کنیزان مہ وشان شرابوں کے آلات کے ساتھ مودب بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ مہاراجا کے اشارے کی منتظر تھیں، کنیزوں سے آگے اور امرا اور مصاحبین کی دو رویہ قطاروں کے درمیان لاہور کی مشہور ترین مغنیائیں اور رقاصائیں اپنے اپنے سازندوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ انہیں مہاراجا نے بسنت کا جشن منانے کے لیے بلایا تھا۔ ہتھیاروں اور سپاہیانہ آن بان سے محروم اہل مجلس، کبھی کبھی مہاراجا کی نظریں بچا کے ان پری چہروں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے اور نہایت احتیاط سے ہونٹوں پر زبان پھیر کے رہ جاتے، مہاراجا ان کے اندرونی ہیجان سے دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہا تھا اور کسی کسی لمحے زیرلب مسکرا کے ان کی حالت زار کا مذاق اڑاتا۔

باغ کے سبزہ زاروں میں مہاراجا کی نگراں اور محافظ فوج بکھری پڑی تھی اور ہتھیاروں سے لیس مجموعہ بھی بسنتی کپڑے پہنے ہوئے تھا، یہ دس دس پانچ پانچ کی ٹکڑیوں میں تقسیم شراب کے مزے لوٹ رہے تھے۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کوتاہ قامت، کوتاہ گردن، بائیں آنکھ ندارد، داہنی آنکھ موجود لیکن غلیل کے غلے کی طرح ابلی ہوئی، چہرہ چیچک کے داغوں سے منقش تھا لیکن یہ داغ آپس میں ملے ہوئے نہیں تھے اور ان نشانات سے دونوں رخساروں پر جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ ناک چھوٹی، سیدھی، مگر آگے سے ذرا موٹی تھی۔ ہونٹ پتلے پتلے، ڈاڑھی کلوں پر گھنی اور نیچے ٹھڈی پر دو حصوں میں گندھی ہوئی، مونچھ گھنی تھی، سر قد کی نسبت سے بڑا تھا گردن موٹی اور پُر گوشت تھی۔ بحیثیت مجموعی مہاراجا ایسا تھا کہ اگر وہ صاحب اقتدار نہ ہوتا تو اپنی بدترین وضع قطع کی وجہ سے لوگوں کی توجہ اور مخاطبت کو ترس جاتا۔

مہاراجا نے ذرا سیدھے ہو کے ایک طائفے کو اشارہ کیا۔ رقاصہ کھڑی ہو گئی۔ پیروں میں بندھے ہوئے گھنگرو خاموش تھے۔ سازندوں نے ریں ریں شروع کر دی۔ طبلے پر تھاپ پڑی اور رقاصہ نے حرکت کی۔ گھنگروؤں نے آہنگ میں بجنا شروع کیا۔ مہاراجا رقاصہ کے فن میں کھو گیا۔ ستم ظریف اور شریر رقاصہ تھرکتی ناچتی مہاراجا کے قریب جا کے ایک دم واپس آجاتی، مہاراجا اس شریر کو مسکرا کے دیکھتا اور اس کی دوبارہ آمد کا منتظر ہو جاتا۔ رقص و موسیقی کا نشہ تیز ہونے لگا تو مہاراجا نے کنیزوں کو اشارے سے حکم دیا کہ شراب کے جام پیش کیے جائیں، شراب کے جام بھرے اور خالی کیے جانے لگے۔ آنکھوں میں سرخیاں دوڑنے لگیں۔ حاضرین میں فقیر عزیز الدین طبیب کے سوا سبھی نے مہاراجا کی تقلید اور اتباع میں شراب پینی شروع کر دی۔ فقیر عزیز الدین نے اپنی گردن جھکائی اور محفل رقص و طرب سے بے نیازی اختیار کی۔ یہ صوفی منش طبیب، مہاراجا کو بہت عزیز تھا۔ اس کی طبیعت کا استغنا اور روپے پیسے کی طرف سے بے نیازی یہ دو ایسی خصوصیات تھیں کہ مہاراجا اس کا احترام کرنے لگا تھا۔

یہ رقاصہ دیر تک مہاراجا کو لطف اندوز کرتی رہی اور مہاراجا نے کئی بار والہانہ انداز میں اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور جوش میں انہیں بوسے دینے لگتا اور کہتا۔ ”رقص میری روح ہے اور ساز میری جان ہیں۔“

رقاصہ غریب کسی نہ کسی طرح مہاراجا کی گرفت سے نکل بھاگتی اور ایک بار پھر اپنے خداداد فن سے حاضرین محفل کو لطف اندوز کرنے لگتی۔ اس طرح یکے بعد دیگرے کئی رقاصائیں آئیں اور مہاراجا کو کیف و مستی بخشتی رہیں۔ شراب کے دور چلتے رہے۔ امرا اور مصاحبین مہاراجا کی ہم مشربی کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن ان میں ایک امیر ایسا بھی تھا جو ان سب کی روش و اطوار سے مبرا تھا۔ یہ امیر نہ تو رقص و موسیقی میں دوسروں جیسی والہانہ دلچسپی لے رہا تھا اور نہ ہی شراب نوشی میں شریک تھا۔ مہاراجا نے ایک نگاہ غلط انداز اس امیر پر ڈالی اور مسکرانے لگا۔ ذہین اور چالاک امرا اور مصاحبین میں سے چند نے مہاراجا کی مسکراہٹ کا مطلب پالیا تھا۔ ان میں سے ایک خوشامدی امیر اپنی جگہ سے اٹھا اور لرزاں و ترساں ڈرا سا مہاراجا کے قریب جا کر کھڑا ہوا اور پرسش و سوال کا انتظار کرنے لگا۔

مہاراجا نے نشے میں ڈوبی ہوئی داہنی آنکھ امیر کی طرف اٹھائی اور دریافت کیا۔ ”تجھے کچھ کہنا ہے؟“





امیر نے کئی بار جھک جھک کے ڈنڈوت کی اور عرض کیا۔ ”سرکار کی جے ہو، مہاراجا کے سیوکوں کو، حکیم عزیز الدین سے ایک شکایت پیدا ہو گئی ہے اگر مہاراج اسے اپنے حکم اور دباؤ سے دور فرما دیں تو اس جشن کے سارے شرکا صحیح معنی میں لطف و مسرت سے ہمکنار ہو سکیں گے۔“

مہاراجا نے ایک بار پھر اس فقیر منش امیر کی طرف دیکھا جو شریک محفل ہونے کے باوجود ان سب سے الگ تھلگ نظر آرہا تھا۔ مہاراجا نے کہا۔ ”آخر فقیر عزیز الدین سے تم لوگوں کو کیا شکایت پیدا ہو گئی ہے؟ عزیز الدین ہمارا طبیب اور بہترین مشیر ہے۔ یہ ایک فقیر منش شخص ہے اور اس فقیر منشی کی وجہ سے اس نے اپنے نام کے ساتھ لفظ فقیر کو مستقلاً لگا رکھا ہے۔“

امیر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ”مہاراج! یہ بسنت بہار کا جشن ہے، محفل کا ہر شخص خوشی سے وارفتہ و بے قرار سا ہو رہا ہے۔ جس طرح غم منانے کے کچھ طریقے ہیں اسی طرح خوشیاں منانے کے بھی کچھ انداز ہوتے ہیں۔ محفل کے تمام امرا اور مصاحبین رقص و موسیقی اور مے نوشی سے اس لیے لطف اندوز ہو رہے ہیں کہ ان چیزوں سے خود مہاراج بھی مزے لے رہے ہیں، مہاراج کی پیروی اور تقلید میں سبھی پورے جوش و خروش سے جشن منا رہے ہیں لیکن اکیلا فقیر عزیز الدین ہی ایک ایسا شخص ہے جو اس محفل میں خلوص اور مسرت سے شریک نہیں ہوا ہے۔ وہ نہ تو رقص و سرود کے مزے لے رہا ہے اور نہ ہی شراب پی رہا ہے۔ اس کا ہم سب پر یہ اثر پڑ رہا ہے کہ رہا سہا اپنا سرور و کیف بھی رخصت ہو رہا ہے۔ اس لیے مجھ ناچیز کی مہاراج سے درخواست ہے کہ فقیر عزیز الدین کو اس محفل میں عملاً شریک ہونے کا حکم صادر فرمایا جائے۔“

مہاراجا نے ایک طرح دار رقاصہ کو گھورا جو ابھی تک اپنے فن و کمال کا مظاہرہ دکھانے نہیں آئی تھی۔ مہاراجا نے سازندوں سے پوچھا۔ ”اس کا کیا نام ہے؟“

کسی نے جواب دیا۔ ”موراں!“

مہاراج نے خوشامدی امیر کو ڈانٹ پلائی۔ ”یہ جشن ہو رہا ہے، بسنت بہار کا جشن، یہ دربار یا خلوت نہیں ہے کہ تم لوگ شکایتیں کرو۔ جا، اپنی جگہ پر ادب سے بیٹھ جا، بقیہ باتیں بعد میں ہو جائیں گی۔“ پھر موراں کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ موراں کے پیروں میں گھنگرو بندھے ہوئے تھے وہ چھم چھم کرتی ہوئی مہاراج کے روبرو جا کھڑی ہوئی۔ مہاراجا نے اس کی طرف پوری طرح نہیں دیکھا، اس پر نظر ڈالے بغیر سوال کیا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

لڑکی نے لجا شرما کر جواب دیا۔ ”بندی کو موراں کہتے ہیں!“

”خوب۔“ مہاراج نے کہا۔ ”بالکل وہی نام جو ابھی کچھ دوسرے لوگ بتا چکے ہیں۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا تو مجھے اس حد تک مسرور اور لطف اندوز کر سکے گی کہ میں غم دنیا سے کچھ دیر کے لیے نجات حاصل کر لوں؟“

موراں کی مترنم آواز سے فضا میں لطیف سا ارتعاش پیدا ہوا۔ ”میں کوشش کروں گی مہاراج۔“

مہاراجا نے پھر کہا۔ ”ہاں تب پھر کوئی ایسا راگ چھیڑ دے کہ دلوں میں آگ لگ جائے، دماغ میں نشہ بھر جائے اور میں کچھ دیر کے لیے دنیا کی ہر شے سے نجات حاصل کر لوں۔“

امیر ابھی تک...... کچھ کہنے یا نہ کہنے کے تذبذب کا شکار کھڑا تھا۔ رنجیت سنگھ نے گرجدار آواز میں کہا۔ ”اپنے پیروں سے جاتا ہے یا دوسروں کی مدد سے جانا چاہتا ہے؟“

امیر دہشت سے گھبرایا ہوا پیچھے ہٹا، درمیان میں طبلچی آگیا، امیر اس سے ٹکرایا اور قلابازی کھا کے دور جا گرا۔ امرا، مصاحبین اور حاضرین مجلس اس پُرلطف نظارے پر ہنسنا چاہتے تھے لیکن رنجیت سنگھ کے بے پناہ رعب کی وجہ سے نہیں ہنس سکے۔ ہلکی ہلکی مسکراہٹیں ہونٹوں پر نمودار ہو کر غائب ہو گئیں۔ رقاصاؤں اور گانے والیوں نے ساری کے آنچل منہ میں ٹھونس کے ہنسی روکنے کی کوشش کی، کئی سازندے اپنے سازوں میں سر دے کر مسکرا لیے۔ ہاں، صرف موراں ہی کی ایک ایسی ذات تھی جو قہقہہ مار کے ہنس دی اور ہنستے ہنستے دہری ہو گئی۔ حاضرین محفل خوفزدہ ہو گئے کہ اب شاید موراں کی شامت ہی آگئی ہے۔ مہاراجا کی خشمناک نظر موراں پر جم گئی اور تیوری پر بل پڑ گئے۔ پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ فقیر عزیز الدین صورت حال کی نزاکت کا اندازہ لگا کے اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز تیز قدم چل کے موراں کے قریب پہنچ گیا اور اسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ”او گستاخ، احمق لڑکی! کیا تو آداب شاہی سے واقف نہیں ہے؟ بس، اب ہنسنا بند کر، زیادہ حد ادب۔ اگر مہاراج رعایا پرور اور غریب نواز نہ ہوتے تو تجھے ابھی اسی وقت کسی جلاد کے حوالے فرما دیتے جو تلوار کی نوک یا دھار سے تادیبی کارروائی انجام دیتا۔“

فقیر عزیز الدین کی دھمکی کا موراں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بہ دستور ہنستی رہی یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو

بہہ نکلے۔

اپنی بات کو بے اثر دیکھ کر عزیز الدین خوف زدہ ہوگیا۔ وہ ایک بار پھر موراں پر برسنے لگا لیکن اب اس آواز میں تحکمانہ جوش وخروش نہیں تھا۔ اب اس میں اپنی بات کی بے اثری کی ندامت اور خوف بھی شامل تھا۔ اس نے کہا۔ ”موراں خدا کے لیے درباری آداب کا خیال رکھ اور اپنی ہنسی کو قابو میں رکھ اور مہاراجا کے ضبط وتحمل کا امتحان نہ لے۔ رقص شروع کر اور کوئی اچھا سا گیت بھی سنا تاکہ مہاراج کی مکدر طبیعت کو فرحت و شگفتگی میسر آئے۔“

موراں نے ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”حکیم جی! آپ بھی کیسے پھیکے پھا کے انسان ہیں، ہنسی کوئی ایسی اختیاری چیز نہیں ہے کہ اسے انسان جب چاہے شروع کردے اور جب چاہے روک لے۔“

رنجیت سنگھ کی پیشانی سے شکنیں مٹ چکی تھیں اور آنکھ کا خشمناک تاثر بھی دور ہوچکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر اجنبی اجنبی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے عزیز الدین سے کہا۔ ”عزیز الدین موراں کو ہنس لینے دو، اس کی ہنسی میں معصومیت ہے، کھنک ہے، ترنم ہے اور ایک قسم کی غمگی ہے، اس میں ساز وآواز کا لطیف سا امتزاج پایا جاتا ہے، موراں کو ہنسنے دو اور میں تو یہ سوچنے لگا ہوں کہ جس کی آواز اور ہنسی میں اتنا سحر وکیف پایا جاتا ہے اس کے گیت کیسے ہوں گے، اس کے گانوں میں کیسا سحر ہوگا۔“ پھر موراں سے کہا۔ ”موراں! ابھی جب تو ہنستے ہنستے دہری ہوگئی تھی تو میں نے سوچا کہ جب تیری بے قاعدہ ہنسی کی حرکات وسکنات میں بلا کا رقص اور ناچ کا انداز پایا جاتا ہے تو تیرا رقص کس غضب کا ہوگا۔“

موراں ادب سے مہاراجا کے روبرو جھک گئی اور تسلیمات بجالاتے ہوئے بولی۔ ”مہاراج کی کلا پروری ہے، ذرہ نوازی ہے اور بندی کو خود پر ناز سا ہو چلا ہے کہ مہاراج نے اس کی گستاخی اور بے ادبی کو نظر انداز فرمادیا۔“

مہاراجا نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اب باتیں نہیں اپنے فن کا مظاہرہ کر۔“ اور عزیز الدین کو حکم دیا۔ ”حکیم جی! اپنی جگہ پر واپس جاؤ اور رقص وموسیقی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرو۔“

موراں نے رقص شروع کردیا۔ رقص کے دوران کبھی تو موراں ناچتے ہوئے مہاراجا کے قریب پہنچ جاتی جس سے مہاراجا کے چہرے پر شگفتگی اور تازگی آجاتی اور کبھی وہ ناچتی ہوئی دور چلی جاتی اور مہاراجا اداس اور مشتعل ہوجاتا۔ یہ مشغلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ آخر مہاراجا نے ہاتھ کے اشارے سے ناچ کو بند کردینے کا حکم دیا۔ اس حکم کی موراں نے اس طرح تعمیل کی کہ وہ جس حال میں تھی اسی میں منجمد ہوکر رہ گئی۔ اس کا ایک پیر کچھ اٹھا ہوا تھا اور دوسرا اٹھنے کی کیفیت میں تھا۔ موراں کی نظریں مہاراجا کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ مہاراجا کو اس کی اس ادائے خاص سے ایک اور ہی لذت حاصل ہوئی۔ اس نے موراں کو اپنے قریب بلا کر دریافت کیا۔ ”تو نے اپنا کام تو دکھادیا۔ اب ذرا جسارت بھی دکھا۔“

موراں نے کورنش بجالانے کے انداز میں عرض کیا۔ ”بندی تو حضور کی رضا چاہتی ہے۔ حضور جس فن میں دلچسپی لے رہے ہیں، بندی کو اس میں کیا تکلف ہوسکتا ہے۔“

مہاراجا نے بے تکلفی سے آغوش پھیلادی، کہا۔ ”تب پھر آ، ہماری آغوش میں چلی آ۔ میرے دل کی دھڑکن سن، دیکھ اس میں سے کس کے نام کی مالا جپی جارہی ہے۔“

موراں بے تکلفی سے مہاراج کی گود میں بیٹھ گئی۔ شرکائے مجلس نے کن انکھیوں سے اس منظر کو دیکھا اور نظریں جھکالیں۔ عزیز الدین نے زیر لب کچھ کہا اور حیا سے گردن جھکالی۔ مہاراج دیر تک موراں کے سراپا پر نظریں ڈالتے رہے۔ بالآخر اسے بار بار سینے سے لگا کے اس کے لب و رخسار کے بوسے لینے لگے۔

☆☆☆

27 سالہ نوجوان مہاراجا رنجیت سنگھ کو موراں یہاں تک پسند آئی کہ خلوت وجلوت میں ہر جگہ مہاراج کے ساتھ موراں ہی نظر آتی لیکن موراں کو محل میں داخل ہونے کے بعد کئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں اس سے حسد کرنے والی ذاتیں بھی موجود تھیں اور اس سے عشق ومحبت جتانے والی ہستیاں بھی۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کی عدم موجودگی میں موراں کو اپنی خواص اور کنیزوں کے ساتھ تنہا ہی رہنا پڑتا۔ اس کے اعزاز واکرام میں کوئی فرق نہ آتا۔ بہ ظاہر محل کا ہر شخص اس کے احترام پر مجبور تھا لیکن مہاراجا کی ایک رانی کلدیپ کور کو موراں سے بے حد نفرت اور چڑ تھی۔ وہ ایک مسلمان عورت کا خالصہ محل میں اتنا عروج نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس حسد کی ایک نمایاں وجہ یہ بھی تھی کہ وہ کچھ عرصے سے مہاراجا کی سرد مہری کا شکار چلی آرہی تھی اور جب اس نے موراں پر مہاراجا کی حد سے بڑھی ہوئی عنایات دیکھیں تو احساس محرومی اور قسمت کی نارسائی کا کلدیپ کور کو شدید





احساس ہوا اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ اگر اس خالصہ محل سرا میں وہ خود خوش نہیں رہ سکتی تو کسی اور کو بھی خوش نہیں رہنے دے گی۔ وہ مہاراجا کو بھی ذہنی الجھنوں میں مبتلا رکھنا چاہتی تھی۔

مہاراجا کسی مہم پر لاہور سے باہر گیا ہوا تھا۔ موراں ہجر وفراق کی گھڑیاں بڑی بے کیفی میں گزار رہی تھی۔ انہی دنوں رانی کلدیپ کور کا بھائی سردار عطر سنگھ امرتسر سے اس کی ملاقات کو پہنچا۔ یہ بیس بائیس سالہ حسین نوجوان جب کلدیپ کور سے ملا تو بہن نے اسے لاہور ہی میں روک لیا اور وعدہ کیا کہ مہاراجا کے دربار میں کوئی اعلیٰ منصب دلا دے گی۔ سردار عطر سنگھ سیدھا سادا نوجوان تھا اور اس کے مزاج میں سادگی حماقت کی حد تک پائی جاتی تھی۔ بہن کو اپنے بھائی کی اس خوبی کا اچھی طرح اندازہ تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس سادگی میں جرأت و بے باکی بھی حد درجہ شامل ہے۔ خالصہ محل میں سردار عطر سنگھ نے چند خاص باتیں محسوس کیں۔ اس نے محل کی عورتوں میں بے اعتدالیاں دیکھیں۔ محل میں بیشتر خواتین خوش تھیں لیکن اس نے اپنی بہن کلدیپ کور کو اداس دیکھا۔ ایک دن جب وہ خالصہ محل کے ایک کونے میں پڑی ہوئی... اپنی بہن کلدیپ کور سے ملنے گیا تو یہاں اس نے وہ جشن ہاؤ ہو نہیں دیکھا جو پورے محل میں پایا جاتا تھا۔ دوسری خواتین اپنا دل بہلانے کے لیے ناچ رنگ اور خوش فعلیوں میں مشغول رہتی تھیں اور ان کے جشن طرب کی آوازیں وہ اپنی بہن کے محل تک میں بیٹھ کر سن سکتا تھا۔ کلدیپ کور اپنی مسہری پر اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ کچھ پتا ہی چلا کہ اس کا بھائی عطر سنگھ کب اس کے پاس آکر کھڑا ہوگیا ہے۔ عطر سنگھ کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ”کلدیپ کور! تو کیا سوچ رہی ہے؟“

کلدیپ کور نے چونک کر عطر سنگھ کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ عطر سنگھ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ بہن نے بھائی کی گود میں سر ڈال دیا اور رونے لگی۔ عطر سنگھ نے ذرا غصے سے پوچھا۔ ”کلدیپ! تو اس کا نام بتا جس نے تیرا دل دکھایا ہے۔“

کلدیپ کور نے سسکیوں میں مختصر سا جواب دیا۔ ”موراں۔“

”موراں!“ عطر سنگھ نے تعجب سے پوچھا۔ ”مہاراج کی مسلمان بیوی نے؟“

کلدیپ نے سسکیاں لیتے ہوئے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ ”ہاں موراں نے۔ اس نے صرف میرا ہی نہیں تمام خالصہ بیویوں کا دل دکھا رکھا ہے کیونکہ مہاراجا اس سے زیادہ کسی کو بھی نہیں چاہتا۔“

عطر سنگھ نے نفرت سے کہا۔ ”تو یہ مسلمان اب خالصہ دربار اور محل تک میں گھس آئے ہیں۔“ اس کے بعد وہ کچھ سوچنے لگا پھر خاموش رہ کر پھر کہنے لگا۔ ”میں ان کی سازش ناکام بنادوں گا۔“ اس کے بعد کلدیپ کور کو اٹھا کر بٹھادیا، بولا۔ ”تو پریشان نہ ہو کلدیپ، بس یہ سمجھ لے کر تیرے دکھ کا علاج میں نے تلاش کرلیا ہے اور اس علاج سے تمام خالصہ رانیوں کو سکون مل جائے گا۔“ پھر خود بھی ہنسنے لگا، بولا۔ ”اچھا کلدیپ! اب تو بھی ہنس دے ذرا تاکہ میرا دل بھی خوش ہوجائے۔“

کلدیپ کور نے جبراً ہنسنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ہونٹ تو حرکت میں آگئے لیکن آنکھوں کا مینہ قطروں کی شکل میں بہہ کر رخساروں پر آگیا۔

☆☆☆

موراں اپنی کنیزوں اور خدمت گاروں کے ساتھ داتا دربار میں حاضری دے کر باہر نکلی تو وہاں معلوم نہیں کس بات پر دو فریقوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ دونوں فریق مسلمان تھے اور آپس میں بری طرح الجھ گئے تھے۔ موراں رتھ نما بیل گاڑی میں بیٹھ چکی تھی جسے اعلیٰ نسل کے دو بیل کھینچ رہے تھے۔ اس کے پیچھے معمولی بیل گاڑیاں تھیں جن میں موراں کا چاکر عملہ سوار تھا۔ اس ہنگامے نے اتنا زور پکڑا کہ رتھ اور بیل گاڑیوں کا عملہ موراں اور اس کے خدمت گاروں کو بے یارومددگار چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ موراں سخت بدحواس رتھ کا پردہ اٹھا اٹھا کر حالات کی سنگینی اور نزاکت کا جائزہ لے رہی تھی، پھر چند لمحوں بعد فسادی اس کے رتھ تک بھی آگئے۔ مارے دہشت کے موراں کی چیخ بھی نکل گئی لیکن اس وقت معلوم نہیں کہاں سے دوڑتا ہوا عطر سنگھ آگیا اور تلوار کو نیام سے کھینچ کر فضا میں لہرادیا اور گرجدار آواز میں فسادیوں کو للکارا۔

”خبردار جو کسی نے مہارانی موراں تک آنے کی جرأت کی۔ موراں مہاراجا کی ناموس ہے اور میں سردار عطر سنگھ مہاراجا کا ادنیٰ جاں نثار اور خادم۔ میرے ہوتے ہوئے کسی کی ہمت نہیں جو مہاراجا کے ناموس تک آنے کی جرأت کرے۔“

فسادی ادھر ادھر دبک گئے۔ موراں نے اس جیالے نوجوان کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ عطر سنگھ ذرا اور قریب چلا گیا اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”مہارانی! گھبرانے کی ضرورت

نہیں۔ میں مہاراجا کا نمک خوار آپ کے لیے جان دینے کو حاضر ہوں۔"

موراں نے اس بانکے نوجوان کو دیکھا تو مسکرا شرما کے گردن جھکالی، آہستہ سے بولی۔ "تم بہت اچھے نوجوان ہو، تمہارا شکریہ۔"

سردار عطر سنگھ نے رتھ اور بیل گاڑیوں کے عملہ کو پکار پکار کے بلالیا اور انہیں حکم دیا کہ مہارانی موراں اور ان کے چاکر عملے کو اسی وقت بہ حفاظت محل تک پہنچا دیا جائے۔"

رتھ اور بیل گاڑیاں پھر چرر چرر چوں چوں کرتی محل کی طرف روانہ ہوگئیں۔

اس بات کو بھی کئی ہفتے گزر گئے اور موراں اور عطر سنگھ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے کسک سی محسوس کرتے رہے۔ پہلے تو موراں کا یہ خیال تھا کہ عطر سنگھ خود ہی اس سے دوبارہ ملنے کی کوشش کرے گا لیکن جب توقع پوری نہ ہوئی تو اس نے خود ہی ایک معتبر کنیز کو انعام واکرام دے کر پیام رسانی پر آمادہ کرلیا۔ اس وقت رات نصف کے قریب پہنچ چکی تھی۔ کنیز چھپتی چھپاتی بہ مشکل عطر سنگھ کے کمرے تک پہنچ گئی اور آہستہ آہستہ دستک دے کر دروازہ کھلوالیا۔ عطر سنگھ نے دروازہ کھولنے سے پہلے دریافت کیا۔ "کون؟"

کنیز نے مترنم آواز میں جواب دیا۔ "دروازہ کھولو۔"

عطر سنگھ نے حیران و پریشان ہوکر دروازہ کھول دیا۔ کنیز نے اپنا چہرہ کسی کپڑے میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے آواز بدلنے کی کوشش کی، بولی۔ "مہارانی موراں نے تم کو اسی وقت طلب کیا ہے۔"

عطر سنگھ کا سر گھوم گیا لیکن کسی خیال کے آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ زیرلب مسکراہٹ سے پوچھا۔ "کیا سچ مچ، کہاں طلب فرمایا ہے؟"

کنیز نے جواب دیا۔ "اپنے محل میں۔"

عطر سنگھ نے کہا۔ "کیا مہارانی مجھ سے اتنی ناراض ہیں کہ میرے قتل کا اہتمام کر بیٹھیں؟"

کنیز نے کھسیا کر کہا۔ "نہیں، وہ تو تمہیں چوری سے بلا رہی ہیں۔"

عطر سنگھ نے سر پر پگڑی باندھی اور پہلو میں کرپان لٹکائی اور کنیز کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "اگر مہارانی موراں میرے قتل سے خوش ہوں گی تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

کنیز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں آگے پیچھے قدم اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ اس حصے میں پہنچ گئے جہاں اسلحہ بردار عورتیں پہرے داری کی خدمات انجام دے رہی تھیں۔ ان میں دو ایک طرف جاتی تھیں تو دو دوسری طرف۔ ان سے ذرا دور ہٹ کر ایک کم گہرا نالہ تھا جو موراں کے محل کے اس پار سے شروع ہوکر موراں کے محل میں داخل ہوگیا تھا اور پھر محل سے اُس طرف باہر نکل آیا تھا۔ کنیز نے اس نالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس نالے سے اندر پہنچنے کی کوشش کرو، میں تم سے پہلے اندر پہنچ جاتی ہوں۔"

عطر سنگھ نالے میں اتر گیا۔ اس کا خیال تھا کہ نالے اور محل کے مابین کوئی فولادی جالی ضرور لگی ہوگی لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ غالباً فولادی جالی کو پہلے ہی ہٹا دیا گیا تھا۔ عطر سنگھ دھڑکتے دل کے ساتھ محل میں داخل ہوگیا۔ اندر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وہ آہستہ سے نالے سے باہر نکلا اور اندازے سے ایک طرف چلنے لگا پھر اس نے ایک دیے کو ٹمٹماتے اور جلتے بجھتے دیکھا۔ یہ دیا کسی کسی لمحے گویا بالکل ہی بجھ جاتا تھا۔ عطر سنگھ کو ایسا محسوس ہوا گویا یہ دیا نہیں ایک اشارہ ہے جو اسے یہ بتا رہا ہے کہ چلے آؤ، آگے آجاؤ، میدان صاف ہے۔ عطر سنگھ اس دیے کی طرف بھاگا چلا گیا۔ وہاں کنیز پہلے سے پہنچ چکی تھی۔ اس کنیز نے اسے تھوڑی ہی دیر میں موراں کے کمرے میں پہنچا دیا۔

موراں اس کا نہایت بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ وہ عطر سنگھ کو دیکھتے ہی بے چین ہوگئی، بولی۔ "تم آگئے؟ مجھے بھی یہ یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔" پھر اپنی ہی مسہری کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

عطر سنگھ کو کنیز کی موجودگی میں تامل ہوا تو موراں نے کہا۔ "شرماؤ نہیں یہ اپنی خاص کنیز ہے، بلا کی رازدار ہے، تم اس پر اعتبار کرسکتے ہو۔"

لیکن عطر سنگھ نہیں بیٹھا، بولا۔ "نہیں جناب مہارانی صاحبہ! یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں، آپ کا ایک ادنیٰ خادم اس مسہری پر بیٹھنے کی کس طرح جرأت کرسکتا ہے۔"

موراں ہنسنے لگی، بولی۔ "بے وقوف نوجوان ہمت سے کام لو، ہمت سے۔ میں جو کہتی ہوں اس پر عمل کرو۔ میں زیادہ باتیں ناپسند کرتی ہوں۔"

عطر سنگھ مسہری پر ذرا دبک سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ہی موراں بھی بیٹھ گئی اور کنیز کو آنکھ کے اشارے سے چلتا کردیا۔ موراں، عطر سنگھ کو اشتیاق و محبت کی نظروں سے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر پوچھا۔ "کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا! شاید سردار عطر سنگھ؟"

عطر سنگھ نے جواب دیا۔ "جب آپ کو میرا نام تک

یاد نہیں رہا تھا تو پھر مجھے کس طرح طلب فرمالیا؟"

موراں نے کہا۔ "بے کار باتوں میں وقت نہ برباد کرو، جانتے ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟"

عطر سنگھ نے نہایت سادگی اور معصومیت سے نفی میں گردن ہلادی اور کہا۔ "میں یہی جاننے کے لیے تو ہتھیلی پر سر لیے حاضر ہوگیا ہوں۔"

موراں لگاوٹ کی نظروں سے مسکرا مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ عطر سنگھ کی طرف بڑھا لیکن پھر ہٹ گیا۔ عطر سنگھ اسے للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ موراں نے شرما کر عطر سنگھ کے گال پر ہلکی سی چپت رسید کی اور منہ دوسری طرف کر کے مسکرانے لگی۔ "یہ تم دیکھ کیسی نظروں سے رہے ہو مجھے؟"

عطر سنگھ نے موراں کا ہاتھ پکڑلیا۔ اس کی آنکھوں میں خمار سا آگیا تھا۔ لڑکھڑائے لہجے میں کہنے لگا۔ "موراں تجھے دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ مہاراجا نے اپنا دل تیرے حوالے کیوں کردیا تھا۔"

موراں نے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "مہاراجا کا دل جیتنا کوئی مشکل بات تھوڑی ہے، مہاراجا کو عورتیں بہت پسند ہیں۔" پھر ایک دم سنجیدہ ہوگئی، بولی۔ "مجھے مہاراجا نے ہر قسم کا آرام بخش دیا ہے لیکن انہیں یہ کیا معلوم کہ مجھے اس دھڑکے نے کتنا پریشان کررکھا ہے کہ مہاراجا کل کسی دوسری عورت کو بھی پسند کرسکتے ہیں۔"

عطر سنگھ نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا، بولا۔ "ہاں ایسا تو کسی وقت بھی ہوسکتا ہے۔"

موراں نے افسردگی سے کہا۔ "میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے یہی سوچتی رہتی ہوں کہ کاش مہاراجا کی جگہ تم ہوتے تو یہ زندگی کتنی حسین ہوتی۔"

عطر سنگھ نے خودسری اور بے پروائی سے جواب دیا۔ "موراں! تو فکر کیوں کرتی ہے، مہاراجا کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر تو راضی ہو تو میں تیری خاطر جان تک کی بازی لگا سکتا ہوں۔"

موراں اس کی گود میں گر گئی اور اس کی گردن میں دونوں ہاتھ ڈال دیے، منہ کو ذرا قریب لاتے ہوئے بولی۔ "تم کیا چاہتے ہو؟ میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔"

عطر سنگھ نے کہا۔ "اگر تم کہو تو میں تمہیں انگریزی علاقے میں لے کر چلا جاؤں، وہاں ہم دونوں نہایت آرام سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔"

موراں نے تلملا کر اس کی گردن چھوڑدی، بولی۔ "تم اس طرح نہ سوچو بلکہ یہ سوچو کہ مہاراجا کے پاس رہتے ہوئے بھی ہم دونوں لطف ولذت کے کچھ لمحے کس طرح حاصل کرسکتے ہیں؟"

عطر سنگھ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کی آواز رات کے سناٹے میں دور دور تک گونج گئی۔ موراں نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور گود سے نکل کر کھڑی ہوگئی، سرگوشی میں بولی۔ "سردار عطر سنگھ! عشق کا کھیل تلوار کی دھار پر چلنے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیا تم اپنی زندگی سے بے زار ہوگئے ہو؟"

عطر سنگھ کو بھی اپنی غلطی اور بے پروائی کا احساس ہوگیا۔ ہنسی کو دبالیا اور آہستہ سے بولا۔ "اپنے کو بس دو ہی شوق ہیں ایک کھانے کا دوسرا ہنسنے کا۔" پھر سرگوشی میں کہا۔ "ہاں اب یہ تیسرا شوق بھی لگ گیا ہے۔"

موراں نے پوچھا۔ "تیسرا شوق کون سا؟"

عطر سنگھ نے جواب دیا۔ "تجھ سے عشق لڑانے کا اور اب تو سر رہے یا جائے، میں موراں کو نہیں بھلا سکتا۔"

موراں نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "لیکن عطر سنگھ میں تمہاری بے پروائی سے ذرا گھبرانے لگی ہوں کیا تم وعدہ کرو گے کہ تم آئندہ احتیاط سے کام لوگے؟"

عطر سنگھ نے ایک بار پھر اسے پکڑنے کی کوشش کی، بولا۔ "جنگ اور عشق میں احتیاط کا کیا کام لیکن اگر تو چاہتی ہے کہ میں احتیاط کروں تو ضرور کروں گا۔"

موراں ایک بار پھر اس کے سینے سے لگ گئی اور عطر سنگھ لطف ولذت کا عطر کشید کرنے لگا۔

☆☆☆

مہاراجا مہم سے واپس آیا تو اس کے استقبال کے لیے لوگوں کا ہجوم لاہور کے باہر پہنچ گیا۔ اس ہجوم میں موراں اور بعض دوسری رانیوں کے رتھ بیل گاڑیاں بھی شامل تھیں اور ایک گھوڑے پر سردار عطر سنگھ بھی سینہ پھلائے بیٹھا تھا۔ اس نے دھوپ کی تمازت میں چندھائی آنکھوں سے مہاراجا رنجیت سنگھ کو اس کے چھتر سے پہچان لیا۔ مہاراجا ململ کے لباس میں ملبوس، استقبال کرنے والوں کو بے نیازی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر رتھوں اور بیل گاڑیوں پر جونہی نظریں پڑیں مہاراجا کی طبیعت میں اضطراب پیدا ہوگیا۔ وہاں ان میں موراں کے رتھ کو دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ موراں کا رتھ مہاراجا کے قریب ہوتا جارہا تھا۔ اس کے آس پاس نیلے کپڑوں میں ملبوس خالصہ خدمت گار 'ہٹو بچو' کی





آوازیں لگاتے رتھ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ موراں کا رتھ جیسے ہی مہاراجا کے گھوڑے کے قریب پہنچا، موراں نے رتھ کا پردہ اٹھادیا۔ مہاراجا نے پراشتیاق نظروں سے موراں کی ایک جھلک دیکھ لی اور اس تیزی سے گھوڑا بھگا کے موراں کے رتھ کے قریب لے گیا کہ چھتر بردار پیچھے ہی رہ گئے اور بعد میں ہانپتے کانپتے مہاراجا کے قریب پہنچے۔

مہاراجا نے حکم دیا۔ "ہاتھی لایا جائے۔"

خدمت گار عماری دار ہاتھی لے کر مہاراجا کے قریب پہنچ گئے۔ مہاراجا کے اشارے پر ہاتھی کو بٹھادیا گیا۔ مہاراجا گھوڑے سے اتر پڑا اور رتھ میں دونوں ہاتھ ڈال کر احتیاط سے موراں کو باہر نکال لیا پھر پہلے تو موراں کو ہاتھی پر بٹھادیا اور اس کے بعد مہاراجا نے موراں کو اپنی گود میں بٹھالیا۔ سردار عطر سنگھ اپنے گھوڑے پر بیٹھا دور سے یہ نظارہ دیکھتا رہا پھر تھوڑی دیر بعد یہ ہاتھی عطر سنگھ کے قریب سے گزرا۔ موراں کی نظریں اچانک عطر سنگھ پر پڑیں۔ عطر سنگھ بھی حسرت ویاس سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مہاراجا نے بھی عطر سنگھ کو دیکھ لیا۔ عطر سنگھ گھوڑے کے پشت ہی پر ادب سے ذرا خم ہوگیا۔ مہاراجا نے بے نیازی سے اسے دیکھا اور موراں سے مخاطب ہوا۔

"ابھی تو عطر سنگھ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی، کیا تو اس سے واقف ہے؟"

موراں نے جواب دیا۔ "مہاراج اس نوجوان نے آپ کی عدم موجودگی میں داتا دربار کے باہر میری جان بچائی تھی۔" اس کے بعد اس نے پورا واقعہ سنا ڈالا۔ آخر میں کہا۔ "اس وقت سے میں اس کی احسان مند ہوں۔"

مہاراجا نے بے پروائی سے کہا۔ "وہ اس کا فرض تھا۔ تیرے احسان مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

☆☆☆

رقص وموسیقی کی محفل جمی ہوئی تھی۔ خاص خاص امرا اور مصاحبین مہاراجا کے روبرو دائیں بائیں ادب سے بیٹھے تھے۔ مہاراجا موٹے موٹے تکیوں کے سہارے پشت اور دونوں ہاتھ ٹکائے رقص وموسیقی سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ ہم نشینی اور قربت کا شرف موراں کو بھی حاصل تھا۔ مہاراجا بار بار اسے پُرشوق نظروں سے دیکھتا اور شراب کا جام چڑھالیتا۔ مہاراجا سے چار آدمیوں کے بعد پانچواں عطر سنگھ تھا جسے مہاراجا نے اس محفل میں بطور خاص مدعو کرلیا تھا۔ اگر عطر سنگھ میں ذرا سی بھی ہوشیاری ہوتی تو دیکھ لیتا کہ

مہاراجا بار بار ترچھی نظر سے عطر سنگھ کی حالت کا جائزہ لے رہا تھا۔ رقاصہ ناچ بھی رہی تھی اور گا بھی رہی تھی۔ اس کے گیت کے بول میں جو مفہوم موجود تھا اس میں عطر سنگھ اور موراں کے لیے بڑی کسک تھی۔ وہ گارہی تھی۔

"قسمت کو مہرباں ہوتے دیر نہیں لگتی
لوگ میری خوش نصیبی پر رشک کرتے ہیں لیکن میں خود
شرمندہ ہوں کہ دولت وعشرت کو میں نے اپنی خوش نصیبی
کا معیار قرار دے لیا ہے۔ اگر مجھے یہ اختیار دیا جائے
کہ میں
دولت اور حسن میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلوں تو میں
یقیناً حسن کا انتخاب کروں گی۔ دنیا آنی جانی اور فانی ہے
فقیر منشی اور حسن پرستی کو شعار بنا، جب موت سبھی کو
آنی ہے تو دولت کے گھمنڈ پر خود کو کیوں فنا کیا جائے
حسین یار ہو اور اس کی کالی گھٹاؤں جیسی زلفوں کا سایہ
اس کی آغوش میں گر کر، زانو پر سر رکھ کر اس کی مخمور
آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کے جان دے دینا
کتنا پُرکیف اور خوشگوار کام ہوگا۔"

مہاراجا نے داد دی۔ "خوب خوب، کتنی حسین خواہش ہے، کتنا پیارا خواب ہے۔"

چند جام بکف کنیزوں نے مہاراجا کی طرف جام بڑھائے، مہاراجا نے ایک جام لے کر منہ سے لگالیا۔ اس نے جام کی اوٹ سے عطر سنگھ کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ موراں بھی نظریں بچا بچا کے اور چرا چرا کے عطر سنگھ کو دیکھ رہی تھی۔ مہاراجا نے ایک کنیز کو عطر سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

"ایک جام، ہمارے اس محافظ عزت وناموس کو بھی۔"

کنیز نے وہ جام عطر سنگھ کو دینا چاہا لیکن عطر سنگھ نے ازراہ انکساری اور رعب شاہی جام لینے سے انکار کردیا۔ کنیز نے اسے سرگوشی میں منع کیا۔ "جام لے لو سردار جی، بہ صورت انکار مہاراجا کی بے عزتی متصور ہوگی۔"

عطر سنگھ نے جام لے کر منہ سے لگالیا۔ محفل پھر رقص وسرود میں ڈوب گئی۔ جب عطر سنگھ پر نشے نے اچھی طرح غلبہ پالیا تو مہاراجا نے اسے اپنے قریب بلالیا۔ مہاراجا کی شراب میں ماڑ اللحم، افیون، مشک اور بعض دوسری جڑی بوٹیاں بھی شامل ہوتی تھیں اس لیے یہ شراب کسی اور کے بس کی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ جب عطر سنگھ سادگی اور بھولے پن میں مہاراجا کی عطا کردہ شراب کو اپنے ہونٹوں سے لگا رہا تھا

تو دوسرے امرا اور مصاحب زیرِ لب اس پر ہنس رہے تھے۔ شراب پینے کے ذرا دیر بعد ہی عطر سنگھ اپنے حواس میں نہیں رہا۔ مہاراجا نے اسے بلا کر اپنے پاس بٹھالیا۔

عطر سنگھ للچائی نظروں سے بے حجابانہ موراں کو گھورنے لگا۔

مہاراجا نے ازراہِ مذاق لیکن سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔ ”عطر سنگھ تو اپنی بہن کلدیپ کور سے بھی ملا یا نہیں؟“

عطر سنگھ نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”ملا مگر مل کے خوش نہیں ہوا۔“

مہاراجا نے دریافت کیا۔ ”مل کر خوش کیوں نہیں ہوئے؟ کوئی خاص بات؟“

عطر سنگھ نے نشیلی آواز میں جواب دیا۔ ”کلدیپ سے مل کر خوش کیا ہوتا۔“ اس کے بعد موراں کی طرف نگاہ کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”مہاراج کے دل پر تو اس ترکن نے قبضہ جمالیا ہے۔ ادھر سے فرصت ملے تو مہاراج دوسروں پر بھی توجہ دیں۔“

ایک کونے میں بیٹھے ہوئے فقیر عزیز الدین کو بڑا قلق تھا کہ یہ غریب خوامخواہ مارا جائے گا۔ فقیر عزیز الدین اپنی جگہ سے اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ مہاراجا نے پوچھا۔ ”عزیز الدین تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

عزیز الدین نے جواب دیا۔ ”مہاراج کی نوازشیں تمام حاضرین پر یکساں ہونی چاہئیں کیونکہ دربار کے جاں نثار اس میں اپنی ہتک اور بے عزتی محسوس کرتے ہیں یا تو حضور والا، شراب کا ایک ایک جام شرکائے محفل میں ہر ایک کو عطا ہو یا پھر عطر سنگھ کو ہی اس محفل سے نکال دیا جائے تاکہ دوسرے جاں نثار احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہو جائیں۔“

مہاراجا نے عزیز الدین کو منع کیا۔ ”عزیز الدین! میرے حاضرینِ مجلس کو آج خوشیوں میں شریک ہو لینے دو۔“

عزیز الدین نے جواب دینے کے بجائے سکوت اختیار کرلیا۔ اب عطر سنگھ کا بہت برا حال تھا۔ اسے رقاصہ کے گائے ہوئے حسبِ حال اشعار یاد آرہے تھے۔ عطر سنگھ نشے میں کھڑا ہو گیا اور رقاصہ کا گایا ہوا گیت رقاصہ والی دھن میں گانے لگا پھر وہ مہاراجا کے سامنے ناچ ناچ کے گانے لگا۔

مہاراجا کو ہنسی آگئی اور حاضرینِ مجلس بھی نظریں چرا کر کے اور خود کو سمیٹ کے ہنسنے لگے۔ عطر سنگھ نے کئی شعر تو موراں کو بطورِ خاص مخاطب کر کے سنائے، موراں کی تو جان نکل گئی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اس نشے میں اس کے منہ سے راز کی باتیں نہ نکل جائیں۔ اس نے عطر سنگھ کو ڈانٹا۔

”عطر سنگھ اپنے ہوش میں آؤ، یہ مانا کہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم آدابِ شاہی کا بھی خیال نہ کرو۔“

”یہ چہرہ اور یہ حسن و جوانی، آخر وہ کون سا بہادر ہے جوان کا وار سہہ کر بھی اپنے ہوش و حواس میں رہنے کا دعوے دار ہو سکتا ہے۔“ عطر سنگھ خوب بہک رہا تھا۔

مہاراجا نے پھر سوال کیا۔ ”ہاں تو عطر سنگھ! تم حسن و جوانی کے صحیح قدردان ہو؟“

عطر سنگھ نے ناچنا شروع کردیا۔ ”مہاراج! بس کیا کہوں؟ اب تو کسی ترکن ہی سے دل لگانے کو جی چاہتا ہے۔“

مہاراجا نے موراں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”تجھے موراں کیسی لگتی ہے؟“

عطر سنگھ نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”موراں تو مہاراجا تک کو اچھی لگتی ہے اگر ہمیں اچھی لگتی ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔“

مہاراجا نے پوچھا۔ ”کیا ہم تجھے موراں کے محافظ دستے کا نگراں بنادیں کیونکہ تو ایک بار موراں کی حفاظت کر چکا ہے۔“

عطر سنگھ خوشی سے پھر ناچنے لگا۔ ”مہاراجا کا حکم سر آنکھوں پر، پھر کب سے؟“

لوگوں کو ہنسی آگئی، مہاراجا بھی ہنس دیے۔

مہاراجا نے موراں سے دریافت کیا۔ ”تو کیا کہتی ہے؟“

موراں نے جواب دیا۔ ”میں مہاراجا کی ادنیٰ سی کنیز ہوں۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں، مہاراجا جیسا مناسب سمجھیں، کریں۔“

عزیز الدین اپنی جگہ بیٹھا تلملا رہا تھا۔ اس نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر مودبانہ عرض کیا۔ ”مہاراجا حکم دیں تو یہ ناچیز اس اجڈ اور بدمست انسان کو آدابِ شاہی سکھانے کی جسارت کرے۔“

مہاراجا نے جواب دیا۔ ”عزیز الدین! تم بیٹھ جاؤ۔ مجھے باتیں کرنے دو۔“

عطر سنگھ غصے میں عزیز الدین کی طرف بڑھا، بولا۔ ”حکیم جی! تم خاموش رہو، ورنہ میں تمہارا دماغ ٹھکانے لگا دوں گا۔“

مہاراجا نے ایک تنومند خدمت گار کو اشارہ کیا جس





نے عطر سنگھ کو پکڑ کر زبردستی بٹھا دیا۔ عطر سنگھ اس خدمت گار سے الجھ گیا۔ آخر مہاراجا نے عطر سنگھ کو ڈانٹ دیا۔

”عطر سنگھ، ہوش میں رہ۔ یہ ہمارا دربار ہے کوئی بازار نہیں۔“

عطر سنگھ ایک دم سنبھل گیا اور تقریباً روتے ہوئے بولا۔ ”میں مہاراجا کی رانی کلدیپ کور کا بھائی اور غیرت مند اور بہادر اکالی، مہاراجا کو میری عزت کرنی چاہیے۔“

مہاراجا نے بہ دستور ترشی سے جواب دیا۔ ”ہم اس شخص کی عزت کرتے ہیں جو خود اپنی عزت کرنا جانتا ہے۔ عطر سنگھ پہلے تم خود اپنی عزت کرو اس کے بعد دوسروں سے عزت کروانے کی خواہش کرو۔“

موراں کے چہرے کی وحشت بتا رہی تھی کہ وہ عطر سنگھ کے حشر سے خوف زدہ ہے لیکن یہ خوف مہاراجا نے دور کردیا، مہاراجا نے کہا۔ ”گو یہ دربار نہیں ہے لیکن پھر بھی ہم عطر سنگھ کو اپنے زنانے محلات کا محافظ مقرر کرتے ہیں۔“

عطر سنگھ نے پالتو کتے کی طرح مہاراجا کے قدموں میں گر کر پیر چوم لیے اور تلوؤں سے آنکھیں ملنے لگا۔ وہ نشے میں کہہ رہا تھا۔ ”میں مہاراجا کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ شاید یہ قرض میں اپنی جان دے کر ہی ادا کرسکوں۔“

مہاراجا نے ایک بار پھر ایک تو بہار ناز کو رقص کا حکم دیا اور محفل میں گھنگروؤں اور سازوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ عطر سنگھ مہاراجا کے قدموں میں اوندھا پڑا رہا۔ موراں بہ ظاہر عطر سنگھ سے بے نیاز تھی لیکن جب بھی موقع پاتی کن انکھیوں سے عطر سنگھ کو دیکھ لیتی۔ مہاراجا نے موراں سے کہا۔ ”موراں ہم نے تمہاری خواہش پوری کردی ہے۔ عطر سنگھ کی داتا دربار والی خدمت کا ہم نے وہی صلہ دیا ہے جس کی تم خواہش کر رہی تھیں۔“

موراں نے جواب دیا۔ ”میں کس زبان سے مہاراجا کا شکریہ ادا کروں۔“

مہاراجا نے سرِ محفل ایک بار پھر موراں کو اپنی آغوش میں لے لیا اور رقص و سرود کی لہروں میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

کلدیپ کور نے عطر سنگھ کو ملامت کی۔ ”کیوں رے! تو تو یہ کہتا تھا کہ مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اب یہ سننے میں آیا ہے کہ تو خود موراں کی دربارداری کرنے لگا، یہ کیا بات ہے؟“

عطر سنگھ نے جواب دیا۔ ”دیکھتی رہ کلدیپ کور، میں

## یقین کے مطابق

○ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا معاملہ بندے کے ساتھ اس کے یقین کے مطابق ہے اور میں اس کے بالکل ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے۔ اگر وہ مجھے اپنے جی میں اس طرح یاد کرے کہ کسی اور کو خبر بھی نہ ہو تو میں بھی اس کو اسی طرح یاد کروں گا اور اگر وہ دوسرے لوگوں کے سامنے مجھے یاد کرے تو میں ان سے بہتر بندوں کی جماعت میں اس کا ذکر کروں گا (یعنی ملائکہ کی جماعت میں ان کے سامنے)“ (صحیح بخاری و مسلم)

تشریح: حدیث کے پہلے جملے (انا عند ظن عبدی بی) کا مطلب یہ ہے کہ بندہ میرے بارے میں جیسا یقین قائم کرے گا تو میرا معاملہ اس کے ساتھ بالکل اسی کے مطابق ہوگا۔ مثلاً وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں رحم اور کرم کا یقین کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو رحیم و کریم ہی پائے گا۔ اس لیے بندے کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا یقین کرے اور اسی کے مطابق عمل کرے۔ حدیث کے آخری حصہ میں جو فرمایا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ مجھے خلوت میں اس طرح یاد کرتا ہے (جس میں دعوت وارشاد اور وعظ و نصیحت بھی داخل ہے) تو اس بندہ کے ساتھ اپنے تعلق اور اس کی قبولیت کا ذکر میں فرشتوں کے سامنے بھی کرتا ہوں، جس کے بعد وہ بندہ فرشتوں میں مقبول و محبوب ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اس دنیا میں بھی اس کو قبولِ عام اور محبوبیتِ عامہ حاصل ہو جاتی ہے (معارف الحدیث)

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل ملتان

بھی خالصہ نہیں اگر میں نے موراں کے زور کو نہ توڑ دیا ہو۔“

کلدیپ کور نے پوچھا۔ ”تو نے موراں نامراد کا زور توڑنے کا کیا طریقہ سوچا ہے؟“

عطر سنگھ نے کلدیپ کور کے کان میں کہا۔ ”کلدیپ! پہلے تو میں موراں سے عشق لڑاؤں گا اور یہ طے ہے کہ ایک نہ ایک دن اس عشق کا بھانڈا پھوٹے گا ضرور اور جب یہ بھانڈا پھوٹے گا تو یہ تو تو خوب ہی سمجھ سکتی ہے کہ اس جرم کی سزا مہاراجا موراں کو کتنی دردناک دے گا۔ بس یہی میں چاہتا ہوں۔“

کلدیپ کور نے اس کی پشت پر ایک دوہتڑ رسید کیا، بولی۔ ”ارے نامراد تو نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اس جرم کی سزا تنہا موراں ہی کو کیوں ملے گی، تو بھی تو مارا جائے گا۔“

”میں بھی مارا جاؤں گا۔“ عطر سنگھ نے پریشان ہو کر دہرایا۔ ”یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔“ پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”خیر کوئی پروا نہیں کلدیپ۔ تو فکر نہ کر، میں رہوں یا مروں، موراں کو تو ٹھکانے لگا ہی جاؤں گا۔“

کلدیپ نے جیسے عطر سنگھ کا مذاق اڑایا، بولی۔ ”میں کچھ نہیں جانتی، مجھے تو تیری عقل مندی سے ڈر لگنے لگا ہے، تجھے جو کچھ بھی کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبے۔“

عطر سنگھ نے ترنگ میں جواب دیا۔ ”کلدیپ میرا نام عطر سنگھ ہے، عطر سنگھ۔ جس طرح پھولوں سے عطر نکلتا ہے میں اسی طرح مہاراجا کے دل سے موراں کی محبت نکال دوں گا۔“

اس وقت ایک طرف سے وہ کنیز نمودار ہوئی جو ایک رات عطر سنگھ کو نالے کے راستے موراں کے پاس لے گئی تھی۔ اس کے پیچھے سر پر سرپوش بند قاب لیے ایک اور خدمت گار عورت تھی۔ کنیز نے کلدیپ سے کہا۔ ”رانی جی! ہماری رانی جی نے یہ منت مانی تھی کہ جب مہاراجا بخیر و خوبی واپس آجائیں گے تو وہ اس خوشی میں شیرنی تقسیم کریں گی، یہ شیرنی آپ کو بھیجی ہے۔“

کلدیپ نے ناگوار لہجے میں جواب دیا۔ ”تو اپنی مٹھائی واپس لے جا اور اس موراں سے کہہ دیجیو کہ آئندہ مجھے حصہ وغیرہ نہ بھیجے۔“ یہ کہتے ہوئے کلدیپ اٹھی اور نفرت سے سامنے سے ہٹ گئی۔ کنیز نے کلدیپ کے جاتے ہی ادھر ادھر گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور عطر سنگھ سے سرگوشی میں کہا۔ ”رات اذان کے بعد، اسی راستے سے پہنچ جانا، بلایا ہے۔ میں تمہیں ڈھونڈتے ہوئے اس شیرنی کے بہانے یہاں تک آگئی تھی۔“

عطر سنگھ کی خوف سے آنکھیں پھیل گئیں، آہستہ سے پوچھا۔ ”کیا موراں مجھے قتل کروانا چاہتی ہے؟“

کنیز نے کہا۔ ”یہاں زیادہ باتوں کا وقت نہیں ہے۔ یہ باتیں رانی موراں سے ہی کر لینا۔“

عطر سنگھ نے ذرا جوش میں، اونچی آواز میں کہا۔ ”موراں کا پیغام تو لے کر آئی ہے تو بات بھی تجھی سے ہوگی، اپنی موراں سے جا کے کہہ دینا کہ کیا تو عطر سنگھ کو قتل کروانا چاہتی ہے؟“

کنیز گھبرا کے بھاگ کھڑی ہوئی۔ عطر سنگھ کی غضب ناک آواز سن کر کلدیپ کور دوبارہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے جلدی جلدی متجسس لہجے میں پوچھا۔ ”یہاں موراں کا کیا ذکر آیا تھا؟“

عطر سنگھ اپنی غلطی پر شرمندہ تھا۔ بات بناتے ہوئے مسکرا کے بولا۔ ”بات یہ ہے کہ مہاراجا نے رانیوں کے محل کی حفاظت اور نگرانی کا کام میرے سپرد کیا ہے۔ میں نے سنا تھا موراں داتا دربار پھر جانے والی ہے۔ میں نے کنیز سے کہلوا دیا ہے کہ موراں کو جب داتا دربار جانا ہو تو پہلے مجھے مطلع کرے اس کے بعد جائے۔ کیا اپنی مرضی چلا کر موراں عطر سنگھ کو قتل کروا دینا چاہتی ہے۔“

کلدیپ کور نے طنزاً کہا۔ ”تو موراں کی خیر خواہی پر کیوں تلا ہوا ہے، وہ کہیں جا کے مرنا چاہتی ہے تو اسے مر جانے دے۔“

”افوہ کلدیپ، تو میری بات کیوں نہیں سمجھتی، کوئی ایسی ویسی بات محل کے باہر پیش آگئی تو اس کا مہاراجا کے سامنے جواب وہ کون ہوگا؟ میں کہ تو؟ تیرے پاس میرے جتنی عقل ہوتی تو کلدیپ کور نہ ہوتی، سردار عطر سنگھ ہوتی۔“

☆☆☆

شام کے بعد ہی سے عطر سنگھ اذان کی طرف کان لگا کے بیٹھ گیا۔ سامنے دیوار پر اس نے شان و شوکت کی نمود کی خاطر مختلف ہتھیار سجا رکھے تھے، بیٹھے بیٹھے اکتایا تو ہتھیاروں کے پاس چلا گیا۔ یہاں توڑے دار بندوق بھی تھی اور تلوار بھی۔ کئی خنجر بھی لٹک رہے تھے۔ ایک طرف لمبا سا نیزہ بھی کھڑا تھا۔ کٹار اور جمدھر بھی اور کرپان بھی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے باری باری ان ہتھیاروں کو چھو چھو کر دیکھتا رہا پھر تلوار کو ہاتھ میں لے کر فضا میں لہرانے لگا۔ لہرانے کے بعد اس نے تلوار کی دھار پر انگلی پھیر کے دیکھی۔ باری باری اسی قسم کی حرکتیں اس نے دوسرے ہتھیاروں کے ساتھ بھی





کیں۔ انہی حرکتوں میں اچانک اذان کی آواز کانوں میں پڑی تو عطر سنگھ چونک کر ہتھیاروں کے پاس سے ہٹ آیا پھر کچھ سوچ کر وہ ایک بار پھر ہتھیاروں کے پاس پہنچا اور اس میں سے ایک خنجر نکال کر کمر میں کھرس لیا پھر آہستہ آہستہ دبے قدموں اس نالے تک پہنچ گیا جس کے ذریعے اسے موراں کے پاس پہنچنا تھا۔ اس نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا پھر وہ نالے میں اتر گیا۔ ابھی وہ نالے میں دو قدم بھی نہ چلا ہوگا کہ اوپر سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ یہ چپ چاپ نالے میں لیٹ گیا، جب یہ آہٹ آہستہ آہستہ دور چلی گئی تو وہ بھی نالے میں سے گزر کے موراں کے محل میں داخل ہو گیا۔ موراں کے کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی لیکن کمرے کے باہر غضب کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ وہ نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے موراں کے کمرے کی طرف بڑھا لیکن اسی عالم میں ایک طرف سے ایک سایہ نمودار ہوا اور تیز تیز قدموں سے چل کر عطر سنگھ کے قریب پہنچ گیا۔ عطر سنگھ نے فوراً خنجر نکال لیا اور اس پر حملہ آور ہونا ہی چاہتا تھا کہ ایک ہلکی سی چیخ بلند ہو گئی۔

”سردار عطر سنگھ، میں ہوں رانی موراں کی کنیز، مجھے نہ مارنا۔“

عطر سنگھ کو ہنسی آگئی، قہقہہ لگا کر بولا۔ ”واہ بھئی، وہ تو خیریت ہو گئی کہ تم خون خرابے سے پہلے ہی چیخ پڑیں۔ اگر تم ایسا نہ کرتیں تو میں تمہیں سورگ بھیج چکا ہوتا۔“

”آہستہ آہستہ، کیا غضب کرتے ہو۔“ کنیز نے کہا۔ ”میں کئی گھنٹے سے کھڑی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی سوچتی تھی کہ تم نہیں آؤ گے اور کبھی یہ سوچتی کہ تم ضرور آؤ گے۔“

وہ عطر سنگھ کو موراں کے کمرے میں لیے چلی گئی۔ موراں اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے گلے سے ایک قیمتی مالا اتار کر کنیز کے حوالے کر دی، بولی۔ ”تو صدر دروازے کے قریب موجود رہنا۔ جیسے ہی مہاراجا تشریف لائیں مجھے مطلع کر دینا۔“

عطر سنگھ نے گھبرا کر پوچھا۔ ”موراں! کیا واقعی تو میری جان کی لاگو ہو گئی ہے۔ مہاراجا کی موجودگی میں تیرا مجھے بلانا اور میرا چلے آنا۔ ایسے دو عجیب واقعے ہیں کہ یہ خالصہ تاریخ میں لکھے جائیں گے۔“

موراں نے اس کی شاندار پذیرائی اور ضیافت کی۔ عطر سنگھ بڑھ چڑھ کے خوان صاف کر رہا تھا۔ موراں نے اس بے جا طویل عمل سے اکتا کر دریافت کیا۔ ”کیا یہاں کھانے ہی آئے تھے؟ میں تو تم سے باتیں کرنے والی تھی اور تم کھانے پینے میں الجھ گئے۔“

عطر سنگھ جلدی جلدی منہ چلاتے ہوئے بولا۔ ”دنیا کی ساری رونق کھانے ہی سے ہے۔ پہلے کھانے کھا کے جان بناؤ اس کے بعد کوئی اور کام کرو، اپنا تو سدا سے یہی دستور ہے بس یہ سمجھ لو کہ میں پیدا ہوتے ہی اس اصول پر کاربند ہو گیا تھا اور اب شاید مر کر ہی اس اصول سے پیچھا چھوٹے۔“

موراں نے ازراہ مذاق مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کھانا میں تمہارے ساتھ کر دوں گی، اس فضول مشغلے میں وقت ضائع نہ کرو۔“

عطر سنگھ کو ہنسی آگئی، بولا۔ ”پھر ہم دونوں میں خوب نبھے گی۔ چلو جی تم کہتی ہو تو نہیں کھاتے، کر و باتیں۔ بولو، میں کیا کہوں؟“

موراں نے شکایتاً کہا۔ ”اس دن محفل میں تم نے جیسی حرکتیں کی ہیں ان سے مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں تم کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جاؤ۔“ عطر سنگھ حسب عادت قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

موراں سہم گئی اس نے عطر سنگھ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جھنجلا کر بولی۔ ”تم بڑے عاقبت نااندیش انسان ہو۔ اس طرح قہقہہ مار کے ہنس دیتے ہو گویا اپنے گاؤں کی چوپال میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے ہو۔“

عطر سنگھ نے شرمندگی سے کہا۔ ”موراں! مجھے ہنسنے کا بڑا شوق ہے، کیا کروں بے ساختہ ہنس دیتا ہوں۔“

موراں نے کہا۔ ”کھانے کا تمہیں شوق ہے، ہنسنے کا تمہیں شوق ہے، محبت کرنے کا تمہیں شوق ہے، سچ بتاؤ تمہیں کس کس بات کا شوق ہے؟“

عطر سنگھ نے جواب دیا۔ ”میدان جنگ میں بہادری دکھانے کا بھی شوق ہے......“

موراں نے اس کے سینے سے سر لگا دیا، بولی۔ ”تم اپنے سارے شوق پورے کرو لیکن اس میں ایک شوق کا میری خواہش پر اضافہ کر لو۔“

وہ کون سا شوق؟“

”احتیاط کا شوق، تم آئندہ ہمیشہ احتیاط سے کام لو۔ ورنہ یہ سمجھ لو کہ تم تلوار کی دھار پر بیٹھ چکے ہو اور یہ کسی دن بھی تمہارا کام کر دے گی۔“

عطر سنگھ پھر قہقہہ مار کے ہنس دیا موراں پھر سہم گئی۔ عطر سنگھ نے زور زور سے کہا۔ ”تم کہتی ہو تو احتیاط بھی کر لوں

گا۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ احتیاط وحتیاط اپنے بس کی بات نہیں ہے۔''

اسی دوران کنیز باہر سے بھاگی ہوئی آئی، موراں کی تو جان ہی نکل گئی لیکن عطر سنگھ نہیں گھبرایا۔ موراں نے گھبرا کے کنیز سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، کیا مہاراجا آرہے ہیں؟''

کنیز نے جواب دیا۔ ''قہقہوں کی آوازیں دور تک جارہی ہیں۔''

موراں نے بے بسی سے کہا۔ ''یہ مانتے ہی نہیں، انہیں کس طرح اور کتنی بار سمجھاؤں۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔''

عطر سنگھ نے سادگی سے کہا۔ ''ارے موراں کبھی کبھی تو اپنا ناچ بھی دکھا دیا کر، کیا یہ سارے مزے مہاراجا ہی کی قسمت میں لکھے گئے ہیں۔''

موراں نے کہا۔ ''میں ناچ دکھا تو سکتی ہوں لیکن گھنگروؤں کی آوازیں باہر تک جائیں گی۔''

عطر سنگھ نے کہا۔ ''تب پھر بغیر گھنگروؤں کے ہی اپنا ناچ دکھادو۔''

موراں نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ منظور ہے۔''

''تب پھر شروع کردو۔''

موراں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ ''ایک میں مزہ نہیں آئے گا۔''

عطر سنگھ نے ترشی سے کہا۔ ''مزہ کیسے نہیں آئے گا، میں جو ہوں۔ ہاں پھر رقص شروع کردو۔''

موراں آہستہ آہستہ عطر سنگھ کے پاس سے ہٹ گئی اور کمرے کو اندر سے بند کرلیا۔ عطر سنگھ ایک طرف بیٹھ گیا۔ موراں نے گھنگروؤں کے بغیر ہی رقص شروع کردیا۔ کبھی وہ تتلی کی طرح تھرکتے ہوئے عطر سنگھ کے سر پر پہنچ جاتی اور کبھی اٹھلاتی بل کھاتی اس سے دور ہوجاتی۔ عطر سنگھ اس کی ایک ایک ادا پر جان نچھاور کرتا رہا۔ آخر میں موراں کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا۔ ''موراں! تو مسلمان ہے، پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ مہاراجا کے اردگرد جو مسلمان جمع ہوگئے ہیں ان کی چھانٹی کردوں لیکن جب سے تجھے دیکھا ہے، مسلمانوں کے خلاف میرے دل میں اتنی نفرت نہیں رہ گئی۔''

موراں نے ہنسی ہنسی میں کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو تم میری زیر تعمیر مسجد میں دلچسپی لو اور اسے اپنی نگرانی میں تعمیر کروادو۔''

عطر سنگھ نے چونک کر کہا۔ ''یہ تم اس مسجد کا ذکر کررہی ہو جو گردوارے کے عین سامنے تعمیر ہورہی ہے؟''

''ہاں، میں اسی مسجد کا ذکر کررہی ہوں، کیوں کوئی خاص بات ہے؟''

عطر سنگھ نے بے بسی سے کہا۔ ''ارے موراں! تو بھی کتنے غضب کی نکلی۔ میں گرنتھ جی کی قسم کھا کے تجھے یقین دلاتا ہوں کہ پہلے تو میں نے یہ ارادہ کرلیا تھا کہ کچھ بھی ہو میں یہ مسجد نہیں بننے دوں گا اور کسی بھی طرح اسے گرادوں گا لیکن مہاراجا کی رواداری کی وجہ سے بے بس ہوگیا تھا لیکن اب جب تو اس مسجد کی سفارش کررہی ہے تو یہ مسجد بنے گی اور ضرور بنے گی، تو فکر نہ کر، میں اسے اپنی نگرانی میں تعمیر کروادوں گا۔''

اتنے میں کنیز دوبارہ بھاگی ہوئی آئی اور دروازہ پیٹتے ہوئے سرگوشی میں دونوں کو مطلع کیا۔ ''مہاراجا تشریف لارہے ہیں ہوشیار، خبردار۔''

عطر سنگھ اتنا گھبرایا کہ اپنی پگڑی تک نہ اٹھا سکا۔ اس کے بال بکھر کے آنکھوں پر آگئے وہ انہیں آنکھوں پر سے ہٹاتے ہوئے نالے کی طرف بھاگا اور اس میں پھاند کر غائب ہوگیا۔ موراں نے اس کی پگڑی ایک خالی مرتبان میں ڈال دی اور بیٹھ کے مہاراجا کا انتظار کرنے لگی۔

☆☆☆

ملتان کا قلعہ کسی طرح سر ہی نہیں ہورہا تھا۔ کئی نامی گرامی جرنیلوں نے اس قلعے کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا لیکن ناکام رہے۔ رنجیت سنگھ اس ناکامی سے جز بز ہورہا تھا، اسے سخت غصہ تھا۔ اس نے مختلف جرنیلوں کی ایک ہنگامی مجلس مشورت طلب کی۔ اس مجلس میں سردار دھنا سنگھ اٹاری والا، سردار ہری سنگھ نلوا، سردار دل سنگھ، سردار عطر سنگھ، دیوان محکم چند اور فقیر عزیز الدین جیسے نامی گرامی امرا اپنی جگہوں پر بیٹھے تھے۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ان سرداروں کو مخاطب کیا۔ مہاراجا کی آواز بتدریج تیز ہوتی چلی گئی۔

''سردارو! جیسا کہ تم سب جانتے ہو، ملتان پر کئی بار لشکر کشی کی گئی ہے لیکن انجام ناکامی نکلا، کیا ملتان کے افغان حکمراں اکالیوں سے زیادہ بہادر ہیں؟ کیا ملتان کے نواب کی حکومت اکالی ریاست سے بڑی ہے؟ پورا ہندوستان جانتا ہے کہ اس عہد کے طاقت ور ترین لوگ اکالی ہیں اور ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں ہمیشہ اپنے دشمنوں کی سرزمین کو روندتی ہوئی کہیں سے کہیں پہنچتی رہی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ





ہم ملتان کو فتح کرنے میں ناکام رہے ہیں؟'' اس کے بعد مہاراجا نے ہری سنگھ نلوا سے سوال کیا۔ ''ہری سنگھ تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟''

ہری سنگھ نے جواب دیا۔ ''ملتان میں ابھی تک کوئی حقیقی جنگ نہیں لڑی گئی ہے۔ وہاں کا نواب ہمیشہ ہمیں خراج دے کر واپس کردیتا ہے۔ اگر ملتان کا نواب مظفر خراج دینا بند کردے تو پھر ہم دیکھ لیں گے کہ وہ اس کے بعد کتنے دن ملتان پر حکومت کرتا ہے۔''

مہاراجا نے 'ہوں' کیا اور سر جھکا لیا پھر گردن اٹھاتے ہوئے ایک دوسرے سردار سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں تو سردار دل سنگھ اس سلسلے میں تم کیا کہتے ہو؟''

سردار دل سنگھ نے کہا۔ ''مہاراجا اگر حکم دیں تو ابھی ملتان پر لشکر کشی کرکے اسے غارت کردوں؟''

مہاراجا نے عطر سنگھ سے سوال کیا۔ ''تو کیوں خاموش ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟''

عطر سنگھ نے جواب دیا۔ ''مہاراج! میں تو حکم کا بندہ ہوں مہاراج نے حکم دیا کہ میں رانیوں کی حفاظت کروں، میں نے بھی اپنا حق ادا کردیا اور اب کسی رانی کی مجال نہیں کہ وہ سردار عطر سنگھ کی نگرانی اور حفاظت سے بچ جائے۔''

مہاراجا نے طنزاً کہا۔ ''ہاں اور مجھے یہ جان کر بہت زیادہ خوشی ہوئی کہ تو میری عزیز ترین چہیتی بیوی موراں کا خاص خیال رکھتا ہے۔''

عطر سنگھ عورتوں کی طرح شرما گیا، بولا۔ ''یہ تو مہاراج کا حسن ظن ہے ورنہ بندہ کہاں اس قابل۔''

مہاراجا نے کہا۔ ''لیکن سردار عطر سنگھ! میری یہ بات کان کھول کر سن لے کہ اس بار تجھے بھی ملتان کی مہم پر جانا ہے۔''

عطر سنگھ نے ادب سے گردن جھکائی، بولا۔ ''میں تو اگر مہاراج حکم دیں تو ترکستان تک میں جانے کو تیار ہوں۔''

مہاراجا نے زیر لب کہا۔ ''وہاں تو ایک دن جانا ہی ہے۔'' اس کے بعد مہاراجا نے اسے نہایت معنی خیز نظروں سے گھورا۔

سب سے آخر میں مہاراجا عزیز الدین سے مخاطب ہوا، بولا۔ ''عزیز الدین! تم کیوں خاموش ہو، تم بھی تو کچھ کہو۔''

''مہاراجا مجھ سے بہتر سمجھتے ہوں گے کیونکہ مہاراجا روشن ضمیر واقع ہوئے ہیں۔''

مہاراجا نے اصرار کیا۔ ''لیکن تم اپنی رائے ضرور دو اور صاف صاف دو۔''

عزیز الدین نے کہا۔ ''اگر مہاراج واقعی میری رائے لینا چاہتے ہیں تو میں مہاراجا سے درخواست کروں گا کہ وہ ملتان سے خراج لینے کی حد تک تعلق قائم رکھیں۔ اسے تباہ و برباد نہ کریں کیونکہ ملکوں، شہروں اور قلعوں کی تسخیر نہایت آسان ہے اور دلوں کو مسخر کرلینا بہت دشوار ہے۔''

مہاراج اس جواب سے بہت خوش ہوئے لیکن سردار عطر سنگھ نے خفگی سے کہا۔ ''مہاراج! آپ ہی مسئلے پر ذرا سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ عزیز الدین مسلمان ہیں اور ملتان کا نواب مظفر بھی مسلمان ہے پھر ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کا خیال رکھے گا یا نہیں رکھے گا۔''

مہاراجا نے نرمی سے کہا۔ ''میں عزیز الدین کو تم سب سے زیادہ جانتا ہوں۔''

عطر سنگھ نے کہا۔ ''مہاراج اگر مناسب سمجھیں تو عزیز الدین کا اس وقت امتحان لے لیں بس پھر پتا چل جائے گا کہ یہ شخص اکالیوں کا خیر خواہ ہے یا اپنے مسلمان بھائیوں کا؟''

رنجیت سنگھ کسی قدر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اچانک عزیز الدین سے مخاطب ہوا۔ ''عزیز الدین! میں سکھ دھرم سے تم سے بات نہیں کرتا، تم یہ بتاؤ کہ تمہیں ہندو مذہب اچھا لگتا ہے یا اسلام؟''

عزیز الدین نے جواب دیا۔ ''مہاراج! اس ناچیز کی حالت تو اس جیسی ہے جو دریا کے بیچوں بیچ شناوری کررہا ہو اور شناوری کے دوران وہ دریا کے جس کنارے کو بھی دیکھے اسے دونوں یکساں نظر آئیں۔''

رنجیت سنگھ اس جواب سے بہت خوش ہوا، عطر سنگھ سے کہا۔ ''دیکھا تو نے؟ یہ ہیں عزیز الدین۔ میں ان کی قدر خوامخواہ نہیں کرتا۔''

ہری سنگھ نلوا نے پوچھا۔ ''پھر مہاراج نے ملتان کے سلسلے میں کیا طے فرمایا؟''

مہاراجا نے جواب دیا۔ ''ملتان پر حملہ آوری کے جواز تلاش کیے جائیں۔ اس کے بعد جنگ اور لشکر کشی کا منصوبہ نہایت احتیاط سے بنایا جائے۔'' اسی وقت دربار کا ایک طویل القامت میراثی اجازت لے کر مہاراج کے روبرو پہنچ گیا۔ مہاراجا اس کی طویل القامتی سے بہت محظوظ ہوا، ازراہ مذاق کہا۔ ''او لمبے! میں پوچھتا ہوں تو نے اپنی ماں کے پیٹ سے دنیا میں آنے میں اتنی تاخیر سے کام کیوں لیا اگر جلدی آجاتا تو اتنا لمبا نہ ہوتا۔''

منہ پھٹ میراثی نے مہاراجا کی بند آنکھوں کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”حضور! میں عجلت کا نتیجہ ہر روز ہی دیکھتا رہتا ہوں، لوگ تو عجلت میں ایک آدھ آنکھ ہی چھوڑ کر چلے آتے ہیں۔“

مہاراجا کھسیا گیا لیکن اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا، لوگ مسکرانے لگے۔

☆☆☆

شاہ عالمی دروازے کے اندر بازار پاپڑ منڈی میں، اکالیوں کے گردوارے کے قریب موراں کی مسجد مکمل ہو چکی تھی۔ موراں اس مسجد کو دیکھنے جا رہی تھی۔ شاہی انتظامات میں موراں کا رتھ مسجد کی طرف روانہ ہوا۔ موراں کے خدمت گار ہٹو بچو، رانی موراں کی سواری گزر رہی ہے، کی آواز لگاتے رتھ کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ ان کے علاوہ سردار عطر سنگھ بھی چند گھڑسواروں کے ساتھ موراں کے رتھ کے ساتھ چل رہا تھا۔ آس پاس لگے ہوئے درختوں کے سائے کبھی اپنے دامن میں چھپا لیتے کبھی سورج کی شعاعیں ان پر اپنی روشنی ڈال دیتیں۔

موراں کا رتھ مسجد کے سامنے رک گیا۔ موراں اس میں سے اٹھلاتی ہوئی برآمد ہوئی۔ سردار عطر سنگھ ادب سے آگے بڑھا۔ مسجد کا مہندس اور نگراں مسجد کے دروازے پر کھڑا موراں کا استقبال کر رہا تھا۔ وہ موراں کو لے کر مسجد کے اندر داخل ہو گیا اور مسجد کی صناعی اور نقش و نگار کا مشاہدہ کرواتا رہا۔ مسجد کے باہر گردوارے کے نہنگ اکالی جمع ہو چکے تھے۔ انہوں نے عطر سنگھ کو گھیر رکھا تھا اور اس پر اپنے غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ سب نیلے لباس پہنے ہوئے تھے۔ گھٹنوں تک پاجامے پہنے، بالوں کا جوڑا باندھے ہوئے جس میں کنگھے پھنسے ہوئے تھے، ہاتھوں میں کڑے، پہلو میں کرپانیں لٹکی ہوئی تھیں۔

ان میں کا ایک اکالی سردار عطر سنگھ کے قریب آیا اور غصے میں کہا۔ ”سردار عطر سنگھ! کیا تو نے یہ نہیں سوچا کہ اس مسجد سے شب و روز پانچ وقت اذانیں دی جائیں گی جس سے ہماری نیندوں کے ساتھ ہی عبادت میں بھی فرق پڑے گا۔“

عطر سنگھ نے جواب دیا۔ ”تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس سے میں بھی واقف ہوں لیکن جب اس مسجد کی تعمیر میں خود مہاراجا کی مرضی شامل ہے تو میں یا تم یا اور کوئی کیا کر سکتا ہے۔“

اکالی نمائندے نے جوش و خروش سے کہا۔ ”ہم سب یہ شکایت لے کر مہاراجا کے پاس جائیں گے۔“

ایک اور اکالی بولا۔ ”لیکن مہاراجا کے پاس جانے کا فائدہ؟ مہاراجا تو موراں اور عزیز الدین کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔“

تیسرے نے کہا۔ ”کچھ بھی ہو ہمیں مہاراجا کے پاس جانا تو ضرور چاہیے۔“

عطر سنگھ بولا۔ ”میں تمہارا ساتھ دوں گا اس معاملے میں۔“

کسی سرپھرے اکالی نے کہا۔ ”ارے جا تو کیا ساتھ دے گا، ذرا اس ساتھ دینے والے کی شکل تو دیکھنا، یہ ساتھ دے گا؟“

عطر سنگھ نے غصے میں کہا۔ ”کیا کہا، میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔ چلو، یہ کہتے ہو تو یہی سہی، نہیں دیتا تمہارا ساتھ کرلو تم جو کر سکتے ہو۔“

اکالیوں نے نعرہ لگایا۔ ”غدار ہے غدار، غدار ہے غدار۔“

نعروں کی آواز سن کر موراں مسجد سے نکل آئی۔ عطر سنگھ بھاگ کر مسجد کے دروازے پر پہنچ گیا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں جلدی جلدی بولا۔ ”جتنی مسجد دیکھ چکی ہو بس اتنی ہی کافی ہے، اب وقت نہ برباد کرو، اکالی تمہارے خلاف ہو چکے ہیں۔ یہاں سے بھاگ چلو، ورنہ اگر کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو بڑی بدنامی ہو گی۔“

موراں نے مفسد اکالیوں کی طرف دیکھا اور مہندس کو ایک نظر دیکھ کر مسجد کی طرف دیکھا اور رتھ میں سوار ہو گئی۔ عطر سنگھ نے کوچ کا حکم دیا اور یہ قافلہ ایک بار پھر شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

مہاراجا کے حکم سے مسجد میں ایک امام کا تقرر بھی ہو گیا اور مسجد سے اذان کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور عطر سنگھ کی بہن کلدیپ کور نے بھائی کو بڑی ملامتیں دیں۔ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولی۔ ”دفعان ہو جا میرے سامنے سے۔ تو بھی موراں ہی کا ہو رہا، ذرا موراں کی مسجد کے آس پاس جا کے دیکھ تیرے نام پر کتنی لعنتیں بھیجی جا رہی ہیں۔“

عطر سنگھ بولا۔ ”کلدیپ تو بھی نری احمق ہی ہے، کوئی مسجد میں نے بنائی ہے، موراں نے مہاراجا کی اجازت لے کر مسجد بنوا ڈالی، تو ہی بتا اس معاملے میں، میں کیا کر سکتا ہوں؟“

کلدیپ کور نے کہا۔ ”تو ایک کام تو اب بھی کر سکتا ہے۔“





”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ مسجد نہ گرا۔ نمازیوں کو مت روک لیکن پانچ وقتی اذان بند کروا دے۔“

عطر سنگھ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ میں کس طرح کر سکتا ہوں؟“

کلدیپ کور نے ہونٹ سکیڑ لیے، بولی۔ ”یہ میں کیا جانوں کہ یہ کام تو کس طرح کرے گا؟ میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ تجھے یہ کام ضرور کرنا پڑے گا۔“

عطر سنگھ جھنجلا کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”جو کام تیرا شوہر کر سکتا ہے، وہ تو اپنے بھائی سے لینا چاہتی ہے، کلدیپ تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟“

کلدیپ کور نے جل کر جواب دیا۔ ”میری عقل کوزکام ہو گیا ہے، تیری عقل تو صحیح سلامت ہے، اذان بند کر کے دکھا۔“ عطر سنگھ پیر پٹختا ہوا غصے میں چلا گیا۔

☆☆☆

اس رات وہ پھر موراں کے پاس پہنچ گیا۔ اسی طرح چوری چھپے نالے کے راستے۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی کہ اس وقت موراں تنہا نہیں تھی۔ شاید مہاراجا موجود تھا۔ یہ جس راستے گیا تھا اسی سے واپس چلا آیا۔

دوسرے دن مہاراجا نے اسے طلب کیا اور اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”عطر سنگھ! تیری بے پروائی کی شکایتیں مل رہی ہیں، موراں کہہ رہی تھی کہ اب پہلی جیسی توجہ نہیں دیتا۔“

عطر سنگھ کانپ گیا، بولا۔ ”ایسی بات نہیں ہے مہاراج، میں پوری طرح چوکسی کرتا ہوں۔“

مہاراجا نے کہا۔ ”کل رات مجھے خود شبہ گزرا کہ کوئی شخص نالے کے راستے گیا اور پھر واپس آیا۔ کیا تجھے اس کا علم ہے؟“

عطر سنگھ کی ٹانگیں کپکپانے لگیں، مہاراجا نے دزدیدہ نظر سے اس کی کپکپاہٹ دیکھی اور کہا۔ ”خبردار جو ایسی کوئی اور صورت سننے میں آئی۔ میں تجھے ایک موقع دیتا ہوں۔“

عطر سنگھ نے ادب سے مہاراجا کے روبرو سر جھکا دیا۔

عطر سنگھ ابھی کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ موراں کی کنیز پہنچ گئی، سرگوشی میں بولی۔ ”موراں رانی نے آج تمہیں یاد فرمایا ہے۔“

عطر سنگھ نے بے خیالی میں بہ آواز بلند ڈانٹ دیا۔ ”کیا تو بھی یہ چاہتی ہے کہ میں قتل کر دیا جاؤں؟“

کنیز نے سہم کر جواب دیا۔ ”میں یہ کیوں چاہنے لگی؟“

عطر سنگھ نے اسی آواز میں کہا۔ ”پھر تو یہاں کیا لینے آئی ہے؟“

کنیز نے کہا۔ ”عطر سنگھ! ذرا آہستہ بولو، کیا کوئی فتنہ کھڑا کرنا چاہتے ہو؟“

عطر سنگھ نے اسی طرح چیخ کر کہا۔ ”جا دفعان ہو جا فتنے کی بچی۔ کہہ دینا نہیں آتا۔“

کنیز چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد عطر سنگھ کو ہوش آیا کہ اسے کنیز کے ساتھ یہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ شام ہوتے ہی عطر سنگھ کی نیت ڈانوا ڈول ہو چکی تھی اور عشا کی اذان کے ساتھ اس کے قدم نالے کی طرف اٹھنے لگے۔ اس وقت عطر سنگھ کا عجیب حال تھا۔ دہشت میں شوق بھی شامل تھا، جیسے تیسے وہ موراں کے پاس پہنچ ہی گیا۔ موراں نے اسے اپنے سامنے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا۔ عطر سنگھ دوسری طرف چلا گیا۔ موراں نے ادھر سے بھی منہ پھیر لیا۔ عطر سنگھ پھر ادھر آ گیا۔ موراں نے غصے میں کہا۔ ”عطر سنگھ! تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں پکڑوا دوں گی۔“

”موراں!“ عطر سنگھ نے سرتاپا حسرت سے کہا۔ ”کچھ تو خیال کرو۔“

موراں نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا۔ ”میں کچھ نہیں جانتی، تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

عطر سنگھ نے کہا۔ ”میں چلا جاؤں گا تو فکر نہ کر، میری ایک بات تو سن لے۔“

موراں نے نفرت سے کہا۔ ”میں کچھ نہیں سنتی، میں کہتی ہوں تو اسی وقت چلا جا یہاں سے۔“

عطر سنگھ نے ایک نظر موراں کو دیکھا اور کچھ دیر چپ چاپ کھڑے رہ کے واپسی کے لیے مڑا، موراں کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عطر سنگھ دروازے تک پہنچ کے مڑا اور موراں سے کہا۔ ”موراں! تیرے حکم کی تعمیل میں، میں واپس جا رہا ہوں۔“

موراں ایک دم عطر سنگھ کی طرف مڑ گئی اور دونوں کی نظریں ٹکرا گئیں۔ چند ثانیے دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اس کے بعد عطر سنگھ باہر نکل گیا لیکن ابھی وہ بہ مشکل بیس قدم گیا ہوگا کہ اندھیرے میں موراں دوڑتے ہوئے گئی اور عطر سنگھ کو پیچھے سے پکڑ لیا، بولی۔ ”بس دیکھ لی تیری محبت۔“

عطر سنگھ نے بددلی سے جواب دیا۔ ”جس محبت میں

غیرت ہی نہ رہے وہ کس کام کی۔"

موراں نے کہا۔ "اچھا، اب تم واپس چلو۔ تمہیں بھی میری کنیز سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

عطر سنگھ نے پھر بلند آواز میں کہا۔ "میں کیا جانوں جی کہ مجھے تیری کنیز سے کس طرح بات کرنی چاہیے اور کس طرح نہیں کرنی چاہیے۔"

موراں نے ڈر کے مارے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے، بولی۔ "بس تیری یہی بے احتیاطی تو ہمیں لے ڈوبے گی۔"

عطر سنگھ نے موراں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆☆☆

ملتان پر لشکر کشی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ تلواروں اور کرپانوں وغیرہ پر دھاریں رکھی جارہی تھیں۔ جنگی مشقیں ہورہی تھیں۔ نیزے بازی کے مصنوعی مقابلے جاری تھے۔ انہی ہنگاموں میں موراں مسجد کے قریب والے گردوادے کے اکالی عطر سنگھ سے ملے اور اس سے کہا۔ "عطر سنگھ! مسجد کی اذان نے ہماری نیندیں خراب کردی ہیں اور اب تو ہمارے گیان دھیان میں بھی فرق آنے لگا ہے۔"

عطر سنگھ نے جواب دیا۔ "تو میں کیا کروں؟"

ایک پرجوش اکالی نے کہا۔ "تم اذانیں بند کروادو۔"

عطر سنگھ نے بے بسی سے کہا۔ "لیکن یہ میں کس طرح کرسکتا ہوں؟"

دوسرا اکالی بولا۔ "اسی طرح، جس طرح تم نے مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔"

عطر سنگھ نے ناراضی سے کہا۔ "میں نے مسجد کی تعمیر میں کوئی حصہ نہیں لیا۔"

ایک اور اکالی بولا۔ "اب زیادہ باتیں نہ بناؤ سردار عطر سنگھ جی۔"

عطر سنگھ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "اچھا تم لوگ فکر نہ کرو، میں تم سب کو لے کر مہاراجا کے پاس چلتا ہوں، تم دیکھ لینا کہ میں تمہاری کتنی وکالت کرتا ہوں۔"

یہ لوگ عطر سنگھ کی معیت میں اسی وقت مہاراجا کے پاس چل دیے۔ مہاراجا کے دربار میں اکالیوں کا احتجاجی وفد اس طرح داخل ہوا کہ ان میں عطر سنگھ سب سے آگے تھا۔

مہاراجا نے عطر سنگھ کو پیش پیش دیکھ کر سوال کیا۔

"عطر سنگھ! کیا بات ہے؟ تمہارے ساتھ یہ لوگ کیسے ہیں؟"

عطر سنگھ پر مہاراجا کا رعب غالب آگیا، بولا۔ "یہ لوگ اپنا کوئی ذاتی مسئلہ لے کر مہاراجا کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور انصاف چاہتے ہیں۔"

ایک اکالی نے غصے میں کہا۔ "عطر سنگھ تو ہمارے مذہبی اور قومی مسئلے کو ذاتی بنا کر مہاراجا کے روبرو کیوں پیش کررہا ہے؟"

مہاراجا نے اکالی سے پوچھا۔ "ہاں تو مسئلہ کیا ہے؟"

تھوڑی دیر کے لیے دربار میں سکوت طاری ہوگیا پھر وہی اکالی کہنے لگا۔ "مہاراج! موراں رانی کی مسجد نے وہاں کے باسیوں کی نیندیں حرام کردی ہیں اور ہمارے گردوارے میں گیان ودھیان میں فرق آنے لگا ہے۔"

مہاراجا نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

اس اکالی نے جواب دیا۔ "دن رات میں پانچ بار تو اذان کا شور ہوتا ہے، آپ ہی بتائیں کہ اس شوروغل میں گیان دھیان کس طرح ممکن ہے اور لوگ چین کی نیند کیونکر سوسکتے ہیں۔"

رنجیت سنگھ نے عطر سنگھ سے پوچھا۔ "عطر سنگھ! کیا یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ درست ہے؟"

عطر سنگھ نے اپنی دانست میں نہایت عاقلانہ جواب دیا۔ "مہاراج مجھے کچھ پتا نہیں کیونکہ میں نے اذان کی آواز نہیں سنی، یہ لوگ کہتے ہیں ممکن ہے درست ہی ہو۔"

ایک اکالی گرم ہوگیا۔ "مہاراج! معلوم نہیں یہ کیسا شخص ہے کہ کسی ایک بات پر قائم ہی نہیں رہتا۔ کبھی کھل کر ہمارے ساتھ ہوجاتا ہے اور کبھی غیر جانب دار اور لاعلم ہوجاتا ہے۔"

عطر سنگھ نے جواب دیا۔ "مہاراج! میں اس مسجد سے اتنی دور رہتا ہوں کہ اس مقدمے میں، میں اس کا عینی شاہد نہیں بن سکتا۔"

مہاراجا سوچ میں پڑ گیا کہ ایک طرف اکالی ہم مذہب تھے اور دوسری طرف موراں تھی، مسلمان تھے، عزیز الدین تھا۔ مہاراجا کی ذمے داری اور غیر متعصب شخصیت تھی۔ اس نے عزیز الدین سے پوچھا۔ "عزیز الدین! یہ مسجد میں اذان کیوں دی جاتی ہے؟"

عزیز الدین نے ادب سے جواب دیا۔ "مہاراج! اذان نمازیوں کو یہ بتانے کے لیے دی جاتی ہے کہ انہیں معلوم ہوجائے کہ نماز کا وقت ہوچکا ہے اور وہ نماز کے لیے مسجد میں جمع ہوجائیں۔"

مہاراجا کے چہرے پر خوشی کی چمک آگئی، گویا اس نے اس مقدمے کا حل نکال لیا تھا، بولا۔ "اچھا اگر موراں کی مسجد میں اذان نہ دی جائے اور نماز کے وقت نمازیوں کو کسی اور طریقے سے مطلع کردیا جایا کرے تو کیسا رہے گا؟"

عزیز الدین نے دکھ سے عرض کیا۔ "ویسے نمازیوں کو بلانے کا طریقہ یہی ہے لیکن اس طریقے سے ایک بڑے اور غالب فرقے کی دل آزاری ہوتی ہے تو مہاراج اس کا جو طریقہ تجویز فرمائیں گے تو ہوسکتا ہے کہ وہ بھی اچھا ہو۔"

مہاراجا نے عطر سنگھ اور دوسرے اکالیوں کو مخاطب کیا۔ "اچھا ہم اذان بند کروائے دیتے ہیں لیکن اس کے بدلے ایک کام تم سب کو کرنا پڑے گا۔"

عطر سنگھ نے پوچھا۔ "وہ کیا مہاراج؟"

مہاراجا نے کہا۔ "تم ان سب سے کہو کہ اذان کے بدلے انہیں نمازوں سے ذرا پہلے مسلمانوں کے گھروں پر جاکر دروازے کھٹکھٹانا پڑیں گے اور یہ بتانا پڑے گا کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے، وہ مسجد میں پہنچ جائیں۔"

عطر سنگھ نے اکالیوں سے پوچھا۔ "کہو تمہیں مہاراج کا یہ فیصلہ منظور ہے؟"

اکالی وفد کے بڑے نے سوال کیا۔ "کیا اذان واقعی بند کردی جائے گی؟"

عطر سنگھ نے کہا۔ "مہاراج کی بات پر شبہ کرنے کا مطلب جانتے ہو کیا نکلے گا؟"

وفد کے بڑے نے کہا۔ "ہمیں مہاراج کا فیصلہ منظور ہے۔ ہم نمازوں سے ذرا پہلے وہاں کے مسلمان گھروں کے دروازے کھٹکھٹا کے مطلع کردیا کریں گے۔"

عزیز الدین نے فرطِ غم سے اپنا سر جھکا لیا۔

مہاراجا کے فرمان سے موراں کی مسجد میں اذان دینے کا سلسلہ بند کردیا گیا اور اس کی جگہ اکالیوں نے مسلمانوں کے گھر گھر جاکر دروازے کھٹکھٹانا شروع کردیے۔

☆☆☆

موراں مہاراجا سے روٹھ گئی۔ مہاراجا نے اسے منانے کی کوشش کی تو موراں نے اشکبار نظروں سے مہاراجا کو دیکھا اور کہا۔ "میں مہاراجا کو فراخ دل اور غیر متعصب سمجھتی تھی۔"

مہاراجا نے کہا۔ "ہم اب بھی وہی ہیں جو تم سمجھتی رہی ہو۔"

موراں نے مایوسی سے کہا۔ "میری مسجد میں بزورِ حکم اذان بند کرادی گئی پھر میں کس طرح یہ یقین کرلوں کہ مہاراجا واقعی غیر متعصب فرماں روا ہیں۔"

مہاراجا نے جواب دیا۔ "میرے حکم کے اثرات جب رونما ہوں گے تو تم خوش ہوجاؤ گی اور صرف تم ہی نہیں بلکہ تمام مسلمان اور عزیز الدین بھی۔"

اس رات چوروں کی طرح عطر سنگھ بھی موراں کے پاس پہنچا، اس دن موراں بہت اداس تھی، عطر سنگھ کو دیکھتے ہی ایک طرف چلی گئی اور کنیز سے کہا۔ "تو اس سے کہہ دے، یہ اسی وقت یہاں سے چلا جائے۔"

عطر سنگھ بھی بہت اداس تھا، بولا۔ "موراں! تم کہو گی تو میں اسی وقت یہاں سے چلا جاؤں گا اور پھر کبھی نہ آؤں گا لیکن اپنی صفائی میں یہ ضرور کہتا جاؤں گا کہ جو کچھ ہوا اس میں میرا اپنا کوئی قصور نہیں۔"

موراں نے جل کے کہا۔ "مہاراجا سے کہو تو کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا، صحیح ہوا اس کے اچھے اثرات بعد میں ظاہر ہوں گے، تم بھی یہی کہتے ہو کہ میں بے قصور ہوں۔ آخر قصور کس کا ہے یہ بھی تو معلوم ہو؟"

عطر سنگھ نے جواب دیا۔ "قصور کسی کا بھی نہیں، میری قسمت کا ہے کیونکہ بدقسمتی سے تمہاری مسجد کے سلسلے میں میرے ہم مذہبوں کا یہ خیال ہے کہ میں نے تعمیر کروائی ہے اور مہاراجا یہ سمجھتے ہیں کہ اکالیوں نے میرے مشورے اور ایما پر یہ احتجاج کیا ہے اور تم یہ سمجھ بیٹھی ہو کہ اذان میں نے بند کرائی ہے۔"

موراں نے کہا۔ "دکھ تم دونوں ہی نے پہنچایا ہے، مہاراجا نے بھی اور تم نے بھی!"

عطر سنگھ اس رات زیادہ نہیں ٹھہرا جس طرح اداس آیا تھا اسی طرح اداس چلا بھی گیا۔

☆☆☆

جن اکالیوں نے اذان بند کروائی تھی وہ ایک نئی مصیبت میں مبتلا ہوچکے تھے، پہلے تو وہ صرف اذان کے وقت ہی اپنے اپنے ٹھکانوں پر پریشان ہوجایا کرتے تھے اب ان کا سکھ چین غارت ہوچکا تھا۔ انہیں فجر کے لیے رات گئے اٹھنا پڑتا اور نماز سے کافی پہلے وہ ایک ایک مسلمان کا در کھٹکھٹانے پر مجبور تھے۔ اسی طرح ظہر کے لیے وہ وقت سے پہلے ہی، پریشان اور بدحواس ایک ایک مسلمان کے در پر جاتے اور دروازے تھپتھپا کے انہیں نماز کے وقت سے مطلع کرتے۔ اسی طرح عصر، مغرب اور عشا

کے وقت وہ اپنا فرض انجام دینے پر مجبور تھے۔ اس افتاد نے انہیں کہیں کا بھی نہ رکھا۔ کہاں کا کھانا، کہاں کا پینا۔ اس چاکری نے ان کا سکون تباہ کر کے رکھ دیا۔ وہ ہر روز پانچ بار ایک ایک مسلمان کے در پر فقیروں کی طرح حاضری دیتے اور خوار وبیزار اپنے گھروں میں واپس جا کر بے سدھ ہو کے پڑ جاتے۔ آخر جب یہ مصیبت نا قابل برداشت ہوگئی تو انہوں نے ایک بار پھر مہاراجا کے دربار کا رخ کیا۔ عطر سنگھ کو اس بار بھی حاضری کا وسیلہ بنایا گیا۔ عطر سنگھ نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارے معاملوں میں نہیں پڑوں گا۔ تم لوگ کبھی تو اذان بند کرواتے ہو اور کبھی دوبارہ اجرا کی درخواست لے کر آتے ہو۔“

اکالیوں کے نمائندے نے کہا۔ ”اذان میں ہمیں وہ مصیبتیں نہیں جھیلنی پڑیں جو اب مسلمانوں کے گھر گھر جانے میں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔ عطر سنگھ تم گرو نانک جی کے واسطے ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا دو۔“

عطر سنگھ انہیں ایک بار پھر مہاراجا کے دربار میں لے گیا اور پورا واقعہ دہرا کر عرض کیا۔ ”مہاراج! یہ اکالی دوبارہ یہ خواہش لے کر حاضر ہوئے ہیں کہ موراں رانی کی مسجد میں دوبارہ اذان دینے کا حکم جاری فرما دیا جائے کیونکہ ہر مسلمان کے گھر روزانہ جا کر دروازہ کھٹکھٹانا بڑی مصیبت کا کام ہے۔“

مہاراجا نے کہا۔ ”تم لوگ خوب سوچ لو، یہ بار بار ایک ہی مسئلے میں مختلف نوعیت کے احکام نافذ کروانا ہمارے اور تم سب کے لیے افسوس ناک بھی ہے اور شرم ناک بھی۔ ایک بار پھر سوچ لو کہ تم لوگ جو کچھ چاہتے ہو اس سے کس حد تک مطمئن ہو؟“

ایک اکالی نے کہا۔ ”مہاراج! ہر مسلمان کے گھر پر دن میں پانچ بار حاضری دینا اپنی ہمت کی بات نہیں رہی۔“

ایک اور اکالی نے دو قدم لنگڑا کے چل کر عرض کیا۔ ”مہاراج! اپنی تو ٹانگ ہی اس قابل نہیں رہی کہ مسلمانوں کے دروازوں پر جا کر ذلیل وخوار ہوں۔“

رنجیت سنگھ نے اسی وقت مسجد سے صدائے اذان بلند کرنے کا حکم دے دیا اور اندر موراں کے پاس جا کر اسے خوش خبری سنا دی۔

”موراں! خوش ہو جا کہ تیری مسجد سے دوبارہ اذان دی جائے گی۔“ پھر پورا واقعہ سنا کے کہنے لگا۔ ”ہم تو پہلے ہی اس انجام سے واقف تھے۔“ پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ موراں کے چہرے پر بھی بشاشت آگئی تھی۔

اسی رات عطر سنگھ بھی موراں کے پاس پہنچ گیا لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کے اس رات بھی مہاراجا موراں کے پاس ہی موجود تھا۔ عطر سنگھ تیزی سے اندر جانے لگا لیکن مہاراجا کی موجودگی کو محسوس کرتے ہی وہ تیزی سے واپس ہوا۔ مہاراجا نے بھی اس کی جھلک دیکھ لی تھی اور اس نے اٹھ کر کچھ دور تک اس کا پیچھا بھی کیا لیکن عطر سنگھ بھاگ نکلا اور نالے سے نکل کر اپنے ٹھکانے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ مہاراجا نے موراں کو سر سے پیر تک شک وشبے سے دیکھا اور کوئی بات کہے بغیر واپس آنے لگا۔ موراں نے اسے روک لیا تو مہاراجا نے کہا۔ ”موراں! کیا تو بتا سکتی ہے کہ ابھی ابھی یہاں تک آ کے واپس جانے والا کون تھا، یا محض میرا وہم تھا؟“

موراں نے جواب دیا۔ ”مہاراج سے انکار کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اندر سے باغی ہوتی جا رہی ہوں ورنہ سچ بات یہ ہے کہ کسی شخص کی یہ مجال ہی نہیں کہ وہ ہم تک آنے کی جسارت کرے۔“

مہاراجا کچھ سوچنے لگا، پھر بولا۔ ”موراں! میں عنقریب ملتان کی مہم اور اس کی تیاریوں میں مصروف ہو جاؤں گا، اس لیے میری عدم موجودگی میں ذرا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔“

موراں نے جواب دیا۔ ”مہاراجا کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بندی اپنی حفاظت خود کرنا جانتی ہے۔“

☆☆☆

مہاراجا نے عطر سنگھ کو طلب کیا۔ اس نے عطر سنگھ کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن شاید ناکام رہا مہاراجا نے اپنا نیا فیصلہ عطر سنگھ کو سنا دیا۔

”عطر سنگھ! آج سے تمہاری سابقہ خدمات سے تمہیں سبکدوش کیا جا رہا ہے، اب تم فوج میں کام کرو گے کیونکہ ہمیں اپنی فوج میں تمہارے جیسے سرپھرے اور دوسروں کی عزت وآبرو کا خیال رکھنے والوں کی ضرورت ہے۔“

عطر سنگھ نے کئی بار جھک جھک کر مہاراجا کا شکریہ ادا کیا۔

مہاراجا نے اسے چھیڑا۔ ”عطر سنگھ! وہم بھی کیا چیز ہے، کل میں تمہاری کارکردگی کا جائزہ لینے موراں کے پاس گیا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے یہ شبہ گزرا کہ کوئی نالے کے راستے اندر آیا ہے اور میری موجودگی سے گھبرا کر واپس چلا گیا، میں نے کچھ دور تک اس کا پیچھا بھی کیا لیکن تھک ہار کے باز آگیا۔“





عطر سنگھ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

عطر سنگھ مہاراجا کی فوج میں کچھ اتنا زیادہ منہمک ہوگیا کہ موراں سے ملاقات ہی نہ کر سکا۔ اب وہ ڈر بھی بہت گیا تھا، مہاراجا کو کسی پر شک ہوگیا تھا۔

☆☆☆

مہاراجا نے مصر دیوان نامی فوجی سردار کے ماتحت پچیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج ملتان کی تسخیر کے لیے روانہ کردی۔ یہ فوج ہر قسم کے سامان سے مسلح تھی۔ اس میں احمد شاہ ابدالی کی توپ زمزمہ بھی ساتھ کردی گئی تھی۔ یہ لشکر جرار ملتان شہر میں ذرا سی مزاحمت کے بعد داخل ہوگیا اور قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ قلعے کے اندر اسی سالہ نواب مظفر خان اپنے دو ہزار جاں نثاروں کے ساتھ محصور ہوگیا۔ قلعے کے سامنے ایک قطار میں توپیں نصب کردی گئیں اور قلعے کی دیواروں میں شگاف ڈالنے کے لیے توپیں سرکی جانے لگیں لیکن نواب کی سپاہ اتنی مستعد اور کارگزار تھی کہ جیسے ہی دیوار میں کسی جگہ شگاف ہو جاتا نواب کے آدمی وہاں مٹی کا تودہ کھڑا کر دیتے۔ یہ محاصرہ اور مقابلہ تقریباً پانچ ماہ تک جاری رہا۔ توپوں نے قلعے کے کئی دروازے تک اڑا دیے لیکن نواب کے آدمیوں نے ان کی جگہ مٹی کے پشتے کھڑے کر دیے۔ سردار عطر سنگھ اپنے چند ساتھیوں کو لے کر قلعے میں داخلے کی راہیں تلاش کرتا رہا۔ وہ قلعے کے داخلے میں پہل کا اعزاز خود حاصل کرنا چاہتا تھا اور اسے یہ شبہ تک نہ تھا کہ اس کا ایک دوسرا ساتھی سادھو سنگھ بھی یہی اعزاز حاصل کرنے کا خواہش مند ہے۔ عطر سنگھ کو اس میدان جنگ میں بھی موراں کی یاد ستاتی رہتی تھی اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ مہاراجا نے اسے ملتان کی مہم میں قصداً شامل کر کے اسے موراں سے دور کردیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی کہ مہاراجا اس کے اور موراں کے تعلقات سے آگاہ ہوگیا ہے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ وہ اس حد تک دل برداشتہ ہوا کہ اس مہم میں اسے اپنی جان تک کی پروا نہ رہی۔ راتوں کو قلعے کی دیواروں پر جگہ جگہ مشعلیں روشن کردی جاتیں جن کی روشنی میں قلعے والے محاصرین کی نقل وحرکت سے باخبر رہتے۔ سکھوں کی ٹولیاں قلعے کے چاروں طرف گھومتی رہتیں کہ ممکن ہے کہیں سے قلعے میں داخلے کا راستہ مل جائے لیکن قلعے کا نواب اور اس کے آدمی نہایت ہوشیاری اور جواں مردی سے اپنے محاصرین کا مقابلہ کر رہے تھے۔

صبح ہونے والی تھی اور راتوں کی مسلسل جگائی نے قلعے والوں کو تھکا ڈالا تھا۔ عطر سنگھ اور سادھو سنگھ اس وقت

قلعے میں داخلے کا راستہ تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ سادھو سنگھ کی نظر اچانک ایک ایسے شگاف پر پڑی جو بہ ظاہر نظر نہیں آتا تھا۔ سادھو سنگھ نے عطر سنگھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''عطر سنگھ! میں ابھی آتا ہوں، تم میرا انتظار کرنا۔''

عطر سنگھ نے پوچھا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

سادھو سنگھ نے جواب دیا۔ ''میں قلعے کی دیوار کے نیچے جا رہا ہوں اور اس کے زیر سایہ چل کے موقع کی جگہ تلاش کروں گا۔''

عطر سنگھ اس کا مقصد نہیں سمجھ سکا۔ سادھو سنگھ چند آدمیوں کے ساتھ عطر سنگھ کی نظروں سے بچ بچا کے شگاف میں داخل ہو گیا اور وہاں موجود چند مسلمان سپاہیوں کو اپنی تلوار کی دھار پر رکھ لیا اور اپنی مدد کے لیے وہیں سے نعرہ بلند کیا۔ ''ست سری اکال۔''

عطر سنگھ قلعے کے اندر سے ست سری اکال کی آواز سن کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ادھر بڑھا اور ذرا سی تلاش کے بعد وہ شگاف دریافت کر لیا، وہ اندر سے، ست سری اکال کی آواز سن کر حیران رہ گیا تھا۔ قلعے میں داخلے کی راہ ملتے ہی عطر سنگھ نے کئی سکھ پوری سپاہ کو مطلع کرنے کے لیے روانہ کر دیے۔ آناً فاناً اس مختصر شگاف کو بہت بڑا کر دیا گیا اور اکالی فوج کا بیشتر حصہ اندر داخل ہو گیا۔ سفید ریش اسّی سالہ نواب مظفر خان اپنے آٹھ بیٹوں اور دو تین سو ساتھیوں کے ساتھ اکالیوں پر ٹوٹ پڑا اور تباہ کاری مچا دی۔ اکالی اس پر جوش اور پر جنون حملے کی تاب نہ لا کے پیچھے ہٹے اور آڑ سے توڑے والی بندوقوں کی باڑھ مارنی شروع کر دی۔

بوڑھے نواب نے سکھوں کو للکارا۔ ''چھپ کر بندوقوں سے لڑنا مردوں کی شان نہیں، بہادروں کی طرح سامنے آ کر مقابلہ کرو۔''

لیکن اکالی سامنے نہیں گئے۔ اپنی جان سے بے زار عطر سنگھ نے نواب کے مقابلے پر جانا چاہا لیکن ساتھیوں نے اسے روک لیا۔ وہ نواب کی بہادری سے بہت متاثر تھا۔ اس نے چیخ کر نواب سے کہا۔ ''نواب! اگر تم ہتھیار ڈال کر امان جان طلب کر لو تو ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

نواب نے حقارت سے جواب دیا۔ ''مقابلے سے منہ موڑ کے امان طلب کرنا مردانگی کے خلاف ہے۔''

اتنا کہہ کر نواب اکالیوں کی طرف مردانہ وار بڑھا لیکن بندوقوں کی باڑھ نے نواب کے جسم کو چھلنی کر ڈالا۔ باپ کے ساتھ اس کے چھوٹے بیٹے بھی مارے گئے۔ دو بیٹے زندہ رہے لیکن شدید زخمی ہونے کی وجہ سے زندہ پکڑے گئے۔ اس کے بعد لوٹ کا بازار گرم ہو گیا۔

چونکہ یہ قلعہ سادھو سنگھ کی ہوشیاری اور جرأت مندی سے فتح ہوا تھا اس لیے فوج کے لوگوں نے اپنے کاندھے پر بٹھا کر ایک شاندار جلوس نکالا۔ سادھو سنگھ کے گلے میں پھولوں کے ہار پڑے ہوئے تھے اور جلوس کے لوگ سادھو سنگھ کی جے کار لگا رہے تھے۔ عطر سنگھ ان سب سے الگ تھلگ ایک درخت کی جڑ سے ٹیک لگائے ماضی میں کھویا ہوا تھا۔ سادھو سنگھ کا اعزاز وہ خود حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس نے خوش قسمتی کے اس دور کو یاد کیا جب وہ پہلی بار داتا دربار کے باہر موراں سے ملا تھا پھر یکے بعد دیگرے وہ ساری ملاقاتیں یاد آتی رہیں جو موراں سے وابستہ تھیں پھر مہاراجا رنجیت سنگھ کی نوازشیں یاد آئیں اور جب ان خوشگوار یادوں سے نکل کر اس نے اپنے سامنے نظر ڈالی تو سادھو سنگھ کے اعزاز میں نکلتے ہوئے جلوس کو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔

فاتح لشکر واپس گیا، مہاراجا نے سادھو سنگھ کو بخشش و انعام سے مالا مال کر دیا۔ مہاراجا نے عطر سنگھ کو پوچھا تک نہیں۔ یہ ملول و افسردہ کلدیپ کور کے پاس پہنچ گیا اور بلک بلک کے بچوں کی طرح رونے لگا۔

کلدیپ نے پوچھا۔ ''تو روتا کیوں ہے عطر سنگھ۔ تجھے تکلیف کیا ہے؟''

عطر سنگھ نے سسکیوں میں جواب دیا ''کلدیپ! میں ملتان کے قلعے میں داخلے کی پہل کرنے میں ناکام رہا۔ میں مہاراجا کے دربار میں سرخروئی حاصل کرنے کے بہت بڑے اعزاز سے محروم رہا۔''

کلدیپ نے جل کر کہا۔ ''تو نے موراں کے دربار میں تو رسائی حاصل کر ہی لی تھی، اب اور کتنا بڑا اعزاز درکار ہے تجھے۔''

عطر سنگھ نے خشمناک نظروں سے کلدیپ کو دیکھا اور غصے سے بولا۔ ''کلدیپ میرا دل نہ جلا، میں یوں ہی زندگی سے بے زار ہو رہا ہوں۔''

کلدیپ نے غصے میں جواب دیا۔ ''دل تو تو نے جلایا ہے ہم سب کا، کوئی اور تیرا دل کس طرح جلائے گا۔ کہتا تھا موراں سے دل لگا کے، اسے مہاراجا کی نظروں میں ذلیل و خوار کر دوں گا لیکن ہوا کیا، یہ کہ خود ہی دنیا جہان کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو کر رہ گیا۔''





عطر سنگھ غصے میں اٹھ گیا جب وہ بازار سے گزر رہا تھا تو اس نے ایک بڑے جلوس کو سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ ایک ہاتھی پر سوار چاندی کے سکے لٹاتا چلا جا رہا تھا۔ یہ جلوس ملتان کی فتح کے سلسلے میں نکالا گیا تھا۔ قریب ہی ایک دوسرے ہاتھی پر سادھو سنگھ سوار تھا اور اس کے گلے میں قیمتی مالائیں پڑی ہوئی تھیں اور اس کا لباس بھی مہاراجا کا بخشا ہوا تھا۔ اس نے خود کو سادھو سنگھ اور مہاراجا کی نظروں سے چھپانا چاہا لیکن ناکام رہا۔ سادھو سنگھ اسے دیکھ کر بے نیازی سے مسکرا دیا اور مہاراجا نے بے پروائی سے منہ پھیر لیا۔ عطر سنگھ تیز تیز قدم اٹھاتا کسی گلی میں روپوش ہو گیا۔

☆☆☆

وہ بچتا بچاتا، پہرے داروں سے چھپتا چھپاتا کسی طرح موراں کے پاس پہنچ گیا۔ موراں اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہیں یہاں آتے کسی نے دیکھا تو نہیں؟''

عطر سنگھ نے جواب دیا۔ ''شاید نہیں۔''

موراں نے اپنی کنیز کو حکم دیا۔ ''دیکھو خیال رکھو، کوئی یہاں آنے نہ پائے۔'' کنیز گردن ہلا کے چلی گئی۔

موراں نے جذباتی لہجے میں عطر سنگھ کو مخاطب کیا۔ ''کیا ملتان کے قلعے میں داخل ہونے والے پہلے شخص تم تھے؟''

عطر سنگھ نے افسوس سے جواب دیا۔ ''موراں! میں بدقسمتی سے یہ اعزاز نہیں حاصل کر سکا۔''

موراں نے پھر سوال کیا۔ ''کیا ملتان کی تسخیر میں تم پیش پیش تھے اور تمہارے مشوروں پر عمل کر کے ملتان کو فتح کیا گیا؟''

عطر سنگھ نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا، ملتان کی تسخیر میں میرا نام نہیں لیا جا سکتا۔ میں ملتان میں اس قسم کا کوئی بھی کارنامہ انجام نہیں دے سکا۔''

موراں نے تیسرا سوال کیا۔ ''ملتان کا بوڑھا نواب کیا تمہاری گولیوں سے ہلاک ہوا تھا؟''

عطر سنگھ نے شرم سے گردن جھکا لی، بولا۔ ''افسوس کہ میں اس اعزاز سے بھی محروم رہا۔''

موراں نے اسے گلے سے لگا لیا، بولی۔ ''تب پھر میں تم سے بہت خوش ہوں۔ میں مسلمان ہوں عطر سنگھ اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں ملتان کی تباہی پر خوش نہیں ہو سکتی۔''

عطر سنگھ حیران تھا کہ جن باتوں نے اسے شرمندہ کر رکھا تھا اس وقت موراں کے روبرو وہی عیب خصوصیات بن گئے تھے۔ یہ سوچتے سوچتے عطر سنگھ قہقہہ مار کر بے ساختہ ہنس دیا۔ موراں نے گھبرا کر اس کے منہ میں ہاتھ رکھنا چاہا لیکن عطر سنگھ نے اس کے دونوں ہاتھ ہٹا دیے، بولا۔ ''موراں! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں اب تک جن باتوں کو اپنا عیب اور خامی سمجھ رہا تھا، وہی باتیں تیرے سامنے میری خوبیاں بن گئی ہیں گویا میں نے ایک ایسا اعزاز پا لیا جس کا ابھی تک خود مجھے بھی علم نہیں تھا۔''

اسی وقت کنیز بھاگی ہوئی آئی اور اس نے پریشان لہجے میں موراں کو مطلع کیا۔ ''موراں رانی! مہاراجا تشریف لا رہے ہیں۔''

موراں اور عطر سنگھ پریشان ہو گئے اور ادھر ادھر پناہ کی جگہیں تلاش کرنے لگے۔ موراں نے دریافت کیا۔ ''مہاراجا یہاں سے کتنی دور تک آ چکے ہیں؟''

کنیز نے جواب دیا۔ ''بس وہ آیا ہی چاہتے ہیں۔''

موراں نے اسے توشہ خانے میں چھپا دیا۔

☆☆☆

مہاراجا آیا اور موراں کو آغوش میں لے کر بولا۔ ''موراں! آج میں بہت خوش ہوں۔ ملتان فتح ہو گیا۔ تم یقین کرو موراں کہ ملتان تسخیر کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔''

موراں نے کہا۔ ''لیکن مہاراج! بڑی مچھلیوں کو چاہیے کہ وہ چھوٹی مچھلیوں کو بھی زندہ رہنے دیں۔''

مہاراجا نے محبت سے اس کے گال تھپتھپا دیے، بولا۔ ''نواب مظفر خان مسلمان تھا اور تم بھی مسلمان ہو۔ شاید اس لیے ملتان کی تسخیر سے تمہیں دکھ پہنچا ہے لیکن موراں تم یقین کرو کہ میری کشور کشائی میں مذہبی تعصب ذرا بھی شامل نہیں ہوتا۔''

موراں نے غمگین آواز میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے۔''

مہاراجا نے خواہش کی۔ ''موراں! اس وقت یہاں جشن ہونا چاہیے لیکن جشن سے پہلے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

موراں نے تشویش سے کہا۔ ''کیجیے۔''

مہاراجا نے ادھر ادھر متجسسانہ نظریں ڈالیں اور کچھ سونگھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہاں عطر سنگھ کی بو محسوس ہو رہی ہے۔''

موراں لرز گئی لیکن ہوش و حواس پر قابو رکھا، ہنستے

سے بھی سن لی ہوں گی۔''

عطر سنگھ نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے مہاراجا کا حکم سن لیا ہے لیکن میں یہاں سے نکلوں گا کس طرح؟ کیا باہر پہرا چوکی سخت نہیں ہوگا؟''

موراں نے کہا۔ ''میں شالامار سیر کرنے جاؤں گی، تم میرے کپڑوں کے صندوق میں بند ہو کر وہاں تک پہنچ جاؤ گے۔ وہاں تمہیں ایک گھوڑا اور کچھ زادِ راہ تیار ملے گی، تم اس پر بیٹھ کر فرار ہو جانا۔''

حسبِ منصوبہ موراں شالامار باغ گئی اور وہاں عطر سنگھ کو ایک صندوق سے نکال کر پہلے سے تیار کھڑے ہوئے گھوڑے تک پہنچا دیا گیا۔ یہ گھوڑا شالامار باغ کے مشرقی دروازے پر کھڑا تھا۔ عطر سنگھ گھوڑے پر بیٹھا اور اس نے نہایت حسرت و مایوسی سے موراں کو آخری بار دیکھا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ موراں اسے جاتے ہوئے دیر تک دیکھتی رہی۔ ابھی اس کی محویت کا سلسلہ ٹوٹا بھی نہیں تھا کہ شالامار کے مرکزی پھاٹک سے مہاراجا کا ایک قاصد داخل ہوا اور مہاراجا کا ایک بند خط موراں کے ہاتھ میں تھما دیا۔ موراں نے بے چینی سے خط کھولا اور پڑھنے لگی۔ اس میں لکھا تھا۔

''موراں! عین اس وقت جبکہ عطر سنگھ رخصت ہو چکا ہوگا تجھے میرا یہ خط ملے گا۔ موراں! میں نے تجھ سے محبت کی ہے، غیر معمولی محبت۔ یہ اسی محبت کا کرشمہ ہے کہ میں نے تیرا بڑے سے بڑا گناہ بھی معاف کر دیا لیکن تو یہ مت سمجھ کہ رنجیت سنگھ ان واقعات سے واقف نہیں جو تیرے گھر میں پیش آتے رہے ہیں۔ کیا اس رات عطر سنگھ تیرے توشہ خانے میں نہیں چھپا تھا؟ اور کیا اس وقت بھی وہ تیری مدد سے فرار ہو کر ستلج کے اس پار انگریزی علاقے میں پناہ لینے کے لیے نہیں جا رہا؟ میں رتی رتی واقعات سے واقف ہوں اور وہ حکمراں ہی کیا جو ملک تو ملک اپنے گھر کے اندر پیش آنے والے واقعات تک سے واقف نہ ہو۔''

موراں نے یہ خط پڑھا تو اس کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیلنے لگا لیکن اس پریشانی میں بھی اس نے مہاراجا کے خط کو سینے میں چھپا لیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ گرتی چلی گئی۔

ہوئے بولی۔ ''عطر سنگھ! ہاں عطر سنگھ آیا تو تھا، وہ بہت اداس تھا کہتا تھا ملتان کی تسخیر میں وہ کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہیں دے سکا جس سے وہ شرمندہ ہے۔''

مہاراجا ہنس دیا۔ ''تو تم میری قوتِ شامہ کی قائل ہو گئیں یا نہیں؟'' پھر پوچھا۔ ''اور کیا کہتا تھا؟''

موراں نے جواب دیا۔ ''مہاراجا مجھ سے کچھ ناراض رہتے ہیں۔''

مہاراجا ایک دم سنجیدہ ہو گیا، بولا۔ ''میں اس سے ناراض ہوں، واقعی ناراض ہوں۔''

موراں نے پوچھا۔ ''ناراضی کا سبب؟''

مہاراجا نے جواب دیا۔ ''موراں! میں ایک عظیم خالصہ ریاست کا بانی ہوں۔ میں انسانوں کو ایک نظر میں پڑھ لیا کرتا ہوں۔ ممکن ہے تم اس بات کا اقرار نہ کرو لیکن میں جانتا ہوں کہ عطر سنگھ یہاں آتا رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں آج تک اسے پکڑ نہیں سکا۔''

موراں کی نظر لڑکھڑا گئی، بولی۔ ''مہاراج! وہ یہاں بے شک آتا رہا ہے لیکن مہاراجا کے ایک نمک خوار اور خدمت گزار کی حیثیت سے اور اسے میں نے بھی اسی حیثیت سے اپنے روبرو ہونا قبول کیا ہے۔''

مہاراجا نے حکم دیا۔ ''رقص و موسیقی کا آغاز کیا جائے۔''

اسی وقت ناچنے گانے والیاں سازندوں کے ساتھ حاضر ہو گئیں، رات کے پچھلے پہر تک ہنگامہ جاری رہا اور مہاراجا شراب کے جام پر جام چڑھاتا رہا۔

مہاراجا نے موراں سے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ ''موراں! اب اگر عطر سنگھ آئے تو اسے مت آنے دینا۔''

موراں نے جواب دیا۔ ''مہاراج کے حکم کی تعمیل ہوگی۔''

موراں نے مارے خوف کے عطر سنگھ کو اپنے توشہ خانے میں تین دن تک چھپائے رکھا، پھر جب خوف ذرا کم ہوا تو اس نے چوتھے دن رات کو عطر سنگھ کو وہاں سے نکالا اور ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''عطر سنگھ! اب ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں سے فرار ہو کر ستلج کے اس پار انگریزی علاقے میں چلے جاؤ۔ تم نے مہاراجا کی باتیں اپنے کانوں

**ماخذات**

رنجیت سنگھ، سر لیپل گرفن۔ نقوش، لاہور نمبر۔ کمپنی کی حکومت، باری
تاریخ ہند عہد جدید، ڈاکٹر یوسف حسین خان۔ مرقع ملتان، سید اولاد علی گیلانی۔

# حاشیہ بردار

ش م جمیل

کوئی بھی رشتہ ہو یا پیشہ... جب تک فرض کی ادائیگی ایمانداری سے نہ کی جائے تو ان کے استوار ہونے میں کوئی نہ کوئی سقم رہ جاتا ہے... کچھ ایسا ہی مسئلہ ان دونوں کو بھی درپیش تھا... وہ جو یک جان دو قالب تھے... ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور تک محال تھا کہ اچانک انفرادی حقوق پر اجتماعی حقوق کا غلبہ ہوا اور خوابوں کا محل ٹوٹ کر بکھر گیا۔ وہ جو ایک قدم تنہا چل نہیں پاتے تھے اب قومی مفاد کی خاطر تپتی ہوئی ریت پر تنہا آبلہ پائی کے لیے مجبور تھے کیونکہ... جب رشتوں کی ڈور کو لالچ اور سمجھوتوں کی دھوپ چاٹ جائے تو پائیداری پر یقین کرنا ایک اور حماقت ہے۔

**یادوں کے درپن میں ''سقوط ڈھاکا'' ایک نئے منظر میں**

''وہ ہمیں بھی کچھ نہیں بتاتی۔'' تنویر صاحب نے بے بسی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ان کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ درمیانہ قد اور بدن فربہی کی طرف مائل تھا۔ سر کے آدھے بال اڑ گئے اور آدھے سفید ہو چکے تھے۔ بھوؤں اور مونچھوں کے بال بھی تقریباً سفید تھے۔ سرخ و سفید چہرہ جس پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، اس وقت خلافِ معمول متفکر اور پریشان تھا۔ گزشتہ چند ہفتوں کے دوران وہ اپنی عمر سے دس سال بڑے نظر آنے لگے تھے۔



اس وقت وہ اپنے چھوٹے داماد احسان ضیا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"وہ مجھ سے ملنے پر تیار نہیں ہوتی، آپ لوگوں کو بھی کچھ نہیں بتاتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔" احسان ضیا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ کمرے پر خاموشی طاری ہوگئی۔ اس کا لباس شکن آلود، بال بے ترتیب اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرہ لمبوترا نظر آنے لگا تھا۔ انگلیوں میں جلتی ہوئی سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ جب سے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا۔ تمباکونوشی کی زیادتی کے باعث انگلیوں کے پورے زرد پڑ گئے تھے اور یہی زردی ہونٹوں پر بھی جمی ہوئی تھی۔ اس کا حلیہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بیداری کے عالم میں دہشت ناک خواب دیکھنے کا عادی ہو۔

"میں صرف ایک موقع چاہتا ہوں ماموں جان۔" اس نے اپنے سسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے صرف دس منٹ کے لیے صائمہ کے ساتھ تنہا چھوڑ دیں، صرف دس منٹ۔" اس کے لہجے میں کرب تھا، التجا تھی، بے بسی تھی۔

تنویر صاحب نے افسردگی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

"وہ تیار نہیں ہوتی۔ میں نے بے حد اصرار کیا، درجنوں بار اسے تم سے گفتگو کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ صائمہ نے کبھی میری کوئی بات نہیں ٹالی لیکن اب پتا نہیں اسے کیا ہوگیا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری دلی تمنا ہے کہ تم دونوں گفت و شنید کے ذریعے اپنا جھگڑا طے کرلو۔ شرفا عدالتوں میں نہیں جاتے بیٹے۔"

"آپ یقین کریں ماموں جان ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اس لیے میں حیران ہوں کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ صائمہ نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ دس بارہ روز کے لیے اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ میں نے اسے اجازت دے دی۔ میں نے پہلے بھی اسے کبھی نہیں روکا، پھر چند روز بعد مجھے اس کے وکیل کا خط ملا جس کے ساتھ صائمہ کا حلف نامہ بھی منسلک تھا جو عدالت میں طلاق کی درخواست کے ساتھ داخل کیا گیا ہے۔ میں...... میں بیان نہیں کرسکتا ماموں جان، حلف نامہ پڑھ کر میری کیا حالت ہوئی۔" احسان ضیا اپنی نشست سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے جلتی ہوئی سگریٹ سلگائی اور اضطراب کی حالت میں ٹہلنے لگا۔

"آپ میری حالت دیکھ رہے ہیں ناں؟" اس نے ٹہلنا بند کردیا اور اپنے سسر کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ "جب میں آئینہ دیکھتا ہوں تو خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہیں پاتا۔ میں رات کو سونے کے لیے لیٹتا ہوں تو مجھے نیند نہیں آتی۔ صائمہ نے حلف نامے میں جو...... جو جھوٹے، بے بنیاد...... شرمناک اور بے ہودہ الزامات لگائے ہیں، ان کا خیال آتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اور میرا جسم جہنم کی طرح دہکنے لگتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ صائمہ...... وہ ایسے جھوٹے اور شرمناک الزامات بھی مجھ پر لگا سکتی ہے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ...... یہ حرکت کس کی ہے؟ مجھے یقین ہے...... مجھے پورا یقین ہے کہ یہ ذلیل حرکت اس کے وکیل کی ہے۔ میں وکیلوں کو جانتا ہوں۔ وہی ایسی شرمناک حرکت کرسکتے ہیں۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیوں...... طلاق لینا چاہتی ہے؟ ہماری شادی کو بارہ سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے۔ میں نے صائمہ کو دنیا کی ہر راحت مہیا کی، اسے کبھی ذرا سی تکلیف نہیں پہنچائی۔ میں اس سے کبھی تیز لہجے میں بات نہیں کرتا پھر یہ سب کیا ہے؟ کیا ہورہا ہے؟" اس نے چیخ کر کہا اور قریب پڑے ہوئے صوفے پر اس طرح ڈھیر ہوگیا جیسے مسلسل دوڑنے کے باعث اس کی ٹانگیں بے جان ہوگئی ہوں۔ انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ کانپ رہی تھی۔ چہرے پر خون سمٹ آیا تھا۔ جذباتی ریلے نے سانس اکھاڑ دیا تھا۔ چند لمحے وہ ٹوٹی ہوئی سانسوں کو جوڑتا رہا۔

تنویر صاحب خاموش نظریں جھکائے فرش کو گھور رہے تھے۔

"میں صائمہ سے ملنا چاہتا ہوں ماموں جان۔" احسان ضیا نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ تھکن اس کے لہجے سے بھی عیاں تھی۔ "اگر میں اس سے نہیں ملا تو پاگل ہوجاؤں گا یا میرے دماغ کی کوئی رگ پھٹ جائے گی۔ آپ کو معلوم ہے آج کل سونے کے لیے میں خواب آور گولیاں استعمال کرتا ہوں۔"

"بتاؤ، میں کیا کروں بیٹے۔ وہ تم سے ملنے پر رضامند نہیں ہوتی۔"

"آپ اسے مجبور کریں۔"

تنویر صاحب نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "تمہیں پتا ہے، وہ چار بھائیوں میں اکلوتی ہے۔ میں دولت مند نہ سہی لیکن میں نے ہمیشہ اس کی وہ ہر خواہش پوری کی ہے جس کی تکمیل پر میں قدرت رکھتا تھا۔ اگر وہ تم سے نہیں ملنا چاہتی تو کوئی اسے مجبور نہیں کرسکتا۔ یہ صورت حال خود میرے لیے بہت اذیت ناک ہے۔ یقین کرو میں نے صائمہ کو بہت



سمجھایا ہے۔ اسے ضد اور ہٹ دھرمی کے نتائج سے آگاہ کیا ہے۔ میں نے اسے اپنی محبت کا واسطہ دیا کہ وہ تم سے گفتگو کرکے اس معاملے کو سلجھا دے، جس کی بنیاد کوئی زبردست غلط فہمی ہے، جس کے نتائج بہت ہولناک ثابت ہوں گے لیکن وہ نہیں مانتی، نہ کچھ بتاتی ہے۔ میں بوڑھا ہوگیا ہوں، جلد ہی مرجاؤں گا لیکن اسے پوری زندگی گزارنی ہے اور اس کے ساتھ تین بچوں کا مستقبل بھی وابستہ ہے۔ میں اسے جس قدر سمجھا سکتا تھا سمجھا چکا۔ اس کی سہیلیاں بھی اسے سمجھا چکیں۔ اس نے نجمہ کو بھی کچھ نہیں بتایا جو اس کی رازدار ہے اور سب سے گہری سہیلی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں، سب پریشان ہیں۔ اسے خود بھی اس ہولناک حقیقت کا علم ہے کہ اگر عدالت نے طلاق کی درخواست منظور کرلی تو...... تو......"

ان کی زبان لڑکھڑا گئی۔ چہرے کا رنگ فق ہوگیا، لہجہ دھیما ہوگیا۔ "تو دنیا اس کے بچوں کو ناجائز کہے گی۔"

"وہ ناجائز نہیں ہیں۔" احسان ضیا چیختا ہوا نشست سے کھڑا ہوگیا۔ "وہ میرے بچے ہیں۔ میرے بچے ہیں، میں ان کا باپ ہوں۔ انہیں حرامی کہنے والوں کی زبانیں کھینچ لوں گا۔"

"مجھے معلوم ہے، میں جانتا ہوں بیٹے۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ صائمہ کو سب کچھ معلوم ہے۔ اسے ساری اونچ نیچ سمجھا دی گئی ہے۔ اس کے باوجود وہ نہیں مانتی، ملاقات پر رضامند نہیں ہوتی تو کوئی کیا کرسکتا ہے؟"

☆☆☆

عدالت کا کمرا مقدمے کی کارروائی دیکھنے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اخباری نمائندوں کی کثیر تعداد مقدمے کی غیر معمولی نوعیت اور دلچسپ ہونے کا ثبوت تھی۔ احسان ضیا کی صفائی ملک کا ایک مشہور اور قابل وکیل پیش کررہا تھا۔ اس کے مقابلے میں استغاثہ کا وکیل ایک غیر معروف اور گمنام آدمی تھا۔ انصاف فراہم کرنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے جج کو بھی مقدمے کی غیر معمولی اہمیت کا احساس تھا۔ وہ پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ مقدمے کی کارروائی سن رہے تھے۔ کمرے پر مکمل سکوت طاری تھا۔

"میں اپنے موکل مسٹر احسان ضیا کی بیوی صائمہ پر جرح کرنے سے پہلے معزز عدالت کے سامنے چند گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔" مدعا علیہ کے وکیل نے پرسکون لہجے میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ان گزارشات کا تعلق میرے موکل کی ذات سے ہے جس کی شخصیت اور کردار پر اس کی بیوی نے ناقابل تصور، جھوٹے، گھناؤنے اور شرمناک الزامات عائد کیے ہیں۔"

اس نے پلٹ کر اپنے موکل احسان ضیا کی طرف دیکھا۔ "میرے موکل کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔" وکیل کا لہجہ غیر محسوس طریقے پر بلند ہوگیا تھا۔

"وہ ایک ایسے اخبار کے مالک ہیں جو کثیر تعداد میں شائع ہوتا ہے اور قومی سطح پر پڑھا جاتا ہے۔ سرکاری حلقوں اور عوامی سطح پر اس اخبار کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ میرے موکل احسان ضیا ایک پرانے اور تجربہ کار صحافی ہیں۔ اخبار کے ذریعے انہوں نے ملک وقوم کی جو ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، ان کا بدترین دشمن بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ وہ اصولوں پر کبھی سمجھوتا نہیں کرتے اور ان کا کردار ہر قسم کے شک وشبہے سے بالاتر ہے۔ اگر صورت حال اس کے برعکس ہوتی تو حریف اخبارات ان کی ذرا سی لغزش، کردار کی ذرا سی کمزوری کو عوام کے سامنے پہاڑ بنا کر پیش کرنے سے نہیں چوکتے اور انہیں بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔" وکیل خاموش ہوگیا۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد اس نے دھیمے لہجے میں دوبارہ جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اب میں استغاثہ کی مدعی صائمہ سے درخواست کروں گا کہ وہ گواہوں کے کٹہرے میں تشریف لا کر میرے سوالات کے بالکل صحیح جواب دیں۔"

صائمہ اپنی نشست سے کھڑی ہوگئی اور باوقار انداز میں چلتی ہوئی گواہوں کے کٹہرے میں آگئی۔ عدالت کے کمرے میں موجود ہر شخص کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ درمیانے قد کی خوب صورت اور پرکشش عورت تھی۔ حلف نامے کی رو سے اس کی عمر تیس سال تھی لیکن وہ اپنی عمر سے پانچ سال کم نظر آتی تھی۔ چہرے سے بلند کرداری کی مخصوص روشنی پھوٹ رہی تھی۔ لباس میں سادگی تھی۔ چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ میں وہ وقار تھا جو دوسروں کو احترام کرنے پر مجبور کردیتا ہے۔ وہ پرسکون نظر آرہی تھی۔ احسان ضیا ٹکٹکی باندھے اپنی بیوی کو دیکھنے میں محو تھا اور پورے انہماک سے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا رہا تھا۔ اس کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا جیسے اسے گردوپیش کے ماحول کا کوئی احساس نہ ہو۔

"محترم خاتون، کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ میرے موکل سے آپ کی شادی کو کتنی مدت ہوئی ہے؟"

"تقریباً بارہ سال۔" صائمہ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"آپ اس حقیقت کا اعتراف کریں گی کہ یہ شادی آپ دونوں کی مشترکہ پسند سے ہوئی تھی؟"

''جی ہاں۔''

''کیا بارہ سال کے عرصے میں آپ دونوں کے درمیان کبھی شدید قسم کے اختلافات ہوئے ہیں؟''

''جی نہیں۔''

''کیا حال ہی میں آپ کے درمیان کسی موضوع پر جھگڑا ہوا ہے یا کوئی اختلاف پیدا ہوا ہے؟''

''جی نہیں۔''

''جیسا کہ آپ نے ابھی اعتراف کیا ہے کہ اس شادی کا محرک دوطرفہ جذبۂ محبت تھا، کیا شادی کے بعد آپ کے شوہر کی محبت میں کمی واقع ہوئی ہے؟''

''جی نہیں۔''

''دوسرے لفظوں میں وہ آج بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی شادی سے پہلے کرتے تھے؟''

''جی ہاں، اس سے بھی کچھ زیادہ۔''

''خوب، شادی سے پہلے آپ بھی مسٹر احسان ضیا سے محبت کرتی تھیں اور آپ کے شوہر اب بھی آپ سے محبت کرتے ہیں۔ کیا اب ان کی محبت یک طرفہ ہے؟''

''جی نہیں۔''

وکیل نے چونک کر صائمہ کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد اس نے نیا سوال دریافت کیا۔ ''کیا اس کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ آج بھی آپ اپنے شوہر سے محبت کرتی ہیں؟''

''جی ہاں۔''

عدالت کے کمرے میں اچانک سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ جج نے سر اٹھا کر سخت نظروں سے حاضرین کو دیکھا، سرگوشیاں بند ہوگئیں اور کمرے پر دوبارہ خاموشی چھا گئی۔

''غالباً آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ کو اپنے شوہر سے نفرت تو نہیں ہے لیکن آپ کے دل میں ان کے لیے جو محبت تھی اس میں بہت کمی واقع ہوگئی ہے؟''

''جی نہیں۔ اس کے برعکس میرے دل میں ان کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ محبت موجود ہے۔''

''بہت خوب۔'' وکیل کے لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''آپ اعتراف کر چکی ہیں کہ آپ کے شوہر آج بھی آپ سے محبت کرتے ہیں بلکہ ان کی محبت پہلے سے بھی زیادہ ہے اور آپ بھی ان سے پہلے سے بھی زیادہ محبت کرتی ہیں۔ کیا آپ اس خلاصے سے پوری طرح اتفاق کرتی ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''اب یہ بتائیے خاتون، کیا آپ کے شوہر نے کبھی آپ پر تشدد کیا ہے؟ مارا پیٹا ہے؟ تنہائی میں یا دوسروں کے سامنے کبھی ذلیل کیا ہے؟''

''جی نہیں۔''

''کسی دوسرے طریقے سے آپ کو جسمانی یا روحانی اذیتیں دی ہیں؟''

''جی نہیں۔''

''کیا یہ درست ہے کہ گھریلو کام کاج کے لیے آپ کے شوہر نے دو ملازم اور بچوں کی نگہداشت کے لیے ایک آیا رکھی ہوئی ہے؟''

''جی ہاں۔''

''سفر کے لیے ایک کار شوفر کے ساتھ گھر پر موجود رہتی ہے؟''

''جی ہاں۔''

''آپ کے آنے جانے پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے؟''

''جی نہیں۔''

''آپ کے شوہر آپ کو مناسب سیر و تفریح مہیا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ آپ کو اور بچوں کو دوسرے شہروں میں بھی لے جاتے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''اس ضمن میں آپ کو ان سے کوئی شکایت ہے؟''

''نہیں۔''

''کیا یہ درست ہے کہ گھریلو اخراجات کے لیے آپ کے شوہر ہر مہینے آپ کو ایک معقول رقم فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب کبھی آپ مطالبہ کرتی ہیں تو وہ مزید رقم دینے سے کبھی انکار نہیں کرتے؟''

''درست ہے۔''

''وہ آپ کو جیب خرچ کے لیے ایک معقول رقم علیحدہ دیتے ہیں اور اس سلسلے میں جب کبھی آپ مزید رقم کا مطالبہ کرتی ہیں تو وہ اس سے بھی انکار نہیں کرتے؟''

''درست ہے۔''

''وہ اکثر آپ کو تحائف بھی پیش کرتے ہیں؟''

''درست ہے۔''

''خوب، کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ کے شوہر نے آپ کو ضروریات زندگی کے علاوہ دوسری بہت سی آسائشیں بھی فراہم کی ہیں؟''

''درست ہے۔''

''ایسی آسائشیں جو شادی سے پہلے آپ کو میسر نہیں تھیں؟'' وکیل نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔



''یہ بھی درست ہے۔''

''کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتی ہیں کہ انہوں نے آپ کو مکمل طور پر خود مختار بنایا ہوا ہے اور خود کبھی گھر کے معاملات میں دخل نہیں دیتے؟''

صائمہ نے جواب دینے سے پہلے چند لمحے غور کرتی رہی۔ ''یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ کچھ موقعوں پر اور بعض معاملات میں وہ ضرور دخل دیتے ہیں اور دخل اندازی کو میں ضروری سمجھتی ہوں کیونکہ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن سے عورت تنہا نہیں نمٹ سکتی مثلاً ملازمین کا رکھنا یا انہیں ملازمت سے علیحدہ کرنا، دعوتوں کا انتظام کرنا یا تقریبات میں شرکت کرنے کا فیصلہ۔ اسی قسم کے دوسرے امور بھی ہوتے ہیں۔''

''گویا آپ اس سلسلے میں اپنے شوہر کے طرزِ عمل سے پوری طرح مطمئن ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''اب آپ یہ بتائیں خاتون، کیا آپ بچوں کی رہائش، پرورش، تعلیم و تربیت اور بچوں سے متعلق دیگر امور کے بارے میں اپنے شوہر کے اقدامات سے پوری طرح متفق ہیں؟''

''بڑی حد تک۔'' صائمہ نے جواب دیا۔ ''بچوں کی پرورش، تعلیم و تربیت کی بیشتر ذمے داری میں نے سنبھالی ہوئی ہے کیونکہ انہیں اس کے لیے مناسب وقت نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں ہمارے درمیان معمولی اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔''

''جو کشیدگی کا باعث نہیں بنتے؟''

''جی ہاں۔''

''کیا یہ بات صحیح ہے کہ آپ کے شوہر بچوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں؟''

''بے شک وہ بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔''

''آپ کے جوابات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ میرے موکل مسٹر احسان ضیا محبت کرنے والے ایک مثالی شوہر اور بہترین باپ ہیں؟''

''جی ہاں، درست ہے۔''

''یور آنر!'' احسان ضیا کے وکیل نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''استغاثہ کی مدعی مسز صائمہ یہ حقائق تسلیم کرتی ہیں کہ موکل مسٹر احسان ایک مثالی شوہر اور بہترین باپ ہیں۔ ان کے درمیان کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو دنیا کی ہر راحت مہیا کی ہے، آسائشیں مہیا کی ہیں، انہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔ وہ آج بھی اپنی بیوی سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی شادی سے پہلے کرتے تھے بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ اب یور آنر! میں اس حلف نامے کی طرف آتا ہوں جو صائمہ احسان ضیا نے طلاق کی درخواست کرتے ہوئے عدالت میں داخل کیا تھا لیکن......'' وکیل نے رک کر حاضرین پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ ''اس سے پہلے میں معزز عدالت پر یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے موکل مسٹر احسان ضیا بحالت مجبوری عدالت میں تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے آخر وقت تک ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح ان کی ملاقات ان کی بیوی سے ہو جائے اور یہ معاملہ باہمی افہام و تفہیم سے رفع دفع کر دیا جائے لیکن ان کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ یور آنر! میرے موکل کا شمار اس ملک کے معزز ترین شہریوں میں ہوتا ہے۔ شدید نوعیت کی کاروباری مسابقت کے پیش نظر انہیں بجا طور پر یہ خوف لاحق تھا کہ ان کے کاروباری حریف اس مقدمے بازی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی نیک نامی اور شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ جس کے بہترین ذرائع ان کے پاس موجود ہیں یعنی اخبارات۔ سیاق و سباق کے بغیر جب کوئی خبر شائع کی جاتی ہے تو اس کا مطلب کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔ بعض اخبارات دانستہ خبریں توڑ مروڑ کر شائع کرتے ہیں جس کی اگر تردید شائع کرنے کی نوبت آجاتی ہے تو وہ تردید غیر نمایاں جگہ پر ڈیڑھ سطر میں شائع کی جاتی ہے۔ اگر مسئلہ بچوں کی تحویل کا نہ ہوتا تو وہ اپنی بیوی کی غلط، ناجائز اور غیر قانونی خواہش کو پورا کرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ انہیں طلاق دے دیتے۔ وہ آج بھی اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اپنی بیوی کی کوئی خواہش مسترد نہیں کی۔ وہ ان کی یہ خواہش بھی پوری کرنے پر آمادہ تھے لیکن ان کی بیوی نے انہیں ملاقات کا موقع نہیں دیا اور اس طرح بچوں کے مسئلے پر کوئی گفتگو نہ ہوسکی۔''

مدعا علیہ کا وکیل خاموش ہوگیا۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''اب میں معزز عدالت کے سامنے ان بے بنیاد، گھناؤنے اور شرمناک الزامات کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتا ہوں جو مسز صائمہ نے اپنے حلف نامے میں اپنے شوہر پر عائد کیے ہیں۔ استغاثہ کے وکیل پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ان کی موکلہ حلف نامے میں عائد کردہ الزامات کی تائید اور تصدیق کے لیے کوئی گواہ

پیش کرنے کا ارادہ نہیں رکھتیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر وہ کس طرح ان سنگین الزامات کو صحیح ثابت کرنا چاہتی ہیں۔ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہے کہ میں اپنے موکل کی صفائی پیش کرتے ہوئے ہر ممکن طریقے سے ان الزامات کو غلط ثابت کروں اور اس سلسلے میں عدالت کے سامنے ٹھوس شہادتیں پیش کروں۔ سب سے پہلے میں مدعی صائمہ سے حلف نامے کے بارے میں جرح کرنا چاہتا ہوں جو اس وقت گواہوں کے کٹہرے میں موجود ہیں۔"

"خاتون!" اس نے صائمہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے عدالت میں طلاق کی درخواست داخل کرتے ہوئے اپنے حلف نامے میں تحریر کیا ہے......" وکیل نے جیب سے ایک خط نکالا اور آنکھوں پر بصری چشمہ لگایا اور پھر تحریر پڑھتے ہوئے کہا۔ "میرا شوہر نامرد ہے، عصمت فروشی اس کا ذریعۂ معاش ہے، اس کے ساتھ رہتے ہوئے میں اپنی عزت و آبرو محفوظ نہیں سمجھتی۔ مجھے اپنے شوہر سے طلاق دلائی جائے اور تینوں بچوں کو میری تحویل میں دیا جائے تاکہ باپ کی بدکرداری بچوں پر اثرانداز نہ ہوسکے اور وہ اچھے ماحول میں پرورش پاسکیں۔" وکیل نے چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا اور کاغذ دوبارہ تہ کرکے جیب میں رکھ لیا۔ "خاتون، کیا آپ یہ الزامات واپس لینا چاہتی ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" صائمہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"آپ ان الزامات کی درستگی پر اب بھی اصرار کرتی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"بہت خوب۔ پہلے میں عصمت فروشی ذریعۂ معاش کا الزام لیتا ہوں یور آنر۔" وکیل نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں موجود ہر شخص اور ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے لاکھوں قارئین اس امر کے گواہ ہیں کہ میرے موکل کا ذریعۂ معاش کیا ہے۔ اس حقیقت کو ثابت کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ میرے موکل مسٹر احسان ضیا ایک کثیر الاشاعت اخبار کے مالک ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ملک کی مختلف صنعتوں میں بھی سرمایہ کاری کی ہوئی ہے۔ اس ناقابل تردید حقیقت سے قطع نظر کہ میرے موکل کا کردار ہر طرح کے شک و شبے سے بالاتر ہے اور عصمت فروشی جیسے گھناؤنے کاروبار سے وہ شدید نفرت کرتے ہیں جس کے ثبوت میں، میں نے معزز عدالت کے سامنے وہ متعدد اداریے پیش کیے ہیں جو اس لعنت کے خلاف انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے اخبار میں شائع کیے ہیں۔ اگر چند لمحوں کے لیے یہ فرض کرلیا جائے کہ میرے موکل پوشیدہ طور پر عصمت فروشی جیسے گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہیں تو یور آنر! میں یہ کہنے میں جھجک محسوس نہیں کرتا کہ میرے موکل کے لیے یہ امر ناممکن ہے۔ عصمت فروشی کے لیے جیسا کہ اس کاروبار کے نام سے ظاہر ہے، خریداروں کا وجود لازمی ہے۔ میرے موکل کی ملک گیر شہرت اور عزت کے پیش نظر یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر وہ اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہوتے تو یہ خبر عصمت کے خریداروں کے ذریعے اور اس کاروبار میں شریک عصمت فروش عورتوں کے ذریعے بہت پہلے حریف اخبارات اور ان کے نمائندوں تک پہنچ جاتی۔ اس لیے میں یہ کہتے ہوئے حق بجانب ہوں کہ میرے موکل کے لیے پوشیدہ طور پر عصمت فروشی جیسے کاروبار میں ملوث ہونا ناممکن امر ہے۔ اب یہ استغاثہ پر منحصر ہے کہ وہ اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے کوئی گواہ یا ایک سے زائد گواہ پیش کرے، خاتون!" وکیل نے صائمہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کیا اس سلسلے میں آپ کا وکیل عدالت کے سامنے گواہ پیش کرنا چاہتا ہے؟"

"نہیں۔" صائمہ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"بہت خوب۔ آپ کے حلف نامے سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے شوہر نے بقول آپ کے اب تک خود آپ کو عصمت فروشی پر مجبور نہیں کیا تھا۔ کیا آپ اس نتیجے کی تردید کرنا چاہتی ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"کیا انہوں نے کبھی اشاروں، کنایوں یا واضح لفظوں میں اپنے اس ارادے کا اظہار کیا ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"کیا آپ کے شوہر نے کبھی آپ کے سامنے یا آپ کے احاطۂ علم میں موجود کسی شخص کے سامنے خود کو اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہونے کا اقرار کیا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"خوب، میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس الزام کی وابستگی کے بارے میں معزز عدالت ہی کوئی آخری فیصلہ کرسکتی ہے۔"

عدالت کے کمرے میں سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔ جج نے میز پر ہتھوڑی بجا کر حاضرین کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ "آپ اپنی جرح جاری رکھیں مسٹر صدیقی۔"

"بہتر جناب، اب اس حلف نامے میں عائد کردہ





دوسرے الزام کی طرف آتا ہوں۔ گواہوں کے کٹہرے میں موجود صائمہ احسان ضیا نے اپنے شوہر پر الزام لگایا ہے کہ وہ نامرد ہے۔ میں نے جواب مقدمہ کی دستاویزات کے ساتھ ملک کے ایک مشہور ڈاکٹر کا حلف نامہ پیش کیا جو واضح لفظوں میں اس الزام کی تردید کرتا ہے۔ اس کے علاوہ میرا موکل عدالت کے منتخب کردہ ماہرین کے بورڈ یا کسی ڈاکٹر سے اپنا طبی معائنہ کروانے پر تیار ہے لیکن میں اس سلسلے میں استغاثہ کے مدعی سے براہ راست چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں، خاتون!" وکیل نے صائمہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میرے موکل سے آپ کی شادی کو بارہ سال سے زیادہ کا عرصہ ہوچکا ہے۔ اس دوران آپ تین مرتبہ ماں بنی ہیں۔ کیا آپ کے عائد کردہ الزام کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہوگا کہ آپ کے تینوں بچے حرامی ہیں؟ میرے موکل مسٹر احسان ضیا ان کے باپ نہیں ہیں؟"

"نہیں، یہ نتیجہ بالکل غلط ہے۔"

"کیا ان میں سے دو یا ایک بچے کے لیے یہ نتیجہ درست تصور کیا جائے؟"

"نہیں۔"

"آپ تسلیم کرتی ہیں کہ آپ کے شوہر احسان ضیا آپ کے بچوں کے حقیقی باپ ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"تو کیا آپ کے عائد کردہ الزام سے یہ مطلب اخذ کیا جائے کہ آپ کے شوہر وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کی حد تک آپ کو مطمئن کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں؟"

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے وہ چند لمحے غور کرتی رہی۔ "مسٹر صدیقی، آپ کے اس سوال کا جواب بھی انکار میں ہے لیکن اس سے پہلے کہ آپ میاں بیوی کے مقدس رشتے کی دھجیاں اڑائیں، میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور، میں اپنے علم کی حد تک پوری سچائی سے آپ کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔"

صائمہ کے اس غیر متوقع طرز عمل نے مقدمے کی کارروائی کو ایک نئے موڑ پر لاکھڑا کیا جس سے حاضرین میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ متجسس نظروں سے صائمہ کے حسین و باوقار سراپا کو دیکھنے لگے۔ احسان ضیا کے بدن میں پہلی بار زندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ اب تک وہ مقدمے کی کارروائی سے غیر متعلق نظر آرہا تھا۔ وہ اپنی نشست پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ ایک تجربے کار صحافی تھا، اس نے فضا میں منڈلاتے ہوئے خاموش طوفان کو فوراً محسوس کرلیا۔

"کیا وظیفۂ زوجیت کامیابی کے ساتھ ادا کرنے ہی کا نام مردانگی ہے؟" صائمہ نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"جی...... جی نہیں۔"

"کیا آپ عدالت کے سامنے لفظ مردانگی کی تعریف بیان کرنے کی زحمت فرمائیں گے؟" چند لمحے عدالت کے کمرے پر سکوت طاری رہا۔

"مسٹر صدیقی!" جج نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ "آپ اس سوال کا جواب دینے کے پابند نہیں ہیں۔ آپ چاہیں تو جواب دینے سے انکار کرسکتے ہیں۔"

"یور آنر، میں اس سوال کا جواب دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا۔ فوری طور پر لفظ مردانگی کی مکمل و جامع تعریف بیان کرنے سے قاصر ہوں لیکن عام فہم روزمرہ میں اس لفظ سے جو معنی اخذ کیے جاتے ہیں ان میں ہمت، جرأت، حوصلہ، مصائب و مشکلات کا بےخوفی سے مقابلہ کرنا شامل ہیں۔ یہ لفظ بزدلی کی ضد ہے۔ میں صائمہ احسان ضیا سے درخواست کروں گا کہ وہ اس سوال کے پیچھے کارفرما مقصد کی نشاندہی ضرور کریں اور اس پر کچھ روشنی ڈالیں۔"

"یور آنر۔" جواب میں صائمہ نے عدالت کے جج کو مخاطب کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں عدالتی طریقۂ کار سے ناواقف ہوں لیکن اس موقع پر میں عدالت کے سامنے ایک بیان دینے کی اجازت چاہتی ہوں۔ یہ بیان میرے حلف نامے کی وضاحت کردے گا۔ میں درخواست کرتی ہوں کہ اسی بیان کو استغاثے کی بنیاد تصور کرتے ہوئے عدالت اس مقدمے کا فیصلہ سنادے۔"

"آپ کو اجازت دی جاتی ہے خاتون۔" جج نے درخواست قبول کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ کی اطلاع کے لیے میں یہ امر واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مدعا علیہ کے وکیل کو اس بیان پر جرح کرنے کا پورا حق حاصل ہوگا۔"

"مجھے اس کا احساس ہے جناب عالی اور میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

"تب آپ اپنا بیان شروع کرسکتی ہیں۔ آپ تشریف رکھیں مسٹر صدیقی۔"

عدالت کے کمرے میں موجود حاضرین بےچینی سے صائمہ کا بیان شروع ہونے کا انتظار کرنے لگے جو سر جھکائے اپنے خیالات مرتب کررہی تھی۔ مسٹر صدیقی نے اپنے موکل کے قریب بیٹھتے ہوئے سرگوشی میں کوئی سوال پوچھا۔ مسٹر احسان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا پھر

وہ دونوں بھی صائمہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''جناب والا!'' صائمہ نے دھیمے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ''یہ مارچ 1972ء کا پہلا ہفتہ ہے۔ کوئی ڈھائی ماہ قبل دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان کا المیہ پیش آیا تھا جس کی تاریخ عالم میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس سانحہ پر مجھے جو صدمہ ہوا وہ میں لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میرے شوہر ایک قومی اخبار کے مالک ہیں۔ ان کے پاس ایک بہت بڑی تنظیم موجود ہے اور ایسے ذرائع موجود ہیں جو انہیں ملک میں رونما ہونے والے واقعات سے باخبر رکھتے ہیں۔ واقعات ہی نہیں انہیں تو افواہوں کا بھی علم ہوتا ہے اور ان واقعات کی بھی خبر ہوتی ہے جو رونما ہونے والے ہوتے ہیں یا جنہیں واقع ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔ یہ سیاست کا وہ کھیل ہوتا ہے جو پس منظر میں رہ کر کھیلا جاتا ہے اور جن کی خبریں عام طور پر اخبارات میں شائع نہیں ہوتیں۔ جب کبھی اس قسم کی اطلاعات شائع کی جاتی ہیں تو معتبر ذرائع یا باخبر سیاسی حلقوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ جناب والا...... ان حقائق کا علم مجھے تقریباً دو ماہ قبل اپنے شوہر کی زبانی ہوا، جب میں نے اپنے شوہر سے پہلی بار اس موضوع پر گفتگو کی تھی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اپنے شوہر سے اس کاروبار کے متعلق گفتگو نہیں کی تھی۔ میرے شوہر یہاں موجود ہیں، اگر وہ میرے بیان کردہ حقائق کی تردید کرنا چاہیں تو اس کے لیے یہ مناسب وقت ہے۔'' وہ خاموش ہو گئی اور اپنے شوہر احسان ضیا کی طرف دیکھنے لگی جس نے چند لمحے اس سے نظریں ملانے کے بعد آنکھیں جھکا لیں۔ اس کے وکیل نے سرگوشی میں کچھ کہا۔ جواب میں احسان ضیا کے لب ایک بار ہلے اور پھر ساکت ہو گئے۔

''آپ اپنا بیان جاری رکھیں خاتون۔'' جج نے ہدایت کی۔

اس نے آہستہ سے ایک گہرا سانس کھینچا اور دوبارہ جج کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ''جناب والا! میں اس عقیدے کی حامی ہوں کہ عورت اور مرد کی ذمے داریاں اور فرائض مختلف اور علیحدہ ہوتے ہیں۔ اس لیے بیوی کو شوہر کے کاروبار میں دخل نہیں دینا چاہیے اور مرد کو گھریلو معاملات میں ٹانگ نہیں اڑانا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ بارہ سال کے دوران میں نے اپنے شوہر سے کبھی اس کے کاروبار کے بارے میں باز پرس نہیں کی لیکن جب ملک کے دو ٹکڑے ہوئے تو یہ حادثہ ملک کی نصف آبادی کے لیے اتنا ہی غیر متوقع اور اچانک تھا اور ایسا ناممکن تھا جیسے بادلوں کے بغیر اچانک آسمان سے بجلی گر پڑے۔ عورتیں روزانہ گھروں میں یہ مشاہدہ کرتی ہیں کہ جب تک آگ نہ جلائی جائے اور ہانڈی میں سبزی ترکاری، مسالا جات اور پانی ڈال کر آگ پر نہ چڑھایا جائے، سالن نہیں پکتا۔ اسے پکانے کے لیے ہاتھ پاؤں بھی ہلانا پڑتے ہیں اور چند دوسرے عمل بھی ضروری ہوتے ہیں۔ جناب والا! اس تجربے اور مشاہدے کی موجودگی میں، میں کس طرح تسلیم کر لیتی کہ بس اچانک ہی بلاوجہ ملک کے دو بڑے ٹکڑے ہو گئے۔ میں اس ملک کی شہری ہوں۔ میں باقاعدگی کے ساتھ اخبارات پڑھتی تھی، ٹی وی دیکھتی تھی لیکن ملک کے دو ٹکڑے ہونے سے قبل مجھے نہ آگ جلتی ہوئی نظر آئی، نہ ہانڈی کے اندر سبزی مسالا اور دیگر لوازمات نظر آئے۔ نہ وہ ہاتھ نظر آئے جنہوں نے آگ جلائی تھی اور ہانڈی پکا رہے تھے۔ اس کے باوجود سازش کی کھچڑی پک کر تیار ہو گئی اور ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ یہ سب کچھ اس قدر غیر متوقع اور اچانک ہوا تھا کہ مجھ پر کئی روز سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ جب میرے ذہن نے کام کرنا شروع کیا تو میں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ یہ اچانک کیا ہوا، کیسے ہوا؟''

صائمہ خاموش ہو کر اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی جو نظریں جھکائے۔ فرش کو گھور رہا تھا۔

''جناب والا!'' چند لمحوں کے بعد صائمہ نے بیان کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''میرے شوہر نے جواب دیا کہ یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا۔ نہ یہ کوئی غیر متوقع بات تھی۔ قوموں کا بنتا یا بگڑنا، قوموں کی تباہی و بربادی چند گھنٹوں، چند دنوں یا چند ہفتوں، مہینوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ یہ ایک طویل المیعاد عمل ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ جاری رہتا ہے۔ کچھ چنگاریاں ہوتی ہیں جو آہستہ آہستہ چٹختی رہتی ہیں، کچھ مسالا ہوتا ہے جو ہانڈی میں گرم ہوتا رہتا ہے۔ یہ غلط فہمیاں ہوتی ہیں جنہیں شروع ہی میں بڑی آسانی سے دور کیا جا سکتا ہے اور چنگاریوں کو سرد کیا جا سکتا ہے، لیکن جب جائز شکایات دور نہیں کی جاتیں تو چنگاریاں چیخ چیخ کر پھیلتی رہتی ہیں، بڑھتی رہتی ہیں اور ہانڈی کے پکنے کا عمل کسی قدر تیز ہو جاتا ہے پھر جب موقع پرست، اقتدار کے بھوکے سیاست دان میدان میں آتے ہیں تو وہ پھونکیں مار کر چنگاریوں کو اچانک بھڑکا دیتے ہیں اور اس طرح چنگاریاں آگ کے شعلے بن جاتی ہیں۔ ہانڈی میں مزید مسالا ڈالا جاتا ہے اور اگر کوئی کمی رہ جاتی ہے تو اسے پورا کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح جو عمل سالہا سال سے جاری ہوتا ہے چند مہینوں یا چند ہفتوں میں مکمل ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ میری عمر تقریباً تیس سال ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے نہ میں نے چنگاریاں چٹختے ہوئے دیکھیں، نہ حال ہی میں ان چنگاریوں کو بھڑک کر آگ بنتے دیکھا۔ بس اچانک معلوم ہوا کہ کھچڑی پک کر تیار ہو گئی ہے۔ آخر یہ کیسے ہوا؟ میرے شوہر نے جواب دیا کہ اگر آنکھیں ہونے کے باوجود میں کچھ نہیں دیکھ سکی اور کان ہونے کے باوجود میں کچھ نہیں سن سکی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میری بصارت یا سماعت میں کوئی نقص ہے حقیقت یہ ہے کہ قومی ریڈیو کے زبردست پروپیگنڈے، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے مجھے اور آدھے پاکستان کے عوام کو اندھا اور بہرا بنا دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملک کے دو ٹکڑے ہوئے تو یہ حادثہ منقسم پاکستان کے عوام کے لیے انتہائی غیر متوقع، اچانک اور ناممکن واقعہ ثابت ہوا۔ جناب والا! میں نے اپنے شوہر سے دریافت کیا کہ جب یہ چنگاریاں پیدا ہوئی تھیں، اس وقت ہی ان چنگاریوں کو سرد کیوں نہیں کیا گیا جو کہ بہت آسان کام ہوتا؟ انہوں نے بتایا کہ اس کی وجہ فرد واحد کے اقتدار کو قائم رکھنا تھا۔ جب ملک کے اقتدار اعلیٰ پر ایک آمر نے قبضہ کیا تو ملک کے مشرقی حصے کے عوام میں یہ تاثر پھیل گیا کہ مغربی حصے کے عوام ان پر حکومت کر رہے ہیں، انہیں لوٹ رہے ہیں اور خود ان کی حیثیت مغربی حصے کے غلاموں جیسی ہے۔ یہ تاثر حقیقت کے خلاف تھا۔ جب کسی ملک کے اقتدار پر کوئی آمر قابض ہو جاتا ہے تو وہ مختلف طریقوں سے ملک کے عوام کو غلام بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کا اقتدار تاحیات قائم رہے اور عوام میں اتنی سکت باقی نہ رہے کہ کسی موقع پر وہ اس سے اقتدار چھین کر اپنے حقیقی نمائندوں کے حوالے کر سکیں۔ ظاہر ہے عوام کو غلام بنانا جمہوری طرز حکومت میں ممکن نہیں ہوتا۔ ایک آمر تنہا ملک کے کروڑوں عوام کو غلام نہیں بنا سکتا۔ نہ وہ تنہا حکومت کی مشینری چلا سکتا ہے۔ اس کام کے لیے اسے ایسے کارندوں کی ضرورت ہوتی ہے جو دیکھنے میں انسان نظر آتے ہوں لیکن خصلت اور کردار جانوروں جیسا ہو، تاکہ عوام یہ محسوس کریں کہ ان پر حکومت کرنے والے خود ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے غلام بنائے جانے کا احساس نہیں کر پاتے یا احساس ہوتا ہے تو مکمل ادراک نہیں کر پاتے، بھیڑیوں کی خصلت رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ایک آمر کو اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آقا کی خوشنودی کے لیے اپنی ہی قوم سے تعلق رکھنے والے دوسرے افراد کو آقا کے اشارے پر چیرنے پھاڑنے سے نہیں ہچکچاتا۔ اس کی وفاداری صرف اور صرف اپنے آقا کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اس میں ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آقا کے تلوے چاٹنے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتا ہے۔

اس وفاداری اور خدمات کے عوض اسے پیٹ بھرنے کے لیے غذا ملتی ہے اور دوسری آسائشیں ملتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کے پہلے آمر نے جب ایسے لوگوں کا انتخاب کیا تو اس گروہ میں شامل تمام افراد کا تعلق ملک کے مغربی حصے سے تھا اور جب انہوں نے نچلے درجے کے کارندے منتخب کیے تو ان میں بھی بیشتر تعداد کا تعلق مغربی حصے سے تھا جس طرح غیر منقسم ہندوستان میں جب لوگوں کی نظریں انگریز حاکم پر پڑتی تھیں تو انہیں فوراً اپنی غلامی کا احساس ہو جاتا تھا کیونکہ انگریز کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے نہیں تھا۔ اسی طرح جب مشرقی حصے کے عوام مغربی حصے سے تعلق رکھنے والے فرد کو اپنے اوپر حکمرانی کرتے دیکھتے تو انہیں بھی اپنے غلام ہونے کا احساس ہونے لگا۔ یہ تھی وہ چنگاری جو بہت عرصہ قبل ملک کے مشرقی حصے میں پیدا ہوئی تھی۔ اگر اس وقت یہ غلط فہمی دور کر دی جاتی کہ ان پر حکومت کرنے والے مغربی بازو کے عوام نہیں ہیں بلکہ مغربی بازو سے تعلق رکھنے والے بھیڑیئے ہیں اور خود مغربی حصے پر بھی انہیں درندوں کی حکومت ہے اور دونوں حصوں کے عوام غلام بنائے جا رہے ہیں، انہیں لوٹا جا رہا ہے تو یہ چنگاری اسی وقت سرد ہو جاتی یا اگر اس آمر سے یہ عقل مندی ہو جاتی کہ وہ مشرقی حصے پر ایسے افراد مسلط کرتا جن کا تعلق اسی علاقے سے ہوتا تو اس صورت میں یہ چنگاری پیدا ہی نہیں ہوتی۔ یہ چنگاری اس لیے سرد نہیں کی گئی کہ اس سے آمر کا اقتدار ختم ہو جاتا۔ اگر مشرقی بازو کے عوام کو صحیح صورت حال سے آگاہ کر دیا جاتا تو مغربی بازو سے تعلق رکھنے والے عوام کو فوراً اپنے غلام بنائے جانے کا علم ہو جاتا۔ وہ بیدار ہو جاتے اور غلامی کا طوق اتار دیتے اور آمر کا اقتدار ختم ہو جاتا۔ جناب والا! اس روز میری شوہر سے طویل گفتگو ہوئی جسے یہاں دہرانے کا موقع نہیں ہے، نہ اس گفتگو کا تعلق اس مقدمے سے ہے۔ اب گفتگو کے اس حصے کی طرف آتی ہوں جس کا براہ راست اس مقدمے سے گہرا تعلق ہے اور جو اس مقدمے کی بنیاد بنی ہے۔''

مدعا علیہ کا وکیل فوراً اپنی نشست پر سے کھڑا ہو گیا۔ ''یور آنر! میرے موکل کی بیوی نے ابھی ملکی سیاست

پر جو بیان دیا ہے اس کا اس مقدمے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وکیل نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "میری درخواست ہے کہ درمیان کے اس حصے کو مقدمے کی کارروائی سے خارج کردیا جائے۔"

"جناب والا! میرے شوہر کے وکیل نے جو اعتراض کیا ہے وہ غلط ہے۔ میں نے اپنے بیان میں اب تک ملکی سیاست پر جو کچھ کہا ہے کہ اس کا مقدمے سے گہرا تعلق ہے کیونکہ یہ وہ پس منظر ہے جس کے بغیر اس مقدمے کی بنیاد، طلاق کے جواز اور میرے عائد کردہ الزامات کو نہیں سمجھا جاسکتا۔"

"آپ تشریف رکھیں مسز صدیقی۔ اگر یہ حصہ غیر متعلق نظر آیا تو اسے مقدمے کی کارروائی سے خارج کردیا جائے گا۔ اپنا بیان جاری رکھیں خاتون۔" جج نے رولنگ دیتے ہوئے کہا۔

"جناب والا! میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ ایک قومی اخبار کے مالک ہیں، وہ مشرقی حصے کے عوام کی غلط فہمیاں دور کرسکتے تھے۔ مغربی بازو سے تعلق رکھنے والے عوام کو بیدار کرسکتے تھے۔ کیا اپنے اخبار کے ذریعے ملک کے عوام کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا ان کا فرض نہیں تھا؟ پہلے تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ تنہا کیا کرسکتے تھے پھر انہوں نے صحیح صورت حال بتاتے ہوئے اپنی مجبوریاں گنوائیں جن میں پریس پر عائد شدہ پابندیوں کا ذکر سرفہرست تھا۔ انہوں نے وہ طریقے گنوائے جن کی مدد سے ایک آمر اخبار کے مالکان کو اپنی مرضی پر چلنے پر مجبور کردیتا ہے۔ اشتہارات بند کردیے جاتے ہیں جو ہر اخبار کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اخباری کاغذ کا کوٹا کم کردیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے مہنگا کاغذ خریدنا پڑتا ہے اور اخبار شائع کرنے پر اخراجات دگنے لگتے ہیں۔ اشتہارات کی آمدنی بند ہونے اور اخراجات بڑھنے کے بعد اخبار کو شائع کرنے پر زبردست خسارہ ہونے لگتا ہے۔ یہ خسارہ برداشت کرتے ہوئے اخبار کو صرف اس وقت تک شائع کیا جاسکتا ہے جب تک جمع شدہ پونجی ساتھ دیتی ہے اور اس کے بعد اخبار کا مالک دیوالیا ہوجاتا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جاتے ہیں۔ جھوٹے مقدمے بنائے جاتے ہیں، اخبار کے اہم کارکنوں کو ڈرا دھمکا کر اخبار سے علیحدہ کردیا جاتا ہے۔ جس پریس میں اخبار شائع ہوتا ہے اس کے مالکان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس اخبار کو چھاپنے کا معاہدہ منسوخ کردیں۔ اخبار کے مالک کو دھمکیاں دی جاتی ہیں اور اس کے بعد انتہائی قدم یہ ہوتا ہے کہ اخبار کی اشاعت بند کردی جاتی ہے۔ اس کے مالکان کو جیل میں قید کردیا جاتا ہے۔ میں ان کی مجبوریاں سنتی رہی پھر میں نے سوال کیا کہ جب انہوں نے چنگاریوں کو بھڑکتے ہوئے دیکھا اور انہیں یہ احساس ہوگیا کہ برسہا برس کی چٹختی ہوئی چنگاریاں دہکتی ہوئی آگ میں تبدیل کردی گئی ہیں اور اب چند ہفتوں یا چند مہینوں کے اندر اندر سازش کی کھچڑی پک کر تیار ہوجائے گی، ملک کے دو ٹکڑے کردیے جائیں گے۔ تب انہوں نے قوم کے سامنے صحیح صورت حال کیوں پیش نہیں کی؟ کیا انہیں یہ علم نہیں تھا کہ اگر آگ بھڑکانے اور کھچڑی پکانے والے ہاتھ فوراً ہی نہیں توڑے گئے تو ملک کے دو ٹکڑے کردیے جائیں گے؟ میرے شوہر نے جواب دیا کہ بلاشبہ انہیں آگ بھڑکانے کے نتائج کا علم تھا لیکن وہ مجبور تھے پھر انہوں نے اپنی مجبوریاں بیان کیں جن کی نوعیت وہی تھی جو انہوں نے پہلے بتائی تھیں فرق صرف یہ تھا کہ دوسرا آمر پہلے آمر سے زیادہ سخت تھا جس کی خلاف ورزی کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ جناب والا! میں اپنے شوہر کو دعوت دیتی ہوں کہ اگر وہ میرے بیان کردہ حقائق کی تردید کرنا چاہتے ہوں تو فوراً کھڑے ہوکر بھری عدالت میں سب کے سامنے مجھے جھوٹا کہہ دیں۔"

صائمہ خاموش ہوگئی اور پلٹ کر اپنے شوہر احسان ضیا کو دیکھنے لگی، جس کی پیشانی عرق آلود تھی، چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ گیا تھا اور نظریں زمین کے اندر گڑی جارہی تھیں۔

"یور آنر۔" احسان ضیا کے وکیل نے بلند آواز میں سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ "ان باتوں کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے موکل کی کردار کشی کی جارہی ہے، میں...... میں اصرار کرتا ہوں کہ اس بیان کو مقدمے کی کارروائی سے خارج کیا جائے اور مدعی کو موضوع بدلنے کا حکم دیا جائے۔"

"آپ تشریف رکھیں مسٹر صدیقی، میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ اس بیان کے جس حصے کو غیر متعلق تصور کیا جائے گا اسے مقدمے کی کارروائی سے خارج کردیا جائے گا۔ کیا آپ کے موکل اپنی بیوی کے بیان کردہ حقائق کی تردید کرنا چاہتے ہیں؟" جج نے اعتراض مسترد کرتے ہوئے سوال کیا۔

وکیل نے احسان ضیا کی طرف دیکھا۔ "فی الحال میرا موکل اپنا یہ حق محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔"

"تو آپ تشریف رکھیں اور آئندہ مداخلت سے اجتناب برتیں۔ آپ اپنا بیان جاری رکھیں خاتون۔"



"جناب والا! میں تو یہ جانتی ہوں کہ میرے شوہر نے جتنی دولت کمائی ہے وہ آمروں کے دور میں کمائی ہے۔ اس سے پہلے وہ اخبار شائع کرتے تھے لیکن آمدنی گزارے کے قابل ہوتی تھی۔ نئے آمر نے میرے شوہر کو پچھلے آمر سے زیادہ نوازا۔ اخبار کا دو تہائی حصہ صرف اشتہارات سے بھرا ہوتا ہے۔ اخباری کاغذ کا کوٹا اتنا زیادہ ملتا ہے کہ وہ اسے بلیک میں فروخت کرکے خود نفع کماتے ہیں۔ اس کے علاوہ پرمٹ اور لائسنس علیحدہ ہیں۔ بیرون ممالک کے دورے مفت کروائے جاتے ہیں۔ تمام سرکاری تقریبات میں معزز مہمانوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں میرے شوہر نے جو عذر پیش کیا وہ میرے لیے ناقابل قبول تھا۔ انہوں نے کہا کہ جب ان کے لیے آزاد صحافت پر کاربند رہنا ناممکن بن گیا تو انہوں نے آمروں سے مصالحت کرلی اور ایسے صحافی بھرتی کیے جو محض چند سو روپے ماہانہ تنخواہ کی خاطر ہر آمر کے آگے جھکنے کو تیار ہوجائیں۔"

"میں اعتراض کرتا ہوں یور آنر۔" مدعا علیہ کے وکیل نے اچھل کر کہا۔ "یہ تمام صحافیوں کی اور صحافت کے پیشے کی زبردست توہین ہے، تذلیل ہے۔"

"میں نے جس قسم کے صحافیوں پر اور جس قسم کی صحافت پر جو تبصرہ کیا ہے وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے جناب والا۔ یہ اعتراض کررہے ہیں، آپ میرے ان فقروں کو عدالتی کارروائی سے خارج کرنے کا حکم دے سکتے ہیں لیکن اس سے حقائق تبدیل نہیں ہوں گے۔ سورج کے نیچے کھڑے ہوکر آنکھیں بند کرلینے سے رات نہیں ہوجاتی۔"

"آپ تشریف رکھیں مسز صدیقی، آپ کے اعتراض پر بعد میں فیصلہ کیا جائے گا۔" جج نے رولنگ دیتے ہوئے کہا۔

"اس گفتگو کے فوراً بعد میں نے طلاق لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔" صائمہ نے بیان کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ میرے شوہر کے طرز عمل کا محرک دولت کا حصول اور آمروں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا تو جناب والا، مجھے کہنے دیجیے کہ دنیا کی پیدائش سے لے کر آج تک ماؤں نے جتنے بچے جنے ہیں وہ ان سب سے بدتر انسان ہیں کیونکہ آمر جو کچھ کرتے ہیں یہ اقتدار حاصل کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے کرتے ہیں۔ یہ محرک بذات خود بدترین اور ظالمانہ محرک ہے لیکن ایک اخبار کا مالک جو آمر کی آمریت مضبوط کرتا ہے محض دولت حاصل کرنے کے لیے ایسا مالک آمر سے زیادہ بدتر ہوتا ہے کیونکہ دولت تو چوری، ڈاکے اور طوائفوں کی دلالی سے بھی حاصل ہوسکتی ہے۔ دولت تو چوروں، ڈاکوؤں، طوائفوں اور پیشہ ور بھکاریوں کے پاس بھی ہوتی ہے۔ ایسے اخبار کا مالک آمروں کے ان وفاداروں سے بھی بدتر جانور ہے کیونکہ ان کا دائرہ اثر بہت محدود ہوتا ہے اور ان کی ظالمانہ حرکتوں سے عوام کا ایک محدود حلقہ متاثر ہوتا ہے لیکن اخبار کے ذریعے پوری قوم کو متاثر کیا جاتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ایسے جانور کی لاش کو زمین بھی قبول نہیں کرے گی لیکن جناب والا، میں نے اپنے شوہر کا عذر قبول کرلیا۔ انہیں شک کا فائدہ دیتے ہوئے یہ تسلیم کرلیا کہ میرے شوہر نے ماضی میں جو کچھ بھی کیا مجبوری کے تحت کیا۔ وہ انتہائی مجبور اور بے بس تھے۔ وہ اگر چاہتے بھی تو قوم کے سامنے ان ہاتھوں کی نشاندہی نہیں کرسکتے تھے جنہوں نے ان چنگاریوں کو بھڑکا کر آگ بنایا تھا اور سازش کی کھچڑی تیار کی تھی۔ ان مفروضات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے طلاق کے لیے اپنا حلف نامہ تیار کیا اور اپنے شوہر پر نامردی اور عصمت فروشی کے الزامات عائد کیے ہیں۔ میں ان الزامات کی مختصر سی وضاحت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ مردانگی کی صفت مرد کے ساتھ مشروط ہے اور مرد میں مردانگی نہ ہو وہ نامرد کہلاتا ہے۔ جیسا کہ میرے شوہر کے وکیل اعتراف کرچکے ہیں کہ صرف وظیفۂ زوجیت کو کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کا نام مردانگی نہیں ہے۔ عام فہم زبان میں مردانگی سے جو معنی لیے جاتے ہیں ان میں ہمت، جرأت، مصائب و مشکلات کا بے خوفی سے مقابلہ کرنا شامل ہے۔ مرد وہی ہوتا ہے جس میں یہ صفات موجود ہوں، میرے شوہر میں یہ صفات موجود نہیں ہیں۔ وہ آمر سے اور اس کے وفادار بھیڑیوں کے غول سے ڈر گئے۔ انہوں نے مصائب و مشکلات کے صرف تصور ہی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ان میں ہمت، جرأت اور حوصلے کا فقدان ہے۔ وہ بزدل ہیں، کم ہمت ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں نامرد ہیں۔ میں آج بھی اپنے شوہر سے محبت کرتی ہوں لیکن میں ایک نامرد کو شوہر کی حیثیت سے قبول نہیں کرسکتی۔" صائمہ خاموش ہوگئی اور کچھ سوچنے لگی۔

"جہاں تک دوسرے الزام کا تعلق ہے۔" صائمہ نے چند لمحوں کے بعد بیان کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ "تو جناب والا! اس سے میری مراد قلم کی عصمت فروخت کرنا ہے، عورت کی عصمت فروخت کرنے کو میرے شوہر کے انتہائی قابل وکیل نے انتہائی گھناؤنے اور قابل نفرت کاروبار کے لفظوں سے یاد کیا ہے لیکن قلم کی عصمت فروشی عورت کی عصمت فروشی سے زیادہ گھناؤنا اور قابل نفرت

کاروبار ہوتا ہے۔ ایک فرد واحد کتنی عورتوں کی عصمتیں فروخت کرسکتا ہے؟ پورے ملک میں کتنی طوائفیں عصمت فروشی کے کاروبار میں ملوث ہوں گی؟ میں صحیح اعداد و شمار تو پیش نہیں کرسکتی لیکن اندازاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ طوائفوں کی تعداد چند ہزار سے زائد نہیں ہوسکتی لیکن قلم کی عصمت فروخت کرنے والا اخبار کا مالک پورے ملک کی عورتوں کی عصمت داؤ پر لگا دیتا ہے اور محض اس ایک آدمی کی وجہ سے سیکڑوں ہزاروں اور بعض اوقات لاکھوں باعصمت اور شریف عورتیں اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہوجاتی ہیں اور لاکھوں بچے یتیم ہوجاتے ہیں جس کی ایک مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگر میرے شوہر اور دوسرے اخبارات کے مالکان اپنا فرض صحیح اصولوں پر ادا کرتے تو آج ہمارا وطن متحد ہوتا، کھچڑی پکانے والے ہاتھ توڑ دیے جاتے لیکن عصمت فروشی کی وجہ سے ہی ملک کے مشرقی حصے میں ہزاروں اور لاکھوں عورتیں بیوہ ہوگئیں، بچے یتیم ہوگئے۔ جب ایک مرد ہلاک ہوتا ہے تو پورے خاندان پر قیامت ٹوٹ جاتی ہے۔ جب ایک خاندان کا کفیل اور محافظ ختم ہوجاتا ہے تو بیوہ عورتیں اپنا بدن فروخت کرنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔ یتیم لڑکیاں بدکردار ہوجاتی ہیں اور یہ یتیم لڑکے آوارہ ہوجاتے ہیں۔ وہ یتیم لڑکیاں جو باپ کی نگرانی میں پرورش پاکر بلند کردار کی مائیں بنتیں تو ان کی گودوں میں قوم کے محافظ، مجاہد، مصلح، معزز شہری، سائنس داں، انجینئر، ڈاکٹر، فلسفی، ادیب، قابل فخر لیڈر اور جفاکش مزدور پرورش پاتے، وہ گودیں بدکرداری کی غلاظت سے لتھڑ جاتی ہیں اور ان میں انسان نما کیڑے پرورش پاتے ہیں۔ وہ یتیم لڑکے جو مثالی شوہر اور بہترین باپ بنتے، سائنس داں، انجینئر، ڈاکٹر بنتے، ملک وقوم کے محافظ بنتے، فلسفی، ادیب اور لیڈر بنتے وہ خاندان کے سربراہ کی موت کے بعد آوارہ، بدمعاش، چور ڈاکو، اچکے اور لٹیرے بن جاتے ہیں۔ وہ پیٹ کا جہنم سرد کرنے کے لیے وطن کی عصمت اور عورتوں کی عزت فروخت کرنے سے کبھی نہیں جھجکتے۔ یہی بے کردار بچے آمروں کے وفادار بنتے ہیں اور ملک وقوم کی قسمت ان کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ جناب والا! ایک خاندان کے سربراہ کی موت سے ملک وقوم کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے، کیا اس کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے؟ اگر ہزاروں اور لاکھوں خاندانوں کے سربراہ ہلاک ہوجائیں تو؟'' صائمہ خاموش ہوگئی۔ عدالت کے کمرے پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حاضرین پر سکتے جیسی کیفیت طاری تھی۔

''جناب والا!'' صائمہ کی آواز بہت دھیمی ہوگئی تھی لیکن وہ کمرے میں موجود ہر شخص کو سنائی دے رہی تھی۔ ''اس امر کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ میرے شوہر نے قلم کی عصمت فروخت کرکے آج تک کتنی شریف لڑکیوں کو عصمت فروشی پر مجبور کیا، کتنی معصوم لڑکیوں کو آوارہ اور بدکردار بنایا، کتنے یتیم لڑکے ان کی وجہ سے مثالی شوہر اور بہترین باپ نہ بن سکے۔ ملک وقوم کو کتنے محافظ، مجاہد، مصلح، انجینئر، ڈاکٹر، سائنس داں، فلسفی، ادیب، لیڈر، جفاکش مزدور، دیانت دار افسران اور معزز شہری نہ مل سکے اور انہوں نے ملک کو کتنے غدار، بدمعاش، چور، ڈاکو، لٹیرے اور بدکردار شہری دیے۔ اس تعداد کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا لیکن وہ اس شرمناک اور گھناؤنے جرم کے ارتکاب سے انکار نہیں کرسکتے۔ جناب والا! میں ایسی غلیظ اور مکروہ روزی سے اپنا پیٹ بھرنے اور اپنے بچوں کی پرورش کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ یہ دولت مظلوموں اور بے گناہوں کے خون میں لتھڑی ہوئی ہے۔ اس دولت سے پرورش پانے والی اولاد نیک اور صالح نہیں ہوسکتی۔ محنتی نہیں ہوسکتی، دیانت دار نہیں ہوسکتی، جائز اور ناجائز میں تمیز نہیں کرسکتی۔ جہاں تک میرے شوہر کی نامردی کا تعلق ہے، وہ نامرد ہیں اور ہمیشہ نامرد رہیں گے۔ آئندہ بھی وہ کسی آمر کا سامنا نہیں کرسکیں گے۔ ہر نیا آمر انہیں پرانے آمر سے زیادہ نوازے گا۔ جب تک ایسے لوگ یہاں موجود ہیں، اس ملک کی کسی عورت کی عزت و آبرو محفوظ نہیں۔ اس کے بچوں کا مستقبل تاریک ہے اور ایک ہولناک تباہی اس ملک کا مقدر ہے۔ میں عدالت سے درخواست کرتی ہوں کہ مجھے شوہر سے طلاق دلائی جائے تاکہ باپ کی بدکرداری بچوں پر اثرانداز نہ ہوسکے اور وہ اچھے ماحول میں پرورش پاسکیں۔ میرے شوہر کے وکیل نے اس امر کا ذکر کیا ہے کہ میں نے اپنے شوہر کو ملاقات کا موقع نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں عدالت کے ذریعے ملک وقوم کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں اور میرے بچے ان کے شرمناک گناہوں میں شریک نہیں تھے اور جیسے ہی ہمیں ان کے قابل نفرت ماضی کا علم ہوا، ہم نے ان کی دولت، ان کی شہرت و عزت اور ان کے اثر ورسوخ پر لات ماردی اور ان سے علیحدہ ہوگئے۔ ہم کل کے مورخ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اس شخص کے سنگین اور غلیظ جرائم میں ملوث نہیں تھے۔ طلاق کی یہ درخواست منظور ہونے پر میں اور میرے بچے اپنے ناموں کے ساتھ منسلک احسان ضیا کا نام ترک کردیں گے۔''



عدالت کے کمرے پر بہت دیر تک سکوت طاری رہا۔ جج صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ''مسٹر صدیقی! اب آپ اس بیان پر جرح کرسکتے ہیں۔''

مدعا علیہ کا وکیل اپنی نشست سے کھڑا ہوگیا۔ ''خاتون!'' اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''آپ نے ابھی عدالت کو بتایا تھا کہ آپ نے اپنے شوہر کا یہ عذر تسلیم کرلیا تھا کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا وہ انتہائی مجبوری کے عالم میں کیا تھا۔ آپ کے شوہر مجبور اور بے بس تھے۔ ان کی تمام تر مجبوریوں اور بے بسی کو سامنے رکھتے ہوئے ان حالات میں اگر آپ اپنے شوہر کی جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟''

''میں کوئی پابندی، کوئی دباؤ قبول نہیں کرتی اور دیانت داری کے ساتھ اپنا فرض ادا کرتی رہتی۔'' صائمہ نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''آپ یہ نہ بھولیں کہ اس صورت میں آپ کو زبردست مالی خسارہ ہوتا، آپ دیوالیا ہوجاتیں، کوڑی کوڑی کو محتاج ہوجاتیں۔ آپ پر تشدد کیا جاتا، آپ کو جیل میں ڈال دیا جاتا۔ اس کے ساتھ آپ ان حقائق کو بھی سامنے رکھیں کہ آپ اپنے خاندان کی سربراہ بھی ہیں۔ ایک ایسی بیوی جس سے آپ کو بے پناہ محبت ہے اور ایسے بچوں کی کفالت اور حفاظت آپ کے ذمے ہے جو آپ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ اس کے باوجود آپ تنہا ایک ظالم و جابر حکومت اور اس کے وفاداروں کے غول سے ٹکرا جاتیں؟''

''اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں آپ سے چند سوالات پوچھنا چاہتی ہوں مسٹر صدیقی۔''

''ضرور۔''

''آپ نے پڑھا ہوگا کہ سرکس کے فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اکثر ہلاک ہوجاتے ہیں؟''

''متعدد بار اخباروں میں ایسی خبریں پڑھی ہیں۔'' وکیل نے حیران ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا ان فن کاروں کو وہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے؟''

''نہیں۔''

''کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جب وہ فنکار یہ پیشہ اختیار کرتے ہیں اور اس فن کی تربیت حاصل کرتے ہیں تو انہیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر لمحے ان کی جان خطرے میں ہوگی اور وہ کسی وقت ہلاک بھی ہوسکتے ہیں؟''

''درست ہے، انہیں خطرات کا علم ہوتا ہے۔''

”کیا یہ پیشہ ان کا ذریعہ معاش نہیں ہوتا؟“

”ہوتا ہے۔“

”تو کیا کبھی آپ نے سنا ہے کہ سرکس کے ایسے فنکار نے یہ کہہ کر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے سے انکار کر دیا ہو کہ اس فن کا مظاہرہ انتہائی خطرناک ہے اور اس کے ہمعصر فنکار اسی فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہلاک ہو چکے ہیں؟“

”نہیں، ایسا کبھی سننے میں نہیں آیا۔“

”اور جب وہ فنکار بوڑھے ہو جاتے ہیں یا کسی وجہ سے انہیں اپنے اعصاب پر مکمل اختیار نہیں رہتا جس کی وجہ سے انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ اب اگر انہوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو جلد ہی وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اس وقت ایسے فنکار کیا کرتے ہیں؟“

”وہ اس پیشے سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔“

”اب دوسری مثال لیں، کیا باکسر اور پہلوان مقابلوں کے دوران زخمی نہیں ہوتے؟ کیا بعض اوقات وہ زخموں کی تاب نہ لا کر ہلاک نہیں ہو جاتے؟“

”ایسا ہوتا رہتا ہے۔“

”کیا باکسروں اور پہلوانوں کو وہ پیشے اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے؟“

”نہیں۔“

”کیا انہیں باکسنگ یا پہلوانی کا فن سیکھتے ہوئے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ اس پیشے میں مخالفت کی ضربیں ضرور انہیں زخمی کریں گی۔ بعض اوقات وہ شدید زخمی ہو جاتے ہیں اور ممکن ہے کسی موقعے پر وہ زخموں کی تاب نہ لا کر ہلاک بھی ہو جائیں؟“

”انہیں اس کا علم ہوتا ہے۔“

”اور کیا وہ پیشہ ان کا ذریعہ معاش نہیں ہوتا؟“

”ہوتا ہے۔“

”تو کیا آپ نے کسی باکسر یا پہلوان کو یہ کہتے ہوئے مقابلے سے دستبردار ہوتے سنا ہے کہ اس کا حریف مقابلے کے دوران اس پر حملے کرے گا، اسے مارے گا اور اسے زخمی کرنے سے نہیں چوکے گا؟“

”نہیں۔“

”اور جب باکسر اور پہلوان بوڑھے ہو جائیں یا کسی دوسری وجہ سے ان میں پہلی جیسی قوت اور پھرتی نہیں رہتی اور جب وہ خود کو مقابلے کا اہل نہیں پاتے تو کیا کرتے ہیں؟“

”اس پیشے سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔“

”اب تیسری مثال لیں، کیا دنیا بھر میں فوج کے جوان اور افسران جنگ کے میدان میں ہلاک نہیں ہوتے؟“

”ہوتے ہیں۔“

”جن ملکوں میں جبری فوجی بھرتی کا قانون نہیں ہے، کیا وہاں جوانوں کو فوج کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے؟“

”نہیں۔“

”کیا انہیں فوج کی ملازمت اختیار کرتے وقت اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ دوران ملازمت دشمن سے جنگ چھڑ سکتی ہے اور وہ جنگ کے میدان میں ہلاک ہو سکتے ہیں؟“

”انہیں علم ہوتا ہے۔“

”کیا فوج کی ملازمت ان کا ذریعہ معاش نہیں ہوتی؟“

”ہوتی ہے۔“

”کیا دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے فوجی جوان اور افسر ہلاک نہیں ہوتے؟“

”ہوتے ہیں۔“

”تو کیا کوئی فوجی جوان یہ کہہ کر میدان جنگ میں جانے سے انکار کر دیتا ہے کہ وہاں ہر وقت اس کی جان خطرے میں رہے گی اور دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ ہلاک ہو سکتا ہے؟“

”نہیں۔“

”پھر جب فوج کے ملازمین کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے اور ضابطوں کے مطابق انہیں دشمنوں سے مقابلہ کرنے کا پوری طرح اہل تصور نہیں کیا جاتا تو کیا ہوتا ہے؟“

”انہیں فوج سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔“

”اگر عدالت اجازت دے تو میں اپنے شوہر سے درخواست کروں گی کہ میرے بقیہ سوالات کا وہ خود جواب دیں۔ اگر وہ میری درخواست قبول نہیں کریں گے تو میرا وکیل انہیں گواہوں کے کٹہرے میں طلب کر کے وہی سوالات ان سے دریافت کر سکتا ہے۔“

”یہ درخواست عدالتی ضابطوں کے خلاف ہے لیکن جیسا کہ آپ نے اشارہ کیا ہے کہ آپ کا وکیل بالواسطہ یہ کام انجام دے سکتا ہے، اس لیے میں آپ کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔“ جج نے درخواست منظور کرتے ہوئے کہا۔

احسان ضیا اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ وہ چند لمحے خاموشی کے ساتھ التجا بھری نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھتا رہا۔

”کیا آپ کو کسی نے صحافت کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا؟“ صائمہ نے اپنے شوہر سے پہلا سوال کیا۔



”نہیں۔“ احسان ضیا نے سر جھکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

”کیا کسی نے آپ کو اخبار نکالنے پر مجبور کیا تھا؟“

”نہیں۔“

”کیا یہ پیشہ اختیار کرتے وقت آپ کو اپنے فرائض اور اس پیشے کے ساتھ منسلک دشواریوں اور خطرات کا علم نہیں تھا؟“

”مجھے علم تھا۔“

”جب آپ نے صحافت کے پیشے میں قدم رکھا تو کیا آپ نے اس ملک میں کسی آمر کے اقتدار پر قابض ہونے کے امکان کو بالکل مسترد کر دیا تھا؟“

”نہیں، یہ امکان ہر ملک میں ہر دور میں موجود ہوتا ہے۔“

”کیا آپ کو علم نہیں تھا کہ ہر آمر سب سے پہلے ذرائع ابلاغ عامہ کو اپنی آمریت کا نشانہ بناتا ہے۔ سخت پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں اور آزاد صحافت کو اپنی مرضی کا پابند بنانے کے لیے وہ ہر قسم کا حربہ استعمال کرتا ہے؟“

”مجھے علم تھا۔“

”کیا ہر صحافی اور اخبار کے مالکان کا یہ فرض نہیں ہوتا کہ وہ ملک و قوم کو ہر لمحے صحیح صورت حال سے آگاہ کرتے رہیں؟“

”یہ ان کا بنیادی فرض ہے۔“

”کیا ہر صحافی اور اخبار کے مالکان کو آمریت میں پوشیدہ ملک و قوم کے لیے خطرات کا علم نہیں ہوتا؟“

”ہوتا ہے۔“

”تو کیا ہر صحافی اور اخبار کے مالکان کا یہ فرض نہیں ہوتا کہ وہ سب سے پہلے آمریت کے خلاف جنگ کا آغاز کریں اور قوم کو آمریت میں مضمر ان خطرات سے آگاہ کریں جو ملک و قوم کو تباہ کر دیتے ہیں؟“

”یہ ان کا فرض ہوتا ہے۔“

”تو پھر آپ نے اپنا فرض ادا کیا؟“

”میں مجبور تھا صائمہ، میں تمہیں بتا چکا......“

”جب آپ خود کو اپنے فرائض کی ادائیگی کا اہل تصور نہیں کرتے تھے تو آپ نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا؟ کیا اس ملک کے عوام نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ صحافت کے پیشے میں آئیں اور آپ اخبار نکالیں؟“

”نہیں لیکن......“

”تو کیا اس پیشے میں آنے سے قبل آپ کو اپنے فرائض اور صحافت کے ساتھ منسلک خطرات کا علم نہیں تھا؟“

”یہ سب ٹھیک ہے لیکن......“

”اگر آپ کو بعد میں اپنی نااہلیت کا احساس ہوا اور آپ کو پتا چلا کہ آپ اقتدار پر قابض ایک آمر سے ٹکر نہیں لے سکتے تو سرکس کے فنکاروں، پہلوانوں یا باکسروں کی طرح اس پیشے سے کنارہ کشی اختیار کر سکتے تھے؟“

”یعنی؟“

”اخبار بند کر دیتے۔“

”اخبار بند کر دیتا؟“ احسان ضیا نے ناقابل یقین نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھا۔

”کیوں، اس میں اس قدر حیران کر دینے والی کیا بات ہے؟ کیا اخبار بند نہیں ہوتا؟ کیا جو اخبار ایک دفعہ جاری ہو جاتا ہے ہمیشہ جاری رہتا ہے؟“

”نہیں، اخبار بند ہوتے رہتے ہیں لیکن......میرا مطلب ہے کہ اس قسم کی صورت حال میں حکومتیں تو اخبارات بند کر دیتی ہیں لیکن اخبار کے مالکان خود......“

”اس قسم کی صورت حال میں حکومتیں کن اخبارات کو بند کرتی ہیں؟“

”جو آمر کے سامنے سر نہیں جھکاتے۔“

”یعنی وہ اخبارات جو تمام پابندیوں اور نقصانات کے باوجود دیانت داری سے اپنا فرض انجام دیتے رہتے ہیں؟“

”ہاں۔“

”کیا یہ ہر اخبار کا فرض نہیں ہوتا؟“

”ہوتا ہے۔“

”اور جو اخبارات ایک آمر بند نہیں کرتا، کیا ان کے بارے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ آمر کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں، سمجھوتا کر لیتے ہیں، بک جاتے ہیں؟“

احسان ضیا خاموش رہا۔

”یور آنر!“ ایک طویل وقفے کے بعد صائمہ نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے سوالات ختم ہو گئے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

☆☆☆

عدالت نے طلاق کی درخواست منظور کرتے ہوئے تینوں بچے بیوی کی تحویل میں دینے کا حکم دیا۔ اس نے اپنے فیصلے میں تحریر کیا کہ ”قلم کی عصمت سب سے زیادہ اہم اور قیمتی ہوتی ہے۔ ہر عورت کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ ایک نامرد شوہر سے طلاق لے کر اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔“

دوسرے روز شائع ہونے والے کسی اخبار میں اس مقدمے کی خبر موجود نہیں تھی۔

# کشکول

انوار صدیقی

قسط 29

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

## گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی جھکنے نہیں دی تھی، اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی جبکہ لیاقت حسین نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے باپ کی مخالفت کی اور ماں کی دعائیں لے کر فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پر تاب بھوشن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک لیمو ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر لیمو سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں اور پریشانیوں میں گھر گیا۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو پیچھے ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر بھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ محفوظ رہتا ہے اسی دوران ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے

میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے کچھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعے میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج بھی بظاہر شیخ حامد کا دوست بن کر اسے خوش فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے علم میں لے آتا حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے مگر شیخ حامد اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیچو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کے حوالے سے خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا بیٹا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کر لی جاتی ہے۔ لیاقت حسین فرحین کو اس کے ایک رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے مگر امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور نگزیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی سعی میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اور نگزیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اور نگزیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اور نگزیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے۔ لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر اور نگزیب نے لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد افسر کو ہدایات دیں۔ حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر ٹو کے کوڈ سے کام کرنے والے ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائش گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اور نگزیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی طابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اور نگزیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اور نگزیب معذرت کر کے اس سے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کی آمادگی پر منتج ہوتی ہے۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اور نگزیب اس کی پاداش میں شبنم پر





بجرم اہم کرا کے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیر نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے ہم سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی لیڈی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف دشنو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین گاؤں کو اس کی ماں نے حفاظت کے لیے ایک تعویذ دیا۔ شیخ حامد کے خلاف برسرپیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگ زیب ادا کر رہا تھا جبکہ ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوالو تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا اگرچہ اس نے شبنم اور اسلم ڈنکا کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ بالآخر بگ باس نے ہیلی کاپٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر برد ہو گیا، البتہ لاش نہ مل سکی۔ دوسری جانب دشنو اور لوچن کرنل احتشام کی گرفت سے فرار ہو گئے۔ اورنگ زیب اور سراج آرمی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بن رہے تھے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہر آمد پر خوش تھا مگر اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہو گیا۔ لیاقت حسین کی ماں نے جو کہ خود بھی لیاقت کی طرح ماورائی قوتوں کے زیر سایہ ہے کچھ مبہم تفصیلات فراہم کیں لیکن مکمل معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اورنگ زیب ہنوز یہ ماننے پر تیار نہیں کہ شیخ حامد مر چکا ہے۔ حالانکہ اس خوشی میں ایک تقریب میں اسے فوجی اعزاز بھی دیا گیا۔ اسی دوران لودھی بھی اورنگ زیب سے ملتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا وحشیانہ قتل ہو جاتا ہے اور اس کے تانے بانے آکٹوپس یعنی بگ باس سے ملتے ہیں، میڈم روبی ڈی آئی جی سے نکاح پر تیار ہو گئی اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ سرفراز خان واپس جانے پر بضد تھا لیکن اسے پندرہ دن کے لیے روک لیا گیا۔ شہر میں کئی وارداتیں ایسی ہوئیں جن میں آکٹوپس کی مہر استعمال کی گئی تھی۔ شیخ حامد کی موت یا حیات بدستور ایک معما بنی ہوئی تھی جبکہ اورنگ زیب اپنے موقف پر قائم تھا۔ شیخ حامد کی کوٹھی کو باوجود سخت پہرے کے تباہ کر دیا گیا۔ شیخ حامد کی بیوہ کنول کو دوبارہ اغوا کر لیا گیا اور اس کی ماں کو قتل۔ دوسری جانب راحیلہ بیگم کی کار جو کہ لیاقت حسین ڈرائیو کر رہا تھا، کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ادھر ڈی آئی جی اور میڈم روبی کی منگنی کی تقریب منعقد کی گئی جس میں سراج و اورنگ زیب کے علاوہ سیٹھ عثمان کی فیملی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ منگنی کی رسم تو ادا کر دی گئی لیکن شادی کا اعلان نہیں کیا گیا اور اسے آکٹوپس کی موت کی تصدیق سے مشروط کر دیا گیا۔ شیخ حامد نے کنول کو طلاق دے کر اسے بری حالت میں ویران جگہ پھنکوا دیا، جگا کے فرنیچر کے شوروم کو بگ باس کے غنڈوں نے تباہ کر دیا۔ دشنو کو فون کے ذریعے بگ باس کی جانب سے چند شخصیات کو قتل کرنے کی ہدایت دی گئی جس کی اطلاع لوچن نے اورنگ زیب کو دے دی۔ لیاقت حسین کا سامنا پرتاب بھوشن سے ہوا مگر اس کی ماں کے دیے ہوئے تعویذ نے اس کی رہنمائی اور حفاظت کی اور پرتاب کو پسپا ہونا پڑا۔ کنول نیند کی گولیاں کھا کر پہلے اخبار کے آفس پھر ملٹری آفس گئی اور انہیں بگ باس کے زندہ ہونے کی اطلاع دی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو گئی۔ لیاقت حسین کو رات میں آہٹ محسوس ہوئی چند حملہ آوروں نے اس کے گھر پر نقب لگائی تھی۔ فرحین کے اغوا کے لیے آئے ہوئے دشمنوں کو لیاقت حسین نے جہنم واصل کیا فرحین تھوڑی زخمی ہوئی اسے اسپتال داخل کرا دیا گیا جہاں ایک جعلی نیل نرس نے اسے زہر آلود انجکشن لگانے کی کوشش کی جو لیاقت حسین نے اپنی ماں کی دی ہوئی انگوٹھی کی نشاندہی کی بدولت ناکام بنا دی۔ دشنو انٹیلی جنس کی قید سے فرار ہو گیا۔ میڈم روبی کی سیکریٹری ثریا کو تنبیہ کے طور پر اغوا کر کے دھمکی کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اورنگ زیب اور سراج ایک نئے کردار سکندر علی شاہ کی فائل حاصل کر کے اس کے متعلق معلومات اکٹھی کرتے ہیں جس کی بیوی نگینہ شیلا ورما کے بیوٹی پارلر میں جاتی رہی ہے اور شیلا ورما اور جوہی نوجوان لڑکیوں کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ دوسری جانب جگا اور لوچن شیخ حامد کی کوٹھی کو دھماکوں سے تباہ کر دیتے ہیں۔ آئی جی کا استعفیٰ منظور نہیں ہو رہا تھا اسے "کوبرا" کے نام سے ایک کال موصول ہوئی جس میں اسے دھمکی دی گئی کہ وہ لیاقت حسین کا معاملہ حل کرے یا اورنگ زیب کا تبادلہ کر دے بصورت دیگر اسے اور اس کی مرحومہ بیوی کو خفیہ تصاویر کے ذریعے اخبارات میں بدنام کر دیا جائے گا۔ لہٰذا وہ جو پہلے اورنگ زیب کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلا چکا تھا اس کا تبادلہ منظور کر لیا اور اورنگ زیب اس کی مجبوری بھانپ گیا لیکن بظاہر دونوں کے درمیان تلخی قائم ہو گئی۔ دشنو کو افضل خان کے ذریعے پکڑ لیا گیا۔ اورنگ زیب نے اپنی جگہ سراج کو تعینات کر کے سکندر علی شاہ کی فائل اس کے حوالے کی جس میں انسپکٹر رانا حمید نے اس کے متعلق تفصیلات جمع کی تھیں۔ اورنگ زیب کی رہائش گاہ جسے وہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا تباہ کر دیا گیا۔ بینا نامی لڑکی کے اغوا کو ناکام بنا کر ملٹری ایجنسی نے مفید معلومات حاصل کیں۔ سکندر علی شاہ کو "شکرہ" کے نام سے کال موصول ہوئی جس میں اس ناکامی کے بعد محتاط رہنے کا مشورہ دیا گیا۔ سکندر کے ڈیرے پر ایک لڑکی ماروی لائی گئی۔ جسے رات کی تاریکی میں جنونی عمل سے گزارا گیا۔ اورنگزیب، سراج اور کرنل احتشام مل کر آکٹوپس کیخلاف تحقیقات کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں اورنگزیب بینا سے پوچھ گچھ کرتا ہے کرنل احتشام دشنو سے تفتیش کر رہا ہے دوسری جانب شیخ حامد آئی جی کو کوبرا اور سکندر علی شاہ کو شکرہ کے نام سے بلیک میلنگ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ سکندر علی شاہ ماروی کے ساتھ سلوک کی انکوائری کراتا ہے اسی دوران اسے اطلاع دی جاتی ہے کہ شیلا ورما کے بیوٹی پارلر میں توڑ پھوڑ کی گئی ہے یہ لوچن اور جگا کی کارروائی تھی۔ لیاقت حسین کے حملہ آوروں کو زخمی کرنے کے بعد گرفتاری دینے کے بعد اسے بری کرنے والے مجسٹریٹ کی پراسرار موت واقع ہوتی ہے۔ دارا کی بیوی روشنا کو اغوا کر کے بے عزت کیا جاتا ہے اور سابق چیف پولیس علیم احمد کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب ماروی سے پوچھ گچھ کرتا ہے۔ دوسری جانب دشنو ملٹری کسٹڈی میں تفتیش کے دوران مارا جاتا ہے۔ دشنو کی لاش کو ایک ہندو سماجی تنظیم کے ذریعے جلا دیا جاتا ہے۔ لوچن اور جگا سکندر علی شاہ کی بیوی نگینہ کو پھانس کر اسے قابل اعتراض حالت میں واپس کرتے ہیں یہ سکندر کے لیے دھمکی ہے۔ دوسری جانب سکندر بگ باس سے حاصل شدہ اطلاعات کی روشنی میں اورنگ زیب کو پھانسنے کی کوشش کرتا ہے۔ سکندر کی دست راست دلربا کے ٹھکانے پر ایک اجنبی اس کی چند ہوشربا تصاویر اتار کر غائب ہو جاتا ہے۔ دشنو حبس دم کا ماہر تھا اور سانس روک کر کرنل کو دھوکا دے کر شمشان گھاٹ سے فرار ہو گیا اور افضل خان کے ٹھکانے پر فائرنگ کی لیکن اورنگزیب نے افضل خان کے ذریعے ہی اسے جہنم واصل کیا۔ دوسری جانب میڈم روبی کے گھر شیخ احمد نے پہنچ کر اسے دھمکایا اور بے ہوش کر کے فرار ہو گیا۔ لوچن نے نگینہ کو فون کر کے اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور سکندر علی شاہ کے حصار میں نقب لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیاقت حسین کو حالت خواب میں چند مناظر دکھائے گئے اور خبردار کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا سامنا پرتاب بھوشن سے ہو گیا۔ پرتاب بھوشن سخت مقابلے کے بعد جہنم واصل ہو گیا۔ نگینہ سکندر علی شاہ کی قید سے فرار ہو گئی دلربا کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ اورنگزیب اور اس کے ساتھی شیخ حامد اور سکندر علی شاہ کے آپس کے تعلق اور ان کی چھان بین کر کے ان کے گرد گھیرا ڈالنے میں مصروف ہیں۔ دوسری جانب سیٹھ عثمان کے آفس کے سامنے دھماکا ہوتا ہے۔

چوکیدار زمین پر پڑا آنکھیں پھاڑے خلا میں شاید اس افتاد کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو بلائے ناگہانی بن کر اچانک نازل ہوئی تھی۔ لیاقت حسین اس کی مدد کی خاطر دوڑا تھا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ چوکیدار کو سنبھالتا کچھ فاصلے پر دوسرا دھماکا ہوا جس کے باعث لیاقت حسین بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ خود بھی زمین سے دو تین فٹ اچھلا تھا جب ماں کی محبت بھری آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"اللہ خیر۔" پھر کسی نادیدہ قوت نے جیسے اسے سنبھالا دے کر زمین پر کھڑا کر دیا تھا۔ ایک پل میں جیسے کوئی آفت آتے آتے رہ گئی تھی۔ چوکیدار کے چہرے کی رنگت اور زرد ہوگئی۔ اس نے کراہتے ہوئے مردہ سی آواز میں لیاقت حسین سے پوچھا۔

"یہ...... یہ...... سب کیا تھا؟"

"کسی بزدل نے نامردی کا مظاہرہ کیا ہے۔" لیاقت حسین نے اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "مرد ہوتا تو سامنے آ کر مقابلہ کرتا۔"

سیٹھ عثمان کے علاوہ دفتر کے عملے کے اور افراد بھی لیاقت حسین کے گرد اکٹھا ہونے لگے۔ انیکسی سے فرحین کی آنکھیں بھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

"اندر آ جاؤ لیاقت حسین۔" سیٹھ عثمان نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "میں سراج کو فون کرتا ہوں۔"

"خطرہ ٹل گیا ہے صاحب لیکن باہر تو سادہ لباس والے بھی ڈیوٹی دے رہے تھے پھر......" لیاقت حسین جملہ پورا نہ کر سکا۔ ایک جیپ کے آنے سے سب ہی اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس میں سے وہی دو جوان اترے جن کو لیاقت حسین کی اطلاع کے مطابق سراج اور اورنگ زیب نے دور دور رہ کر نگرانی کا فرض سونپا تھا۔ وہ تنہا نہیں تھے ایک بائیس تیئس سال کا جوان بھی ان کے ساتھ تھا جو بار بار اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

سادہ لباس والوں نے جیپ کے ڈرائیور کو کچھ ضروری ہدایات دیں پھر وہ نوجوان کو لے کر اندر آ گئے۔

"کون ہے یہ؟" سیٹھ عثمان نے سادہ لباس والوں کو مخاطب کیا۔

"ٹینس کے بال نما دو بارود بھرے گولے اسی حرام زادے نے پھینکے تھے۔ ہم اس وقت تھوڑے فاصلے پر تھے۔" سادہ لباس والے نے نوجوان کو حقارت سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "ڈی ایس پی صاحب کا حکم آڑے نہ آ جاتا تو ہم اسے گولی مارنے سے دریغ نہ کرتے لیکن اب یہ سب کھایا پیا اگل دے گا۔ میں نے صاحب کو بھی اس کی اطلاع کر دی ہے۔"

"اوئے حرام کے تخم......" دوسرے سادہ لباس والے نے پشت سے نوجوان کی گدی پر بھرپور مکا مار کر کرخت لہجے میں سوال کیا۔ "زندگی چاہتا ہے تو سیدھی طرح اگل دے کہ تو کس کا آدمی ہے ورنہ کتوں کی موت مارا جائے گا۔"

"مم...... میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھا۔" نوجوان نے سنبھل کر جواب دیا۔ "میں ادھر آ رہا تھا جب اس نے پچھلے موڑ پر مجھے روک کر ایک آفر دی تھی۔ دو ہزار پیشگی رقم کے عوض مجھے یہ حکم بھی دیا تھا کہ میں ٹینس کے وہ وزنی گولے اس بنگلے کے اندر پھینک کر نکل جاؤں۔"

"اور تو نے اس کو اپنا باپ سمجھ کر ہامی بھر لی تھی۔" سادہ لباس والے کا ہاتھ دوبارہ گھوم گیا۔ نوجوان لڑکھڑایا پھر اس نے سادہ لباس والے کو حقارت سے گھورتے ہوئے کہا۔

"جو سچ تھا وہ میں نے بتا دیا۔ اگر مجھ سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہے تو تم بے شک مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔"

"ہم تھانے اور کچہری کا روگ نہیں پالتے شہزادے۔" دوسرے سادہ لباس والے نے اس کی گردن دبوچ کر الٹے ہاتھ کا بھرپور تھپڑ رسید کیا۔ "کورٹ کچہری میں کیا ہوتا ہے یہ ہم بھی جانتے ہیں اس لیے موقعِ واردات پر ہم خود ہی کیس بھی نمٹا دیتے ہیں۔"

"تمہاری مرضی۔" نوجوان نے بے پروائی سے کہا۔ "جو بیان میں نے ایک بار دے دیا اس میں تبدیلی نہیں کروں گا۔"

دس منٹ تک سادہ لباس والے نوجوان کی زبان کھلوانے کی کوشش کرتے رہے پھر سراج کے آ جانے کے بعد وہ سلیوٹ کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے یہ بھی کہہ گئے کہ نوجوان شرافت سے زبان نہیں کھول رہا۔

نوجوان کی نظریں ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو دیکھ کر ادھر ادھر بھٹکی تھیں پھر اس نے زبان کھولنے میں پہل بھی خود ہی کی۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ ٹینس کے دونوں بال میں نے ہی ایک معقول رقم ملنے کے بعد یکے بعد دیگرے اندر پھینکے تھے۔ میں ایسا کرنے پر مجبور تھا ورنہ......"

"ورنہ کیا؟" سراج نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

"میری ایک مجبوری ان کے ہاتھ میں ہے جس کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"مجبوری کیا ہے؟"

"وہ...... وہ...... بات میں زبان تک نہیں لاؤں گا۔" نوجوان نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔

"دس منٹ کا موقع مجھے بھی دیں صاحب۔" لیاقت حسین نے سرسراتے لہجے میں درخواست کی۔ "اس کی زبان کھلوانے کی ذمے داری پھر میری ہوگی۔"

"فکر مت کرو لیاقت حسین۔" سراج نے کہا۔ "پولیس مجرموں کی رگ رگ سے واقف ہوتی ہے۔ ایسے جدید طریقے بھی قابلِ عمل ہو گئے ہیں جس کے بعد مردہ بھی بولنا شروع کر دیتا ہے۔"

"یہ آپ کا ذاتی خیال ہے جناب ورنہ میں نے جو بیان دیا ہے وہی سچ ہے۔"

"ایک آخری موقع اور دے رہا ہوں پھر سوچ لو...... پولیس کے ٹارچر سیل میں جانے کے بعد ہو سکتا ہے کہ تمہیں اور بھی بہت سارے جرائم کا اقبال کرنا پڑے۔"

"ایسی صورت میں ایک خواہش کا اظہار ہی باقی رہ جاتا ہے۔"

"بکو۔"

"آپ جو بیان کہیں وہ میں تحریر کر کے اس پر دستخط کر دوں گا۔" نوجوان نے بے زاری کا اظہار کیا۔

"یہ شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا صاحب۔" لیاقت حسین نے نوجوان کو گھورتے ہوئے سراج سے کہا۔ "لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔"

سراج نے نوجوان کو بغور دیکھا۔ اس کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ نوجوان عادی مجرم نہیں ہے۔ کوئی مجبوری ضرور تھی جو وہ کسی ایسے گروہ کے ہاتھوں چڑھ گیا تھا جو اسے استعمال کر رہا تھا لیکن وہ کون لوگ تھے؟ ان کا سرغنہ کون تھا؟ اور خاص طور پر سیٹھ عثمان ہی کو دہشت زدہ کرنے کی کیا وجہ تھی؟ نوجوان نے جو آخری جملہ کہا تھا وہ بھی اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ کسی مجبوری کے تحت ہی موجودہ صورت میں ملوث ہوا ہے۔

ایک لمحے تک سراج کی نظریں نوجوان کے چہرے پر منڈلاتی رہیں پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"مجرموں کے علاوہ سارے پولیس والے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس لیے میں تم سے ایک آخری بار پوچھ رہا ہوں کہ سچ کیا ہے؟ بات یہاں سے نکل کر تھانے کچہری تک پہنچ گئی تو پھر اس کا نتیجہ تمہاری توقع کے خلاف ہی ہوگا۔"

"اس بات کی ضمانت میں بھی لیتا ہوں کہ حقیقت بیان کر دینے کے بعد تمہارے ساتھ عادی مجرموں جیسا برتاؤ نہیں ہوگا۔" سیٹھ عثمان نے نوجوان سے سلجھی ہوئی زبان میں بات کی تو ایک لمحے تک وہ خاموش رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے برف پگھل رہی ہو پھر اس نے دبی زبان میں کہا۔

"میرا اس دنیا میں ایک بہن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ پچھلے دنوں اس کی شادی کے سلسلے کی بات ہو رہی تھی لیکن اب......" نوجوان نے بڑی دل گرفتہ آواز میں بات مکمل کی۔ "اب وہ ان ہی کے قبضے میں ہے جن کے حکم پر میں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔"

"تم کسی نہ کسی کو تو ضرور جانتے ہو گے؟ مجھے اسی کا نام بتا دو پھر شاید میں تمہارے کام بھی آ سکوں۔" سراج نے سنجیدگی سے کہا لیکن جو جواز نوجوان نے پیش کیا تھا وہ اس کے حلق کے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔

"مم...... میں...... اس کا نام زبان تک نہیں لاؤں گا۔" نوجوان نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "ان کو ایک رتی برابر بھی شک ہو گیا تو میری بہن کو بے آبرو کر کے اوپر پہنچانے میں بھی دیر نہیں کریں گے۔"

"تمہارا نام کیا ہے، کہاں رہتے ہو؟ یہی بتا دو تا کہ تمہارے بیان کی تصدیق ہو سکے؟" سیٹھ عثمان نے کہا تو نوجوان کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے فیصلہ کن لہجے میں سراج کو مخاطب کیا۔

"میں اپنے جرم کا اقرار کر رہا ہوں صاحب، اب مجھے اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہنی۔"

سراج کو اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ نوجوان کا بار بار قلابازی کھانا اب اس بات کی ترجمانی کر رہا تھا کہ وہ دیدہ و دانستہ خود کو مظلوم اور معصوم ظاہر کرنے کی خاطر کینچلی بدل رہا تھا۔ ایک لمحے بعد سراج کے اس خیال کی تصدیق بھی اورنگ زیب کی آنے والی کال نے کر دی۔

"جو نوجوان ہاتھ لگا ہے اس پر وقت نہ ضائع کرو۔ اس کی جڑیں زمین کے اندر ہی اندر کہاں تک پھیلی ہیں تم اس کا اندازہ تک نہیں کر سکتے۔"

"اس کے ڈسپوزل کا طریقہ بھی بتا دیں؟" سراج نے مبہم انداز میں پوچھا۔

"جو سادہ لباس والے تعینات ہیں ان کے حوالے

کر کے واپس آجاؤ۔ میں نے ان کو ضروری ہدایت دے دی ہے۔"

دوسری جانب سے اتنی عجلت میں سلسلہ منقطع کیا گیا کہ سراج بھی الجھ گیا۔ اس نے وہی کیا جو اورنگ زیب نے کہا تھا۔ ذاتی طور پر اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر سادہ لباس والوں کو یہ تاکید بھی کردی تھی کہ اس کا نام درمیان میں نہ لیا جائے۔

☆☆☆

پرانے ماڈل کی وہ موریں ایک سابقہ وزیر کے بنگلے کے عقبی حصے کی طرف جا کر رکی تھی۔ اس پر سوار دونوں افراد نیچے اترے، کچھ دیر تک وہ بونٹ اٹھا کر انجن پر جھکے رہے۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی خرابی تلاش کر رہے ہوں، ان کے درمیان سرگوشی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

"کیا یہ جگہ مناسب رہے گی؟" پستہ قد والے نے اپنے ساتھی سے سوال کیا۔

"پورا علاقہ سنسان پڑا ہے۔" دوسرے نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ہمارا مطلوبہ بنگلا بھی یہاں سے قریب ہی ہے۔ اس طرف گاڑی لے جانا بھی مناسب نہیں ہوگا۔"

"تم جانو۔" پہلے نے شانے اچکائے۔ "میرے لیے رات اور دن دونوں برابر ہیں۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر موت سے کھیلنا میرا پیشہ بھی ہے۔"

"جانتا ہوں دوست لیکن دنیا کے کسی بھی پیشے میں احتیاط اور آنکھیں کھلی رکھنا بھی شرط ہے۔" دوسرے نے مسکرا کر جواب دیا پھر وہ گاڑی کا بونٹ کھلا ہی چھوڑ کر پیدل چل پڑے تھے۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اس وقت ہاتھ آجائے گا؟" کچھ توقف کے بعد پستہ قد والے نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا پھر تیزی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ دنیا کے ہر پیشے میں نفع اور نقصان کے چانسز ففٹی ففٹی ہوتے ہیں لیکن شیر اور ہرن کے شکار میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ شیر زخمی ہو کر نکل جائے تو آدم خور بن جاتا ہے۔ ہرن میں شیر جیسی حس نہیں ہوتی اس لیے دوبارہ بھی جال میں پھنس جاتا ہے۔"

"میرے آدمی بھی سب نمک حلال ہیں۔" دوسرے نے قدم بڑھاتے ہوئے دائیں بائیں دیکھ کر جواب دیا۔ "ان کی اطلاع یہی تھی کہ چالیس منٹ پہلے وہ ہمارے مطلوبہ بنگلے میں موجود تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔"

"ان تینوں کے علاوہ بنگلے میں اور رہائشی بھی ضرور ہوں گے؟"

"ہوسکتا ہے لیکن ہمیں بنگلے کے آؤٹ ہاؤس میں جانا ہے جو عام طور سے خالی رہتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" پستہ قد آدمی چونکا۔ "کیا بنگلے کے رہائشی بھی آؤٹ ہاؤس میں غیر متعلقہ آدمیوں کی آمد و رفت سے بے خبر ہوں گے؟"

"نہیں، سب سے زیادہ باخبر وہی ہیں۔" دوسرے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ہمارا مطلوبہ بنگلا ایک مقامی صنعت کار نے کرایے پر لے رکھا ہے جہاں صرف اس کی دوسری بیوی رہتی ہے۔ گھریلو ملازم نو بجے کے بعد اپنے کوارٹروں سے باہر نہیں نکلتے۔"

"آئی سی۔" پستہ قد والے نے سیٹی بجاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "وہاں شاید ہٹ اینڈ رن کا ڈرٹی گیم کھیلا جاتا ہوگا۔"

دونوں محتاط انداز میں قدم اٹھاتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک سنگل اسٹوری بنگلے کی پشت پر پہنچ کر رک گئے۔ اس وقت رات کے گیارہ کا عمل تھا جبکہ اس پوش علاقے کے مکین نو بجے کے بعد اپنی اپنی خواب گاہوں کے دروازے بند کرلیتے تھے۔ صرف چوکیدار گیٹ پر پہرا دیتے نظر آتے تھے۔

مطلوبہ بنگلے کی عقبی سڑک بھی ویران تھی۔ سناٹے میں کبھی کبھی چوکیدار کی سیٹی کی آواز ضرور سنائی دے رہی تھی۔

دونوں افراد نے بڑے محتاط انداز میں پچویشن کا جائزہ لیا پھر یکے بعد دیگرے عقبی دیوار کی آٹھ فٹ بلندی کو ایک دوسرے کی مدد سے پھلانگ کر دوسری طرف اندر کود گئے۔ آؤٹ ہاؤس کے ایک کمرے کی کھڑکی کے شیشے روشن تھے جس کا مطلب یہی تھا کہ اندر کوئی موجود ہے۔ پستہ قد آدمی نے اپنا آٹومیٹک پستول جیب سے نکال لیا۔ دوسرے نے بھی اس کی پیروی کی۔ دونوں ہی میک اپ میں تھے اور انہوں نے اس قدر مہارت سے ظاہری شکل میں ایسی ردوبدل کی تھی کہ کوئی پرانا واقف کار بھی انہیں جگا یا لوچن کی حیثیت سے شناخت نہ کرپاتا۔

چند لمحے وہ دیوار کے ساتھ بیٹھے قرب و جوار کی سن گن لیتے رہے پھر محتاط انداز میں دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کھڑکی تک پہنچ گئے۔ جگا نے ایک پٹ پر دباؤ ڈالا لیکن کھڑکی اندر سے بند تھی۔ لوچن دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ جگا نے بھی اس کی پیروی کی۔ اس بار لوچن نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا زور لگایا۔ دروازہ بند نہیں تھا





اس لیے تھوڑا سا خلا پیدا ہو گیا۔

سامنے بیڈ پر ایک حسین اور جوان عورت موجود تھی جس کی عمر اٹھائیس اور تیس سال کے درمیان تھی۔ اس کے جسمانی نشیب و فراز میں قیامت کی کشش موجود تھی۔ لباس کی جگہ اس نے نائٹی پہن رکھی تھی جو ستر پوشی کے لیے بھی ناکافی تھی۔ جنس مخالف کے لیے اس کے اندر تمام رعنائیاں موجود تھیں لیکن اس وقت اس کی خوب صورت غلافی آنکھوں میں شدید نفرت اور الجھن کے تاثرات نمایاں تھے۔ بیڈ پر رکھے ہوئے گلاس بوتل کے ساتھ نظر آرہے تھے۔ دو گلاسوں میں شراب کی کچھ مقدار باقی تھی لیکن کرسیاں خالی تھیں۔

لوچن اور جگا نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر دونوں بیک وقت اپنا اپنا آٹومیٹک اٹھائے برق رفتاری سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ پل بھر میں دونوں کو اندازہ ہو گیا کہ کمرے میں عورت کے سوا کوئی نہیں ہے۔ عورت نے ان دونوں کو حقارت سے دیکھ کر گلاس میں بچی ہوئی شراب بھی حلق کے اندر انڈیل لی پھر نفرت سے بولی۔ "تم نے ہمارے رنگ میں بھنگ ڈال کر اچھا نہیں کیا۔"

"رنگ تو نظر آرہا ہے لیکن بھنگ......" لوچن نے اسے خشک اور سرد لہجے میں مخاطب کیا۔ "وہ کہاں گیا؟"

"تمہیں جس کی تلاش ہے وہ بھی آنکھیں کھلی رکھنے کا عادی ہے۔ اس کے ساتھی بھی دشمنوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔"

"تم کس کی بات کررہی ہو؟" جگا نے سوال کیا۔

"میرا اور اپنا وقت مت ضائع کرو۔" عورت نے بہ دستور جھلا کر کہا۔ "چاہو تو دوسرے کمرے میں جھانک لو پھر جتنی خاموشی سے آئے ہو اتنی ہی خاموشی سے الٹے قدموں واپس چلے جاؤ۔"

"اور اگر ہم اس کو خبر کردیں جس نے تمہاری صورت میں ناگن پال رکھی ہے۔" لوچن نے دکھتی رگ کو چھیڑنے کی کوشش کی تو عورت نے لات مار کر میز کو مع لوازمات کے فرش پر الٹ دیا۔ کسی زخمی ناگن کی طرح اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

"تم جس کو خبر کرنے کی بات کررہے ہو وہ بھی بے خبر نہیں ہے لیکن وہ زبان کھولنے کی جرأت کبھی نہیں کرے گا۔ موت سے وہ بھی گھبراتا ہے۔"

"پیاس شدت اختیار کرجائے تو مرد بھی تڑپ اٹھتا ہے۔" لوچن نے مسکرا کر کہا۔ "تم تو پھر عورت ہو لیکن ہمارا وہ ٹائپ نہیں ہے اگر ہوتا تو بھی ہم باسی مال پر ہاتھ نہ ڈالتے۔"

"بات بڑھانے کی کوشش مت کرو۔" عورت نے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔ "اگر مرد ہو تو اس کے تعاقب میں جاؤ جس کی تلاش میں تم یہاں نازل ہوئے تھے۔"

"اسے کیا نام دو گی ڈارلنگ جو دم دبا کر بھاگ گیا؟" لوچن نے سوال کیا تو عورت بپھر گئی۔

"وہ اصل مرد ہے جو چوروں کی طرح چھپ کر کسی کو نہیں مارتا۔ ہمیشہ شکار کو للکار کر موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔"

"تم جس مرد کے کھونٹے پر لال پیلی ہو رہی ہو اس کا نام لینے سے کیوں کترا رہی ہو؟" جگا نے بہ دستور بدلی ہوئی آواز میں عورت کے غصے کو ہوا دی تو وہ حلق کے بل چیخ کر بولی۔

"میں ناگی کی بات کررہی ہوں...... وہ ناگی جس نے پولیس کے کچھ افسروں کو بھی خرید رکھا ہے جو پالتو کتوں کی طرح اس کے اشاروں پر دم ہلاتے رہتے ہیں۔ اسی نے اس عزت دار صنعت کار کو بھی مجھ سے شادی کرنے پر مجبور کردیا جس نے دھوکے سے مجھے بے آبرو کیا تھا اور اب وہی باعزت صنعت کار یہ بھی جانتا ہے کہ میں ناگی کے اشارے پر کسی کو بھی گلے لگا سکتی ہوں اور کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"ناگی کی صحبت نے تمہیں قبل از وقت بہت سمجھدار بنا دیا ہے۔" لوچن نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "جب ناگی یہاں سے فرار ہوا تو اس نے تمہیں ہمارے نام بھی ضرور بتا دیے ہوں گے۔"

"نہیں۔" عورت بہ دستور جذباتی انداز میں بولی۔ "اس کے کسی مخبر نے یہی اطلاع دی تھی کہ دو زخمے بھیس بدل کر ادھر آرہے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد ناگی نے میری رہائش گاہ پر خون خرابا پسند نہیں کیا بلکہ خون کے گھونٹ پی کر چلا گیا۔"

"گڈ۔" جگا نے مسکرا کر کہا۔ "پھر تو تم اس مچھلی کو پکڑنے کی خاطر بطور چارا بھی ہمارے لیے کارآمد ہوسکتی ہو...... کیا خیال ہے؟"

"تمہارے اس ارادے کی اطلاع بھی ناگی تک پہنچ گئی ہوگی۔" عورت نے مسکرا کر کہا۔ "ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔"

لوچن کے چہرے پر اس آدم خور چیتے کی چمک ابھری جو اپنے شکار کو دیکھ کر ابھرتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے لپک کر عورت کو الٹے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ کر اس کے منہ پر ہاتھ کی گرفت بھی مضبوطی سے جما دی۔ گردن بھی ہاتھوں کے حصار میں تھی اس لیے عورت پنجرے میں پھنسے پنچھی کی طرح پھڑ پھڑانے لگی۔

"تم نے پکی گولیاں کھیلی ہوتیں تو ہمیں کسی خطرے سے آگاہ کرنے کی غلطی کبھی نہ کرتیں۔"

پھر اس سے پیشتر کہ جگا کوئی سوال کرتا، لوچن نے عورت کی داہنی کنپٹی پر کسی خاص نس پر انگوٹھے کو ایسے ماہرانہ انداز میں دبایا کہ عورت بے ہوش ہو کر جھول گئی۔ اسے فرش پر ڈالنے کے بعد لوچن نے جگا کا ہاتھ تھام کر سرسراتے لہجے میں کہا۔

"نکل چلو دوست ورنہ ہم پنجرے میں پھنس کر شکار بھی ہو سکتے ہیں۔"

"تمہیں اچانک اس کا اندازہ کیسے ہوا؟" جگا نے اس کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

"ڈرٹی وومن کے آخری جملے پر غور کرو۔" لوچن قدم مارتا بنگلے کی عقبی دیوار تک پہنچ گیا۔ "ہم جس کا شکار کرنے آئے تھے وہ بھی یہیں کہیں چھپا ہے، اس باسٹرڈ نے ہماری باتیں بھی ضرور سنی......"

لوچن جملہ مکمل نہ کر سکا، یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے تھے۔ گولیاں لوچن اور جگا کے قریب ہی چہار دیواری پر لگی تھیں۔ دونوں بڑی سرعت سے زمین پر بیٹھ گئے۔ لوچن نے آنے والی گولیوں کی سمت کا اندازہ کر کے دو فائر کیے پھر دونوں ہی نے اپنی پوزیشن بدل دی۔ ایک لمحے کی تاخیر کسی کی موت کا سبب بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

"گولیاں چلانے والے چھت پر موجود ہیں۔" لوچن کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ "شاید ان باسٹرڈز کے پاس ٹارچ نہیں ہے ورنہ وہ اندھیرے میں گولیاں ضائع کرنے کی حماقت نہ کرتے۔ فائرنگ کی آواز بنگلے کے چوکیداروں نے بھی ضرور سنی ہوگی۔ وہ بھی کسی وقت آ سکتے ہیں۔"

لوچن کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اندھیرے کے باوجود اس نے ایک چوکیدار کو اس کی یونیفارم کی وجہ سے پہچان لیا تھا۔ اس کی گرجتی ہوئی آواز ابھری۔

"ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ ورنہ ہم تمہیں بھون کر رکھ دیں گے۔"

"بلف کر رہا ہے بارکنگ ڈوگ۔" لوچن نے سرگوشی کی۔ "تمہارا کیا خیال ہے ہم رسک لے کر دیوار پھلانگ کر نکل چلیں یا پھر بازی پلٹنے کی کوشش کریں...... ایز یو وش۔"

جگا کی نظریں اس آواز کی سمت تھیں جہاں سے ہتھیار پھینکنے کی وارننگ دی گئی تھی۔ لوچن کی بات کا جواب دینے سے قبل ایک ٹارچ بھی روشن ہوئی، وہ جو بھی تھا سامنے دیوار کے کونے میں پوزیشن لیے ہوئے تھا۔ جگا نے اندازے سے روشن ٹارچ لیے ہوئے شخص پر فائر کیا۔ اس کا نشانہ خطا نہیں گیا۔ روشن ٹارچ زمین پر گر کر نشیب کی طرف لڑھک گئی۔ ساتھ ہی کسی کے کراہنے کی تیز آواز بھی ابھری۔ اس کے ساتھ ہی لوچن نے بھی پوزیشن تبدیل کرنے میں تاخیر نہیں کی۔

"سوپر فائن۔" لوچن نے مدھم لہجے میں کہا۔ "وہ باسٹرڈ قریب آنے کا رسک نہیں لیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں مخالف سمت سے گزر کر عمارت کے سامنے کی طرف پہنچنا چاہیے۔ ناگی یہاں مقابلہ کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔"

"وش آل دی بیسٹ۔" لوچن نے جواب دیا پھر دونوں ہی لپک کر عمارت کی دیوار تک گئے اور آہستہ آہستہ محتاط انداز میں قدم اٹھانے لگے۔

دس پندرہ منٹ تک کسی کی آواز نہیں سنائی دی۔ زخمی ہونے والا چوکیدار شاید دوبارہ اٹھ گیا تھا۔ اس کی مانوس آواز پھر ابھری۔

"تم جہاں بھی ہو نکل کر سامنے آ جاؤ۔ ہم نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے۔ مرنے سے بہتر ہے کہ گرفتاری دے دو۔"

جگا یا لوچن کسی نے جواب نہیں دیا۔ جگا پنجوں کے بل چل رہا تھا۔ اس نے اپنی حرکت تیز کر دی لیکن دس قدم بڑھنے کے بعد اسے رکنا پڑا۔ کوئی انسانی وجود زمین سے چپکا ہوا چہار دیواری کی سمت تیزی سے رینگ رہا تھا۔ جگا نے پستول والا ہاتھ فضا میں بلند کیا پھر رینگنے والے کی ٹانگ کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ ایک چیخ کی آواز کے ساتھ رینگتا ہوا وجود رک گیا پھر چیخ کر بولا۔ "گولی مت چلانا، تمہارا اصلی شکار نکل چکا ہے۔"

جگا نے تیزی سے پوزیشن تبدیل کی، اس نے زخمی کو جواب نہیں دیا۔ دو منٹ بعد لوچن بھی اس کے قریب آ گیا۔

"میرا خیال ہے کہ چوکیدار اور تمہاری گولی سے زخمی ہونے والے کے علاوہ اب اور کوئی عمارت میں موجود نہیں ہے۔ ہمیں اب اس چوہے دان سے فوری نکلنا چاہیے۔"

"زخمی کا کیا کریں؟"

"کوئنگ ڈسپوزل۔" لوچن نے نشانہ لے کر زخمی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے کے بعد جگا کا ہاتھ تھام لیا پھر وہ عقبی دیوار پھلانگ کر کچھ ہی دور گئے تھے کہ پولیس موبائل کے مخصوص سائرن کی آواز بھی سناٹے میں گونجنے لگی۔

☆☆☆





افضل خان نے شبنم کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا وہ اس بات کو نوٹ کر رہا تھا کہ سات روز کی وارننگ ملنے کے بعد سے شبنم کچھ فکر مند رہنے لگی تھی۔ اس وقت شام کے ناشتے کے وقت بھی چائے کا ایک گھونٹ لینے کے بعد بالکونی سے باہر کی سمت کچھ دیکھ رہی تھی جب افضل خان نے اسے سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"میں تمہارے بارے میں فکر مند ہوں۔"

"خود کو بلاوجہ ہلکان مت کرو۔ تم میرے ماضی سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔" افضل خان نے کہا۔ "میں نے اس وقت بھی کبھی غم پالنے کی غلطی نہیں کی تھی۔"

"جانتی ہوں لیکن اس وقت ہم دونوں کو جس کا تحفظ حاصل تھا اب وہی دشمن ہے۔ وہ وشنو کی موت کو آسانی سے ہضم نہیں کرے گا۔" شبنم نے بات جاری رکھی۔ "تم بھی واقف ہو گے، اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ ابھی تک قانون بھی اس کا کوئی سراغ پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"شاید اس وجہ سے کل تک جو سینہ تان کر سامنے پھرتا تھا اب وہ بھی کسی خوف کی وجہ سے ہی چوہے کے بل میں چھپا کہیں بیٹھا ہے۔"

"اس لیے محفوظ ہے لیکن ہم سامنے ہیں اور اندھیرے سے چلائی جانے والی کوئی گولی خدانہ کرے ہم دونوں کے لیے ہی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔"

"یہ بھی اچھا ہے کہ جینے کے علاوہ ہمارا مرنا بھی ایک ساتھ ہوگا۔" افضل خان نے شبنم کا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے کہا۔

"تمہیں جو مہلت ملی ہے اس میں دو دن اور باقی رہ گئے ہیں۔"

"پلیز......" افضل خان یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ "تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ پولیس کے سادہ لباس والوں کے علاوہ کرنل احتشام کے کچھ خاص لوگ بھی ہماری حفاظت پر مامور ہیں۔"

افضل خان مزید کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہو گئی۔ کرنل احتشام کے نمبر دیکھ کر اس نے موبائل آن کر لیا۔ سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"کوئی نئی ہدایت؟"

"یس...... حالات کی روشنی میں تمہارا اور شبنم کا ایک ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے۔" دوسری جانب سے سنجیدگی سے کہا گیا۔ "ایس پی اورنگ زیب کی بھی یہی رائے ہے کہ

## ساری بات نظر کی ہے

☆ آپ کسی انسان سے سب کچھ چھین سکتے ہیں لیکن اس کے جذبے کبھی نہیں۔

☆ ابلیس کا دوسرا نام شراب ہے

☆ ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے اور اسی حل کی موجودگی کے احساس کا نام امید ہے۔

☆ آدھی جنگ تو آپ اسی وقت جیت لیتے ہیں جب آپ اس یقین کے ساتھ میدان میں اترتے ہیں کہ یہ بازی آپ کی رہی۔

☆ سچ میں یہی تو ایک خرابی ہے کہ کبھی کسی کا بھرم نہیں رکھ پاتا۔

☆ اس زندگی کی حقیقت صرف اور صرف جدوجہد ہے۔

☆ عورت میں سے حیا کو نفی کر دیا جائے تو وہ محض ایک بے جان مورت ہے۔

☆ بیماری میں مر جاؤ احسان کی دوا مت کھاؤ۔

☆ کسی کا دل نہ دکھاؤ تیرے پہلو میں بھی دل ہے۔

☆ دولت کے بھوکے کو کبھی سکون نصیب نہیں ہوتا۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ



## خوبصورت باتیں

☆ عورت ٹھنڈا پانی ہے جو تشنگی کے وقت مرد کے لیے نہایت ضروری ہے۔

☆ عورت و محبت لازم و ملزوم ہیں۔

☆ عورت کا پیار اس چشمے کے مانند ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔

☆ پریم کس طرح کیا جاتا ہے یہ صرف ایک عورت ہی جان سکتی ہے۔

☆ عورت قدرت کی نہایت حسین اور خوبصورت تخلیق ہے۔

☆ دنیا میں سب سے بڑی آبی قوت عورت کے آنسو ہیں۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

تمہیں کہیں اور شفٹ کر دیا جائے۔ اس کے بعد تم ہمارے لیے کارآمد بھی ہو سکتے ہو۔"

"سوری کرنل۔" افضل خان نے سنبھل کر جواب دیا۔ "میں نے شبنم کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کر لینے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"گڈ نیوز...... کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

"ابھی تک کسی قاضی کا بندوبست نہیں ہو سکا ورنہ میں ایک پل کی دیر بھی نہ کرتا۔"

"اور اگر میں تمہاری یہ پرابلم حل کر دوں تو؟"

"پھر میں بھی آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کروں گا۔"

"او کے، میں تمہارے لیے یہ نیک کام ضرور کروں گا لیکن اس کے بعد تمہیں ایک اہم ذمے داری سنبھالنا ہوگی۔"

"آپ حکم دیں۔"

"وشنو کے سلسلے میں تمہاری کارکردگی شاندار رہی ہے اس لیے ہائی کمان نے تمہیں ایک اور کام کے لیے منتخب کیا ہے۔"

"میں زبان دے کر پیچھے ہٹنے کا عادی نہیں ہوں۔ آپ صرف ایک اشارہ کریں۔"

"ناگی کو جانتے ہو؟"

"کسی ناگ ہی کی طرح زہریلا اور خطرناک بھی ہے۔" افضل خان نے کھل کر بات کی۔ "یہ بھی گوش گزار کر دوں کہ پولیس کی کچھ کالی بھیڑیں بھی اس کی پشت پناہی کرتی ہیں۔"

"ہمارے پاس بھی یہی انفارمیشن ہے لیکن ناگی کو پٹارے میں بند کرنے کے لیے تمہیں پولیس کے مقابلے میں ہماری پروٹیکشن حاصل رہے گی۔ ایس پی سے بھی میری بات ہو گئی ہے۔"

"مجھے ایک شبہ اور بھی ہے۔" افضل خان نے کہا۔ "اسے سکندر علی شاہ کے علاوہ ممکن ہے شیخ حامد کی بھی حمایت حاصل ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ اور بڑے لوگوں نے بھی اس کی خدمات حاصل کر رکھی ہوں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں کوشش کروں گا کہ اسے للکار کر ہی ماروں۔"

"گڈ۔" دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

"وشنو کے بعد اب کرنل نے شاید تمہیں ناگی کے لیے آمادہ کیا ہے؟" شبنم نے کال ختم ہونے کے بعد افضل خان کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"تمہارا خیال درست ہے۔" افضل خان مسکرا کر جواب دیا۔ "جانتی ہو مجھے اس کام کا کیا معاو... ملے گا؟"

"میں تمہاری پوری بات توجہ سے سن رہی تھی... رہی ہوں کہ کرنل نے تم سے کیا وعدہ کیا ہے۔"

"اس کے بعد بھی خوش نہیں ہو؟"

"تم میرے لیے بہت قیمتی ہو افضل۔" شبنم... ہونٹ چباتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ "میں... تمہیں بڑی مشکلوں سے پایا ہے، اب پا کر دوبارہ کھونا... چاہتی۔"

"پا کر کھونا اور...... کھو کر پانا یہی تو زندگی کی ... سے بڑی کامیابی ہوتی ہے۔"

"کرنل نے شاید تم سے کوئی اور اہم بات بھی... تھی؟ غالباً وقتی طور پر مجھ سے دور رہنے کی؟"

"یہ وقتی دوریاں ہی انسانی رشتوں کو ایک دوسر... سے زیادہ مربوط کرتی ہیں۔" افضل خان نے شبنم کے قری... ہو کر اس کو بڑی احتیاط اور محبت سے بانہوں میں سمیٹا تو... بھی کسمسا کر رہ گئی۔

☆☆☆

سکندر علی شاہ کسی زخمی درندے کے انداز میں... خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا۔

فارم ہاؤس میں ماروی کے ساتھ شروع ہونے... کہانی سے لے کر دلربا کے اغوا ہو جانے تک کے... واقعات دہکتی چنگاریوں کے مانند اس کے وجود میں چ... تھے۔ اس کا ذہن ان کی بکھری ہوئی کڑیوں کو ملانے... سلسلے میں اور الجھتا جا رہا تھا۔

ماروی کو بے آبرو کرنے کے سلسلے میں چوکیدا... خودکشی اور اس کے ساتھی کا بیان بھی ابھی تک اس کے... کے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ مرنے والا کھرا آدمی تھا،... سکندر علی شاہ کے اعتماد پر پورا اترتا تھا پھر اس نے کس... خوف سے خودکشی کر لی؟ وہ کون تھا؟ فارم ہاؤس میں... طرح داخل ہوا؟ کس طرح سب کی نظروں میں... جھونک کر نکل گیا؟ حالات کی کڑیاں ملاتے ہوئے اس... ذہن میں گونگے کا خیال ابھرا تھا۔ وہ مجرد زندگی گز... تھا۔ ممکن ہے ماروی کو دیکھ کر اس کے جذبات بھڑک... ہوں لیکن اس شبہے کی تردید دلربا کے بیان سے ہو گئی... نے کہا تھا کہ ماروی کو بے آبرو کرنے والے نے بڑا جا... طرز عمل اختیار کیا تھا۔ اپنی پیاس بجھانے کے بعد ا...





ماروی کو یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر اس نے زبان کھولنے کی جرأت کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا پھر چوکیدار کی خودکشی اور اعتراف جرم کے بعد سکندر علی شاہ نے بھی اس کہانی کو کریدنے کی کوشش نہیں کی مگر اب......!

اب حالات نے پے در پے جو رخ بدلا تھا وہ اس کے لیے قابل برداشت نہیں تھے۔ نگینہ اس کے لیے زیادہ اہم نہیں تھی۔ جس وقت رینبو کلب سے اغوا کیے جانے کے بعد اس کا برہنہ گفٹ پیک ملا تھا اسی وقت سکندر علی شاہ نے اس کے ٹکڑے کر کے سمندر برد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر شگرہ بروقت آڑے نہ آجاتا تو اب تک آدم خور مچھلیاں بھی اس کو ہضم کر چکی ہوتیں۔ اپنے انجام کا اندیشہ خود نگینہ کو بھی تھا جو موقع ملتے ہی فرار ہو گئی لیکن حویلی سے نکل کر کہاں گئی؟ کسی نہ کسی نے اسے پناہ دی ہوگی اسے...... وہ کون تھا؟

دلربا کے اغوا کی اطلاع اسے پہلے شگرہ نے دی پھر ایس پی اورنگ زیب نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ سکندر علی شاہ کو علم تھا کہ ماروی سے ملاقات کے بعد دلربا بھی ایجنسی کے لوگوں کی نظروں میں آگئی تھی۔ اورنگ زیب کے سادہ لباس والے اس کی خفیہ نگرانی پر مامور تھے لیکن شگرہ کو اس کے اغوا کی خبر کہاں سے ملی؟ اگر اس کے کچھ شکاری کتے بھی دلربا کے تعاقب میں دم ہلا رہے تھے تو انہوں نے اس کے اغوا میں مزاحمت سے گریز کیوں کیا؟

"شیلا ورما اور جونی۔" سکندر علی شاہ کے ذہن میں یہ دونوں نام گونجے تو اس کے اندر ابلتا ہوا لاوا پھٹ پڑا۔ جونی اور نگینہ کے تعلقات کا شبہ اسے پہلے بھی تھا۔ اب اس شبہے نے ایک نئے زاویے سے سر ابھارا تو اس نے جھپٹ کر فون اٹھا لیا۔ اسے علم تھا کہ بیوٹی پارلر کی آڑ میں شیلا ورما کیا دھندا کر رہی تھی۔ ایک بار شگرہ نے بھی کہا تھا کہ نگینہ کو جونی اور بیوٹی پارلر سے دور رکھا جائے۔ شیلا ورما کے نمبر ڈائل کرتے وقت بھی سکندر علی شاہ اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

"ہیلو۔" رابطہ قائم ہوتے پر شیلا ورما کی سریلی آواز ابھری۔

"سکندر علی شاہ بول رہا ہوں، جونی کہاں ہے؟"

"آپ حکم دیں جونی سے کیا کام پڑ گیا؟" اس بار بڑی اپنائیت سے دریافت کیا گیا۔

"تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہاری سفارش پر جونی کو......"

"میں احسان فراموش نہیں ...... آپ کی غلام ہوں۔" شیلا ورما نے بات کاٹ کر اعتراف کیا۔ "آپ کی خدمت کرنا میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ جونی سے آپ کو کیا کام پڑ گیا؟"

"تم جونی پر کس حد تک اعتبار کرتی ہو؟"

"اوہ......" شیلا ورما نے اس بار سکندر علی شاہ کے لہجے کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "میرا خیال ہے کہ شاید آپ کو جونی سے کوئی شکایت ہو گئی ہے؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" سکندر علی شاہ نے جھلا کر کہا۔ "کیا وہ کبھی نمک حرامی کا ثبوت دے سکتا ہے؟"

"اسے اپنا پالتو کتا ہی سمجھیں شاہ جی۔" شیلا ورما نے جواب دیا۔ "آپ کے اشارے پر وہ دم ہلانے کے علاوہ اور کسی بات کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

"تم جانتی ہو کہ جونی اور نگینہ کے درمیان کس قسم کے مراسم تھے؟"

"میں کسی قسم کی صفائی نہیں پیش کروں گی۔ صرف ایک عرض کروں گی کہ نگینہ نے اسے مجبور کیا تھا۔ آپ بھی

جانتے ہیں کہ نگینہ پہلے کیا تھی۔"

"اوقات سے بڑھنے کی کوشش دوبارہ کبھی نہ کرنا۔" سکندر علی شاہ نے حقارت آمیز اور درشت لہجہ اختیار کیا پھر کچھ توقف سے بولا۔ "میں جس کی بات کر رہا ہوں وہ اب میرے کام کی نہیں رہی۔ اسے ہر قیمت پر تلاش کر کے ڈسپوز کرنا ہے۔"

"اوہ...... میں سمجھ گئی، آپ مطمئن رہیں۔ میں ذاتی طور پر بھی آپ کے کام آنے کی کوشش کروں گی۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اس معاملے سے جونی کو الگ رکھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

"ٹھیک ہے مگر ایک بات ذہن نشین کرلو...... یہ بات دوسروں کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیے۔"

سکندر علی شاہ نے دبی زبان میں وارننگ دینے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا پھر اس کا ذہن دوبارہ حالات کی بکھری ہوئی کڑیاں ملانے میں مصروف ہوگیا۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر شکرہ، اورنگ زیب اور فارم ہاؤس کا تکون چکرا رہا تھا۔ نگینہ اور دلربا سے زیادہ اسے اپنی عزت اور حیثیت کا احساس تھا۔

اس نے اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا تھا وہ جس مقام تک پہنچا تھا اس میں کسی نامعلوم آدمی نے اندھیرے میں رہ کر کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اب وہ شکرہ کے نام سے خود کو متعارف کروا چکا تھا لیکن شکرہ ایک فرضی نام تھا۔ اس کی اصلیت کیا تھی؟ وہ کون تھا؟ پردے میں بیٹھ کر وہ کس مقصد سے حکم چلا رہا تھا۔ دلربا اور نگینہ میں دلچسپی لینے کی اسے کیا ضرورت تھی؟ ماروی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بعد جب سکندر علی شاہ نے گونگے سے باز پرس کی تھی اس وقت بھی شکرہ نے گونگے کی حمایت کی تھی۔ یہ بھی کہا تھا کہ اصلی مجرم چوبیس گھنٹے تک کیفر کردار تک پہنچ جائے گا۔ اس فون کال کے بعد ہی ایک چوکیدار نے خودکشی کرلی تھی۔ مرنے سے پیشتر اس نے ماروی کو بے آبرو کرنے کا اعتراف بھی کیا تھا۔

سکندر علی شاہ کو مرنے والے پر پورا اعتماد تھا اس لیے وہ اس کی خودکشی کو ہضم نہیں کر سکا مگر اب یہ خیال اس کے ذہن میں رہ رہ کر ابھر رہا تھا کہ شکرہ کو فارم ہاؤس کے اندر اور باہر ہونے والے تمام حادثات کی اطلاع کس طرح پہنچ جاتی تھی؟ وہ حویلی کے اندر ہونے والی سرگوشیوں سے بھی واقف ہو جاتا تھا۔

اورنگ زیب کو فارم ہاؤس بلا کر بلیک میلنگ کا پروگرام بھی شکرہ کا منصوبہ تھا لیکن دلربا کے اغوا کے بعد اس نے پروگرام کو وقتی طور پر ملتوی کروا دیا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا دلربا کے اغوا سے اورنگ زیب کو جال میں پھانسنے کا تعلق تھا؟ شکرہ کے بعد اورنگ زیب نے بھی دلربا کے اغوا کی تصدیق کردی تھی۔ سکندر علی شاہ کو بھی اس بات کا علم تھا کہ اورنگ زیب کے سادہ لباس والے دلربا کی نگرانی پر مامور تھے پھر انہوں نے دلربا کے اغوا کو ناکام بنانے میں کیا کردار ادا کیا؟

اگر وہ خاموش تماشائی بنے رہے تو پھر نگرانی کا کیا جواز ہوسکتا تھا؟ اس زاویے سے شکرہ اور اورنگ زیب کی شخصیتوں کو بھی یا تو ایک ہی تصویر کے دو رخ کہا جا سکتا تھا یا پھر ان دونوں کا آپس میں ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا؟ مگر اس تعلق کی نوعیت کیا تھی؟

سکندر علی شاہ کے وجود میں شکوک وشبہات کا یہ سلسلہ جاری تھا جب فون پر اسے شکرہ کی کال موصول ہوئی۔ جس کے سبب اس کی پیشانی پر نفرت کی شکنیں بھی پھیل کر گہری ہوتی چلی گئیں۔

"اس وقت کیسے یاد کیا؟" وہ روانی میں کہہ گیا۔

"تم......" دوسری جانب سے شکرہ کی آواز میں تناؤ کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی۔ "مجھ سے گفتگو کرتے وقت محتاط انداز اختیار کیا کرو۔ میں بے تکلفی پسند نہیں کرتا۔" جواب میں سکندر علی شاہ ہونٹ کاٹنے لگا۔

"دلربا کے بارے میں تم نے کیا معلومات حاصل کیں؟"

"ابھی میں نے اس معاملے میں زبان کھولنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"کیوں؟"

"مجھے اپنی حیثیت کا خیال بھی لاحق ہے۔" سکندر علی شاہ نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ "میڈیا کے بلیک میلر ایسی کہانیوں کو اچھالنے میں دیر نہیں کرتے۔"

"میں تمہارے خیال سے متفق ہوں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ تم نے کچھ لوگوں کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔"

"آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے؟"

"پالتو کتوں کو بھی دن میں ایک دو بار زنجیر پہنانی ضروری ہوتی ہے ورنہ وہ بھی اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔" شکرہ نے سرد لہجے میں بات جاری رکھی۔ "میں ناگی کی بات کر رہا ہوں جسے تم اپنا دست راست سمجھتے ہو۔"

"اس وقت ناگی درمیان میں کیسے آگیا؟"



"سیٹھ حمدان کا نام ضرور سنا ہوگا؟"

"یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا اصلی نام احمد عدنان تھا۔ ایک آبرو باختہ ایرانی عورت ثمرہ شیرازی سے شادی کرنے کے بعد وہ احمد عدنان سے حمدان بن گیا۔"

"اب میری بات کان کھول کر سنو۔" اس بار شکرہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "احمد عدنان یا حمدان نے ناگی کے زور دینے کے بعد ہی اس فاحشہ سے شادی کی تھی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا جب دو شکاری کتے ناگی کا تعاقب کرتے ہوئے اس کوٹھی تک پہنچ گئے تھے جہاں تمہارا ناگی اسی عورت کے ساتھ موجود تھا۔ اتفاق ہی سمجھو کہ وہ بروقت وہاں سے بچ کر نکل گیا۔ اگر مار دیا جاتا تو شاید تمہاری دلربا کا اغوا بھی نہ ہوتا۔"

"دلربا کا اس عورت سے کیا تعلق تھا؟" سکندر علی شاہ نے چونک کر سوال کیا۔

"کچھ بھی نہیں، لیکن ناگی نے ان دونوں بدمعاشوں کو ٹریپ کرنے کی خاطر اپنے کسی ہم شکل کو ایک بدمعاش کے میک اپ میں دلربا کے پاس بھیجا تھا۔ تم بھی واقف ہوگے کہ ماروی سے ملاقات کے بعد ایس پی کے سادہ لباس والے دلربا کی نگرانی پر مامور تھے۔ ناگی ان کی نظر میں آگیا تھا۔ اس کے بعد ناگی کے دو تین آدمی بھی مارے جا چکے تھے اسی وقت دلربا کا اغوا بھی عمل میں آگیا۔"

"اس کے اغوا میں کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟"

"میرا شبہ ایس پی پر ہی ہے لیکن تم صرف ناگی کے گلے میں زنجیر ڈالنے کی کوشش کرو۔"

"کیا ہم دشمن کو اسی کے جال میں پھانسنے کی کوشش نہیں کر سکتے؟" سکندر علی شاہ نے مشورہ دیا۔ "اگر ہم ایس پی کو فارم ہاؤس بلا کر ٹریپ کریں تو پھر وہ بھی ہمارے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"ایس پی کا پروگرام میں نے وقتی طور پر ملتوی کر دیا ہے۔" شکرہ نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "تم ناگی کو نکیل ڈالنے کی فکر کرو۔ ورنہ مجھے ایس پی کے ساتھ ساتھ اسے بھی بساط سے ہٹانا پڑے گا۔ ایک بات اور...... آئندہ مجھ سے گفتگو کرتے وقت اپنی اوقات کا خیال ضرور رکھنا۔" دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو سکندر علی شاہ کے اندر دبی ہوئی چنگاریاں پھر شعلوں کا روپ اختیار کرنے لگیں۔ شکرہ کے آخری جملوں نے جیسے جلتے توے پر پانی کے ایک چھینٹے کا ہی کام کیا تھا۔

سکندر علی شاہ نے جس مقام کو حاصل کیا تھا اس میں شکرہ کی مالی امداد کے علاوہ خود اس کی ذاتی صلاحیتوں کا بھی دخل تھا۔ حکومت کے بلند ترین حلقوں میں دور دور تک اس کی پہنچ تھی۔ ڈبا پیر ہونے کے باوجود اس کے مریدوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ مالی حیثیت سے بھی وہ اس پوزیشن میں تھا کہ کسی بھی چیز کو خرید کر اسے حقارت سے کسی کچرا کنڈی میں پھینک سکتا تھا۔ کسی مخالف کی سمت ایک اشارہ بھی کر دیتا تو اس کے مرید ہی اس کی تکا بوٹی کرنے کے لیے کافی ہوتے۔ سرکاری مشینری بھی حرکت میں آجاتی لیکن وہ ہواؤں سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ اندھیروں میں کسی دشمن کو تلاش کرنا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا اور شکرہ...... وہ جو بھی تھا ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ ایسی صورت میں سکندر علی شاہ کی بے بسی بھی کسی کام نہیں آسکتی تھی۔ وہ اس نادیدہ دشمن کی شان میں مغلظات بکتا رہا پھر اس نے موبائل پر ناگی سے رابطہ قائم کیا۔

"خادم بول رہا ہوں شاہ جی۔"

"ثمرہ شیرازی کا نام کبھی سنا ہے؟"

"سیٹھ حمدان کی دوسری بیوی ہے لیکن اس کا ماضی......"

"تم اسے کس حیثیت سے جانتے ہو؟"

"شادی سے پہلے اس کے میرے ساتھ بھی کچھ مراسم رہ چکے ہیں۔" ناگی نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"اب بھی ہیں؟" سکندر علی شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ بھی جانتا ہوں کہ ابھی حال ہی میں تمہارے کچھ



## مہکتی کلیاں

☆ محبت کتنی طاقتور ہے جو کسی بھی لمحے ایک وحشی انسان کو انسان اور ایک انسان کو حیوان بنا دیتی ہے۔

☆ محبت کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں شاید اس لیے کیوپڈ کو تصویر میں اندھا دکھایا گیا ہے۔

☆ محبت ست کا پیشہ جنگجو کے لیے الجھن ہے اور حکمرانی کے لیے ٹھوکر۔

☆ محبت کا ایک گھنٹا سو برس کی بے محبت زندگی سے بہتر ہے۔

☆ محبت اور عداوت کبھی پوشیدہ نہیں رہتی۔

☆ محبت ایک نورانی کلمہ ہے جسے نورانی ہاتھ نے نورانی کاغذ پر لکھا ہے۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

پرانے رقیب ثمرہ شیرازی کی کوٹھی تک بھی پہنچ گئے تھے۔"
"میں انکار نہیں کروں گا شاہ جی۔ ثمرہ کی کوٹھی نہ ہوتی تو میں ان سے اپنا کچھ پرانا حساب بھی چکتا کر دیتا۔"
"مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہے لیکن ایک اور بات کی تصدیق بھی کرنی ہے۔"
"میں اس کے لیے بھی معذرت خواہ ہوں۔" ناگی نے خود ہی اعتراف کیا۔ "میں نے اپنے حلیے میں کسی خاص آدمی کو دلربا کی رہائش گاہ تک بھیجا تھا مقصد ان ہی دشمنوں کو پھانسنا تھا لیکن اس کوشش میں میرے دو تین بندے بھی ضائع ہو گئے۔"
"لعنت بھیجو ان پر۔" سکندر علی شاہ نے تلملا کر کہا۔ "مجھے دلربا کے اغوا کی فکر ہے۔ تم حماقت نہ کرتے تو شاید ایسا نہ ہوتا۔"
"میں معافی چاہتا ہوں شاہ جی۔ یہ عرض کر دوں کہ میرے آدمی دلربا کی تلاش میں کونا کونا چھانتے پھر رہے ہیں......"
"کوئی سراغ ملا یا نہیں؟"
"ہوسکتا ہے کہ میری اطلاع غلط ہو لیکن میرا خیال ہے کہ اس اغوا کے پیچھے کسی نہ کسی ایجنسی کا ہاتھ بھی ہوسکتا ہے جس نے اغوا کر کے کہیں انڈر گراؤنڈ کر دیا ہے۔"
"ناگی......" اس بار سکندر علی شاہ نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں یہ آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک حکم اور سن لو مجھے دلربا ہر قیمت پر واپس چاہیے۔ ناکامی کی بات زبان پر نہ لانا ورنہ تم بھی جانتے ہو کہ میرا ایک اشارہ ہی تمہارے لیے کافی ہوگا۔" پھر سکندر علی شاہ نے جواب کا انتظار کیے بغیر لائن کاٹ دی۔ اس کے ذہن میں ایک بار پھر شگرہ کا تصور ڈنک مارنے لگا جو اندھیرے میں ہونے کی وجہ سے اس کی دسترس سے باہر تھا۔

☆☆☆

اورنگ زیب نے اب تک خود کو سراج کے مکان تک محدود کر رکھا تھا لیکن باہر کیا ہو رہا تھا؟ ایک ایک پل کی اطلاع اسے پینتھر اور دوسرے سادہ لباس والوں کے ذریعے مل رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھا حالات کے تیزی سے بدلتے گراف کا اندازہ لگا رہا تھا جب سراج آگیا۔ اس کے چہرے سے الجھن مترشح تھی۔
"خیریت؟" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے سوال کیا۔
"آپ کی غیر حاضری سے ہمارے آئی جی صاحب کے پیٹ میں کچھ زیادہ مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ آج بھی دو بار فون آیا تھا۔"
"پریشان مت ہو۔ تم بھی واقف ہو کہ وہ کسی اور دشمن کے اشاروں پر کھیل رہا ہے۔"
"لیکن جو لوگ سائے کی طرح ہمارے پیچھے ہیں کیا وہ اس بات سے واقف نہیں ہوں گے کہ آپ کہاں ہیں؟"
"ضرور واقف ہوں گے لیکن وہ یہاں تک آنے کی غلطی نہیں کریں گے۔"
"وہ کیوں؟" سراج نے پہلو بدل کر حیرت کا اظہار کیا۔
"مجھے خود سے زیادہ مخبر اور الماس کا خیال بھی تھا اس لیے میں نے چاروں طرف اپنے سادہ لباس والے کمانڈوز کو تعینات کروا دیا ہے۔ ویسے بھی وہ ابھی براہ راست مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی غلطی نہیں کریں گے۔"
"کیا یہ آپ کی خوش فہمی نہیں ہے؟"
"ہو بھی سکتی ہے لیکن جو اللہ نے لکھ دیا ہے وہ کبھی ٹل نہیں سکتا۔" اورنگ زیب نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔
"جس نوجوان کو عثمان کے آفس میں لیاقت حسین کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا تھا اس نے کیا اگلا؟"
"وہ ناگی کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ اپنی بہن کے اغوا کے بعد ناگی کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہو گیا مگر پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ عادی بھی بن گیا۔"
"کیا اس کی بہن واپس مل گئی؟"
"ہاں لیکن اب اس کے خلاف جو ثبوت ناگی کے پاس ہیں اس کے پیش نظر وہ ہر حکم ماننے پر مجبور ہے۔"
"سکندر علی شاہ نے جو پروگرام عارضی طور پر ملتوی کیا ہے اس کی بھی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔"
"ہوسکتا ہے وہ دلربا اور نگینہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد الجھ گیا ہو۔ ممکن ہے کہ اس نے آکٹوپس کے اشارے پر ایسا کیا ہو۔"
"گویا آپ تسلیم کر رہے ہیں کہ سکندر علی شاہ اور آکٹوپس ایک دوسرے سے واقف ہیں۔"
"نہیں۔" اورنگ زیب نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں اب بھی یہی کہوں گا کہ سکندر علی شاہ براہ راست اس بات سے واقف نہیں ہے کہ آکٹوپس کس چیز کا نام ہے۔" سراج کچھ کہنا چاہتا تھا کہ راحیلہ بیگم کا فون آگیا۔
"آپ کیسی ہیں اور عثمان؟"
"عثمان کل رات سے غائب ہیں۔" راحیلہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔





"اور آپ اس کی اطلاع مجھے اس وقت دے رہی ہیں؟"
"پولیس اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکے گی۔ عثمان مجھ سے خفا ہو کر گئے ہیں۔"
"کیا بات ہو گئی؟" سراج نے پوچھا۔ "وہ تو ہمیشہ آپ کے گن گاتا ہے۔"
"اصل سبب بھی آپ ہی ہیں۔" اس بار راحیلہ نے بڑی معصومیت سے شکایت کی۔ "آپ اتنے دنوں سے کہاں غیر حاضر ہیں؟"
"میں اپنا جرم تسلیم کرتا ہوں لیکن کچھ سرکاری کام کی مصروفیت کی وجہ سے وقت نہیں نکال سکا۔"
"میں نے بھی اس وقت ایک اہم بات کے لیے فون کیا ہے۔ کل رات نگینہ کا فون ہاسٹل سے آیا تھا۔ اس نے اس بات کا شبہ ظاہر کیا ہے کہ وہاں بھی اس کی زندگی کو خطرہ ہے۔ یہ بات مجھے میڈم روبی نے بتائی ہے، کسی خاص وجہ سے انہوں نے براہ راست آپ کو فون نہیں کیا۔"
"کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی؟"
"نہیں، لیکن وہ خاصی پریشان لگ رہی تھیں۔ میڈم کا یہی اصرار تھا کہ میں پہلی فرصت میں آپ کو اطلاع دے دوں۔"
"ٹھیک ہے، میں اس سے مل لوں گا۔"
"لیاقت حسین بھی آپ کی طرف گیا ہے۔ شاید اسے آپ کے اورنگ زیب صاحب نے کسی خاص کام کی وجہ سے طلب کیا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔" سراج نے سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اورنگ زیب کو نگینہ کے فون کے بارے میں بتایا پھر جب لیاقت حسین کی بات کی تو اورنگ زیب نے حیرت کا اظہار کیا۔
"میں نے لیاقت حسین کو فون نہیں کیا تھا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ میڈم روبی نے براہ راست فون کرنے سے گریز کیوں کیا۔ کیا اسے پھر کسی قسم کا خطرہ لاحق ہے؟"
"میرا خیال ہے کہ یکے بعد دیگرے نگینہ اور دلربا کے اغوا نے سکندر علی شاہ کے علاوہ کچھ اور لوگوں کو بھی ضرور چونکا دیا ہوگا۔ آپ کے ریسٹ ہاؤس جانے والا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا۔"
"اور لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟"
"آپ کا آکٹوپس جو بلاواسطہ یا بالواسطہ سکندر علی شاہ کو اپنے اشاروں پر نچاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسی کے اشارے پر ریسٹ ہاؤس والا پروگرام بھی التوا کا شکار ہو گیا ہو۔"
"کسی وقت الماس سے اپنی نظر اتروا لینا۔" اورنگ زیب نے ستائشی انداز میں کہا پھر لیاقت حسین کے آنے کی اطلاع پا کر وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آگئے۔
"کیسے ہو لیاقت حسین؟" سراج نے اسے مخاطب کرنے میں پہل کی۔
"اللہ کا کرم ہے جو بھلا چنگا ہوں۔"
"ہمیں وقتی طور پر پھر تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں دو چار دن ہمارے ساتھ ہی رہنا پڑے۔" اورنگ زیب نے کہا۔
"آپ خدمت کا موقع دیتے ہیں یہ بھی میری عزت افزائی ہے۔"
"تمہیں معلوم تو ہوگا کہ اس وقت ہمیں کہاں چلنا ہے؟" سراج نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔
"مجھے صرف آنے کا حکم ملا تھا۔" اس نے اورنگ زیب کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ "کسی جگہ کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا۔"
"ٹھیک ہے، میں تیار ہو کر آتا ہوں۔" اورنگ زیب اٹھ کر اندر چلا گیا۔ دو منٹ بعد اس نے سراج کو بلا لیا پھر بڑے معنی خیز انداز میں بولا۔ "گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ہوسکتا ہے لیاقت حسین کو مس جوزف کے وومن ہاسٹل کا خیال آجائے۔"
"میں سمجھا نہیں؟" سراج نے وضاحت طلب انداز میں دریافت کیا۔
"تم نے بتایا تھا کہ کچھ غیبی طاقتیں لیاقت حسین کی رہنمائی کرتی ہیں۔ میرے فون کے بغیر لیاقت حسین نے میرا حوالہ دیا ہے تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔"
"ہوسکتا ہے۔" سراج نے پرخیال انداز میں جواب دیا۔
کچھ دیر بعد سراج اور اورنگ زیب باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ لیاقت حسین نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اورنگ زیب نے مس جوزف کے ہاسٹل کے علاقے میں واقع ایک معروف سپر اسٹور پر چلنے کو کہا تو گاڑی میں حرکت میں آگئی۔ راستے میں ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا پھر اس وقت سراج کو بھی تعجب ہوا جب لیاقت حسین نے سپر اسٹور کے سامنے سے گزرنے کے بعد گاڑی مس جوزف کے ہاسٹل کے برابر بنے ہوئے ایک میڈیکل اسٹور پر روکی اور تیزی سے نیچے اتر کر اس آدمی کے قریب چلا گیا جو میڈیکل اسٹور کے باہر اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ لیاقت حسین نے اس کے قریب پہنچ کر اچانک اسے اپنی گرفت میں لیا تو اورنگ زیب اور سراج

بھی گاڑی سے اتر کر قریب چلے گئے۔

"خنزیر کا تخم، اب بولو تم ادھر کس کا انتظار کر رہا ہے؟"

"تہذیب سے بات کرو، تم کون ہو؟"

"ہم تمہارا باپ ہے ولد الحرام۔" لیاقت حسین نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر کے کرخت لہجے میں کہا۔ "تم بتاؤ، تم ادھر کس کا انتظار کر رہا ہے؟"

لیاقت حسین جس انداز میں نوجوان سے دست و گریباں ہوا تھا اسے دیکھ کر کچھ راہ گیر بھی رک گئے۔ میڈیکل اسٹور کے ملازموں کے علاوہ قریب ہی کھڑا ایک کانسٹیبل بھی قریب آ گیا۔ وہ لیاقت حسین کی طرف بڑھ رہا تھا جب سراج نے اسے روک دیا۔ اپنی شناخت کروائی تو کانسٹیبل نے سیلیوٹ کرنے کے بعد کہا۔

"میرے لیے کوئی حکم؟"

"اس بات کا خیال رکھو کہ یہاں مجمع نہ ہونے پائے۔" اورنگ زیب نے تحکمانہ لہجے میں کہا پھر وہ قدم اٹھاتا لیاقت حسین کے قریب جا کر بولا۔

"یہ کون آدمی ہے لیاقت حسین؟"

"آپ ہاسٹل کے اندر جاؤ صاحب۔" لیاقت حسین نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ "جس کو یہاں جان بچانے کے لیے رکھا گیا اس عورت کا زندگی خطرے میں ہے اور یہ...... بدذات بھی اس عورت کا ساتھی ہے جو یہاں کام کرتی ہے۔"

اورنگ زیب کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ سراج کو رکنے کا اشارہ کرتا ہوا تیزی سے مس جوزف کے ہاسٹل میں داخل ہوا۔ مس جوزف تک رسائی حاصل کرنے میں اسے بہ مشکل پانچ منٹ لگے تھے۔ اورنگ زیب نے تعارف کروایا تو مس جوزف خود اس کے ساتھ اٹھ کر فرسٹ فلور کے اس کمرے تک گئی جہاں نگینہ کو رکھا گیا تھا مگر اندر قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ نگینہ اپنے بستر کے بجائے فرش پر چت پڑی تھی۔ اس کے منہ سے خارج ہونے والا جھاگ بتا رہا تھا جو سریع التاثیر زہر اسے دیا گیا تھا وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ کچھ دیر بعد ہاسٹل کی ریذیڈنٹ لیڈی ڈاکٹر نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ اس کے بعد اس لیڈی ورکر کو حراست میں لے لیا گیا جو فرسٹ فلور پر رہائشی لڑکیوں کے کمرے کا خیال رکھتی تھی۔ تھوڑی سی مزاحمت کے بعد اس نے بھی اپنا جرم تسلیم کر لیا۔ یہ بھی انکشاف کیا کہ جو شخص باہر موجود ہے اسی کے کہنے پر اس نے وہ دوا نگینہ کو پلائی تھی۔ یہ بھی اقرار کیا کہ اگر وہ اس کا حکم نہ مانتی تو خود اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔

اورنگ زیب نے مس جوزف کے آفس میں آ کر ملحقہ تھانے کے انچارج کو طلب کیا۔ ساری صورت حال بتانے کے بعد یہ تاکید بھی کر دی کہ اس کا اور سراج کا نام کہیں درمیان میں نہ آنے پائے۔ تھانہ انچارج نے باہر موجود نوجوان کو بھی حراست میں لے لیا۔ مس جوزف نے بھی تھانہ انچارج سے یہی درخواست کی تھی کہ اس کے ہاسٹل کا نام درمیان میں نہ آنے پائے ورنہ اس کی ساکھ کو نقصان پہنچے گا۔

"میں کوشش کروں گا لیکن وعدہ نہیں کر سکتا۔"

اورنگ زیب تھانہ انچارج کو علیحدگی میں کچھ مزید ہدایات دینے کے بعد باہر آیا تو سراج اس کا بے چینی سے منتظر تھا۔ لیاقت حسین ڈرائیونگ سیٹ پر بڑے سکون سے بیٹھا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے جو کچھ ہو چکا اس کے بارے میں اسے مطلق کوئی علم نہیں تھا۔ پولیس کے آ جانے سے باہر مجمع بھی منتشر ہو چکا تھا۔

اورنگ زیب اور سراج کے گاڑی میں گھر جانے کے بعد بھی لیاقت حسین گم صم ہی رہا پھر اس نے حسب پروگرام سپر اسٹور پر گاڑی روکی تو اورنگ زیب نے کوئی اعتراض نہیں کیا، سراج کو لے کر سپر اسٹور میں چلا گیا۔

"یہ سب کچھ میرے لیے حیرت انگیز ہے۔ لیاقت حسین کا کسی غیبی قوت کے اشارے پر عمل کرنا، پھر سب کچھ یکسر بھول جانا۔ سائنس کے حیرت انگیز تجربات میں بھی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔"

"اس لیے کہ سائنس کا تعلق بھی اسی کائنات سے ہے جس کا خالق نیلی چھتری والا ہے۔" سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اور اس کی مصلحتیں اس کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ جن و ملک بھی اس کے آگے لاچار ہیں۔ میں نے اسی وجہ سے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ فارم ہاؤس جائیں تو لیاقت حسین کو ضرور ساتھ رکھیں۔" اورنگ زیب نے اثبات میں سر ہلایا پھر اس نے موبائل نکال کر سکندر علی شاہ کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری گھنٹی پر رابطہ قائم ہو گیا تو اس نے بڑی رازداری سے کہا۔

"آپ کا دوست بول رہا ہوں۔"

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے دوست تسلیم کر لیا۔"

"میں آپ سے نگینہ کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں اگر براہ راست بات ہو جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے ابھی تک کھلے دل سے مجھے اپنا دوست تسلیم نہیں کیا۔" اورنگ زیب کے لہجے میں کاٹ تھی۔

"میں سمجھا نہیں۔" سکندر علی شاہ نے اس بار بھی تجاہل عارفانہ سے کام لیا تو اورنگ زیب نے کھل کر کہا۔

"مجھے اس بات کا علم تھا کہ وہ گھر سے فرار ہوگئی تھی، بعد میں یہ بھی سراغ مل گیا کہ اس نے مس جوزف کے ویمن ہاسٹل میں پناہ لی ہے۔ میں اس وقت وہیں سے آرہا ہوں۔"

"یہ بات ایسی نہیں تھی کہ میں آپ کو بتاتا۔ بدنامی کا اندیشہ ہی سمجھ لیں لیکن میں اب مس جوزف کو بھی دیکھ لوں گا جس نے اسے پناہ دی تھی۔"

"اب وقت آپ کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے شاہ جی۔" اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "ہاسٹل کی ایک لیڈی ورکر نے کسی کے اشارے پر اسے زہر دے کر ہمیشہ کی نیند سلا دیا ہے۔"

"گڈ۔ میں بھی اس بدنامی کے داغ کو دھونا چاہتا تھا لیکن ایک دوست کی حیثیت سے آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ اس کی موت میں میرا ہاتھ شامل نہیں ہے۔"

"یہ بھی جانتا ہوں اسی لیے میں نے معاملہ تھانہ انچارج کے حوالے کرکے یہ تاکید کردی ہے کہ میرا یا آپ کا نام کہیں درمیان میں نہ آئے پائے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" سکندر علی شاہ کے لہجے میں اس بار اپنایت ہی اپنایت تھی۔

"میرا مشورہ ہے کہ ہم دونوں کو اس سلسلے میں خاموش رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا۔" اورنگ زیب نے اپنا جملہ مکمل کرکے رابطہ منقطع کردیا۔

☆☆☆

دو روز یوں گزر گئے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔

اس وقت بھی وہ سرمستی کے عالم میں بستر پر بے سدھ پڑا تھا۔ نیم غنودگی کے عالم میں اس کا ہاتھ بستر پر دور تک رینگا پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ بستر کی شکنیں گواہ تھیں کہ کرنل احتشام نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا بھی کردیا تھا۔ دو راتوں سے شبنم اس کی زندگی کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ اب ان دونوں کی خواب گاہ ایک تھی لیکن شبنم اس وقت بستر پر موجود نہیں تھی۔ اس نے دستی گھڑی پر نظر ڈالی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس وقت دس بج رہے تھے۔

کچن سے انڈا تلنے کی آواز سن کر وہ تیزی سے لپکتا ہوا غسل خانے میں چلا گیا۔ جلدی جلدی غسل کرکے نکلا تو شبنم ناشتے کی میز پر اس کی منتظر تھی۔

"آج آپ نے اٹھنے میں پھر دیر کردی۔" شبنم نے بڑی محبوبیت سے شکوہ کیا۔ "کل آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آٹھ بجے اٹھ جائیں گے۔"

"اس میں بھی تمہاری غلطی ہے۔" افضل خان نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "تم نے محبت سے جگادیا ہوتا تو......"

"تو آپ پھر اپنی من مانی شروع کردیتے۔" شبنم روانی میں کہہ گئی پھر اس نے ناشتے کی طرف اشارہ کیا۔ "چلیے اب جلدی سے ناشتا کرلیجیے پھر شاید یہ بھی ممکن ہے کہ......"

"تم خود سے مجھ پر مہربان ہوجاؤ۔" افضل خان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بلی کے خواب میں چھیچھڑے۔" شبنم نے شوخی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "کرنل احتشام کا فون دو بار آچکا ہے۔" پھر ان کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ کرنل کا فون پھر آگیا۔

"افضل بول رہا ہوں سر۔"

"وش یو ہیپی ہنی مون ٹو بوتھ آف یو۔" کرنل نے بڑے خلوص سے کہا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "جو لوگ ایکٹو سروس میں ہوتے ہیں ان کی زندگی خود سے زیادہ قوم کی امانت ہوتی ہے۔"

"جانتا ہوں سر لیکن دنیاداری بھی......"

"تمہیں یہی بتانا چاہ رہا تھا ینگ مین کہ قوم کی ضرورت دنیاداری سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔" کرنل نے بات جاری رکھی۔ "جس دن میری انگیج منٹ ہوئی تھی اس کے دو دن بعد ہی مجھے فرنٹ لائن پر جانے کے آرڈر بھی مل گئے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر تمہیں دو دن ڈسٹرب نہیں کیا لیکن اب...... تمہیں پہلی فرصت میں ناگی کی مہم کو سر کرنا ہے۔ دشمن کو ڈھیل دینا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔"

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے کرنل۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا، صرف ایک درخواست ہے۔"

"سمجھ رہا ہوں...... شبنم۔" کرنل نے ذہانت کا ثبوت دیا۔ "ڈونٹ وری ینگ مین، تمہاری غیر موجودگی میں میرے آدمی زیادہ الرٹ رہیں گے۔"

"شکریہ کرنل۔"

"ایک بات کا خیال رکھنا۔ ناگی کسی کوبرا سے بھی





زیادہ خطرناک اور زہریلا ہے۔ تمہیں ہر قدم پر محتاط رہنا ہوگا۔"

"مچان پر بیٹھ کر کسی درندے کو شکار کرنا بھی میری عادت کے خلاف ہے۔" افضل خان نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ "جیت ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے جو موت کی پروا کیے بغیر خطروں سے کھیلنے کا عادی ہو۔"

"وش یو گڈ لک۔" دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔ افضل خان نے موبائل آف کرکے شبنم کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"تم سے دور رہنا میرے لیے آسان نہیں ہوگا۔"

"جو لوگ دل میں رہتے ہوں، آنکھوں میں بسے ہوں، کبھی ایک دوسرے سے دور نہیں رہتے۔" جواب میں افضل خان نے شبنم کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا پھر دوبارہ ناشتا کرنے میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

دلربا نے جس زندگی کا آغاز کیا تھا اس میں آئے دن حادثات اور چھوٹے موٹے خطرات پیش آتے رہتے تھے۔ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر ہی اس نے خود کو سکندر علی شاہ کے لیے مخصوص کردیا تھا پھر سکندر علی شاہ کے بعد اسے ناگی جیسے خطرناک آدمی کی حمایت بھی حاصل ہوگئی تھی مگر اب وہ جن حالات سے دوچار تھی وہ اس کے لیے بھی حیران کن تھے۔

اغوا کرنے والوں نے ابھی تک کوئی ایسی ویسی بات بھی نہیں کی تھی۔ ایک صاف ستھرے کمرے میں رکھا گیا تھا جہاں فوری ضرورت کی تمام آسائش میسر تھی۔ تینوں وقت اسے پابندی سے خوراک بھی مل رہی تھی۔ جو شخص پہرے پر موجود تھا وہ بھی کڑیل جوان تھا لیکن اس نے بھی دلربا کی طرف میلی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کا موبائل بھی اس کے پاس موجود تھا یہ اور بات کہ دلربا نے ابھی تک اس کو استعمال نہیں کیا تھا۔ وجہ معقول تھی، اسے اندیشہ تھا کہ شاید موبائل پر ہونے والی گفتگو کسی خفیہ ڈیوائس کے ذریعے دوسری جانب سے سن لی جائے۔

اس کے ذہن میں اس وقت بھی متعدد خیالات ابھر رہے تھے۔ اسے اغوا کرنے والے کون تھے، اگر ان کا مقصد غلط نہیں تھا تو پھر اسے کیوں اٹھالیا گیا تھا؟ وہ کیا چاہتے تھے، کس بات کا انتظار کررہے تھے؟

اس وقت بھی وہ ان ہی خیالوں سے الجھ رہی تھی جب پہلی بار اس کے موبائل پر سگنل ملا، روشن اسکرین پر جو نمبر ابھرے وہ اس کے لیے نئے تھے۔ پل بھر کے لیے اس نے کچھ سوچا پھر موبائل آن کرکے کان سے لگالیا۔ سپاٹ اور خشک لہجے میں سوال کیا۔ "کون بول رہا ہے؟"

"اپنا ہمدرد ہی سمجھو۔"

"اس ہمدردی کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟" دلربا کی خوب صورت پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

"حماقت بھی کہہ سکتی ہو۔" جواب میں تلخ لہجہ اختیار کیا گیا۔ "تم جس جال میں پھنسنے والی تھیں وہ شاید تمہاری جیسی خاتون کے لیے زیادہ حسب حال ہوتا۔"

"کیا مطلب؟"

"تم ابھی تک یہاں عزت سے ہو۔" اس بار بڑے سرد لہجے میں جواب ملا۔ "اگر ناگی تم کو اغوا کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو شاید تمہارے سارے انجر پنجر ڈھیلے پڑ چکے ہوتے۔ سکندر علی شاہ کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوتا کہ آستین کے سانپ نے تمہیں ڈس لیا ہے۔"

"ناگی کو تم کس طرح جانتے ہو؟" نگینہ نے قدرے سنبھل کر پوچھا۔

"اس کا کچھ قرض مجھ پر واجب الادا ہے اسے بھی چکتا کرنا تھا۔" بہ دستور تلخ اور تند انداز میں جواب ملا۔ "تمہاری جیسی انمول چیز کے گم ہوجانے کے بعد اب وہ پاگل کتوں کے مانند کونے کھدرے چھانتا پھر رہا ہے۔"

"کیا سکندر علی شاہ کو اس کا علم ہے کہ ناگی......"

"تم اس سلسلے میں براہ راست شاہ جی سے بات کرسکتی ہو۔" اس بار دلربا کا جملہ کاٹ کر کہا گیا۔ "میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ آخری بار اس کے کسی آدمی نے جگا نامی بدمعاش کا روپ اختیار کرکے تم سے ملاقات کی تھی، وہ غلطی بھی ناگی کو بہت بھاری پڑ رہی ہے۔"

"کیا تم جگا کے آدمی ہو؟" دلربا نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

"حماقت کے سوالات کرنے سے گریز کرو۔ چاہو تو اپنے شاہ جی سے فون پر بات کرلو۔ ناگی کی اصلیت کی بھنک میرے خیال میں ان کو بھی مل چکی ہوگی۔"

"تم شاہ جی کو کیسے جانتے ہو؟"

"مجھے بھی ان کا معتقد سمجھو لیکن میری اصلیت سے وہ بھی ناواقف ہے۔"

"کیا میں تمہارے نمبروں پر دوبارہ رابطہ قائم کرسکتی ہوں؟"

"نہیں...... یہ سم میں حسب ضرورت استعمال کرتا

ہوں۔ ایک دو روز بعد میں دوبارہ کال کرلوں گا۔ ایک بات اور سن لو شاید تمہارے لیے وہ بھی کارآمد ہو......" بات جاری رکھی گئی۔ "نگینہ بھی اوپر جا چکی ہے۔ اس کی موت میں بھی ناگی کا خفیہ ہاتھ شامل ہے لیکن تم اس کا حوالہ شاہ جی کو نہ دینا۔ وہ خود بھی ایک نادیدہ ہمدرد نما دشمن کے ہاتھوں بے بسی کا شکار ہیں۔"

"تمہاری معلومات میرے لیے حیرت انگیز ہیں۔" دلربا نے کچھ سوچ کر کہا۔ "تمہیں ان باتوں کا کیسے علم ہوا جس کے بارے میں شاہ جی نے کبھی مجھ سے تذکرہ بھی نہیں کیا۔"

"ضروری نہیں کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں۔"

"مجھے کس مقصد سے یہاں رکھا گیا ہے؟"

"شاہ جی کا مرید ہونے کی وجہ سے تمہاری حیثیت بھی میرے لیے اہم تھی ورنہ مجھے تم جیسی لڑکیوں سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔"

"صرف ایک سوال اور کروں گی۔" دلربا نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر شاہ جی کہیں تو کیا تم مجھے آزاد کردو گے؟"

"ہاں...... لیکن تم آزاد ہونے کے بعد کسی بھی ایسی بات کا حوالہ نہیں دوگی جو اس وقت میرے اور تمہارے درمیان ہوئی ہیں۔"

"کیا ناگی پر شبہے کا اظہار کرسکتی ہوں؟"

"ناگی کا تذکرہ کرنا اہم ہے اس لیے کہ اسی کی نیت تم پر خراب ہوگئی تھی۔" دوسری طرف سے جواب دینے کے بعد رابطہ بھی ختم کردیا گیا۔ دلربا کچھ دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر اس نے براہ راست سکندر علی شاہ کے نمبر ڈائل کیے۔

"تم......" پہلی گھنٹی کے بعد ہی سکندر علی شاہ کی حیرت میں ڈوبی آواز ابھری۔ "تم اس وقت کہاں ہو؟"

"مجھے اس کا اندازہ نہیں ہے۔"

"اس...... کا نام بتاؤ جس نے تمہیں اغوا کیا ہے۔ میں اسے قبر سے بھی برآمد کرلوں گا۔"

"میں اس کے بارے میں صرف ایک شبہ ظاہر کرسکتی ہوں کہ وہ ناگی کا آدمی ہوگا۔"

"یہ...... یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟"

"اس کا کوئی کارندہ آخری بار مجھ سے جگا بدمعاش کے میک اپ میں ملا تھا۔"

"تم...... جگا کو کس طرح جانتی ہو؟"

"جو آدمی بھیس بدل کر ملنے آیا تھا اس نے جگا نام بھی لیا تھا۔" دلربا نے خوب صورتی سے بات بنائی۔ "یہ موبائل بھی اغوا کرنے والوں نے آج ہی واپس کیا ہے۔ مجھے اسی نے بتایا ہے کہ ناگی کی نیت میرے اوپر خراب ہوگئی تھی۔ پہلا فون میں نے آپ کو کرنا مناسب سمجھا۔"

"اچھا کیا لیکن ہوسکتا ہے کہ تمہاری گفتگو کہیں اور بھی سنی جارہی ہو۔"

"ہوسکتا ہے کہ وہی سن رہا ہو جس نے موبائل واپس کیا ہے۔" دلربا نے اس بار بھی دوراندیشی سے جواب دیا۔ "اس نے کہا تھا کہ میں موبائل پر آپ کے علاوہ کسی سے بات کرنے کی غلطی نہ کروں...... ایک بات اور بھی کہی تھی۔"

"وہ کیا؟"

"مجھے آزاد کیا جاسکتا ہے صرف آپ کے اشارے پر۔"

"میں نہیں سمجھا کہ اس بات کا کیا مطلب ہے اور اسے میرے اشارے کا علم کس طرح ہوگا؟"

"وہ کل مجھے دوبارہ فون کرے گا۔"

"مم...... میں تمہیں ہر قیمت پر دوبارہ حاصل کرنے کو تیار ہوں۔" دوسری طرف سے سنجیدگی سے جواب ملا۔ "اس کے بعد میں تمہاری حفاظت کا ایسا بندوبست کراؤں گا کہ کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکے گا۔"

"ایک درخواست اور کروں گی۔ جب تک میں یہاں سے آزاد نہ ہوجاؤں آپ ناگی سے کوئی تذکرہ نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" سکندر علی شاہ نے جواب دیا پھر اس نے موبائل آف کردیا۔

دلربا کا فون خلاف توقع آنے کے بعد سکندر علی شاہ کے شاطر ذہن میں بہت سارے شبہات سر ابھار رہے تھے۔ ایک نام شکرہ کا بھی تھا جو سکندر علی شاہ کے لیے سوہان روح بنتا جارہا تھا۔

☆☆☆

رستم علی آغا خانی اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا لیڈی اسٹینو کو ایک کاروباری خط ڈکٹیٹ کروارہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی، ایک لمحے کو وہ الجھ گیا۔ اس نے اپنی پرسنل سیکریٹری کو سختی سے تاکید کررکھی تھی کہ جب وہ کسی دفتری کام میں مصروف ہو تو کال اندر ٹرانسفر نہ کی جائے۔ بہرحال یہ سوچ کر اس نے ریسیور اٹھالیا کہ ممکن ہے کہ وہ کوئی اہم کال ہو۔ اس کا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔

"ہیلو ڈیڈ، آپ کیسے ہو؟" دوسری جانب سے





کی آواز سنائی دی۔

"ٹھیک ہوں۔" رستم علی آغا خانی نے کہا۔ "تمہارے چلے جانے کی وجہ سے کاروباری مصروفیات کا سارا بوجھ مجھے اکیلے ہی سنبھالنا پڑتا ہے۔"

"امی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"وہ تمہاری اور روشا کی کمی شدت سے محسوس کرتی ہے۔"

"مجھے اس کا احساس ہے لیکن یہاں بھی ہماری غیر موجودگی کے سبب کاروبار کی دیکھ بھال صحیح طور پر نہیں ہورہی تھی۔ اب میں آگیا ہوں تو میں نے صورت حال کنٹرول کرلی ہے۔ ایک دو ورکر کی چھانٹی بھی کرنی پڑی ہے۔"

"کاروبار میں ایسا ہوتا رہتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تم وہاں دو چار مہینے گزار کر واپس آجاؤ۔"

"سوری ڈیڈ......" اس بار دارا نے دبی زبان میں کہا۔ "میں نے جن وجوہات کی بنا پر شفٹنگ کی ہے اسے زبان تک نہیں لاسکتا۔ ہوسکے تو آپ مما کو لے کر دو تین مہینے کے لیے یہاں آجائیں۔"

"تمہاری مما کا بھی یہی پروگرام تھا لیکن تجارتی پالیسی کی کچھ تبدیلیوں کے باعث فی الحال سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ہے۔ جیسے ہی موقع ملا کچھ وقت ضرور نکال لوں گا۔ روشا کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"خود کو حالات سے ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کررہی ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ وہ مستقل طور پر یہاں سے جانے کے حق میں نہیں تھی لیکن تم نے نہ جانے کیوں اتنا بڑا فیصلہ کرڈالا۔"

"سوری ڈیڈ۔" دارا نے دبی زبان میں کہا۔ "یہ سچ ہے کہ روشا اب بھی بار بار واپسی کی ضد کرتی رہتی ہے لیکن وہاں رہنا اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔"

"تم چاہتے تو میجر عاطف سے بھی مدد لے سکتے تھے۔ وہ تم دونوں کا دوست بھی ہے۔"

"اس کا فون بھی آتا رہتا ہے لیکن میں نے اس کو یہی بتایا ہے کہ میرا اور روشا کا آنا ناگزیر تھا۔"

"ماں سے بات کی تم نے؟"

"ان کا فون انگیج تھا اس لیے آپ سے کال ملالی۔"

"اچھا کیا، روشا کو ہماری طرف سے دعا دینا اور اپنا خیال رکھنا۔"

رستم علی آغا خانی نے سلسلہ منقطع کردیا۔ لیڈی اسٹینو کو فارغ کرنے کے بعد اس کے ذہن نے ان وجوہات کو کھوجنا شروع کردیا جس کے سبب دارا اچانک روشا کو لے کر بیرون ملک منتقل ہوگیا تھا۔ خاصی دیر وہ مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا پھر انٹرکام کے بزر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"یس۔" اس نے ریسیور اٹھا کر لیڈی سیکریٹری سے رابطہ قائم کیا۔

"سر، ہیکریٹری انڈسٹریز کے ایک ورکر آپ سے فوری طور پر ملنا چاہتے ہیں۔"

"کیا نام ہے؟"

"کسی وجہ سے وہ نام نہیں بتاسکتے لیکن کاروباری معاملہ ہے۔" لیڈی سیکریٹری نے کہا۔ "نئی تجارتی پالیسی کے سلسلے میں کچھ بات کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے، بھیج دو۔"

دو منٹ بعد جو آدمی اندر داخل ہوا وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ پستہ قد ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی صحت بھی قابل رشک تھی۔ کمرے میں داخل ہوکر اس نے رستم علی آغا خانی سے ہاتھ ملایا پھر سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میرا خیال ہے کہ میں آپ سے پہلی بار مل رہا ہوں۔" رستم علی آغا خانی نے گفتگو کا آغاز محتاط انداز میں کیا۔ "کیسے زحمت کی؟"

"سب سے پہلے میں ایک غلط بیانی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میرا تعلق انڈسٹریز سے نہیں اسٹاک مارکیٹ سے ہے۔"

"آئی سی...... کوئی خاص انفارمیشن؟"

"دو روز بعد امریکا اپنی نئی ڈیفنس پالیسی کا اعلان کرنے والا ہے جس کے بعد ڈالر کا ریٹ کم از کم پندرہ پرسنٹ بڑھ جانے کی توقع ہے۔"

"سوری...... میں کرنسی کے معاملات میں ہاتھ ڈالنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"حیرت ہے، پندرہ پرسنٹ کچھ کم نہیں ہوتے۔"

"میرے پاس وقت کم ہے۔" جواب بے زاری سے دیا گیا۔ "اور کوئی بات؟"

"اب آپ کے آفس تک آگیا ہوں تو خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔" نووارد نے ڈھٹائی سے کہا۔ "کچھ نہ کچھ سودا تو ضرور کروں گا۔"

"میرا خیال ہے تم اپنا قیمتی وقت برباد کررہے ہو۔"

"ایک قیمتی آئٹم اور بھی ہے میرے پاس۔ ایک نظر اسے بھی دیکھ لو سیٹھ۔ ہوسکتا ہے کہ بات بن جائے۔" نووارد

نے اس بار سرسراتے لہجے میں کہا پھر ایک لفافہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔

رستم علی آغا خانی کی پیشانی شکن آلود ہونے لگی۔ اس نے فوری طور پر یہی سوچا تھا کہ خفیہ کال بیل کو دبا کر اپنے خاص آدمیوں کو طلب کرے اور نووارد کو ڈنڈا ڈولی کر کے باہر پھنکوا دے لیکن پھر اس نے کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ نووارد کی نگاہوں میں جو اعتماد نظر آرہا تھا وہ اس قدر معنی خیز تھا کہ رستم علی آغا خانی نے ایک نظر اس لفافے پر بھی ڈالنی ضروری سمجھی جو اس کے سامنے رکھا ہوا تھا پھر جب اس نے لفافہ کھول کر اندر موجود پہلی تصویر دیکھی تو اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ دارا اور روشنا کے فوری طور پر باہر چلے جانے کا ایک اصل سبب اس کے سامنے موجود تھا۔ وہ روشنا کی ایک برہنہ تصویر تھی جس کا جسم لباس کی قید سے یکسر آزاد تھا۔

"ایسے تین چار شاہکار اور بھی ہیں میرے پاس۔" نووارد مسکرایا۔

"کیا چاہتے ہو؟" رستم علی آغا خانی نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا۔

"نگیٹو سمیت تمام تصویروں کی واپسی کے عوض تمہارے لیے خاص رعایتی قیمت بیس لاکھ، وہ بھی فوری ادائیگی کی صورت میں۔" نووارد زہر خند سے بولا۔ "تمہاری کاروباری ساکھ اور خاندانی عزت کے لیے یہ رقم کچھ اتنی زیادہ بھی نہیں ہے۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ تم کوئی ثبوت اپنے پاس نہیں رکھو گے؟"

"تمہیں میری زبان پر اعتبار کرنا پڑے گا، کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔"

"کیا تم سب کچھ ساتھ لائے ہو؟" رستم علی آغا خانی نے سوال کیا۔

"نہیں۔" نووارد نے مسکرا کر جواب دیا۔ "فوری طور پر تمہیں کم از کم دو لاکھ ادا کرتے ہوں گے نقدی کی صورت میں۔ باقی رقم بھی نقدی ہی کی صورت میں تیار رکھنا۔ میں کسی وقت بھی آکر تصویریں اور نگیٹو تمہارے حوالے کر کے وصول کرلوں گا۔"

رستم علی آغا خانی کے لیے خاندانی عزت بچانے کے لیے یہ سودا اتنا مہنگا بھی نہیں تھا۔ اس نے اٹھ کر سیف سے رقم نکال کر نووارد کے سامنے رکھ دی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

"مجھے یہاں آتے وقت پورا یقین تھا کہ تم میری … قبول کرلو گے۔"

"تت...... تم اب جاسکتے ہو۔" رستم علی آغا خانی … ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "اپنا وعدہ یاد رکھنا میں حسب … رقم تیار رکھوں گا۔"

"تم نے ابھی تک میرا نام دریافت نہیں کیا…" نووارد نے بڑی بے پروائی سے رقم جیب میں رکھتے ہو… سوال کیا۔

"مجھے نام کی نہیں کام کی ضرورت ہے۔"

"نام بھی ضروری ہے۔" نووارد نے کہا۔ "ہو… ہے کہ میں دوبارہ آؤں تو کسی اور حلیے میں آؤں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" رستم علی آغا خانی چونکا۔

"فی الحال اتنا سمجھ لو کہ تم نے میرے ساتھ منف… سودا کیا ہے۔ تصویروں کے حصول سے پہلے ممکن ہے کہ دار… بھی روشنا کو ساتھ لے کر ہمیشہ کے لیے واپس لوٹ آئے۔"

"کون ہو تم؟"

جواب دینے سے پہلے نووارد نے بڑی سرعت … اپنا بے آواز آٹومیٹک ریوالور جیب سے نکال کر رستم علی آ… خانی پر تان لیا پھر بدلی ہوئی آواز میں بولا۔

"تمہاری موت کے بعد تمہاری بیوہ کو دارا … ضرورت ہوگی۔ اس ضرورت کو دارا بھی نظر انداز نہ… کرے گا۔"

"تت...... تت...... تم......" رستم علی آغا خانی … طرح چونکا جیسے بے خیالی میں اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار… سے چھو گیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے نووارد کو گھور رہا تھا۔

"ہاں یہ میں ہوں...... تمہارا پرانا واقف کار… حامد۔ تم چاہو تو آکٹوپس بھی کہہ سکتے ہو۔" اس کے بعد … علی آغا خانی کو بولنے کا موقع نہیں ملا۔ ٹچ...... ٹچ کی … آواز کے ساتھ ہی وہ اپنی ریوالونگ چیئر پر ڈھلک کر … سمٹا گیا تھا۔

☆☆☆

اخبارات میں رستم علی آغا خانی کی موت کی … آکٹوپس کے مخصوص نشان کے ساتھ شائع ہوئی تو دبی … چنگاریاں پھر بھڑک اٹھیں۔ کاروباری حلقوں نے تین … کے سوگ کے علاوہ بڑے پیمانے میں احتجاج کیا تو صو… سے لے کر مرکز تک تمام اعلیٰ افسروں کی نیندیں … گئیں۔ وزیر داخلہ نے خانہ پری کی خاطر پریس کانفر… بھی طلب کرلی۔ حسب دستور وہی گھسے پٹے پولیس…

پرانے دعوے دہرائے گئے کہ مجرم کے علاوہ اپنے فرائض سے چشم پوشی کرنے والے ذمے داروں کو بھی معاف نہیں کیا جائے گا۔ خواہ وہ کسی رینک کا آفیسر کیوں نہ ہو۔

مقامی آئی جی نے وقت سے فائدہ اٹھا کر اپنی نا اہلی کا اعتراف کرتے ہوئے استعفیٰ پیش کیا جسے اس کی بدقسمتی سے پھر نامنظور کر دیا گیا۔ یہ ہدایت بھی سخت لہجے میں دی گئی کہ مجرموں کو فوری طور پر قانون کے شکنجوں میں جکڑنے کی خاطر سخت اقدامات کیے جائیں اور تمام افسران کو ہائی الرٹ کر دیا جائے۔

اسی ضمن میں سراج اس وقت ڈی آئی جی کے آفس میں موجود تھا اس کے علاوہ دو ایس پیز بھی تھے۔

''رستم علی آغا خانی کے سلسلے میں اوپر سے جو احکامات موصول ہوئے ہیں اس کا علم آپ سب کو بھی ہوگا۔'' ڈی آئی جی نے رسمی گفتگو کے بعد سنجیدگی سے کہا۔ ''تجارتی حلقوں نے بھی حکومت کو مطلع کر دیا ہے کہ اگر مرحوم کے قاتلوں کو گرفتار نہ کیا تو ٹیکس کی ادائیگی روک دیں گے۔ اس کے علاوہ بھی کئی مطالبات کیے گئے ہیں۔ ایسی صورت میں مجرم یا مجرموں کو گرفتار کرنا پولیس کی ذمے داری ہے جس سے ہم چشم پوشی نہیں کر سکتے۔''

''ہم بھی صورت حال کی سنگینی کو محسوس کر رہے ہیں لیکن آکٹوپس ایک فرضی نام ہے جس کا علم کسی کو نہیں۔'' ایک ایس پی نے کہا۔ ''بغیر کسی نام و پہچان کے ہم ہواؤں سے تو نہیں لڑ سکتے۔''

''آپ کا کہنا کسی حد تک درست ہے لیکن ہم سب اس بات سے بھی واقف ہیں کہ ایس پی مسٹر اورنگ زیب نے شیخ حامد کو یہ نام دیا ہے۔''

''شیخ حامد کے سلسلے میں آخری اطلاع یہی ہے کہ وہ اور اس کا کوئی ساتھی ہیلی کاپٹر کی تباہی کے ساتھ ہی سمندر برد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد سے شیخ حامد کا کوئی سراغ کسی کو نہیں ملا۔'' دوسرے ایس پی نے دلیل پیش کی۔

''لیکن اس کی لاش بھی برآمد نہیں ہو سکی تھی۔'' ڈی آئی جی نے پہلو بدل کر کہا۔ ''ایسی صورت میں یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کسی طرح بچ گیا پھر ہماری نظروں سے روپوش ہو جانے میں ہی اس کی عافیت بھی تھی۔''

''ایک بات اور بھی ممکن ہے۔'' پہلے ایس پی نے جواز پیش کیا۔ ''ممکن ہے کہ شیخ حامد اور آکٹوپس کے نام سے کوئی دوسرا مجرم فائدہ اٹھا رہا ہو۔''

''ان مفروضوں پر پہلے بھی بہت کہا جا چکا ہے لیکن بہرحال رستم علی آغا خانی کے قاتل یا قاتلوں کو گرفتار کرنا ہماری ذمے داری ہے۔'' ڈی آئی جی نے بات جاری رکھی۔ ''مقتول کی لیڈی سیکریٹری نے اس شخص کا تفصیلی حلیہ بتایا ہے جو آخری بار رستم علی آغا خانی سے ملنے آیا تھا، قاتل پر موجود ہے۔ لیڈی سیکریٹری نے یہ بھی کہا ہے کہ اس نے اس شخص کو پہلی بار دیکھا تھا جبکہ وہ مقتول کے دفتر میں پانچ سال سے موجودہ سیٹ پر کام کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہمارے لیے قابل غور ہے۔ جائے وقوعہ سے فنگر پرنٹس کے نشانات بھی نہیں ملے۔ یہ نقطہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ملزم انتہائی چالاک اور شاطر ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ شیخ حامد کے کیس پر ایس پی اورنگ زیب شروع سے کام کر رہے تھے۔'' دوسرے ایس پی نے جان چھڑانے کی خاطر کہا۔ ''کیا آج کی میٹنگ میں انہیں نہیں بلایا گیا تھا؟''

''آپ جانتے ہیں کہ مسٹر اورنگ زیب کا تبادلہ ہیڈ کوارٹر ہو چکا ہے، اس کے علاوہ ان کے پاس مرکز کی طرف سے جاری کردہ ایک مخصوص اجازت نامہ بھی ہے جس کی روشنی میں وہ آج کل کسی اہم کام پر مامور ہیں۔ اس کام کی نوعیت کا علم آئی جی کو بھی نہیں ہے۔'' ڈی آئی جی نے اس بار انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ''کسی ایک افسر پر انحصار کر کے ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں یہ بات باعث شرم بھی ہے۔ اوپر سے جو احکامات ملے ہیں انہیں نظرانداز کر کے ہم اپنی نااہلی کا ثبوت نہیں دیں گے۔ آپ تینوں حضرات کو ہر قیمت پر اصل قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانا ہوگا۔''

''ہم کسی قسم کی کوتاہی نہیں کریں گے۔'' اس بار سراج نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے براہ راست ڈی آئی جی سے کہا۔

کچھ دیر تک دونوں ایس پیز بھی مقتول کی کیس فائل کے اوراق الٹتے پلٹتے رہے پھر وہ چلے گئے تو ڈی آئی جی نے سراج سے دریافت کیا۔

''کیا آپ کو علم ہے کہ مسٹر اورنگ زیب آج کل کس کام میں مصروف ہیں؟''

''یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا...... میرا خیال ہے کہ وہ ابھی آکٹوپس کی طرف سے غافل نہیں ہیں۔''

''رستم علی آغا خانی کے کیس میں آپ نے کیا رائے قائم کی ہے؟''

''لیڈی سیکریٹری نے جو حلیہ بیان کیا ہے اور جس ماہرانہ انداز میں واردات کی گئی ہے اس سے یہی ظاہر ہے کہ شیخ حامد ایک بار پھر بھیس بدل کر متحرک ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔'' سراج نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''مقتول کو پہلے بھی دھمکی دی جا چکی تھی، ہم نے جو سادہ لباس والے مقتول کے آفس پر تعینات کیے تھے ان کا بے ہوشی کی حالت میں پایا جانا بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بھی قاتل کی نظروں میں آ چکے تھے۔''

''مسٹر اورنگ زیب کا قیام شاید آپ ہی کے ساتھ ہے؟'' ڈی آئی جی نے مسکرا کر رازداری سے دریافت کیا۔

''جی ہاں لیکن تمام تر ذاتی مراسم کے باوجود وہ خاص طور پر آکٹوپس کے بارے میں کوئی بات کھل کر نہیں کرتے۔''

''یہ بھی ان کی ذہانت کی دلیل ہے۔ بات زبان سے نکل جائے تو پرائی ہو جاتی ہے۔'' ڈی آئی جی نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آکٹوپس بھی مسٹر اورنگ زیب کو اپنے لیے سب سے اہم خطرہ محسوس کرتا ہوگا۔''

سراج نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے ذہن میں ایک سوال گردش کر رہا تھا۔ رستم علی آغا خانی کی موت سے شیخ حامد کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟ کیا یہ کسی پرانی دشمنی کا قرض تھا جسے چکتا کیا گیا تھا یا قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لیے کھلا چیلنج۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی اس کے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ ڈی آئی جی کا فون اس نے اورنگ زیب کی موجودگی میں ریسیو کیا تھا لیکن حسب معمول یہی کہا تھا کہ اورنگ زیب اس وقت گھر پر موجود نہیں ہے۔ فون پر رابطہ ختم ہونے کے بعد اس کی اورنگ زیب سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ بھی ذہن میں گونج رہی تھی۔ اورنگ زیب نے بھی کہا تھا کہ شیخ حامد کسی وجہ سے بوکھلا کر دوبارہ سامنے آ گیا ہے۔ اسی ضمن میں یہ بھی کہا تھا کہ دارا اور روشنا کے باہر چلے جانے کے بعد ہی اس نے کسی اہم کام کے سلسلے میں رستم علی آغا خانی سے بھیس بدل کر ملاقات کی ہوگی۔ کوئی ایسا مطالبہ کیا ہوگا جو منظور نہیں کیا گیا جس کی پاداش میں رستم علی آغا خانی کو موت کی سزا بھگتنی پڑی۔ سراج کا ذہن ان ہی باتوں پر غور کر رہا تھا جب ڈی آئی جی کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

''آپ کس سوچ میں گم ہو گئے؟''

''کک...... وہ...... میں اورنگ زیب صاحب کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ آپ کی کال آنے کے بعد میں نے یہاں آتے وقت دو تین بار ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے موبائل سے پاورڈ آف کا میسج ہی سنائی دیتا رہا۔''

''ہو سکتا ہے کہ کسی خاص وجہ سے ایسا کیا گیا ہو۔'' ڈی آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ڈونٹ وری، مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت بھی کسی نہ کسی آفس ڈیوٹی کو سرانجام دے رہا ہوگا۔'' پھر ڈی آئی جی کے ساتھ ہی سراج بھی اٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

سکندر علی شاہ کی نظریں بار بار دستی گھڑی کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ جس انداز میں وہ اس وقت اپنی خواب گاہ میں بچھے قیمتی قالین کو قدموں تلے روند رہا تھا وہ بھی اس کی



## کترنیں

☆ اگر دولت مندوں میں انصاف اور مفلسوں میں قناعت ہوتی تو دنیا سے گدائی کی رسم اٹھ چکی ہوتی (حضرت چچل سرمست)

☆ ہر شخص سچا دوست تلاش کرتا ہے لیکن خود سچا دوست بننے کی زحمت گوارا نہیں کرتا (لقمان)

☆ غریب آدمی امیر کا اتنا محتاج نہیں جتنا امیر آدمی غریب کا ہوتا ہے کیونکہ امیر کا کوئی کام غریب کے بغیر نہیں چل سکتا (آسکر وائلڈ)

مرسلہ: محمد خواجہ، کورنگی، کراچی

## سنہری بات

جب تم جان جاؤ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے تو پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون کون تمہارے خلاف ہے۔

مرسلہ: قاضی عرفان احمد عاجز، آڑہ، چکوال

## خوب صورت باتیں

☆ محبت آنکھ سے نہیں دل سے دیکھتی ہے۔

☆ جو بار بار محبت کرتے ہیں وہ محبت کرنا نہیں جانتے۔

☆ محبت وہ کھیل ہے جس میں عقل ہار جاتی ہے۔

☆ دل کی ہزار آنکھیں ہوتی ہیں۔ مگر وہ محبوب کے عیب کو نہیں دیکھ سکتیں۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

کسی ذہنی الجھن اور پریشانی کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے نگینہ کی موت کا کوئی ملال نہیں تھا۔ اس خبر کو سن کر اسے خوشی ہوئی تھی لیکن دلربا کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اسے جن حالات میں اغوا کیا گیا تھا اور جو تفصیل خود دلربا نے موبائل پر بتائی تھی وہ بھی سکندر علی شاہ کے حلق کے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ کئی پیچیدہ سوالات تھے جو اس کو الجھا رہے تھے۔

"وہ کون تھا جس نے دلربا کو اغوا کیا تھا؟ اگر وہ ناگی یا اس کا کوئی آدمی تھا تو دوسرا فرد کون تھا جس نے دلربا کو درمیان سے اچک لیا تھا؟ دلربا کے بیان کے مطابق اگر وہ کوئی عقیدت مند مرید تھا تو براہ راست بھی اس کی اطلاع سکندر علی شاہ کو دے سکتا تھا پھر اغوا کر کے دلربا کو کہاں رکھا گیا؟ اس کا موبائل کیا صرف اسی مقصد کے پیش نظر واپس کیا گیا تھا کہ وہ سکندر علی شاہ کو ناگی کی نمک حرامی کی اطلاع دے یا اس میں کوئی خاص چال تھی؟"

بہرحال سکندر علی شاہ اس وقت اضطرابی کی کیفیتوں سے دوچار تھا جب اس کے موبائل نے گنگنانا شروع کر دیا۔ روشن اسکرین پر جو نمبر نظر آئے اسے دیکھتے ہی اس نے موبائل آن کر لیا۔ وہ اسی سم کے نمبر تھے جو سکندر علی شاہ نے اپنے خاص آدمی کو دی تھی جو دلربا کو بازیاب کرنے گیا تھا۔

"ہیلو...... کون؟" سکندر علی شاہ نے محتاط انداز میں سوال کیا۔

"دلربا بول رہی ہوں۔"

"اس وقت کہاں ہو؟"

"کیا مطلب؟" دوسری جانب سے حیرت سے دریافت کیا گیا۔ "جو آدمی مجھے فائیو اسٹار ہوٹل کے باہر ملا تھا کیا آپ نے اسے یہ ہدایت نہیں دی تھی کہ مجھے چوبیس گھنٹے اسی ہوٹل میں قیام کرنا ہے؟"

"اس نے جو کہا وہ بھی درست ہے لیکن جن لوگوں نے تمہیں میرا مرید ہونے کی وجہ سے آزاد کروایا ہے مجھے ابھی تک ان کے بارے میں پوری طرح اطمینان نہیں ہوا ہے۔" سکندر علی شاہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ہوسکتا ہے کہ اس میں بھی تمہیں اغوا کرنے والوں کی کوئی مصلحت ہو۔ بہرحال میں چوبیس گھنٹے بعد تمہیں ایسی جگہ منتقل کر دوں گا جہاں تم پوری طرح محفوظ رہو گی۔"

"اگر آپ کا شبہ کسی خاص فرد یا گروہ کی طرف ہے تو کیا وہ لوگ چوبیس گھنٹوں کے بعد میری طرف سے غافل ہوجائیں گے؟"

"تم ان باتوں پر غور نہ کرو۔" سکندر علی شاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں نے جو قدم اٹھایا ہے وہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی اٹھایا ہے۔ میرے آدمی بھی پوری طرح [illegible] ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تمہیں چوبیس گھنٹوں سے پہلے ہی دوسری جگہ شفٹ کر دیا جائے۔"

"ناگی کے بارے میں آپ نے کیا معلوم کیا؟"

"تم نے جس شبہے کا اظہار کیا ہے وہ بھی میرے کسی دشمن کی چال ہوسکتی ہے لیکن اگر ناگی ہی نے اپنی محسن کو دعوت دی ہے تو اس کا انجام بھی عبرت ناک ہی ہوگا۔"

"نگینہ کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

"کیا مطلب؟" سکندر علی شاہ بری طرح چونکا۔ "تمہیں اس وقت خلاف توقع نگینہ کا خیال کیسے آگیا؟"

"جس نے مجھے آزاد کیا ہے اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ نگینہ بھی اوپر پہنچا دی گئی ہے اور اس کی موت میں بھی ناگی کا ہی خفیہ ہاتھ شامل ہے۔"

"نگینہ کے بارے میں پولیس بھی تفتیش کر رہی ہے۔" سکندر علی شاہ نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ "اس کی لاش مس جوزف کے وومن ہاسٹل کے ایک کمرے سے ملی تھی۔ جس عورت پر اسے قتل کرنے کا شبہ ہے وہ اور اس کے ایک ساتھی کو بھی پولیس نے حراست میں لے رکھا ہے۔"

"آپ پر تو کوئی بات نہیں آئی، میرا مطلب ہے نگینہ مس جوزف کے ہاسٹل میں......"

"تم پریشان نہ ہو، سب خیریت ہے۔"

"ایک سوال اور کروں گی۔"

"پوچھو؟"

ایک لمحے کو دوسری جانب خاموشی طاری رہی پھر دلربا نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"کیا آپ بھی اپنے کسی نادیدہ مگر ہمدرد دشمن کے ہاتھوں بے بسی کا شکار ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ وہ آپ سے رابطے میں ہے لیکن ابھی کھل کر سامنے نہیں آیا؟"

سکندر علی شاہ کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ دلربا کا آخری جملہ سن کر اس کے ذہن میں کئی نام ابھرے تھے۔ سرفہرست نام شکرہ کا تھا جس نے ناگی اور نگینہ دونوں کے بارے میں اسے سرزنش کی تھی۔ دلربا کے اغوا کی خبر بھی اسی نے دی تھی جس کی تصدیق بعد میں اورنگ زیب نے کر دی تھی۔

"کیا بات ہے؟" دلربا کی آواز ابھری۔ "آپ خاموش کیوں ہوگئے؟"

"جب ملاقات ہوگی تو تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ فی الحال تم آرام کرو، جسٹ ریلیکس۔" سکندر علی شاہ نے جواب دینے کے بعد موبائل آف کر دیا۔ دلربا نے نگینہ اور نادیدہ دشمن کے حوالے سے جو بات کی تھی اسے سن کر سکندر علی شاہ کے ذہن میں ایک بار پھر سوالات کی یلغار شروع ہوگئی۔

نگینہ کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی لیکن کسی نادیدہ دشمن والی بات سکندر علی شاہ کے سوا کسی اور کو نہیں معلوم تھی پھر دلربا نے یہ سوال کیوں کیا تھا؟ کیا یہ محض اتفاق تھا یا اسے اغوا کرنے والوں نے نادیدہ دشمن کے حوالے سے کوئی کلیو دیا تھا۔ ان باتوں کے تسلسل میں ایک خیال اور بھی اس کے ذہن میں چکرانے لگا۔ "کیا دلربا کو خود شکرہ نے کسی خاص مقصد کے پیش نظر اغوا کیا تھا؟"

اور بھی کئی باتیں سکندر علی شاہ کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں جب فون کی گھنٹی کی آواز ابھری۔ سکندر علی شاہ نے تین گھنٹیوں کے بعد ریسیور اٹھا لیا۔ سلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سکندر علی شاہ بول رہا ہوں۔"

"دلربا کے بارے میں تم نے اب کیا غور کیا ہے؟" دوسری جانب سے شکرہ کی آواز ابھری۔

"مم...... میں سمجھا نہیں۔" سکندر علی شاہ نے اس اچانک سوال پر چونک کر کہا۔ "وہ...... وہ......"

"وہ تمہیں واپس مل گئی ہے۔ اس وقت جہاں ہے وہ بھی جانتا ہوں لیکن اس کا ہوٹل میں رہنا مناسب نہیں ہے۔"

"اب میں اسے کسی محفوظ مقام پر ہی منتقل کروں گا۔"

"جانتے ہو اسے کس نے اغوا کیا تھا؟"

"اس کی اطلاع سب سے پہلے مجھے آپ ہی نے دی تھی۔"

"اب یہ اطلاع بھی میں ہی دے رہا ہوں کہ اس کے اغوا اور دوبارہ واپسی میں ایس پی کا ہاتھ شامل ہے۔"

"لیکن وہ......"

"بحث نہیں۔" دوسری جانب سے بات کاٹ کر قدرے درشت لہجے میں کہا گیا۔ "ایس پی کو میں نے جو مہلت دی اس کا کچھ مقصد بھی تھا لیکن اب تم اسے اگلے ویک اینڈ پر فارم ہاؤس میں بلا لو۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ایک بار پھر ہدایت دے رہا ہوں کہ ایس پی سے محتاط رہنا۔" سرسراتے لہجے میں کہا گیا پھر رابطہ ختم ہوگیا۔

☆☆☆

رستم علی آغا خانی کے قتل کی اطلاع اورنگ زیب کو تھانہ انچارج نے دی تھی۔ دیگر تفصیل سے بھی آگاہ کیا تھا۔

## تلاش

میاں بیوی کی بول چال بند تھی۔ میاں کو سخت زحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بیوی غصے میں کوئی کام نہیں کر رہی تھی۔ سب ترکیبیں منانے کی بیکار ہوگئیں۔ ایک روز دن کی روشنی میں چراغ جلایا اور کچھ ڈھونڈنے لگا۔ بیوی کو اس جستجو پر صبر نہ ہوسکا اور میاں سے پوچھا۔ کیا ڈھونڈ رہے ہو۔"

میاں چراغ پھینک کر بولا۔ "تمہاری زبان ڈھونڈ رہا تھا، شکر ہے بڑی تلاش کے بعد مل گئی۔"

## بے چارگی

ٹرین کے ایک پورے ڈبے میں بارات بیٹھی تھی ایک آدمی کو جب کہیں جگہ نہ ملی تو وہ بھی ٹرین کے اس ڈبے میں آکے بیٹھ گیا ٹرین چل پڑی کچھ دیر بعد باراتیوں نے ایک ڈبہ کھولا اور اس میں سے میٹھے چاول نکالے اور ساری بارات کو دیئے لیکن اس آدمی کو نہ دیئے۔ وہ چپ کر کے بیٹھا رہا کہ کوئی بات نہیں شاید انہوں نے مجھے دیکھا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد باراتیوں نے ایک اور ڈبہ کھولا اور اس میں سے برفی نکالی اور ساری بارات میں تقسیم کی لیکن اس آدمی کو نہ دی اسے بہت غصہ آیا کہ ایک میں ہی باہر کا آدمی ہوں مجھے بھی دے دیتے تو کیا تھا۔ لیکن وہ ضبط کر کے بیٹھا رہا۔ تیسری دفعہ باراتیوں نے لڈو نکالے اور سب کو ایک ایک لڈو دیا لیکن اس آدمی کو نظر انداز کر دیا۔ اب تو اس آدمی کو بہت غصہ آیا وہ کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا۔ "اللہ کرے اس ڈبے پر بجلی گرے اور تم سب مر جاؤ۔"

باراتیوں میں ایک سیانا آدمی کھڑا ہوا اور بولا۔ "اگر اس ڈبے پر بجلی تو تم کیسے بچو گے؟"

اس آدمی نے جواب دیا۔ "جیسے چاول، برفی اور لڈوؤں کی دفعہ بچ گیا تھا۔"

مرسلہ: بابر عباس، گلیانہ روڈ، کھاریاں

قاتل کا حلیہ بھی لیڈی سیکریٹری کے بیان کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا تھا لیکن سب سے اہم بات آکٹوپس کے علامتی نشان کی تھی جس کے بعد یہ بات کھل کر واضح ہوگئی تھی کہ شیخ حامد کسی وجہ سے دوبارہ میدان عمل میں آگیا تھا۔ تفصیل ملنے کے بعد یہی سوال سراج نے بھی کیا تھا۔

''فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ اس کی وجہ روشنا اور دارا کے غیر ملک چلے جانے سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھتی ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ روشنا کے اغوا میں بھی کسی نہ کسی زاویے سے اسی کا ہاتھ ہوگا۔''

''یہ بات ایک عام آدمی کے ذہن میں بھی آسکتی تھی۔'' اورنگ زیب نے پہلو بدل کر کہا۔ ''بنیادی سوال یہ ہے کہ جب روشنا کی برہنہ تصویریں مجرم کے پاس تھیں تو قتل جیسے سنگین جرم کے ارتکاب کی کیا ضرورت تھی۔''

''آپ کا اس ضمن میں کیا خیال ہے؟''

''فی الحال انتظار کرو۔''

''سوری۔'' سراج نے منہ بنا کر کہا۔ ''میں بھول گیا تھا کہ آپ مجھ سے بھی اپنے دل کا حال بتانے سے گریز کرتے ہیں۔''

''غلط خیال ہے تمہارا۔'' اورنگ زیب نے بہ دستور سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ''میں خود بھی ابھی تک کوئی آخری نتیجہ اخذ نہیں کرسکا ہوں۔ اس قتل کی واردات کے دو ہی مقاصد ہوسکتے ہیں۔ کسی وجہ سے دارا کو واپس آنے پر مجبور کرنا یا پھر پولیس کو غلط راستے پر ڈالنا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس واردات کے تسلسل میں کچھ اور لوگ بھی آکٹوپس کی بوکھلاہٹ کا نشانہ بن جائیں۔''

''اور لوگ کون ہوسکتے ہیں؟'' سراج نے چونک کر سوال کیا۔

''پریشان مت ہو فی الحال آکٹوپس مجھے نشانہ بنانے کی غلطی نہیں کرے گا۔''

''اس یقین کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟''

''پہلی وجہ یہ ہے میں اپنی سیٹ سے دور کردیا گیا ہوں اس کے پس پشت بھی آکٹوپس کا ہاتھ ہوگا۔ دوسری وجہ یہ کہ اگر اس کا مقصد مجھے نشانہ بنانا ہوتا تو وہ پہلا وار کسی اور کے بجائے براہ راست مجھ پر کرتا۔''

اس کے بعد سراج اور اورنگ زیب کے درمیان دوسرے متعدد پہلوؤں پر بھی غور ہوتا رہا۔

جب ڈی آئی جی کی میٹنگ کے لیے کال آئی اس وقت بھی سراج اورنگ زیب کے ساتھ ہی تھا لیکن اس اورنگ زیب کے اشارے پر ہی کہا تھا کہ وہ اس وقت گ پر موجود نہیں ہے۔

سراج کے جانے کے بعد اورنگ زیب کا ذہن ر علی آغا خانی کے قتل کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ الماس کافی لے کر آئی جب بھی وہ اپنے خیال میں مستغرق تھا۔

''خیریت؟'' الماس نے بڑی اپنایت سے پوچھا۔ ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''یونہی کچھ دفتری معاملات کے بارے میں غور کررہا تھا۔''

الماس کے جانے کے بعد اس نے کافی ختم کی پھر فو بھی ڈی آئی جی کے آفس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ لیاقت حسی کو اس نے موبائل پر اپنے ارادے سے آگاہ کردیا تھا ا لیے وہ گاڑی لیے تیار کھڑا تھا۔

پچھلی نشست پر بیٹھ کر اورنگ زیب نے آنکھیں بن کرلیں۔ وہ بڑی یکسوئی سے شیخ حامد کے اچانک سامنے آجانے کے مختلف پہلوؤں پر غور کررہا تھا۔ رستم علی آغا خانی کے قتل کو محض پرانی تجارتی دشمنی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ روشنا او دارا کا بیرون ملک چلے جانا بھی اس قتل کا محرک ہوسکتا تھا۔ شیخ حامد نے خود کو منظر عام پر دوبارہ اجاگر کرنے کی خا بطور خاص رستم علی آغا خانی کا انتخاب کرکے قانون کو بھی ا بات کا احساس دلانے کی کوشش کی ہوگی کہ وہ سامنے رو بھی اس کی دسترس سے دور ہی ہوگا۔ اس واردات سے ا کا بنیادی مقصد اورنگ زیب کو بھی چیلنج کرنا تھا جسے ا سیٹ سے ٹرانسفر کردیا گیا تھا۔ اس ضمن میں آئی جی پوزیشن کا اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ بھی کسی نامعلوم دشمن اشارے پر عمل کرنے پر مجبور تھا اور بھی کئی پہلو کے دیگرے اورنگ زیب کے ذہن میں ابھر رہے تھے جب اس کے موبائل پر سگنل موصول ہوا۔ روشن اسکرین نظر آنے والے نمبر نئے تھے پھر بھی اس نے موبائل آ کرلیا۔

''ہیلو۔'' اس نے محض ہیلو کہنے پر اکتفا کیا۔

''تمہارا ایک پرانا واقف کار بول رہا ہوں''

دوسری جانب سے بولنے والے نے آواز بدلنے کی کو کی تھی۔

''میرے واقف کاروں کی فہرست بہت طو ہے۔'' اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا ''میرے واقف کار یہ بھی جانتے ہیں کہ مجھے پہیلیاں بوجھ شوق بھی نہیں رہا۔''



''کیا رستم علی آغا خانی کا حوالہ کافی نہ ہوگا؟''

''اوہ...... تم۔'' اورنگ زیب شیخ حامد کی آواز پہچان کر محتاط لہجے میں بولا۔ ''میں اسے تمہارا کارنامہ نہیں بلکہ بزدلی کا نام دوں گا۔ بہادر ہوتے تو براہ راست میرے اوپر وار کرنے کی کوشش کرتے۔''

''تمہاری حیثیت محض ایک ایس پی کی ہے جسے میں نے پاؤں کی جوتی سے زیادہ بھی کوئی اہمیت نہیں دی۔'' جواب حقارت سے دیا گیا۔ ''رستم علی آغا خانی کو فی الحال کسی آنے والی فلم کا ٹریلر ہی سمجھو۔ اصلی فلم بھی بہت جلد شروع ہوجائے گی۔''

''کیا صرف یہی بکواس کرنے کی خاطر فون کیا تھا؟'' اورنگ زیب نے دبنگ لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں...... یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ آکٹوپس ایک وقت میں کئی شکار کرسکتا ہے۔ یہ نام بھی تم نے ہی دیا ہے۔ یہ بھی سن لو کہ میں تم کو کسی رینگنے والے حقیر کیڑے سے زیادہ کمزور سمجھتا ہوں۔ تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی باور کروادوں کہ میں پولیس والوں کی طرح ڈبل گیم کھیلنے کا عادی نہیں ہوں۔ قبل از وقت یہ بھی ذہن نشین کرلو کہ وہ وقت دور نہیں جب تم بھی پالتو کتوں کی طرح میرے قدموں میں لوٹو گے۔ اسے میرا چیلنج ہی سمجھو۔''

جواب میں اورنگ زیب کچھ کہنا چاہتا تھا جب دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کردیا گیا پھر دوبارہ وہ اس وقت چونکا جب لیاقت حسین نے گاڑی سکندر علی شاہ کی کوٹھی کے دروازے پر روکی تھی۔

''یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟'' اس نے لیاقت حسین سے سوال کیا۔

''آپ شاید بھول رہے ہیں کہ آپ نے مجھے یہیں آنے کا حکم دیا تھا۔'' لیاقت حسین نے سادگی سے کہا۔ ''مجھے تعجب ہی ہوا تھا کہ آپ پیری مریدی کے چکر میں کہاں پھنس گئے۔''

''تم جانتے ہو سکندر علی شاہ کو؟''

''نام سنا ہے ملنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔''

کوٹھی کے چوکیدار نے گاڑی میں جھانکا۔ اورنگ زیب کو دیکھ کر اس نے بڑے ادب سے سلام کیا پھر پھاٹک کھول دیا۔ کچھ دیر بعد اورنگ زیب، سکندر علی شاہ کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ اس وقت وہاں اس کی آمد میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ شیخ حامد کا فون بھی اسے خلاف توقع ہی موصول ہوا تھا۔ وہ گھر سے ڈی آئی جی کے آفس جانے کے لیے نکلا تھا لیکن لیاقت حسین نے اسے سکندر علی شاہ کی کوٹھی پر پہنچا دیا تھا، آخر کیوں؟

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ڈی آئی جی آفس چلنے کی ہدایت دی تھی۔ اس وقت وہ ذہنی طور پر صرف اور صرف رستم علی آغا خانی کے قتل کے بارے میں مختلف پہلوؤں پر غور کررہا تھا۔ ڈی آئی جی کی میٹنگ میں بھی اس نے سراج کو بھیج دیا تھا پھر اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ میٹنگ کے دوران کچھ نئی معلومات سامنے آجائیں وہ خود بھی گھر سے روانہ ہوا تھا، راستے میں شیخ حامد

کا فون آنے کے بعد وہ اسی کی دیدہ دلیری کے بارے میں غور کر رہا تھا اور اب وہ سکندر علی شاہ کے خوب صورت ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔

آج سے پیشتر وہ اتنا بے خبر کبھی نہیں ہوا تھا، ہر قدم پر آنکھیں کھلی رکھنے کا عادی تھا یہی اس کی ڈیوٹی کا تقاضا بھی تھا۔ سب سے زیادہ تعجب اسے لیاقت حسین کی بات پر ہوا تھا۔ وہ ان ہی اتفاقات پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ جب سکندر علی شاہ نے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''اس وقت کیسے آنا ہوا؟''

''اگر آپ مصروف ہیں تو پھر کسی وقت......'' اورنگ زیب نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ایسا بھی نہیں ہے، جب ہم نے ایک دوسرے کو دوست کہا ہے تو پھر رسمی باتوں کی گنجائش بھی نہیں رہی۔''

''بات دراصل یہ ہے شاہ جی کہ میں ادھر چند دنوں سے ذہنی طور کچھ زیادہ ہی الجھا ہوا ہوں۔''

''اگر یہ معاملہ ہے تو آپ بروقت آئے ہیں۔'' سکندر علی شاہ نے پہلو بدل کر کہا۔ ''میں بھی آپ کے علاج کی طرف سے غافل نہیں تھا لیکن درمیان میں کچھ مصروفیات ایسی پیش آگئیں کہ میں نے وقتی طور پر فارم ہاؤس والا پروگرام منسوخ کر دیا تھا مگر آج...... آج آپ نہ آتے تو میں خود آپ کو کال کرتا۔''

''سب خیریت تو ہے؟'' اورنگ زیب نے بڑی معصومیت سے دریافت کیا۔

''میں نے اس ویک اینڈ کا پروگرام تیار کر لیا ہے۔'' سکندر علی شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''سارے انتظامات بھی مکمل کر لیے ہیں۔''

''پھر غور کر لیں شاہ جی۔'' اورنگ زیب نے کسمسا کر جواب دیا۔ ''اگر بات کسی ذریعے سے بھی فارم ہاؤس کے باہر آگئی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ ساری بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی۔''

''دوست کہا ہے تو پھر دوست پر اعتماد بھی کریں۔'' سکندر علی شاہ نے اس بار خالص کسی پہنچے ہوئے بزرگ کا انداز اختیار کیا۔ ''میں نے آپ کے لیے جو علاج طے کیا ہے وہ موثر ہی ثابت ہوگا۔ نفسیاتی طور پر وہ گرہ کھلنی ضروری ہے جو آپ کے تحت الشعور میں پوری طرح جڑ پکڑتی جا رہی ہے۔''

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خود کو ذہنی الجھن کا شکار ہی ظاہر کرتا رہا۔ سکندر علی شاہ اسے کمزور دیکھ کر اس پر اپنی روحانی قوتوں کا سکہ جماتا رہا۔ اورنگ زیب بھی ظاہر کرتا رہا کہ وہ اس کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ایک ملازم لوازمات کی ٹرالی لیے داخل ہوا تو سکندر علی شاہ نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

خاصی دیر بعد جب اورنگ زیب جانے کی اجازت لے کر اٹھا تو سکندر علی شاہ پہلی بار اسے باہر تک چھوڑنے آیا جہاں لیاقت حسین گاڑی کے ساتھ موجود تھا۔ گاڑی کوٹھی سے باہر نکلی تو اورنگ زیب نے سکون کا سانس لیا لیکن اس کا یہ سکون بھی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ گاڑی احاطے سے نکلنے کے دو منٹ بعد ہی لیاقت حسین نے کچھ عجیب انداز میں پوچھا۔

''یہ جو باہر تک آیا تھا، کون تھا؟''

''سکندر علی شاہ، جس کے ہزاروں عقیدت مند ہر وقت اس کے آگے پیچھے لگے رہتے ہیں۔''

''نہیں۔'' لیاقت حسین نے بدستور خلا میں گھورتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''میں نے اس کو پہچان لیا ہے۔ یہ وہی ملعون ہے جس نے ایک معصوم اور مجبور لڑکی کی عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ جب اس مظلوم لڑکی نے آبرو بچانے کی خاطر خودکشی کر لی تو اس نے اپنے زرخرید کتوں کے ذریعے اسے دفن کروا دیا۔ میں اس قبر کو دیکھ چکا ہوں جہاں وہ ایک عرصے سے دفن ہے۔''

''لیاقت حسین......'' اورنگ زیب نے حیرت سے دریافت کیا۔ ''یہ تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ اس غریب اور بے سہارا لڑکی کی لاش اس وقت تک اپنی اصلی حالت میں محفوظ رہے گی جب تک مجرم کو پھانسی نہیں لگ جاتی۔ یہی مشیت ایزدی بھی ہے۔''

لیاقت حسین کی آواز میں نفرت اور حقارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کچھ دیر پیشتر اس نے کہا کہ صرف سکندر علی شاہ کا نام سنا ہے ملنے کی کوشش نہیں کی لیکن اب وہ شاید کسی غیبی قوت کے زیر اثر تھا جو غیر ارادی طور پر اس کی زبان سے کچھ اہم انکشافات کروا رہی تھی۔ اس بات کا علم سراج کے علاوہ اورنگ زیب بھی ایک دو موقعوں پر کر چکا تھا اور...... اس وقت بھی غالباً لیاقت حسین اسی غیبی قوت کے اشارے پر ڈی آئی جی آفس جانے کے بجائے اورنگ زیب کو سکندر علی شاہ کی کوٹھی پر لے آیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد لیاقت حسین خاموش ہو گیا لیکن اورنگ زیب بدستور ان ہی باتوں کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا جو لیاقت حسین کی زبان سے ادا ہوئی تھیں۔

یہ بات بھی زیادہ حیرت انگیز نہیں تھی کہ واپسی کے بعد خود لیاقت حسین بھی ان باتوں کو یکسر بھول چکا تھا۔ اورنگ زیب نے بھی اسے زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

ساحلی علاقے میں مچھیروں کی وہ قدیم بستی جو کبھی خاصی گنجان آباد تھی اب وہاں گنتی ہی کے کچھ کچے پکے مکانات رہ گئے تھے۔ اس کی وجہ وہ قبرستان تھا جو رفتہ رفتہ خاصا پھیل گیا تھا۔ مچھیروں نے اس قبرستان سے متعلق بہت ساری پراسرار کہانیوں کی وجہ سے ہجرت کر کے نئی بستی آباد کر لی تھی لیکن پندرہ بیس کچے پکے مکانات اب بھی باقی تھے۔ ایک دو دکانیں بھی تھیں جہاں روزمرہ کی ضرورت کا سامان مل جاتا تھا۔

پہلے اس ساحلی علاقے پر پکنک منانے کے لیے لوگ بھی آیا کرتے تھے لیکن اب ان کی تعداد بھی کم ہو گئی تھی پھر بھی کچھ پرانے مچھلی کے شکاری تھے جو اب بھی وہاں آتے رہتے تھے شاید اس لیے کہ سمندر کے اس حصے میں آبادی ختم ہونے کے بعد مچھلیوں کے شکار کی سہولت زیادہ ہو گئی تھی۔

اس وقت شام کے جھٹ پٹے کا وقت تھا جب ایک پرانے ماڈل کی کار آبادی کے قریب آ کر رکی تھی۔ اس میں سے جو شخص اترا وہ ادھیڑ عمر ہی کہا جا سکتا تھا۔ کار کے رکتے ہی آبادی کے دو تین افراد اس کے قریب آ گئے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ تازہ مچھلی کے حصول کے لیے اب بھی پرانے گاہک ادھر آتے رہتے تھے۔

''کیا چاہیے صاحب؟'' ایک مچھیرے نے قریب آ کر سوال کیا۔

''مجھے وہ خاص مچھلی درکار ہے جو مجھ جیسے لوگوں کے لیے بڑی کارآمد ہوتی ہے۔'' ادھیڑ عمر کے شخص نے بغیر کسی جھجک کے کہا۔ ''بھلا سا نام بتایا ہے کسی واقف کار نے مگرا...... یا پھر نگرا۔''

''سمجھ گیا صاحب۔'' سوال کرنے والے نے معنی خیز انداز میں آنے والے کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر بڑی صاف گوئی سے بولا۔ ''ہم وہ مچھلی فروخت نہیں کرتے۔''

''میں تمہیں منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہوں۔''

''معافی چاہتا ہوں صاحب۔'' مچھیرے نے کہا۔ ''ایک دو پرانے گاہکوں کے علاوہ ہم اسے کسی اور کو نہیں

سردار شادی کے دن کنفیوز ہو گیا کہ اپنی بیوی سے بات کیسے شروع کرے؟ آخرکار وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ کے گھر والوں کو معلوم ہے کہ آج آپ یہیں رکیں گی؟''

مرسلہ: محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال

دیتے۔ تم جس مچھلی کی بات کر رہے ہو وہ مشکل ہی سے جال میں پھنستی ہے۔ تم شاید پہلی بار ادھر آئے ہو۔''

''کیا مطلب؟ کیا اس طرف کسی نئے آدمی کا آنا منع ہے؟'' آنے والے نے قدرے ناگوار لہجہ اختیار کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے صاحب لیکن ہم وہ مچھلی......''

مچھیرا اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اس کی وجہ اس کا وہ نوجوان ساتھی تھا جو سامنے آ گیا تھا۔

''تم کو اس مچھلی کے بارے میں جو معلوم ہوا ہے وہ غلط بھی نہیں ہے لیکن تمہیں اس عمر کے بعد اس کا نام کس نے بتا دیا۔'' نوجوان نے آنے والے کو سپاٹ لہجے میں مخاطب کیا۔

''کیوں...... کیا اس کا نام بتانا جرم ہے؟'' آنے والے کے تیور بھی بدل گئے۔

''میں تمہیں، تمہاری مطلوبہ مچھلی فراہم کر سکتا ہوں۔'' نوجوان نے اس بار بھی سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا قیمت دے سکو گے اس کی؟''

''جو تم مانگو۔'' آنے والے نے جیب سے اپنا پرس نکال لیا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' نوجوان نے اس بار کاروباری لہجہ اختیار کیا۔ ''پہلے اپنی مطلوبہ مچھلی دیکھ لو پھر...... سودا بھی طے ہو جائے گا۔''

نوجوان اور ادھیڑ عمر والا آگے پیچھے بستی میں داخل ہوئے۔ ادھیڑ عمر والا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا شاید اسے نوجوان کا انداز گفتگو پسند نہیں آیا تھا۔

بستی میں داخل ہونے کے بعد نوجوان مختلف راستوں کے پیچ و خم طے کرتا رہا پھر وہ ایک نیم پختہ مکان کے سامنے رک گئے جہاں اس کا کوئی ساتھی موجود تھا۔ اس نے بھی ادھیڑ عمر والے پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر نوجوان سے پوچھا۔

''یہ کون ہے؟''

''اسے گرم مچھلی کی تلاش ہے۔'' نوجوان نے جواب

دیا پھر ادھیڑ عمر والے کو ساتھ لے کر مکان میں داخل ہوگیا۔ ایک کمرے سے گزر کر وہ دوسرے کمرے میں پہنچا جہاں ایک چھریرے بدن کا فرد پہلے سے موجود تھا۔ نوجوان کے ساتھ ادھیڑ عمر والے کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمایاں ہوگئیں۔ آنکھوں میں کسی سانپ جیسی ہی چمک بھی ابھری تھی۔ ایک لمحے تک وہ آنے والے کو تیز نظروں سے گھورتا رہا پھر اس نے نوجوان کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''استاد۔'' نوجوان نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اسے گرم مچھلی منگرا یا مگرا کی تلاش ہے۔ صحیح نام کیا ہے، یہ خود بھی نہیں جانتا۔''

''اوہ......!'' چھریرے بدن والے نے نظر بھر کر آنے والے کو دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر معنی خیز انداز میں سوال کیا۔ ''کسی مچھلی کے حصول کے لیے تمہیں بھیس بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''یہ......یہ میں نے شرمندگی سے بچنے کی خاطر......''

''نہیں افضل خان۔'' چھریرے بدن والے نے جو ناگی کے سوا کوئی اور نہیں تھا، افضل خان کو حقارت سے گھورا۔ ''کوئی حماقت نہ کرنا ورنہ تمہاری لاش کے ٹکڑے بھی نہیں ملیں گے۔''

آنے والا ہونٹ چبانے لگا۔ اس کی نظریں بھی ناگی پر جمی ہوئی تھیں۔ خود کو پہچان لیے جانے کے بعد بھی وہ خوف زدہ نہیں تھا لیکن اس وقت اس کے کانوں میں شبنم کا کہا ایک جملہ ضرور صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔

''تم میرے لیے بہت قیمتی ہو افضل۔ میں نے تمہیں بڑی مشکلوں سے پایا ہے، پا کر دوبارہ کھونا نہیں چاہتی۔''

''کس سوچ میں گم ہوگئے؟'' ناگی نے سرسراتے انداز میں پوچھا۔

''سوچ رہا ہوں کہ تم جیسا نامی گرامی آدمی بھی کبھی کبھی خوف زدہ ہو کر ویرانوں میں چھپنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔'' افضل خان کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

''حالات پر منحصر ہے۔'' ناگی زہرخند سے بولا۔ ''تم بھی ہمیشہ سینہ تان کر چلنے کے عادی تھے لیکن شیخ حامد کے روپوش ہونے کے بعد اب چہرے پر نقاب سجانے پر مجبور ہوگئے ہو، کیوں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''پالتو اور شکاری کتوں سے بچنے کا یہی ایک جدید طریقہ ہے۔''

افضل خان کا جواب سن کر قریب کھڑے نوجوان کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا تھا جب ناگی نے اسے روکا۔

''نہیں، گھر آئے مہمان کی خاطر مدارات کے کئی طریقے ہیں۔ اسے سانس درست کرنے کا کچھ موقع...''

نوجوان نے ناگی کی بات سن کر دوبارہ افضل ... خونخوار نظروں سے دیکھا پھر ہونٹ چباتا ہوا باہر نکل... ناگی کی نگاہیں پھر افضل خان کے چہرے پر جم گئیں۔

''کس کے اشارے پر آئے ہو؟''

''جو سوال کرنے کا عادی رہا ہو وہ جواب ... کرتا۔'' افضل خان نے بے پروائی سے کہا۔

''اپنا نہیں تو اس نئی نویلی دلہن کا خیال کرو جسے ... واپسی کی امید ضرور ہوگی۔'' ناگی مسکرایا۔

''مرد ہو تو صرف مردوں کی بات کرو، عورت کا ... نہ لو۔''

''اوہ......'' ناگی بل کھا کر رہ گیا۔ ''تم شاید ... کی زبان نہیں سمجھو گے۔''

''ناگی۔'' افضل خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم یہاں سے باہر چل کر کھلی فضا میں بات کریں۔''

''اب اس وہم کو ذہن سے نکال دو۔ آنا تمہارے اختیار میں تھا واپسی کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے...''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو... خالی ہاتھ جانے کے ارادے سے نہیں آیا ہوں۔''

ناگی بڑے زہریلے انداز میں مسکرایا پھر اس ... جیب سے اپنا پستول نکال لیا۔ اس کے تیور بدلنے لگے۔

''کچھ دیر پہلے تم نے اپنے آدمی سے کہا تھا کہ ... سانس لینے کا موقع دیا جائے۔'' افضل خان نے ... کہا۔ ''مرد ہو کر اتنی جلدی اپنا وعدہ بھول گئے۔''

''تمہاری سانسیں اب گنی چنی رہ گئی ہیں۔ ... شکوہ مجھ سے نہیں اوپر والے سے کرو۔'' ناگی نے ... سرد لہجے میں کہا پھر اس کی انگلی کا دباؤ ٹریگر پر بڑھنے لگا۔

افضل خان نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا... نظریں بدستور ناگی پر مرکوز تھیں لیکن دل کی دھڑکنیں ... ہونے لگی تھیں۔ کرنل احتشام کا ایک جملہ اس کے ذہن ... گونجنے لگا۔

''ناگی کسی کوبرا سے زیادہ خطرناک اور زہریلا ... تمہیں ہر ہر قدم پر محتاط رہنا ہوگا۔''

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید ...
واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے





# کھلاڑی

کاشف زبیر

بنا کر مٹانا، مٹا کر بنانا... مل کر بچھڑنا، بچھڑ کر مل جانا... کبھی نظر آنا، کبھی چھپ جانا... حضرت انسان کے ایسے بے شمار مشاغل ہیں جن میں سے کچھ پر وہ ایسی مہارت بھی حاصل کر لیتا ہے کہ کھلاڑی بن جاتا ہے مگر... ایک کامیاب کھلاڑی وہی ہوتا ہے جو قواعد و ضوابط کی پاسداری بھی کرتا ہے۔ بس اسی کامیابی کی بلندی کو چھونے کے لیے اس نے کئی خطرات کو گلے بھی لگالیا یہ اور بات کہ اس کی تمام تر توجہ قانون سے معرکہ آرائی پر مرکوز رہی لیکن جو بھی تھا اس نے سب اناڑیوں کو ایک لائن کھڑا کر کے خود کو کامیاب کھلاڑی ثابت کر دیا تھا۔

اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ایک بے اصول جنگ کا احوال

بینک کے سامنے گاڑی رکی اور اس سے چار افراد اتر کر تیزی سے بینک میں داخل ہوئے۔ فاصلہ مشکل سے چھ فٹ کا تھا۔ اس لیے کسی نے نوٹ نہیں کیا کہ چاروں افراد نے چہروں پر ربر ماسک چڑھا رکھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی سب سے آگے موجود شخص جس نے بل کلنٹن کے نقوش والا ماسک لگا رکھا تھا۔ بینک گارڈ کی طرف لپکا۔ ''ہاتھ اوپر کرو۔'' اس نے دہاڑ کر کہا تو گارڈ نے بے ساختہ ہاتھ اوپر کر لیے۔ ڈاکو

نے اس کا پستول لے کر اسے اوندھے منہ لیٹنے کا حکم دیا۔ وہ پھرتی سے فرش پر لیٹ گیا جہاں پہلے ہی بینک میں موجود دوسرے افراد لیٹ رہے تھے۔ بینک کا عملہ کاؤنٹرز کے پیچھے ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ باقی تین افراد نے پورے بینک کو اس طرح کور کر لیا کہ کوئی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں تھا۔ ایک جا کر کیبن سے منیجر کو نکال لایا۔ کلنٹن کے نقاب والا دوڑ کر اچھلا اور کیشئر کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوا۔ اس نے کہا۔

”لیڈیز اینڈ جنٹل مین، میں آپ کا سابق صدر ان دنوں بے روزگار ہوں اس لیے بینک لوٹنے پر مجبور ہوں، امید ہے آپ مجھ سے اتفاق کریں گے۔“

وہ بات کرتے ہوئے چاروں طرف نظر رکھے ہوئے تھا اور اب اس کے ساتھی کیش جمع کر رہے تھے۔ انہوں نے کیشئر کی دراز خالی کی اور اب وہ منیجر سے سیف روم کھلوا رہے تھے۔ اصل رقم وہاں موجود تھی اور یہ کم سے کم بھی ایک ملین ڈالرز کی رقم تھی۔ وہ انہوں نے ساتھ لائے تھیلوں میں منتقل کی۔ کلنٹن کے نقاب والا لوگوں کے ساتھ ہاتھ پر بندھی گھڑی پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ انہیں بینک میں آئے دو منٹ ہوئے تھے اور انہیں تین منٹ کے اندر یہاں سے روانہ ہو جانا تھا۔ اس کے ساتھی سیف روم سے نکلے اور دروازے کی طرف لپکے ان کے جاتے ہی وہ چھلانگ مار کر نیچے اترا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔ ”ہمارے جانے کے بعد کوئی ایک منٹ سے پہلے حرکت نہ کرے ورنہ اپنی موت کا خود ذمے دار ہوگا۔“

کلنٹن کے نقاب والا دروازے کے پاس پہنچا جہاں اس کا ساتھی دروازے کھولے کھڑا تھا۔ جیسے ہی کلنٹن کے نقاب والا باہر نکلا اس کے ساتھی نے عجیب حرکت کی، اس نے اپنا ٹراؤزر نیچے کیا۔ اس کے کولہے دکھائی دیے جن پر لکھا تھا۔ ”تھینک یو۔“

☆☆☆

”ایک منٹ اس منظر کو پھر سے دکھانا۔“ گیری رونالڈ نے ایف بی آئی، آئی ٹی سیکشن کی مچلی سے فرمائش کی۔ اس نے ڈاکو کے کولہے دکھانے والا سین ریورس کیا اور مسکرا کر بولی۔

”لگتا ہے تمہیں یہ سین بہت پسند آیا ہے۔“

گیری نوجوان اور پرجوش تھا۔ اسے ایف بی آئی میں آئے ہوئے دو سال ہوئے تھے اور اس دوران میں وہ کئی کیسز میں اپنے پارٹنر کے ساتھ کام کر چکا تھا مگر اس کی خواہش تھی کہ وہ کوئی ایسا کیس حل کرے جو اسے پورے ملک نہ سہی کم سے کم اپنے شہر ہوسٹن میں مشہور کر دے۔ اس کا پارٹنر کارسن وائلڈ تقریباً چالیس سال کا تجربے کار سنجیدہ شخص تھا جو ان تمام نشیب و فراز سے گزر چکا تھا جن سے فی الحال گیری گزر رہا تھا اس لیے وہ سکون سے ایک طرف اپنا کافی کا کپ لیے ایک کریم رول سے انصاف کر رہا تھا۔ گیری بینک ڈکیتی کے دوران کیمروں کی ویڈیو دیکھ رہا تھا۔ یہ تین منٹ کی ویڈیو تھی جو چار مختلف کیمروں سے لی گئی تھی۔ یعنی کل بارہ منٹ کی مووی تھی۔ اس میں چاروں ڈاکو نمایاں تھے۔ وہ بہت پراعتماد تھے کیونکہ وہ چاروں صرف پستول لے کر آئے تھے۔ کسی کے پاس بڑا یا خوفزدہ کرنے والا اسلحہ نہیں تھا جیسا کہ ڈاکو بینک ڈکیتی میں استعمال کرتے ہیں۔ گیری ویڈیو دیکھتے ہوئے یہ تمام نقاط اپنی نوٹ بک پر لکھتا جا رہا تھا۔ اس نے مچلی سے کہا۔

”ویڈیو میرے کمپیوٹر میں بھیج دو۔“

ڈاکے کے پانچ منٹ کے اندر پولیس بینک پہنچ گئی تھی مگر اتنی دیر میں ڈاکو غائب ہو چکے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد ہوسٹن کے ایک نواحی علاقے میں لوگوں کی طرف سے ایک کار کے جلنے کی اطلاع پر پولیس اور فائر بریگیڈ والے پہنچے تو وہ ڈاکوؤں کی کار ثابت ہوئی تھی۔ کار چوری کی گئی تھی۔ اسے صبح چھ بجے اس کے مالک کے گھر کے سامنے سے چرایا گیا تھا۔ ڈکیتی کے پندرہ منٹ بعد ڈاکوؤں نے اسے ایک نواحی علاقے میں خالی پلاٹ پر کھڑا کر کے پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ ظاہر ہے ان کا مقصد کار سے ہر قسم کے نشانات مٹانا تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ اس گروہ نے بینک لوٹا تھا۔ بلکہ اب تک یہ ہوسٹن اور اس کے گرد و نواح میں گزشتہ پانچ سال کے دوران کوئی بتیس بینک لوٹ چکے تھے اور انہوں نے ایک بار بھی اپنا سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ پولیس کی مسلسل ناکامی کے بعد یہ معاملہ ایف بی آئی کے پاس آیا تھا۔ مقامی بیورو چیف ریفسل نے کیس گیری اور کارسن کے حوالے کیا اور ابھی وہ کیس کا جائزہ لے رہے تھے کہ اسی گروہ نے یہ تازہ واردات کر دی تھی۔

گیری، کارسن کے پاس آیا۔ اس نے اسے اپنی تحقیق کے نتائج سے آگاہ کیا۔ کارسن غور سے سن رہا تھا۔ بڑے جسم اور بڑے منہ والا یہ بظاہر بے پروا شخص تھا۔ ان چند سالوں میں گیری اسے اچھی طرح جان گیا تھا۔ ایک پروفیشنل ایف بی آئی ایجنٹ تھا۔ قطع نظر اس کے کہ اس وقت بھی برمودا شرٹ میں تھا۔ ریفسل اس کا سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایف بی آئی ایجنٹ کو اپنے حلیے سے بھی ایف بی آئی ایجنٹ نظر آنا چاہیے یعنی سیاہ سوٹ، سیاہ سن گلاسز اور تنا ہوا چہرہ۔ کارسن ان تمام چیزوں کے خلاف کرتا تھا۔ البتہ گیری ٹھیک سمجھا ہوا ایف بی آئی ایجنٹ نظر آتا تھا۔ کارسن کا کہنا تھا کہ کیا ضروری ہے کہ وہ ایک میل دور سے ایف بی آئی ایجنٹ دکھائی دیں۔ اس نے کبھی سیاہ سوٹ نہیں پہنا تھا اور وہ سن گلاسز بھی اسٹائلش استعمال کرتا تھا۔ اسے دنیا میں کسی چیز کی فکر تھی تو وہ اس کا پیٹ تھا جسے وہ ہمہ وقت بھرنے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ اس وقت بھی گیری کی بات سنتے ہوئے وہ ایک سینڈوچ لے رہا تھا۔

”ویڈیو منگوالی ہے؟“ کارسن نے آخر میں ایک یہی بات پوچھی۔

”ہاں ہمارے کمپیوٹرز پر آچکی ہوگی۔ میں نے مچلی سے کہہ دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے لیکن آج کچھ فیلڈ ورک ہے۔“

ان کے پاس ایک کیس اور تھا اگرچہ یہ خاص نہیں تھا۔ ٹیکساس ہمیشہ سے میکسیکو سے آنے والے غیر قانونی تارکین وطن کا اولین پڑاؤ رہا ہے۔ کیونکہ امریکا اور میکسیکو کے بارڈر کا نصف حصہ ٹیکساس سے لگتا ہے۔ نیو میکسیکو، ایریزونا اور کیلیفورنیا کے برعکس ٹیکساس میکسن نسل کے لوگوں کی ریاست ہے اور ان تین ریاستوں میں اکثریت اسپینش نسل کے لوگوں کی تھی۔ گیری اور کارسن انسانی اسمگلروں کے ایک گینگ کے خلاف بھی تحقیق کر رہے تھے۔ اس کا مقامی سرغنہ ایک منشیات فروش تھا جو میکسیکو سے انسانوں کے ساتھ منشیات بھی اسمگل کرتا تھا۔ کارسن کا خیال تھا کہ اصل میں یہ بارڈر سیکیورٹی فورس اور اینٹی نارکوٹکس کا کیس تھا جو بلاوجہ ان کے سر مار دیا گیا تھا۔ ان معاملات سے نمٹنے کے لیے ہی یہ ایجنسیاں بنائی گئی تھیں۔ ایف بی آئی سرحد پار معاملات میں دخل نہیں دیتی تھی۔ چند مہینے پہلے ہوسٹن سے کچھ لاشیں ملی تھیں جن کی موت پیٹ میں کوکین اور ہیروئن کے کیپسول پھٹ جانے سے ہوئی تھی۔ یہ تمام غیر قانونی تارک وطن میکسیکن باشندے تھے۔ وہ واپس دفتر آئے تو شام ہو چکی تھی۔ کارسن نے چھٹی کرنے کے بجائے گیری سے کہا۔

”کیا خیال ہے ان ڈاکوؤں والے کیس پر کچھ کام نہ کر لیا جائے؟“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ گیری خوش ہو گیا۔ وہ اکیلا آدمی تھا، کوئی گرل فرینڈ بھی نہیں تھی۔ پھر اسے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ دفتر کے بیشتر لوگ چھٹی کر کے جا چکے تھے۔ اکثر کیبنوں میں تاریکی تھی وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ ریفسل نے اپنے دفتر سے جھانکا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”کام۔“ گیری نے جواب دیا۔

ریفسل کمرے سے نکل آیا۔ ”یہ ہماری ساکھ کا معاملہ ہے۔ پولیس سے یہ کیس ہمارے پاس آیا ہے۔ ہمیں جلد از جلد اس معاملے میں کچھ کرنا ہوگا۔“

”کتنا جلد؟“ کارسن نے نیم سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ”پولیس کو پانچ سال ملے اس لیے ایف بی آئی کو بھی کم سے کم اتنی مدت ملنی چاہیے۔“

”مذاق نہیں۔“ ریفسل خشک لہجے میں بولا۔ ”اوپر والے تاک میں بیٹھے ہیں کہ ہم ناکام ہوں اور وہ دھاوا بول دیں۔“

اپنے کمرے میں آکر کارسن نے ریفسل کو ایک گالی دی۔ ”یہ صرف تعلقات کی وجہ سے یہاں تک آگیا ہے اور اب اسے اپنی ساکھ کی فکر پڑی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے یہ کیس کا کریڈٹ لینے کے لیے بے چین ہے؟“

”بالکل... ورنہ اس نے عملی طور پر آج تک کچھ نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے پولیس کو گندا کرنے کے لیے اسی نے یہ کیس جوڑ توڑ کر کے ایف بی آئی منتقل کرایا ہے۔“

”اس صورت میں پولیس سے کسی تعاون کی امید نہیں کی جا سکتی ہے۔“

کارسن نے شانے اچکائے۔ گیری نے وہ بھاری بھر کم فولڈر اٹھایا جس میں سابقہ ڈکیتیوں کا احوال تھا۔ یہ تمام ڈکیتیاں ہوسٹن کے مرکز سے چالیس میل کے دائرے میں ہوئی تھیں۔ گیری نے کہا۔ ”یہ تو طے ہے کہ اس گروہ کا تعلق ہوسٹن سے ہی ہے۔“

”زیادہ امکان ہے کیونکہ اسی صورت میں انہیں یہاں کے بینکوں کے بارے میں اتنی تفصیل سے پتا ہوتا ہے۔“

”دوسرے یہ ہمیشہ عام شاخوں کو لوٹتے ہیں جہاں ایک یا دو سیکیورٹی گارڈز ہوتے ہیں اور وہاں زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگ آتے ہیں جن میں زیادہ تعداد عورتوں اور بوڑھوں کی ہوتی ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے بینک گارڈز فوراً ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔“

کارسن نے سر ہلایا۔ ”اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ بہت چالاک ہیں۔“

گیری نے نوٹ پیڈ اور کیلکولیٹر سنبھال لیا۔ ”صرف چالاک نہیں ہیں بلکہ ڈکیتی ان کا مستقل پیشہ بھی ہے۔ انہوں نے بتیس وارداتیں کیں اور اوسطاً انہوں نے ہر واردات

سے سات لاکھ ڈالرز کی رقم حاصل کی۔ اس کا ٹوٹل بائیس ملین ڈالرز سے کچھ اوپر بنتا ہے۔ پانچ سال کے ساٹھ مہینوں پر اس رقم کو تقسیم کیا جائے تو فی مہینا تین لاکھ ستر ہزار ڈالرز بنتے ہیں اور اس رقم کو چار سے تقسیم کیا جائے تو ہر ایک کے حصے میں نوے ہزار ڈالرز آرہے ہیں۔ باقی رقم اخراجات کے لیے ہوگی۔ ایک فرد کے لیے نوے ہزار ڈالرز اگر وہ پرتعیش زندگی بسر کرتا ہے تو بہت زیادہ رقم نہیں ہے۔"

"تمہارا حساب اچھا ہے۔ لیکن دوست یہ رقم کم بھی نہیں ہے۔ اگر وہ ذرا بھی دوراندیش ہوں تو اس کا بڑا حصہ محفوظ کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ جتنے منظم طریقے سے مسلسل کامیاب وارداتیں کر رہے ہیں یہ مجھے عام قسم کے جرائم پیشہ نہیں لگتے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" گیری نے کہا۔ "بینک ڈکیتی کے دوران بھی یہ بالکل پرسکون رہتے ہیں اور ان کا انداز جوکروں والا ہوتا ہے۔"

"ذرا ویڈیو چلانا۔"

گیری نے اپنا ڈیسک ٹاپ آن کیا اور اس پر ڈکیتی کی ویڈیو چلائی۔ بڑے سائز کے ایل سی ڈی پر منظر بہت واضح ہو کر آرہا تھا۔ جب کلنٹن کے نقاب والا اچھل کر ایک خاص انداز میں کاؤنٹر پر چڑھا تو گیری چونک گیا۔ اس نے یہ منظر ریورس کر کے پھر دیکھا۔ اس نے کارسن سے کہا۔ "تم نے نوٹ کیا؟"

"کیا؟"

"یہ شخص اس طرح کاؤنٹر پر اچھل کر چڑھا جیسے سمندری لہروں پر سرفنگ کرنے والے لہر آنے پر اچھل کر سرفنگ بورڈ پر چڑھتے ہیں، دیکھو اس کا انداز، بالکل ویسا ہی ہے۔" گیری نے دوبارہ ویڈیو ریورس کر کے دکھائی کارسن متفق نظر آنے لگا۔

"واقعی یہ بالکل ویسا ہی لگ رہا ہے۔"

"مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ یہ چاروں کھیلوں کے شوقین ہیں۔ ان کی چستی اور حرکات دیکھو بالکل کھلاڑیوں جیسی لگتی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ سب سرفر ہیں؟"

"سب تو نہیں لیکن یہ شخص ضرور لگ رہا ہے تم نے غور کیا کہ اپنے انداز سے یہ باس لگتا ہے اور پولیس رپورٹس میں بھی اسے سب سے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔"

کارسن سوچ میں پڑ گیا پھر وہ اچانک اچھل کر سرفر کے انداز میں میز پر چڑھا اور بولا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

کارسن ایسی اداکاری کر رہا تھا جیسے سرفنگ بورڈ پر کھڑا لہروں پر ڈول رہا ہو۔ گیری ہنسنے لگا۔ "اس لیے ہم ہوسٹن کے آس پاس ایسے ساحلوں پر انہیں تلاش کرنا چاہیے جہاں سرفنگ کی جاتی ہے۔"

کارسن کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور وہ فوراً میز سے نیچے اتر آیا۔ "تمہارا دماغ درست ہے، ہوسٹن کے آس پاس ساحلوں پر درجنوں ایسے مقامات ہیں جہاں سرفنگ کی جاتی ہے اور ہر جگہ سیکڑوں لوگ آتے ہیں۔"

"پھر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ مستقل سرفنگ کرنے والے ہوئے تو ضرور نظروں میں آئیں گے۔ ہمیں چار افراد کا ایک گروہ تلاش کرنا ہے جو بہت چلبلا اور توانائی سے بھرپور ہو۔ ایسے لوگ آسانی سے نظروں میں آجاتے ہیں۔"

کارسن نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ "تم سنجیدہ ہو؟"

"کیوں نہیں۔" گیری نے ویڈیو کا۔۔ وہ حصہ دکھایا جب وہ چاروں بینک کے اندر آرہے تھے۔ "یہ کیس پانچ سال سے پولیس کے پاس ہے اور اس کا مطلب ہے انہوں نے مجرموں کو پکڑنے کی ہر ممکن کوشش کر لی ہوگی۔ یہ مروجہ طریقوں سے قابو میں نہیں آئیں گے انہیں پکڑنے کے لیے ہمیں دوسرے طریقوں پر کام کرنا ہوگا۔"

کارسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "رینسل اس تھیوری کو نہیں مانے گا۔"

"وہ جائے جہنم میں۔" گیری نے کہا۔ "کیس ہمارے پاس ہے ہم اپنے طریقے کے مطابق کام کریں گے۔"

"سوچ لو یار کہیں مروامت دینا۔" کارسن نے سرد آہ بھری۔ "چیف پہلے ہی مجھ سے خار کھاتا ہے۔"

"اسے بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"رپورٹ تو دینا ہوگی۔" کارسن نے کہا۔ "لیکن کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔"

☆☆☆

گیری اس وقت گالوسٹن کے جزیرہ نما کے ساحل پر تھا۔ ہوسٹن سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر اور ٹیکساس کے ساتھ سمندر میں ساحل سے کچھ دور جزیرہ نما زمین تھی۔ یہ اصل میں چٹانیں تھیں جو سمندر میں جانے سے بچ گئی تھیں جب کہ ان کے عقب میں سمندر نے زمین کھالی تھی۔ گالوسٹن سے جنوب میں کوئی تین سو میل تک میکسیکو کی سرحد تک جزیرہ نما ساحل موجود تھا جس کے دونوں طرف سمندر تھا۔ کہیں کہیں یہ جزیرہ نما زمین صرف ایک پتلی سی پٹی کی صورت میں رہ جاتی تھی اور اس کے دوسری طرف اچھا خاصا بڑا سمندر یا سمندری جھیلیں آجاتی تھیں۔ یہ چٹانیں



گہرے سمندر کے اوپر تھیں اور یہاں سارے سال خوفناک پہاڑ جیسی لہریں اٹھتی رہتی تھی۔ ان لہروں نے اس ساحل کو سرفنگ کرنے والوں کے لیے جنت بنا دیا تھا۔ کیونکہ لہروں کی وجہ سے عام تیراکی بلکہ غسل آفتابی بھی ممکن نہیں تھا اس لیے یہاں صرف سرفنگ کرنے والے ہی آتے تھے۔

گیری سرفنگ کے لباس میں تھا۔ اس وقت ساحل پر بہت کم لوگ تھے صرف ایک لڑکی تھی جو سرفنگ کی تیاری کر رہی تھی جیسے ہی وہ سمندر کی طرف بڑھی۔ گیری تیزی سے اپنا تختہ سنبھال کر لہروں میں اتر گیا۔ چند قدم کے بعد پانی کمر سے اونچا ہو گیا اور اب وہ تیرتے ہوئے آگے جا رہا تھا۔ دس گز کے بعد بڑی لہریں آنے لگیں، جب لہر آتی تو وہ تختے سے چمٹ جاتا اور لہر کے دوسری طرف نکلتا تھا۔ ساحل سے کوئی سو گز دور آنے پر کوہ پیکر لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے ایک لہر کا انتظار کیا اور جیسے ہی وہ اس کی ڈھلان پر آئی اس نے اچھل کر تختے پر سوار ہونا چاہا مگر تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ سر کے بل گرا اور پانی میں چلا گیا۔ لہر اسے دبا رہی تھی اور وہ جتنا اوپر آنے کی کوشش کرتا اتنا ہی گہرائی میں جا رہا تھا۔ تختے کی رسی اس کے پاؤں سے بندھی تھی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اچانک ایک ہاتھ نے اس کا بازو پکڑ لیا اور لڑکی اسے کھینچ کر سطح پر لے آئی۔ پانی سے باہر نکلتے ہی گیری کھانس کھانس کر سانس لینے لگا تھا۔ لڑکی اسے دھکیلتی ہوئی اتھلے پانی تک لائی۔ یہاں سے وہ خود ساحل تک پہنچا اور ریت پر گر کر ہانپنے لگا۔ لڑکی نے اس کا تختہ پاس پٹخا اور طنزیہ انداز میں بولی۔

"خودکشی کرنے کے آسان طریقے بھی ہوتے ہیں۔"

"میں سرفنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" گیری نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ بلاشبہ وہ ان چند حسین ترین لڑکیوں میں سے تھی جو گیری نے آج تک دیکھی تھیں۔ تراشے ہوئے نقوش اور اسی طرح تراشا ہوا بدن، اس کے سنہری بال پونی ٹیل کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں ایک فسوں تھا۔ گیری کو خود کو یاد دلانا پڑا کہ وہ ایک آن ڈیوٹی ایف بی آئی ایجنٹ ہے۔

"تم سرفنگ کر رہے تھے۔" لڑکی نے ترحم آمیز انداز میں کہا۔ "بہتر ہے کوئی دوسرا کام کرو۔ اگر میں تمہیں ایک منٹ اور نہ نکالتی تو پھر پولیس کے غوطہ خور تمہیں نکالتے۔"

"تم مجھے سرفنگ سکھا سکتی ہو؟"

جواب میں لڑکی مسکرائی اور دوڑ کر پانی میں گھس گئی۔ دو منٹ بعد وہ نہایت مہارت سے ایک بڑی لہر پر تختے کے سہارے پھسل رہی تھی۔ اس کا توازن اور حرکت کرنے کا انداز غضب کا تھا، گیری سچ مچ متاثر ہو رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد وہ سمندر سے نکل کر کچھ دور سڑک کے ساتھ کھڑی اپنی منی شیورلیٹ کی طرف بڑھی جس کی چھت اتری ہوئی تھی۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور کار میں بیٹھ کر روانہ ہوگئی۔ گیری نے اس کی کار کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد وہ دفتر میں مچلی سے کار نمبر کی مدد سے لڑکی کا سارا ڈیٹا نکلوا رہا تھا۔ اس کا نام کیرن کارلوس تھا۔ نسلاً فرانسیسی تھی۔ اس کے ماں باپ فرانس سے ہجرت کر کے امریکا آبسے تھے اور وہ امریکا میں پیدا ہوئی تھی۔ پھر ماں باپ ایک ائر کریش میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ایک بیچ بار میں کام کرتی تھی۔ ڈیٹا میں اس کا سیل اور گھر کا نمبر بھی تھا۔ گیری منصوبے کے تحت اس سے ملا تھا۔ وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو باقاعدگی سے سرفنگ کرتا ہو اور وہ یقیناً باقاعدگی سے سرفنگ کرنے والے دوسرے افراد کے بارے میں بھی جانتا ہوگا۔ اتفاق سے کیرن اس کی نظر میں آگئی۔ ایف بی آئی کے ریکارڈ میں اس کی تصویر بھی تھی، مچلی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"لڑکی تو اچھی ہے۔"

"یہ مشکوک ہے اس لیے اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتانا۔" گیری نے پرنٹر سے نکلنے والا صفحہ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن وہ اس بیچ بار میں داخل ہوا۔ اس نے کاؤنٹر پر کہا۔ "ایک بیئر اور دو عدد ویٹر ایگ سینڈوچز۔"

"دس منٹ لگیں گے۔" وہاں موجود ویٹریس نے آرڈر نوٹ کر کے اس سے رقم وصول کی اور اسے پرچی تھمائی۔ "دو نمبر کاؤنٹر پر چلے جاؤ۔"

اتفاق سے کیرن دو نمبر کاؤنٹر پر موجود تھی۔ اس نے مختصر سا لباس پہن رکھا تھا۔ یہ اس کا یونیفارم بھی تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چونکی اور گیری نے بھی چونکنے کی اداکاری کی۔ کیرن سرد لہجے میں بولی۔ "تم یہاں بھی آگئے؟"

"اتفاق سے۔" گیری نے صفائی پیش کی۔ "میں بیئر اور لنچ کے ارادے سے آیا ہوں۔" اس نے ٹوکن کیرن کے سامنے رکھا۔

"ٹھیک ہے کچھ دیر میں تمہارا لنچ آجائے گا۔"

"میری مدد کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں انکار کر چکی ہوں۔"

"پلیز تم میری مدد کر سکتی ہو۔ میرے ماما پاپا کی خواہش

تھی کہ میں سرفر بنوں لیکن اس وقت میں نے ان کی خواہش پر توجہ نہیں دی پھر وہ ایک کار حادثے میں مجھ سے بچھڑ گئے۔" گیری نے لہجے میں ممکنہ حد تک درد سمو کر کہا، وہ دیکھ رہا تھا اس کی بات پر کیرن کے تاثرات بدلے تھے۔ "پلیز اب میں صرف ان کی خواہش پوری کرنے کے لیے سرفر بننا چاہتا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرے پاس وقت..."

"تم جو وقت دو گی میں آجاؤں گا اور تمہاری مرضی مجھے جتنا وقت دو میں تم کو بالکل بھی پریشان نہیں کروں گا۔"

بالآخر کیرن مان گئی اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے اپنا نمبر دیدو مسٹر..."

"گیری... گیری رونالڈ... میرا چھوٹا سا بزنس ہے۔"

"کیرن کارلوس۔" اس نے گیری کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "مجھے فرصت ہوئی تو میں تمہیں کال کرلوں گی۔"

"شکریہ۔" گیری نے خوش ہو کر اسے نمبر دیا۔ "جب تک تمہیں فرصت نہیں ملتی میں خود کوشش کرتا رہوں گا۔"

"ہرگز نہیں۔" کیرن جلدی سے بولی۔ "اس دن بھی تم مرتے مرتے بچے تھے۔ ٹھیک ہے میں جلد وقت نکالنے کی کوشش کروں گی۔"

گیری بھی یہی چاہتا تھا۔ ان دنوں وہ اور کارسن صبح سے شام تک ہوسٹن کے پاس پائے جانے والے سرفنگ بیچز کا چکر لگاتے رہے تھے۔ ان میں سب سے معروف گالوسٹن والا ساحل ہی تھا۔ اس ساحل پر کم سے کم ایک درجن سرفنگ پوائنٹ تھے۔ اسی لیے گیری کی توجہ گالوسٹن کی طرف تھی۔ کارسن نے کیرن کو دور سے دیکھا تھا جب گیری کار میں آیا تو اس نے کہا۔ "خیال رہے کہیں تم لڑکی کے چکر میں نہ پڑ جاؤ۔"

"ایسا نہیں ہے۔" گیری جھینپ گیا۔ "لیکن مجھے اسے دھوکا دینے کے خیال سے نفرت ہو رہی ہے۔"

"ہم ایف بی آئی ایجنٹ ہیں۔" کارسن نے اسے یاد دلایا۔ "دھوکا دینا ہمارا پیشہ ہے۔"

اسی رات گیری کو کیرن کی کال آگئی۔ "کل صبح چھ بجے اسی ساحل پر۔"

اس سے پہلے کہ گیری کچھ کہتا کال کٹ گئی۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اگلی صبح وہ پانچ بجے تیار ہو کر گھر سے نکل گیا تھا۔ کیونکہ فوری ضرورت نہیں تھی اس لیے اس نے کارسن کو نہیں بلایا لیکن اسے میسج کر کے بتا دیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ ٹھیک چھ بجے کیرن کی کار وہاں رکی۔ اس نے سرفنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اپنا تختہ اٹھائے اس کے پاس آئی اور بولی۔ "آج میں تمہیں ساحل پر طریقہ بتاؤں گی اور پھر خود سرف کر کے دکھاؤں گی تم غور سے مجھے دیکھنا۔"

"وہ تو میں اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں۔" گیری نے کہا تو کیرن کا چہرہ ایک لمحے کو سرخ ہوا تھا پھر وہ جلدی سے بولی۔ "شروع کرتے ہیں، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آج سنڈے ہے اور بار جلدی کھل جائے گا۔"

کچھ دور نوجوانوں کا ایک گروہ فٹ بال کھیل رہا تھا جب کیرن اسے سکھا رہی تھی تو وہ گیری کا مذاق اڑا رہے تھے مگر وہ انہیں نظر انداز کر کے پوری سنجیدگی سے کیرن کی باتوں پر عمل کرتا رہا۔ جب کیرن تھیوری سے مطمئن ہو گئی تو وہ تختہ لے کر سمندر کی طرف بڑھی۔ گیری ایک نسبتاً بلند جگہ چلا گیا۔ وہاں سے کیرن کو سرفنگ کرتے دیکھتا رہا۔ اسے ایک بار اعتراف کرنا پڑا کہ وہ ماہر سرفر تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ سرفنگ کے مقابلوں میں کیوں حصہ نہیں لیتی تھی۔ بیچ بار کی اس معمولی سی ملازمت سے اسے کیا ملتا ہوگا۔ جب وہ واپس آئی تو گیری نے اس سے یہ سوال کیا۔ اس نے تولیے سے بال صاف کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے سرفنگ کا شوق ہے میں اسے پیشہ بنانا نہیں چاہتی کیونکہ میں زندگی کو صرف ایک مقصد کے تحت گزارنے کی قائل نہیں ہوں۔"

"اب کب ملو گی۔" گیری نے اسے روانگی کی تیاری کرتے دیکھ کر پوچھا پھر جلدی سے وضاحت کی۔ "میرا مطلب ہے سکھانے آؤ گی؟"

"جب وقت ملا... بائے۔" وہ کار میں بیٹھی اور روانہ ہو گئی۔ گیری اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ تیسری کلاس میں اس نے گیری کو صحیح سے لہر پر سوار ہونا سکھایا۔ مگر تختے پر سوار ہونا اسے ٹھیک سے پانچویں کلاس میں آیا تھا۔ اس دن گیری نے درست طریقے سے سرفنگ کی اگرچہ وہ ہر بار گرا تھا مگر اس سے پہلے خاصی دیر تک لہر پر سواری بھی کرتا رہا تھا۔ اس دن وہ اور کیرن دونوں بہت خوش تھے۔ وہ ساحل پر آئے تو گیری نے پہلی بار اپنے مطلب کی بات کی۔ "میں چاہتا ہوں کسی اچھے سرفر گروپ سے منسلک ہو جاؤں، ظاہر ہے تم ساری عمر تو مجھے نہیں سکھا سکتی ہو۔"

"میں بھی تمہیں یہی مشورہ دینے والی تھی۔" کیرن نے کہا۔ "میرے کچھ جاننے والے ہیں وہ ایک گروپ کے تحت سرفنگ کرتے ہیں میں تعارف کرا دیتی ہوں۔"

"بالکل..." گیری نے کہنا چاہا تھا کہ عقب سے ایک مضبوط جسامت کے سنہری بالوں والے جوان نے آکر اچانک کیرن کو گود میں اٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ گیری کوئی ردعمل ظاہر کرتا، کیرن چیخ اٹھی۔

"جونز تم... کہاں غائب تھے؟"

جونز نے اس کے رخسار پر پیار کیا۔ "میں یہیں تھا، ہم آج یہاں آئے ہیں۔" اس نے کہتے ہوئے سوالیہ نظروں سے گیری کی طرف دیکھا۔

"یہ گیری ہے، میرا شاگرد، میں اسے سرفنگ سکھا رہی ہوں۔" کیرن نے تعارف کرایا۔ "گیری یہ جونز ہے۔ ابھی تم سرفنگ گروپ کی بات کر رہے تھے تو اس کا اتفاق سے سرفنگ گروپ ہے۔ یہ سرفنگ میں میرا استاد بھی ہے۔ جونز یہ کسی گروپ کے ساتھ سرفنگ کا خواہش مند ہے تاکہ سیکھ سکے۔"

"کیوں نہیں۔" جونز نے گرم جوشی سے کہا۔ "مگر آج ہم رگبی کھیل رہے ہیں۔ اگر تم چاہو تو آجاؤ۔"

جونز اصل میں بال اٹھانے آیا تھا اس لیے وہ جلدی چلا گیا۔ گیری اور کیرن ساحل پر بیٹھ گئے۔ آج کیرن کی چھٹی تھی اس لیے اسے جانے کی جلدی نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد جونز کا گروپ کھیلتا ہوا ان کے پاس آگیا۔ جونز رگبی اٹھا کر سب سے آگے بھاگ رہا تھا اور باقی اس سے پیچھے تھے جیسے ہی وہ ان کے پاس آیا گیری، جونز کے راستے میں آیا اور وہ اس سے ٹکرا کر گر پڑا۔ جونز کے ساتھی دوڑتے ہوئے آئے۔ ان میں سے ایک نوجوان غصے سے چلایا۔ "تمہارا دماغ درست ہے۔"

جونز جلدی سے اٹھ کر گیری کے سامنے آگیا۔ "نہیں یہ دوست ہے، میں نے خود اس سے کہا تھا۔"

یہ سنتے ہی جونز کے ساتھیوں کا موڈ بدل گیا۔ وہ خوشدلی سے گیری سے ملے اور اسے ساتھ کھیلنے کی دعوت دی۔ گیری اٹھ گیا۔ جونز کے ساتھی میٹ، شارپ، جوائے اور [illegible] زندہ دل اور زندگی سے خوشی کشید کرنے والے لوگ تھے۔ گیری کو ان سے مل کر اچھا لگا تھا۔ اسے افسوس ہوا کہ یہ سب ایک ایکٹ تھا جو اسے ایف بی آئی ایجنٹ کی حیثیت سے کرنا پڑ رہا تھا۔ ورنہ اسے یہ لوگ سچ مچ اچھے لگے تھے۔ اس شام وہ دیر تک وہاں رہا۔ اگلی صبح وہ اکیلا ساحل پر آیا تھا۔ اس نے کیرن کو نہیں بتایا تھا ورنہ وہ مشکوک ہو جاتی کہ وہ روز ساحل پر کیا کرنے آتا ہے؟ کام کا دن ہونے کی وجہ سے اس دن رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر گیارہ بجے تک اچھے خاصے لوگ آگئے تھے۔ گیری اور کارسن کا خیال تھا کہ بینک ڈکیتی کرنے والے کہیں جاب تو نہیں کرتے ہوں گے اس لیے ویک اینڈز کے علاوہ ان کے ساحلوں پر آنے کا امکان زیادہ تھا۔

گیری کی توجہ ایک گروپ نے حاصل کرلی۔ یہ ورزشی جسموں والے صورت اور جسم سے بدمعاش نظر آنے والے لوگ تھے۔ ان میں سے دو جو ملی جلی نسلوں سے تھے انہوں نے سر کے بال مینڈیوں کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ ایک سفید فام تھا اس نے جسم پر بے شمار ٹیٹوز بنائے ہوئے تھے جب کہ چوتھا اسپینش نژاد تھا۔ وہ اونچے سسپنشن کے ایک طاقتور فور وہیل ٹرک سے اتر رہے تھے اور اپنا سامان اتار رہے تھے۔ گیری نے کارسن کو کال کی۔ "مجھے ایک مشکوک گروپ نظر آیا ہے اس میں چار ہی افراد ہیں؟"

"میں آرہا ہوں لیکن میرے آنے تک کوئی حرکت مت کرنا۔"

کارسن ایک گھنٹے بعد آیا کیونکہ ہائی وے پر طویل ٹریفک جام تھا۔ ویک اینڈ کے بعد لوگ واپس جا رہے تھے اس لیے پولیس نے چار لین میں سے تین جانے والوں کے لیے مخصوص کر دی تھیں اور آنے والوں کے لیے صرف ایک لین تھی۔ کارسن پولیس کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ غصہ ٹھنڈا ہونے پر گیری نے اسے دوربین سے ان چاروں کو دکھایا جو اب لہروں پر سرفنگ کر رہے تھے اور ان کا انداز بتا رہا تھا کہ انہیں اس کام میں مکمل مہارت تھی۔ سرفنگ کرتے ہوئے وہ آپس میں ہنسی مذاق بھی کر رہے تھے۔ گیری نے کہا۔ "میں انہیں چھیڑنے جا رہا ہوں، ممکن ہے وہ جھگڑا کریں اور تمہیں ان کو گرفتار کرنے کا موقع مل جائے۔"

"ٹھیک ہے میں دوربین سے نظر رکھوں گا۔"

کارسن نے کار سڑک کے دوسری طرف ایک بلند جگہ روکی تھی جہاں سے وہ ساحل پر نظر رکھ سکتا تھا۔ گیری لباس تبدیل کر کے اور تختہ لے کر لہروں میں آیا۔ وہ جان بوجھ کر اسی سمت گیا جہاں وہ سرفنگ کر رہے تھے اس نے سفید فام کو تاڑ لیا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ کلنٹن کے نقاب والا ڈاکو وہی تھا۔ وہ ایک بڑی لہر پر سوار ہونے جا رہا تھا گیری بھی اس کے ساتھ ہی پہنچا اور دونوں بیک وقت تختوں پر سوار ہوئے۔ اس نے چلا کر گیری سے دور ہونے کو کہا لیکن گیری اس سے دور ہونے نہیں آیا تھا اس کا تختہ لہرا کر اس کے تختے سے ٹکرایا اور دونوں سمندر میں گرے، لہر ان کو دبا رہی تھی مگر اب گیری کو لہر سے لڑنے کا فن آگیا تھا وہ کوشش کر کے ساحل پر آیا۔ سفید فام اس کے پاس ہی تھا، اس نے گالی دی۔

"...تم میرے پاس کیوں آئے تھے؟"

"سوری۔" گیری نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا اور سمندر سے نکل آیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے پیچھے آئیں گے۔ سفید فام اب اپنے ساتھیوں کو بتا رہا تھا۔ مگر وہ اس کے پیچھے نہیں آئے تھے۔ گیری کو مایوسی ہوئی وہ اپنا تختہ اٹھا کر اوپر کی طرف بڑھا، اس طرف جھاڑیاں تھیں اور یہاں چھوٹے چھوٹے ہٹس تھے جن میں کھانے پینے کی چیزیں فروخت ہو رہی تھیں۔ یہاں سرفرز کے لیے نہانے کا انتظام تھا تا کہ وہ سمندری پانی سے چھٹکارا حاصل کریں۔ گیری بھی ایک شاور کے نیچے آ گیا۔ اچانک اسے احساس ہوا کی اس کے آس پاس کچھ لوگ تھے اس نے شاور بند کر کے دیکھا۔ یہ سفید فام اور اس کے ساتھی تھے۔ ان کے عزائم ان کے چہروں سے عیاں تھے۔ گیری فکر مند ہوا کیونکہ کارسن یہاں نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے اسے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ گیری پھنس گیا ہے مگر اس نے سکون برقرار رکھا۔

"کیا چاہتے ہو دوستو؟"

"تم نے اس کو ٹکر ماری تھی۔" ایک مینڈھی والے نے کہا۔

"میں نے سوری کر لی تھی۔"

"مگر اس کی تسلی نہیں ہوئی۔"

"کوئی بات نہیں، اب تسلی کر دیتا ہوں۔" گیری نے تختہ اٹھاتے ہوئے اسے اچانک سامنے کھڑے مینڈھی والے کے منہ پر مارا۔ اسے لڑنا آتا تھا مگر وہ چار تھے اور لڑائی کے فن سے واقف تھے۔ ابتدائی چوٹیں کھا کر انہوں نے گیری کو قابو کر لیا اور ایک اس کے پیٹ پر گھونسے مارنے لگا۔ چند ضربیں کھا کر گیری دہرا ہو گیا تھا۔ اچانک ہی کسی نے اس پر گھونسے برسانے والے کو پیچھے کھینچ کر پھینک دیا۔ موقع ملتے ہی گیری نے پیچھے جکڑنے والے کے پیٹ میں کہنی ماری اور سامنے سے آنے والے دوسرے مینڈھی والے کو لات رسید کی۔ تب اس نے دیکھا اس کی مدد کرنے والا جونز تھا وہ مہارت سے دو سے لڑ رہا تھا اور وہ مسلسل مار کھا رہے تھے۔ گیری باقی دو کے لیے کافی ثابت ہوا۔ ایک منٹ میں وہ سب زمین پر پڑے کراہ رہے تھے یا ان سے دور ہو گئے تھے۔ جونز نے ہانپتے ہوئے انہیں دھمکی دی۔

"بس... اب چلے جاؤ ورنہ..."

وہ شاید جونز سے واقف تھے۔ اس لیے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ جونز نے گیری کی طرف دیکھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

گیری سے سیدھا کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا مگر ... میں اس کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ وہ جونز کے ساتھ ... ہوا اس نے جونز کو بتایا کہ جھگڑا کیوں ہوا تھا مگر ... سیڑھیوں کے پاس پہنچے تو اوپر سے کارسن نمودار ہوا ... ہاتھ میں پستول تھا وہ یقیناً گیری کے لیے آیا تھا مگر ... کے ساتھ دیکھ کر اس نے مہارت سے بات ... لوگوں نے کسی کو دیکھا تو نہیں ہے کچھ لفنگے ایک خاتون ... پرس چھین کر بھاگے ہیں۔"

"ہاں چار افراد ابھی نیچے گئے ہیں۔" گیری ... اور ان کا حلیہ بتایا۔ کارسن اس کا شکریہ ادا کرتا ... جونز نے مسکرا کر کہا۔

"تم نے ان کو پھنسا دیا۔"

"وہ اسی قابل ہیں۔"

مگر اس شام ایف بی آئی کے دفتر میں گیری ... پھنسا محسوس کر رہا تھا چار مشکوک افراد سامنے آ گئے ... اور اب رینسل سے بات کرنا ضروری ہو گئی تھی۔ وہ گیری ... تھیوری جان کر اچھل پڑا تھا۔ "تمہارا دماغ درست ... ایک ڈاکو کی جمپ دیکھ کر سرفنگ کرنے والوں کے پیچھے ... کھڑے ہوئے؟"

"ہاں اس کے نتیجے میں یہ چار مشکوک افراد ... آئے ہیں۔"

"اور اب تم چاہتے ہو کہ میں اپنے ایجنٹ دن ... ان کی نگرانی پر لگا دوں۔"

"اس کے بغیر ہم انہیں کیسے پکڑیں گے یا کوئی ... حاصل کریں گے؟"

خاصی بحث کے بعد رینسل مان گیا تھا مگر ساتھ ... اس نے واضح کیا تھا کہ اگر وہ مبینہ ڈاکو نہ نکلے تو ... اس کا کریڈٹ لینے کے لیے تیار رکھنا ہو گا۔ بہر حال ... تھیوری منوانے میں کامیاب رہے تھے۔ مگر پہلی ڈیوٹی ... ان کی لگی تھی، انہیں رات کو ان چاروں کے ٹھکانے کی ... کرنی تھی۔ ایف بی آئی کے ریکارڈ میں چاروں ... مشکوک تھے۔ ان میں سے ایک چوری کے الزام میں ... جا چکا تھا جب کہ ایک مجرمانہ حملے میں ملوث تھا اسے ... ہوئی تھی۔ باقی دو بھی چھوٹے موٹے جرائم جیسے ... فروشی اور رہزنی میں ملوث تھے۔ مگر انہیں سزا ... تھی۔ کارسن کا موڈ خراب تھا اور اس کا موڈ ٹھیک کر... لیے گیری کو ایک کلومیٹر دور پیدل جا کر چند شاپ...



اور کولڈ ڈرنک لانا پڑی تھی۔ وہ مشکوک افراد کے ٹھکانے سے کچھ دور سڑک کے کنارے کار میں موجود تھے۔ کارسن نے پیزا کھاتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ سچ مچ وہی ڈاکو نہ نکلے تو تم سوچ سکتے ہو رینسل ہمارے ساتھ کیا کرے گا۔"

"بہت برا۔" گیری نے سرد آہ بھری۔ "لیکن مجھے یقین ہے یہ وہی ڈاکو ہیں۔ ان کی تعداد چار ہے اور پھر یہ جرائم پیشہ تو ہیں۔"

"امریکا میں کوئی ساٹھ لاکھ مستند جرائم پیشہ ہیں لیکن وہ سب تو مبینہ بینک ڈاکو نہیں ہو سکتے ہیں۔"

گیری نے بحث نہیں کی کچھ دیر بعد اس کے موبائل نے بیل دی تو اس نے دیکھا۔ کیرن کی کال تھی۔ وہ ریسیو کرتے ہوئے کار سے اتر آیا اور ذرا دور چلا گیا۔ "ہیلو۔"

"گیری کیسے ہو؟"

"فائن... تم سناؤ؟"

"کل رات جونز نے اپنے بیچ ہاؤس پر پارٹی دی ہے مجھے بلایا ہے اور کہا ہے کہ تمہیں بھی لے کر آؤں تو کیا خیال ہے؟"

گیری ہچکچایا۔ "میں ابھی نہیں بتا سکتا... کل تک کنفرم کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے میں انتظار کروں گی ویسے میری خواہش ہے کہ تم آؤ۔"

گیری نے واپس آ کر کارسن کو جونز کی پارٹی کے بارے میں بتایا۔ کارسن نے کہا۔ "تم چلے جاؤ، میں کل رات جوزف کو ساتھ لے لوں گا۔"

جوزف دفتر میں ایک اضافی ایجنٹ تھا جسے ضرورت کے وقت کوئی بھی ساتھ لے جا سکتا تھا۔ گیری خوش ہو گیا۔ "ٹھیک ہے میں کل کیرن سے کہہ دوں گا۔"

اس رات وہ دوربین اور نائٹ وژن کی مدد سے مکان کی نگرانی کرتے رہے۔ اس میں کئی مشکوک باتیں سامنے آئیں۔ مکان میں کم سے کم دو خواتین تھیں جو ناقابل بیان حلیے میں گھوم رہی تھیں۔ ایک اسی حلیے میں بے تکلفی سے اپنے کتے کی تلاش میں لان پر آ گئی۔ اندر سے تیز میوزک کے ساتھ بعض اوقات اونچی آواز میں گالیوں کے ساتھ گفتگو بھی سنائی دیتی تھی مگر کوئی کام کی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ صبح گیری گھر جاتے ہی سو گیا تھا۔ اچانک کال بیل بجی تو اس کی آنکھ کھلی۔ شام کے چار بج رہے تھے اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے کیرن کو دیکھ کر وہ چونکا۔ وہ بے تکلفی سے اندر آ گئی۔ "مجھے دیکھ کر حیران ہو رہے ہو۔"

"ہاں، تمہیں میرا پتا کیسے چلا؟"

"صرف تمہیں جاسوسی نہیں آتی ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی تو گیری کا دل رک گیا تھا۔ مگر کیرن معمول کے مطابق نظر آ رہی تھی۔ وہ متجسس نظروں سے گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔ گیری نے جلدی سے اپنا پرس اور پستول گدے کے نیچے کیا۔ کیرن مکان کا معائنہ کر کے اس کے پاس آئی۔ "میں تمہیں لینے آئی ہوں، جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

گیری شاور لینا چاہتا تھا مگر وہ کیرن کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس لیے مجبوراً ایسے ہی تیار ہو کر اس کے ساتھ نکل آیا اس نے اپنا پستول اور بیج گھر میں چھوڑ دیا تھا۔ گالوسٹن جزیرے کے جنوب میں..... یہ لکڑی سے بنا ہوا خوب صورت دو منزلہ بیچ ہاؤس تھا۔ مگر یہ مستقل رہائش کے لیے نہیں تھا۔ جونز اور اس کے ساتھی وہ دوست احباب یہاں صرف تفریح کے لیے آتے تھے۔ گیری کار سے اترا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجی۔ کارسن کی کال تھی۔ کیرن کی کار پیچھے رکی تھی وہ بھی اتر آئی تھی۔ وہ کیرن سے دور چلا گیا اور کال ریسیو کی۔ کارسن نے کہا۔ "فیصلہ ہو گیا ہے کل صبح ایف بی آئی ریڈ کرے گی۔"

"کل صبح کتنے بجے؟"

"تم نو بجے یہاں پہنچ جانا۔"

"ٹھیک ہے۔" گیری نے کہا اور کال کاٹ دی۔ وہ فکر مند تھا مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نصف رات کو بہانہ بنا کر رخصت ہو جائے گا یہ اچھا تھا کہ وہ اپنی کار لے آیا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد پارٹی شروع ہوئی اور ایک ہلا گلا مچا، پینے پلانے کا دور شروع ہوا۔ انہوں نے ڈنر کیا اور پھر باہر الاؤ کے پاس آ گئے۔ نشے کی ترنگ میں سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ میٹ اور جوائے اپنی بہادری کے قصے سنا رہے تھے کہ انہوں نے کیا کیا کارنامے انجام دیے تھے۔ گیری کو پتا چلا کہ وہ اسکائی ڈائیونگ بھی کرتے تھے۔ جونز نے اسے دعوت دی۔ "تم بھی کسی دن ہمارے ساتھ چلنا۔"

اس نے سر ہلایا تھا۔ کچھ دیر بعد سب اٹھے اور اندر سے اپنے سرفنگ بورڈ نکال لائے۔ انہوں نے گیری اور کیرن کو بھی مجبور کیا۔ رات کی تاریکی میں وہ سمندر کی لہروں سے کھیلنے لگے۔ گیری، کیرن کے ساتھ تھا۔ جب وہ تھک گئے تو ساحل پر آ گئے۔ کیرن اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے پہلی بار گیری سے اس کی نجی زندگی کے بارے میں سوال کیا۔ "تمہاری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے؟"

"نہیں، بزنس کے چکر میں موقع ہی نہیں ملا۔"
کیرن خوش نظر آنے لگی۔ اس نے گیری سے کہا۔ "اندر چلتے ہیں، میں تھک گئی ہوں۔"
وہ کھڑے ہوئے تو کیرن لڑکھڑا کر گرنے لگی۔ گیری نے بے ساختہ اسے سنبھال لیا۔ وہ ہنسی تو گیری کو پتا چلا وہ نشے میں تھی۔ گیری نے اسے بازوؤں میں اٹھا لیا اور اندر ایک بیڈ روم میں لے آیا۔ وہ اسے بیڈ پر لٹا کر سیدھا ہو رہا تھا کہ کیرن نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ باہر جونز اور اس کے ساتھیوں کے شور شرابے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر گیری اس وقت سب بھول گیا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ کیرن کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ کھڑکی سے آتی سورج کی روشنی نے اسے بیدار کیا تھا۔ چاروں طرف غیر معمولی سناٹا تھا جس میں صرف سمندر کی آواز آرہی تھی۔ اچانک اس کی نظر گھڑی پر گئی اور وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اور اسے نو بجے پہنچنا تھا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر کپڑے پہنے۔ کیرن کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ مسکرائی۔ "کہاں جارہے ہو؟"
"مجھے کسی سے ملنا ہے، وقت دیا ہوا ہے۔" گیری نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔ "میں بعد میں تمہیں کال کروں گا۔"
ایک منٹ بعد گیری ہر ممکن رفتار سے ڈرائیو کرتا ہوا ہوسٹن کی طرف جارہا تھا۔ نو بج کر پانچ منٹ پر وہ وہاں پہنچا تو اسے کارسن اور ایف بی آئی کے دوسرے ایجنٹس کی کاریں خالی نظر آئی تھیں۔ وہ تیزی سے مکان کے پیچھے کی طرف آیا وہ سب وہاں جمع تھے۔ کارسن نے اسے گھورا مگر کچھ کہا نہیں۔ گیری نے معذرت کی۔ "سوری، میں لیٹ ہو گیا۔"
"تم تینوں تین طرف سے مکان کو گھیرو گے اور گیری تم پیچھے سے جاؤ گے۔" کارسن نے کہا۔ "میں سامنے سے جاؤں گا۔ لیکن میرے اشارے کے بغیر کوئی حرکت میں نہیں آئے گا ہاں اگر مجرموں کی طرف سے غیر متوقع مزاحمت ہو تو سب اپنا دفاع کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔"
انہوں نے سر ہلایا تو کارسن روانہ ہو گیا۔ وہ گھوم کر مکان کے سامنے والے حصے کی طرف آیا۔ گیری نے ایک واکی ٹاکی سیٹ اور پستول لیا اور مکان کے عقبی حصے میں آیا۔ یہ خاصا بڑا مکان تھا کم سے کم تین سو یارڈز پر پھیلا ہوا تھا۔ اس طرف کھڑکیاں تھیں اور ایک دروازہ تھا۔ مکان کا چھوٹا سا صحن پیچھے والے مکان کے بڑے سے لان سے ملا ہوا تھا۔ گیری جھٹ سے ہی پودوں کے درمیان دبکا۔ دوسرے مکان کے لان میں کسی نے گھاس کاٹنے والی مشین چلانا شروع کر دی۔ گیری نے زیر لب اسے کوسا اور جیب سے وہ آلہ [illegible] جو ڈینٹسٹ دانتوں کے اندرونی معائنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یعنی کروم کا چمکدار چھوٹا سا گول دھاتی آئینہ جس کے ساتھ چھوٹی سی سلاخ لگی ہوتی ہے۔ اس نے ایک کھڑکی سے یہ آئینہ بلند کر کے اندر کا منظر دیکھا۔ مشین کا شور ایک لمحے کے لیے رکا تو اسے کارسن کی آواز سنائی دی جو [illegible] مٹی کو پکارتا ہوا مکان کے سامنے والے حصے میں آچکا تھا [illegible] کے بعد مشین دوبارہ اسٹارٹ ہو گئی۔ اسی لمحے گیری نے ایک مینڈھی والے کو تیزی سے کمرے میں آتے دیکھا۔ اس نے ایک طرف رکھا لکڑی کا بکس کھولا اور اس میں سے جدید ترین مہلک رائفلیں اور مشین گنیں نکالنے لگا۔ گیری تیزی سے حرکت میں آیا اس نے واکی ٹاکی نکال کر دوسرے ایجنٹوں سے رابطہ کیا۔
"کارسن کو روکو، اندر موجود لوگ بہت زیادہ مسلح ہیں۔"
"کیا کہہ رہے ہو، سنائی نہیں دے رہا۔ پیچھے شور ہے۔" ایک ایجنٹ نے کہا۔ گیری اپنی بات دہرانے لگا مگر اسی لمحے اندر سے مشین گن کا شور گونجا۔ گیری واکی ٹاکی پھینک کر اٹھا اور پستول لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کھڑکی کا پٹ کھولا اور اندر کود گیا۔ اسی لمحے سفید فام خود کار رائفل سنبھالے نمودار ہوا اسے دیکھتے ہی گیری بھاگا اور سامنے نظر آنے والا دروازہ کھولتا ہوا اندر گھس گیا اس کے پیچھے گولیوں کی بوچھاڑ آئی تھی اور وہ بال بال بچا۔ مگر یہاں ایک اور مصیبت اس کی منتظر تھی۔ یہ باتھ روم تھا اور وہاں شاور میں ایک عورت موجود تھی۔ شاور کی آواز میں اسے باہر ہونے والے ہنگامے کا پتا نہیں چلا تھا مگر وہ اسے تو دیکھ سکتی تھی۔ اس نے چیخ ماری اور گیری کی طرف لپکی۔ وہ اس سے چمٹ گئی اسے جنونی انداز میں نوچنے کھسوٹنے لگی۔ گیری کو باہر والے کی فکر تھی اور اوپر سے یہ بلا اسے چمٹ گئی تھی۔ اس نے پستول کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ وہ بے سدھ ہو کر نیچے گری تھی کہ سفید فام دروازے پر نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی گیری نے فائر کیا گولی اس کے بازو میں لگی اور وہ رائفل چھوڑ کر بھاگا۔ گیری اس کے پیچھے لپکا تھا۔ اس دوران میں مکان کے دوسرے حصوں میں فائرنگ کا شور گونج رہا تھا۔ کارسن اور اس کے آدمی چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو پوچھ رہے تھے۔
گیری فرار ہونے والے کے پیچھے لپکا۔ وہ اسی کھڑکی سے نکل گیا تھا جس سے گیری اندر آیا تھا۔ جب وہ کھڑکی سے نکلا تو سفید فام درمیانی باڑھ سے الجھ کر گر رہا تھا۔ گیری کے پہنچنے سے پہلے وہ اٹھ کر بھاگا مگر گیری نے اسے دوسرے مکان کے لان کے وسط میں جالیا۔ وہ اسے لیتا ہوا گرا تو گھاس کاٹنے والا شخص مشین چلتی چھوڑ کر اپنے مکان کے اندر بھاگ گیا۔ شاید وہ پولیس کو کال کرنے گیا تھا۔ گیری نے سفید فام کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ اس کا بازو زخمی تھا اس کے باوجود وہ اس کے قابو میں نہیں آرہا تھا اس نے گیری کو اچھال دیا۔ وہ مشین کے پاس گرا۔ سفید فام اچھل کر اس پر آیا اور اس نے گیری کا سر گھاس مشین کے گھومتے کٹر سے لگانے کی کوشش کی۔ گیری اپنا سر روک رہا تھا مگر نیچے ہونے کی وجہ سے وہ مجبور تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا سر کٹر کے پاس ہوتا جا رہا تھا۔ اگر اس کا سر کٹر سے لگ جاتا تو وہ لمحوں میں اسے کاٹ کر رکھ دیتا اور وہ فوری طور پر موت کے گھاٹ اتر جاتا۔ مگر اس سے پہلے کہ اس کا سر کٹر سے لگتا اچانک اس کی آواز بند ہو گئی اور کٹر رکنے لگا۔ سفید فام نے چونک کر پیچھے دیکھا تو کارسن نے اسے گردن سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور پھر ایک جاندار گھونسا رسید کیا تو گھاس پر جا گرا۔ مشین بھی کارسن نے بند کی تھی اس نے سہارا دے کر گیری کو اٹھایا۔
"تم ٹھیک ہو؟"
گیری نے سر ہلایا۔ "کیا رہا؟"
"کامیاب... ایک مارا گیا اور ایک زخمی ہے۔ ایک عورت بھی ماری گئی۔ لیکن یہاں ایک پانچواں آدمی بھی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایجنٹ ہے۔"
گیری نے سفید فام کو ہتھکڑیاں لگائیں اور اسے بھی اندر لے آیا جہاں دوسرے ایجنٹس قیدیوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ پانچواں فرد ان چاروں سے بالکل مختلف تھا۔ آدھے گھنٹے میں رینسل اور اینٹی نارکوٹکس کے ایجنٹس کے آنے سے صورت حال واضح ہو گئی تھی۔ پکڑا جانے والا ایجنٹ کارٹر اس کیس کا انچارج تھا اور اس کا غصے سے برا حال تھا کیونکہ آج کسی وقت یہاں منشیات کی بہت بڑی کھیپ آنے والی تھی اور وہ ان لوگوں کو اس کھیپ سمیت پکڑنا چاہتا تھا۔ مگر اب کھیپ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کارٹر مکان کے اندر سے کچھ منشیات کے پیکٹ لایا اور وہ اس نے عملاً کارسن اور گیری کے منہ پر دے مارے۔ "یہ لو اور انہیں عدالت میں لے جاؤ۔"
ایک مینڈھی والا جو مشین گن سے فائرنگ کر رہا تھا اور کسی صورت ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں تھا وہ مارا جا چکا تھا۔ لڑکی اسی کی فائرنگ سے ہلاک ہوئی تھی۔ رینسل کے تاثرات بتا رہے تھے کہ ان کی شامت آنے والی ہے اور ایسا ہی ہوا۔ وہ دفتر میں پہنچتے ہی ان پر برس پڑا تھا۔ کارسن خاموشی سے سنتا رہا پھر اس نے کہا۔ "فیلڈ ورک میں ایسی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔ یہ آفس ورک تو ہے نہیں جو ہمیشہ ایک جیسا اور نپا تلا ہو گا۔ ویسے بھی کیس لیے صرف دو ہفتے ہوئے ہیں۔"
یہ سن کر رینسل کھسیا گیا تھا۔ "اب تم لوگ اس تھیوری کی جان چھوڑ دو اور کسی اور نظریے پر کام کرو۔"
"دیکھتے ہیں۔" کارسن نے کہا اور گیری کو اشارہ کرتا ہوا کمرے کی طرف چلا گیا۔ گیری شرمندہ تھا کیا اس کی وجہ سے کارسن جیسے سینئر ایجنٹ کی بے عزتی ہوئی تھی اس نے معذرت کی تو کارسن نے بے پروائی سے کہا۔
"چلتا رہتا ہے تم فکر مت کرو، کل جب ہم کامیاب ہوں گے تو ان سب کے منہ بند ہو جائیں گے۔"
"مگر میری تھیوری فیل ہو گئی۔" گیری نے سرد آہ بھری۔ "ان کم بختوں کو بھی منشیات فروش نکلنا تھا۔"
"تم فکر مت کرو کارٹر پرانا آدمی ہے وہ اس وقت غصے میں تھا لیکن ساتھ ہی ہمارا شکر گزار بھی ہو گا کہ اس کی بلا ہم نے سر لے لی اور اس کو انگلی بھی ہلانا نہیں پڑی۔ منشیات نہ سہی وہاں اتنا اسلحہ موجود تھا اور انہوں نے ایجنٹس پر حملہ کیا تھا۔ سمجھو لو کارٹر انہیں دس بارہ سال سے کم کے لیے جیل نہیں بھجوائے گا۔"
شام کو کیرن نے کال کی، وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ گیری نے بہانہ کیا۔ "آج کل میں مصروف ہوں نہیں آسکتا۔"
کیرن نے کہا کہ وہ آجاتی ہے اور وہ آگئی تھی۔ اس رات وہ گیری کے گھر رہی۔ صبح گیری دفتر پہنچا تو اسے پتا چلا کہ یہ کیس ان سے لے لیا گیا تھا اور اب وہ معمول کی ڈیوٹی پر تھے۔ کارسن کو دفتر میں بیٹھنا پسند نہیں تھا اس لیے وہ گیری کو لے کر نکل گیا۔ وہ بلفلکس اسٹریٹ پر موجود تھے۔ گیارہ بج رہے تھے اور کارسن کو بھوک لگ رہی تھی اس نے گیری سے کہا۔ "اسی سڑک پر کوئی دو سو گز آگے جا کر تم دائیں طرف مڑو گے تو سامنے فاسٹ فوڈ کی ایک بہت اچھی شاپ ہے۔ وہاں سے زنگر، کولڈ ڈرنک اور فنگر چپس لے آؤ۔"
گیری کا موڈ نہیں تھا مگر وہ اتر کر چل پڑا۔ شاپ واقعی اچھی تھی۔ اندر جانے سے پہلے اس نے سرمئی رنگ کی وین کو سڑک کے دوسری طرف بینک کے سامنے رکتے دیکھا اور پھر شاپ گرل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اسے آرڈر نوٹ کرانے لگا اس لیے نہیں دیکھ سکا تھا کہ وین سے چار نقاب پوش اتر کر بینک میں گھس گئے تھے۔ لڑکی نے تین منٹ میں اسے چیزیں دیں اور وہ لے کر باہر آیا۔ اسی لمحے بینک سے نقاب

پوش نکلے اور وین میں گھس گئے۔ گیری نے انہیں دیکھا اور پستول نکالتے ہوئے چلایا۔ ''رُک جاؤ ایف بی آئی۔''

ایک ڈاکو نے اپنی گن کا رخ اس کی طرف کیا تھا لیکن کلنٹن کے نقاب والے نے اسے روک دیا اور وہ سب وین میں گھس گئے۔ گیری نے پستول نکال کر وین کی طرف فائر کیے لیکن وہ نکلتی چلی گئی۔ گیری اپنی کار کی طرف بھاگا۔ اسے یوں بھاگتے دیکھ کر کارسن کار اسٹارٹ کر کے خود لے آیا۔ گیری نے شاپر پچھلی سیٹ پر پھینکا اور بولا۔ ''سامنے ڈاکو بینک میں ڈکیتی مار کر بھاگ رہے ہیں، وہی ہیں۔''

کارسن نے تیزی سے کار آگے بڑھا دی اور ان کے پیچھے سڑک پر آیا۔ گیری ریڈیو پر وین کے بارے میں پولیس کو اطلاع دینے لگا۔ کارسن تیز ڈرائیو کر رہا تھا اس نے وین کو جا لیا۔ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے وین ایک ون وے کے خلاف چلی گئی۔ کارسن غرایا۔ ''لعنت ہو۔''

اچانک وین ایک سڑک پر گھومی جو آگے سے بند تھی مگر وین گارڈز کا کیبن روندتی ہوئی گزر گئی۔ گارڈز بہ مشکل جان بچا کر بھاگے تھے۔ وین کے ٹائر سائڈ پر بنے ٹائر کلرز پر چڑھے اور دھماکے سے برسٹ ہو گئے۔ کارسن بھی اپنی کار کی رفتار پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ اس کے ٹائر بھی ٹائر کلرز کا نشانہ بنے۔ کار رک گئی تھی۔ گیری نے اترتے ہوئے کہا۔ ''تم دوسری طرف سے جاؤ۔''

گیری دوڑتا ہوا اس موڑ تک پہنچا جس طرف وین گئی تھی تو اس نے وین کو ایک گیس اسٹیشن پر دیکھا۔ اس میں سے ڈاکو اتر کر ایک کار میں سوار ہو رہے تھے جو وہاں پیٹرول کے لیے رکی تھی۔ اس میں موجود سوار افراد اتر کر بھاگ رہے تھے۔ کلنٹن کے نقاب والا پمپ کے پاس کھڑا تھا۔ گیری نے پستول سیدھا کیا اور گولی چلائی مگر اتنی دور سے فائر بیکار تھا۔ وہ اس طرف بھاگا۔ نقاب پوش نے وین کو پیٹرول سے بھگو دیا تھا۔ نزدیک آتے ہوئے گیری نے مزید فائر کیے تو نقاب پوش بچنے کے لیے کار سے دور ہوا تھا۔ اس دوران میں پولیس سائرن کی آواز گونجنے لگی تھی۔ کار میں سوار تین ڈاکو فرار ہو گئے اور کار چند لمحوں میں سڑک پر پہنچ گئی تھی۔ گیری نقاب پوش کے پیچھے بھاگا۔ اس نے فائر کر کے وین میں آگ لگا دی تھی اور گیس اسٹیشن کے ساتھ ایک پتلی گلی میں گھس گیا جو عقب میں واقع رہائشی علاقے کی طرف جا رہی تھی۔ گیری دوڑتا ہوا اس کے سرے پر پہنچا تو اسے نقاب پوش سڑک کے دوسری طرف نالے میں کودتا دکھائی دیا۔ گیری کنارے پر پہنچا اور گہرائی دیکھ کر

ایک لمحے کو جھجکا۔ یہ بارش کا پانی لے جانے والا نالا تو پکا بنا ہوا تھا۔ گیری کودا اور اس کا پاؤں زمین پر لگتے ہی مڑا اور گھٹنا فرش سے لگا تو تکلیف کی لہر اٹھی اور وہ ... ہوئے گر گیا۔ نقاب پوش بھاگتا ہوا نالے کے دوسری طرف لگی فولادی جالی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ قریب جا کر اچھلا ... جالی پر چڑھ گیا۔ گیری نے اس کی طرف پستول سیدھا ... نقاب پوش نے مڑ کر دیکھا۔ کچھ دیر دونوں ایک دوسرے ... دیکھتے رہے۔ نقاب پوش منتظر تھا کہ وہ اس پر گولی چلائے ... گیری سے فائر نہیں ہوا اسے وہ منظر یاد آ گیا جب ایک ... اس پر فائر کرنے والا تھا اور نقاب پوش نے اسے روکا ... تھا۔ نقاب پوش جالی پر چڑھا اور دوسری طرف کود گیا۔

☆☆☆

گیری دو دن سے گھر میں تھا۔ اس کے گھٹنے کی چوٹ ... بہتر تھی لیکن چلتے ہوئے وہ لنگڑاتا تھا اور ڈاکٹر نے مزید ... دن آرام کرنے کو کہا اس لیے وہ آرام کر رہا تھا۔ فارغ ... اس لیے اس کا ذہن خیالی گھوڑے دوڑانے میں لگا ... تھا۔ کال بیل بجی تو وہ دروازے تک آیا۔ اس کی توقع ... عین مطابق کیرن تھی۔ وہ اس کے لیے کھانا بنا کر لائی تھی ... کچھ سامان بھی تھا جو گھر کے لیے لیا تھا۔ وہ سامان فریج ... کیبنٹس میں رکھنے لگی۔ اس نے گیری سے کہا۔ ''کل جونز ... تھا، تمہارا پوچھ رہا تھا میں نے بتایا کہ تمہیں چوٹ لگی ... کہنے لگا کہ تمہیں اسکائی ڈائیو پر لے جائے گا۔''

گیری مسکرانے لگا۔ ''وہ ایسا ہی شخص ہے انسان ... موت کے بستر سے کھینچ کر لے جائے۔''

''اس لیے کل تیار رہنا وہ کہہ رہا تھا تمہارے ... کے لیے کچھ لائے گا۔''

گیری اس کے پیچھے کچن میں آ گیا۔ اس نے ... سے کیرن کو بازوؤں میں لے لیا۔ ''اسے چھوڑو یہ بتاؤ ... نے کچھ سوچا؟''

''کیا سوچا؟'' کیرن انجان بنی۔

''ہمارے تعلق کے بارے میں؟''

''تم نے کچھ سوچا ہے؟''

''ہاں... میں چاہتا ہوں کہ اب ہم ہمیشہ ساتھ رہیں ...''

کیرن نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیا تم ... پرپوز کر رہے ہو؟''

''ابھی تو ایسا ہی سمجھ لو، میں ذرا ٹھیک ہو جاؤں ... کچھ بزنس کے معاملات نمٹا لوں تو تمہیں باقاعدہ پرپوز ... کروں گا ابھی میں تمہاری رائے لینا چاہ رہا ہوں۔''



''میں تم سے متفق ہوں۔'' کیرن نے دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اگلے دن تک گیری کی تکلیف تقریباً ختم ہو گئی تھی لیکن وہ ابھی کسی ایڈونچر کے قابل نہیں تھا۔ مگر جونز نے اس کی ایک نہیں سنی۔ وہ اس کے لیے ایک خاص کپ لایا تھا جو گھٹنے کو نیچے پنڈلی تک جکڑ لیتا تھا اور گھٹنے کو بچاتا تھا۔ جونز نے کپ باندھا اور اسے لے کر روانہ ہو گیا۔ ایک نجی ایئر کلب میں ان کا طیارہ موجود تھا۔ گیری کو حیرت ہوئی۔ ''یہ طیارہ تمہارا ہے؟''

''نہیں لیکن ہمارے لیے ہائر رہتا ہے ہمیں جب ضرورت ہوتی ہے یہ دستیاب ہوتا ہے۔''

جونز کے ساتھ شارپ، جوائے اور میٹ تھے۔ وہ طیارے میں سوار ہوئے۔ گیری فری فال کا تجربہ رکھتا تھا لیکن اس نے ظاہر کیا کہ اسے کچھ نہیں آتا اور یہ اس کا پہلا موقع ہے۔ جونز اسے بتانے لگا کہ پیراشوٹ کیسے کھولتے ہیں اور اسکائی ڈائیو کے دوران جسم کو کس طرح رکھتے ہیں۔ اگر توازن نہ رکھا جائے تو انسان قلابازیاں کھانے لگتا ہے۔ طیارہ تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچا تو وہ نیچے کود گئے۔ اب ان کے پاس دس منٹ کا وقت تھا، اس کے بعد انہیں لازمی پیراشوٹ کھول لینا تھا۔ گیری سب سے آخر میں کودا تھا اس لیے وہ انہیں اوپر سے مختلف کرتب دکھاتے اور قلابازیاں کھاتے دیکھ رہا تھا وہ ان لمحات سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کچھ دیر وہ سب فارمیشن بناتے ہوئے نزدیک آئے اور ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے۔ جونز نے نیچے ایک بڑے سرخ دائرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہمیں وہاں اترنا ہے۔''

نو منٹ ہو چکے تھے اور وہ زمین سے کچھ ہی دور رہ گئے تھے۔ دس منٹ پورے ہوتے ہی انہوں نے پیراشوٹ کھول لیے اور ایک ایک کر کے زمین پر اتر گئے۔ گیری کو ہلکا سا جھٹکا لگا لیکن کپ نے اسے بچا لیا تھا۔ وہ پیراشوٹ سمیٹ رہا تھا کہ جونز اس کے پاس آیا۔ ''کیسا رہا تجربہ؟''

''شاندار... میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس میں اتنا مزہ آتا ہے۔''

''تم نے مجھے حیران کر دیا۔ تم ماہر ڈائیور لگ رہے تھے، ایک موقع پر بھی تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔''

''میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں بس سیدھا گرتا رہا جب دوسروں نے پیراشوٹ کھولے تو میں نے بھی کھول لیے۔''

جونز کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر مسکرایا۔ ''ہاں تم سیدھے آدمی ہو۔''

وہاں ان کے لیے ایک جیپ موجود تھی۔ وہ اس پر اپنے سامان سمیت سوار ہوئے اور شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے گیری کو اس کے گھر چھوڑا تھا۔ جیسے ہی جیپ آگے بڑھی۔ میٹ نے جونز سے کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو... جب اس کی حقیقت سامنے آ گئی ہے۔''

''تم فکر مت کرو یہ بھی ایک کھیل ہے۔'' جونز ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ ''مزہ نہیں آ رہا؟''

''مزہ۔'' میٹ پھٹ پڑا تھا۔ ''ایف بی آئی ہمارے پیچھے ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ مزہ نہیں آ رہا؟''

''وہ کچھ نہیں کر سکتے۔'' جونز بولا۔

''وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں، بہت ہو گیا اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''تاکہ ان کو یقین ہو جائے۔'' جونز نے طنز کیا۔ ''یہ اعصاب کا کھیل ہے۔ وہ بغیر ثبوت کے ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔''

''ثبوت حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں ہے۔'' میٹ نے اصرار کیا۔ ''دیکھو ہم اتنا کما چکے ہیں کہ ساری عمر اسی طرح عیش و آرام سے گزار سکتے ہیں۔''

''تم بھول رہے ہو ہم صرف رقم کے لیے بینک میں ڈاکا نہیں مارتے ہیں۔'' جونز کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''ہمارا ایک مقصد ہے۔ ہم اس سسٹم کے خلاف ہیں جو لوگوں کا خون چوس رہا ہے۔''

''لیکن ہم ہمیشہ تو ڈاکے نہیں مار سکتے۔''

''میٹ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' جوائے بولا۔ ''اب تک ہم نامعلوم تھے لیکن اب ہم ایف بی آئی کی نظروں میں آ چکے ہیں اور ہماری غیر محسوس انداز میں نگرانی ہو گی۔''

''اب میں کسی ڈاکے میں حصہ نہیں لوں گا۔'' میٹ نے کہا۔ ''جیسے ہی یہ معاملہ ختم ہو گا میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''میری طرف سے بھی اینڈ سمجھو۔'' جوائے بولا۔

شارپ نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ان دونوں سے متفق ہے۔ جونز نے گہری سانس لی۔

''ٹھیک ہے لیکن ہمیں اس مسئلے کو حل کرنا ہو گا۔''

''وہ کیسے؟''

''میں ایک طریقہ جانتا ہوں۔''

☆☆☆

کیرن پھر رات گیری کے گھر میں رکی تھی۔ گیری سو رہا تھا کہ اچانک فائر کے دھماکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو کیرن سامنے اسی کا پستول لیے موجود تھی۔

برابر والے تکیے میں سوراخ ہوگیا تھا۔ کیرن نے اس پر گولی چلائی تھی۔ ”کیرن یہ کیا ہے؟“

”بات مت کرو مجھ سے دغا باز شخص۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”تم مجھے اب تک دھوکا دیتے آئے تھے۔“

”کیسا دھوکا؟“

کیرن نے اس کا ایف بی آئی کا کارڈ اس کے منہ پر مارا۔ ”یہ دھوکا، تم مجھے استعمال کررہے تھے۔“

”کیرن میری بات سنو۔“ گیری نے اٹھنا چاہا تو کیرن نے دوسری گولی چلائی۔ یہ بھی تکیے میں لگی تھی۔ گیری واپس بیٹھ گیا۔ ”او کے، تم کہو۔“

”میں تم پر لعنت بھیجتی ہوں۔“ کیرن نے کہا اور پستول پھینک کر وہاں سے چلی گئی۔ گیری کے باہر نکلنے سے پہلے وہ اپنی کار میں جا چکی تھی۔ گیری کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیرن نے اتنی احتیاط سے چھپایا بیج اور پستول کیسے تلاش کرلیا۔ جب تک اسے شبہ نہیں ہوتا وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ان دنوں قسمت کے ستارے گردش میں تھے۔ مجرم ہاتھ نہیں آرہے تھے اور کیرن ہاتھ سے نکل گئی تھی اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اب وہ اس کی صورت بھی نہیں دیکھے گی۔ صبح کارسن کی کال آئی۔

”برخوردار کمر کس لو۔“

”کیا ہوا؟“

”کیس واپس آگیا ہے۔ ایک پیش رفت ہوئی ہے، اس بار بینک ڈکیتی کے دوران فارنسک والوں کو ایک بال ملا ہے۔ اس سے ڈی این اے حاصل کرلیا گیا ہے اور وہ بینک میں موجود کسی فرد سے میچ نہیں کررہا ہے اس لیے امکان ہے کہ وہ ڈاکوؤں میں سے کسی کا ہے۔“

گیری کے لیے کئی دن بعد یہ پہلی اچھی خبر تھی۔ کارسن نے اسے پہلے بتادیا تھا کہ کیس لوٹ پھر کر ان کے پاس ہی آئے گا کیونکہ رینسل نے اپنے جیسے نکمے جمع کررکھے تھے جنہیں کچھ نہیں آتا تھا۔ وہ تیار ہوکر دفتر پہنچا جہاں کارسن اس کا منتظر تھا۔ اس نے گیری کو بال کی بڑی کرکے بنائی ہوئی تصویر دکھائی اور بولا۔ ”اب ہمیں اس بال کے مالک کو تلاش کرنا ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔ ٹیسٹ میں بال کے اندر باریک سمندری نمک کے آثار ملے ہیں یعنی یہ شخص سمندر میں اکثر جاتا ہے۔ ہمیں ساحل پر موجود ایسے رنگ کے بالوں والے افراد کے نمونے لینے ہوں گے۔ یہ مردانہ بال ہے۔“

کام مشکل تھا مگر گیری کے مطلب کا تھا اسے خو... طرح کے کاموں میں مزہ آتا تھا اس لیے وہ تیار ہوگیا۔ دونوں گالوسٹن کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ اس جگہ سے ... کرنا چاہتے تھے۔ شام تک انہوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے تقریباً پچاس افراد کے بالوں کے نمونے جمع کیے۔ وہ یہ نمونے لے کر روانہ ہوا۔ کام خاصا مشقت طلب تھا۔ کارسن نمونے والے فرد کی ٹیلی لینس کیمرے سے تصو... تھا اور اسے ایک نمبر کے ساتھ محفوظ کرلیتا۔ وہ واپس آ کر گیری کو نمبر بتاتا اور وہ بال والے پلاسٹک شاپر پر یہ نمبر لکھ لیتا۔ گیری وہیں رکا تھا، اس کا ارادہ کچھ دیر سرفنگ کرنے کا ... اس کا گھٹنا اب ٹھیک تھا۔ تختہ اس کی کار میں موجود تھا۔ وہ ... نکال کر ساحل کی طرف بڑھا تب اس نے وہاں موجود ... اور اس کے ساتھیوں کو سرفنگ کرتے دیکھا۔ وہ کس وق... وہاں آئے تھے وہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ اونچی لہروں پر سوار ہو کر سرفنگ کررہے تھے۔ میٹ بہت پرجوش تھا۔ وہ ایک ... پر دیر تک سواری کرنے میں کامیاب رہا تو اس نے ا... ساتھیوں کو چڑانے کے لیے ان کی طرف پشت کرکے ا... نیکر ذرا نیچے کی تھی۔ گیری ٹھٹک گیا، اس کے ذہن میں ... کی ویڈیو کا منظر آگیا جب ایک ڈاکو نے باہر نکلتے ہوئے ... طرح اپنا ٹراؤزر نیچے کرکے دکھایا تھا۔

”میرے خدا۔“ اس نے خود سے کہا۔ ”ہم ... میں جارہے تھے اور ڈاکو ہمارے سامنے تھے۔“

پھر اسے کلنٹن کے نقاب والے ڈاکو کی آنکھیں ... آگئیں۔ جو جالی پر لٹکا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے گیری کو اپنے ساتھی سے بچایا تھا۔ اس نے جلدی سے کارسن کو کال کی۔ وہ راستے میں تھا۔ گیری نے کہا۔ ”میں جان گیا ہوں کہ ڈاکو کون ہیں۔ مجھے یقین ہے جونز اور اس کے ساتھی نقاب پوش ڈاکو ہیں۔“

”تمہیں یقین ہے۔“ کارسن حیران رہ گیا تھا۔ ”... ثبوت ہے کہ وہی ڈاکو ہیں؟“

گیری اسے بتانے لگا مگر کارسن نے کہا۔ ”یہ ثبوت نہیں ہے۔ یہ حرکت تو تقریباً ہر نوجوان لڑکا ... ساتھیوں کے ساتھ کرتا ہے۔“

”مجھے یقین ہے کلنٹن والے نقاب میں جونز تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔“

”فرض کرو وہ جونز تھا تب بھی ہم اسے کیسے ثابت کرسکتے ہیں؟“



”ان کی رہائش گاہ، مجھے یقین ہے وہاں سے ہمیں بہت کچھ ملے گا۔“

”لیکن اس کے لیے ہمیں وارنٹ نہیں ملے گا۔ رینسل کا رویہ تم دیکھ چکے ہو۔ منشیات فروشوں کے پکڑے جانے کے بعد وہ خود کو باس سمجھنے لگا ہے۔“ کارسن کے لہجے میں تلخی آگئی۔ ”اس لیے جو کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرو۔“

کارسن کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس وقت اس کا ساتھ دینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ ”ہمارے پاس موازنے کے لیے ایک ڈی این اے موجود ہے۔ بال بالکل جونز جیسے رنگ کا ہے۔“

”تب تم اس کا بال حاصل کرنے کی کوشش کرو۔“

گیری نے کال کاٹی اور اپنی کار کی طرف لپکا۔ یہ سب یہاں موجود تھے اس کا مطلب تھا کہ ان کے گھر کی تلاشی لی جاسکتی تھی۔ اس نے راستے میں کیرن کو کال کی مگر وہ ریسیو نہیں کررہی تھی۔ اس نے کیرن کو آواز کا پیغام چھوڑا، اس نے کہا۔ ”کیرن پلیز مجھ سے رابطہ کرو، یہ ایمرجنسی ہے۔ جونز، شارپ، جوائے اور میٹ نقاب پوش ڈاکو ہیں جو بینک لوٹتے رہے ہیں۔ ان سے ہوشیار رہو۔“

پیغام دے کر وہ موبائل رکھنے والا تھا کہ اسے ایک خیال اور آیا۔ اس نے دوبارہ موبائل اٹھایا اور کیرن کے لیے دوسرا پیغام ریکارڈ کرایا۔ ”کیرن اگر تمہیں میرے بارے میں جونز نے بتایا تھا تو اس کا مطلب ہے وہ میرے بارے میں جان چکے ہیں، میں اصل میں ان کے پیچھے ہوں۔ پلیز مجھ سے رابطہ کرو اور ان سے دور رہنا۔“

وہ تیز رفتاری سے کار دوڑاتا ہوا جونز کے گھر پہنچا۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ جونز کے باقی ساتھی کہاں رہتے تھے کیونکہ اس نے انہیں ہمیشہ جونز کے ساتھ ہی پایا تھا اسے یقین تھا، چاروں ایک ہی جگہ رہتے ہوں گے۔ مکان کا سامنے والا دروازہ لاک تھا۔ وہ پیچھے سے آیا اور اس نے کچن کے دروازے کا شیشہ کہنی مار کر توڑا اور اندر ہاتھ ڈال کر لاک کھول لیا۔ وہ اندر آیا اور کمروں کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی توجہ کا مرکز بیڈ رومز تھے۔ مگر وہاں کچھ نہیں تھا سوائے فرنیچر کے۔ جونز اور اس کے ساتھیوں کا سارا سامان غائب تھا۔ حد یہ کہ ان کی الماریاں اور باتھ روم کے شیلف تک خالی تھے۔ وہ اپنا سامان یہاں سے لے گئے تھے۔ باقی گھر میں بھی فرنیچر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ان کے کھیلوں کا سامان بھی غائب تھا۔ گیری باہر آیا اور اس نے کارسن کو کال کی۔ ”وہ سب غائب ہیں۔“

”ہاں اب بات بن سکتی ہے۔“ کارسن نے کہا۔

”فائدہ۔“ گیری نے مایوسی سے کہا۔ ”وہ بہت چالاک ہیں انہوں نے یہاں سے سارے نشان مٹادیے ہیں۔“

”تم فکر مت کرو، ہم وہاں سے ڈی این اے کے نمونے ضرور حاصل کرلیں گے اور ایک بار ڈی این اے میچ ہوگیا تو ان کا بچنا مشکل ہوگا۔ میں ابھی وارنٹ کی بات کرتا ہوں ہم رات تک نمونے اٹھالیں گے۔“

”پولیس کو یہاں لگادیتے ہیں ممکن ہے وہ اس مکان کو تباہ کرنے کی کوشش کریں۔“ ابھی گیری نے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ سڑک کے پاس مکان کی طرف سے ہلکا سا دھماکا سنائی دیا اور پھر کھڑکیوں سے شعلے لپکنے لگے تھے۔ گیری چلایا۔ ”لعنت ہو وہ مکان میں آگ لگانے کا بندوبست کرکے گئے تھے۔“

”ایمرجنسی کو کال کرو۔“ کارسن نے کہا اور کال کاٹ دی گیری ایمرجنسی کو کال کرنے لگا۔ مگر آگ جس طرح سے پھیل رہی تھی صاف لگ رہا تھا کہ فائر بریگیڈ کی آمد تک یہاں سوائے راکھ کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ جونز اور اس کے ساتھی ان کے اندازے سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئے تھے اسے یقین تھا کہ آگ لگانے کا بندوبست بھی ایسا ہوگا جسے بعد میں سازش ثابت نہیں کیا جاسکے گا۔ وہ دانت پیس رہا تھا کہ اسے کیرن کا خیال آیا۔ دس منٹ بعد پولیس کاریں اور پھر فائر بریگیڈ والے وہاں آگئے تھے مگر آگ نے مکان کو پوری طرح لپیٹ میں لے لیا تھا اور اب اس میں کسی چیز کے بچنے کا امکان نہیں تھا۔ وہ پولیس والوں کو ہدایت دے کر وہاں سے روانہ ہوا۔ اس کا رخ کیرن کے گھر کی طرف ہوا۔ وہ پرل لینڈ کے علاقے میں رہتی تھی۔ یہ اچھا خاصا پوش علاقہ تھا۔ کیرن کا چھوٹا سا خوب صورت مکان ایک جنگل کے ساتھ تھا اور اس کے سامنے باغ تھا۔ گیری نے کار سڑک پر چھوڑی اور پیدل مکان کی طرف بڑھا۔ کیرن کی کار پورچ میں کھڑی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ کال بیل کا بٹن دبایا لیکن اندر سے کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ اس نے دوبارہ بٹن دبایا بیل بج رہی تھی۔ پھر اس نے کیرن کے موبائل پر کال کی اور دروازے سے کان لگا کر سنا۔ اندر بیل بجنے کی آواز آرہی تھی۔ یعنی کیرن گھر پر تھی اور جواب نہیں دے رہی تھی۔ اس بار اس نے دروازہ بجایا۔

”کیرن یہ میں ہوں تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“

اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا تو گیری سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ہینڈل گھمایا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ گیری اندر آیا اس

نے ایک بار کیرن کو آواز دی اور پھر پورے گھر میں دیکھا لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ اس کا موبائل اور پرس اس کے بیڈ روم میں موجود تھا۔ ان چیزوں کے بغیر وہ کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے موبائل چیک کیا۔ اس کے میسیج کیرن نے سن لیے تھے۔ تو اس کے بعد وہ کہاں گئی تھی۔ گیری چیزیں چیک کر رہا تھا کہ اس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر گئی۔ وہاں ایک گلابی رنگ کا کاغذ لگا ہوا تھا۔ اس پر گلابی لپ اسٹک سے جے لکھا تھا۔ اس نے کاغذ کھینچا۔ جے سے جونز بنتا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے جلدی سے جونز کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"کیرن کہاں ہے؟" اس نے بلاتمہید پوچھا۔

"میرے پاس ہے۔" جونز نے بلاجھجک جواب دیا۔

"اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تعلق تو نہیں ہے لیکن اگر تم نے کوئی حرکت کی تو تعلق بن بھی جائے گا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کہاں؟"

"تم باہر آؤ میں یہاں موجود ہوں۔" جونز نے جواب دے کر کال کاٹ دی۔ گیری باہر کی طرف لپکا۔ جونز اور اس کے تینوں ساتھی ایک بند وین میں وہاں موجود تھے۔ جونز اسے وین میں لایا لیکن اس سے پہلے اس نے گیری کا پستول اور موبائل لے لیا تھا۔ گیری بڑی مشکل سے خود پر قابو پائے ہوئے تھا، صرف کیرن کا خیال اسے روکے ہوئے تھا۔ جونز نے کہا۔ "کیرن ہماری انشورنس پالیسی ہے۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"یہ دیکھو۔" جونز نے اپنا آئی فون سامنے کر دیا۔ ویڈیو میں کیرن ایک کرسی سے بندھی ہوئی تھی اور اس کا منہ کپڑا ٹھونس کر بند کیا ہوا تھا۔ "یہ ایک جگہ قید ہے۔"

گیری کے خون میں ابال آ رہا تھا اس نے دانت پر دانت جما کر کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"ہم ایریل بینک میں ڈاکا مارنے جا رہے ہیں اور تم ہمارا ساتھ دو گے۔ اس کے بدلے تمہیں کیرن مل جائے گی۔"

"میں قانون کا محافظ ہوں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

"اس صورت میں ہم تمہیں بے ہوش کر کے کہیں پھینک دیں گے اور اس کے بعد تمہیں نہ تو ہم ملیں گے اور نہ کیرن ملے گی۔"

گیری سمجھ رہا تھا وہ فرار کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ اگر یہ موقع گنوا دیتا تو اسے کیرن کبھی نہیں ملتی۔ اس نے [illegible] ہلایا۔ وین تیز رفتاری سے سڑکیں طے کر رہی تھی۔ جونز نے سب میں نقاب تقسیم کیے اور آخر میں خود اس نے کلنٹن [illegible] نقاب پہن لیا۔ گیری نے پوچھا۔ "کیرن کو میرے بارے میں تم نے بتایا تھا؟"

جونز نے سر ہلایا۔ "اس سے رابطہ رکھنا ہمارے لیے مفید ثابت ہوا۔ ہم بروقت اس تک پہنچے تھے جب [illegible] تمہارے پیغام سن چکی تھی۔ اگر ایک منٹ کی دیر ہوتی [illegible] نکل جاتی۔ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ تم ہماری راہ پر لگ چکے ہو۔"

جونز نے ایک شاٹ گن نکالی اور پھر اسے ان لوڈ کر کے گیری کو تھما دیا۔ "تمہارے چہرے پر نقاب نہیں ہے اس لیے تم بیک اپ میں رہو گے کسی ہنگامی وقت مدد کے لیے آؤ گے اور یاد رکھنا ڈاکے میں ناکامی کی سزا کیرن کو ملے گی۔ اس کے ساتھ ایک ٹائم بم ہے جسے صرف ہم ناکارہ کر سکتے ہیں۔ ہم وہاں نہیں پہنچے تو کیرن کا خوب صورت جسم ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔"

گیری کا جسم سرد پڑ گیا تھا وہ پوری تیاری سے آئے تھے۔ وین بینک کے سامنے رکی اور وہ چاروں اتر کر اندر گھس گئے۔ جونز نے پھرتی کے ساتھ بینک گارڈز کو غیر مسلح کیا جنہوں نے مسلح ڈاکوؤں کو دیکھتے ہی ہاتھ اوپر کر دیے تھے وہاں دو درجن سے زیادہ عام لوگ اور عملے کے ایک درجن افراد تھے۔ ایک منٹ کے اندر وہ سب فرش پر لیٹ گئے تھے۔

جوائے نے ایک کیشیر لڑکی سے کہا۔ "سیف روم کھولو۔"

"اس کی چابی مسٹر توسٹر کے پاس ہے۔" لڑکی نے بینک منیجر کی طرف اشارہ کیا جو مسکین بنا ہوا گاہکوں کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ جونز نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور لڑکی کی طرف دھکیل دیا۔

"چابی دو۔"

منیجر نے کانپتے ہاتھوں سے چابی لڑکی کو دیدی۔ جوائے اور شارپ اسے سیف روم کی طرف لے گئے۔ وہاں جونز اور میٹ تھے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ گاہکوں میں ایک پولیس والا بھی تھا اور وہ مسلح تھا۔ عام لباس میں اس نے پستول چھپا رکھا تھا۔ جیسے ہی جونز اور میٹ کی توجہ اس سے ہٹی اس نے اچانک پستول نکال کر میٹ پر گولی چلا دی۔ وہ نیچے گرا تو پولیس والے نے جونز پر بھی گولی چلائی۔ جونز بچ گیا تھا گولی اس کے سر سے گزر گئی تھی۔ اس نے جوابی فائر کیا اور پولیس والا اپنا سینہ تھام کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ جونز میٹ کے پاس آیا۔ گولی اس کی گردن میں لگی تھی اور خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اس کا جسم جھٹکے لے رہا تھا۔ جونز نے اس کا سر تھام لیا۔

"میرے خدا... میٹ... میٹ۔"

اسی لمحے میٹ نے دم توڑ دیا۔ فائر کی آواز سن کر اندر سے جوائے اور شارپ رقم سے بھرے بیگ لے کر دوڑے آئے۔ میٹ اور پولیس افسر کو دیکھ کر انہیں صورت حال سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ جوائے نے جونز کا شانہ جھنجوڑا۔ "اٹھو پولیس آنے والی ہوگی۔"

اسی لمحے بظاہر ساکت پڑے پولیس والے نے پستول اٹھا کر فائر کیا۔ گولی جوائے کے پہلو میں لگی اس نے گھومتے ہوئے جوابی گولی چلائی اور اس بار پولیس والا سو فیصد مارا گیا، گولی اس کی پیشانی پر لگی تھی۔ گیری شاٹ گن لیے اندر آیا۔ اس نے جونز سے کہا۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

"اس نے میٹ کو مار دیا اور میں نے اسے۔" جونز نے کہا۔

"نکلو یہاں سے۔" شارپ بولا اور اپنا بیگ اٹھائے باہر بھاگا۔ جونز جوائے کو سہارا دیے آگے بڑھا پھر اسے دروازے کے پاس چھوڑ کر گیری کے پاس آیا۔ اس نے کہا۔ "مدد کا شکریہ۔" اور یہ کہتے ہوئے اچانک پوری قوت سے گیری کے سر پر گھونسا مارا۔ وہ چکرا کر نیچے گرا تھا۔ اس نے تاریک ہوتی آنکھوں سے جونز کو جاتے دیکھا تھا۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا اور جب ہوش آیا تو پولیس آ چکی تھی۔ صرف پولیس نہیں بلکہ اس کے محکمے کے لوگ بھی آ گئے تھے۔ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر اس کے ساتھ موجود پولیس والا اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ڈالنے لگا۔ گیری نے مزاحمت کی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"تمہیں بینک ڈکیتی میں شامل ہونے کے الزام میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔" ریڈسل نے آگے آ کر کہا۔ "اس میں ایک پولیس آفیسر اور ایک ڈاکو مارا گیا ہے۔"

گیری نے دل میں سوچا کہ جونز اسے پھنسا گیا ہے۔ اسے اپنی نہیں کیرن کی فکر تھی۔ اسی دوران میں کارسن اندر آیا۔ اسے ہتھکڑی میں دیکھ کر وہ غصے میں آ گیا تھا۔ "یہ کیا ہے؟"

پولیس آفیسر کارسن کو بتا رہا تھا کہ گیری کو کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ اس نے کہا۔ "ڈکیتی... بکواس... یہ ڈیوٹی پر ہے۔"

کارسن گیری کو بازو سے پکڑ کر لے جانے لگا تو ریڈسل درمیان میں آیا مگر کارسن کے گھورنے پر ہٹ گیا۔ کارسن اسے کار میں لایا اور پھر اس کے ہاتھ کھول دیے۔ "اب بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟"

"تم چلو میں راستے میں بتاؤں گا۔ اس سے پہلے جونز اور اس کے ساتھی فرار ہو جائیں ان کو پکڑنا لازمی ہے۔ انہوں نے کیرن کو کہیں قید کر رکھا ہے۔"

کارسن نے کار آگے بڑھا دی۔ گیری نے راستے میں کارسن کو ساری کہانی سنائی۔ اس نے سر ہلایا۔ "اس نے بہت چالاکی سے کام لیا۔ لیکن وہ ایک بات سے مار کھاتا ہے۔ یہ کیس ہمارے پاس ہے۔ شاید اسے علم نہیں تھا کہ کیس دوبارہ ہمیں مل گیا ہے۔"

ان کا رخ اس ائرفیلڈ کی طرف تھا جہاں جونز اینڈ پارٹی کے لیے طیارہ مخصوص رہتا تھا۔ گیری کو یقین تھا کہ وہ طیارے کے ذریعے ہوسٹن سے نکل جائیں گے اور جب تک ان کے بارے میں پتا چلے گا وہ شاید امریکا سے بھی نکل چکے ہوں گے۔ وہ جبھی ائرفیلڈ پہنچے تو گیری نے پستول لیا اور وہیں اتر گیا۔ اس نے کارسن سے کہا۔ "تم پیچھے سے آؤ۔"

یہاں لائن سے طیارے کھڑے تھے اور ان میں سے اکثر سیسنا کمپنی کے تھے اس لیے گیری کو پاس جا کر دیکھنا پڑ رہا تھا۔ بالآخر اسے جونز والا طیارہ دکھائی دیا اور اس کے ساتھ جونز بھی تھا۔ جو بیگ اٹھا کر طیارے میں پھینک رہا تھا۔ اس کے ساتھ جوائے تھا جو طیارے سے ٹکا کھڑا تھا۔ خون چھپانے کے لیے اس نے اوپر جیکٹ پہن لی تھی۔ شارپ نظر نہیں آ رہا تھا۔ گیری اچانک سامنے آیا تو زخمی جوائے نے پستول نکال لیا لیکن جونز نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ "تم نے پیچھا نہیں چھوڑا... یہاں بھی آ گئے۔"

"میں حراست سے بھاگا ہوں۔" گیری پہلے ہی پستول پیچھے اڑس چکا تھا، وہ دونوں ہاتھ سامنے رکھ کر خود کو نہتا ظاہر کر رہا تھا۔ "کیرن کہاں ہے؟"

"اگر تمہیں کیرن چاہیے تو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"جونز اسے کہاں لے جا رہے ہو۔" جوائے بولا۔ "اسے شوٹ کر دو۔"

اسی لمحے کارسن عقب سے نمودار ہوا اور اس نے جوائے اور جونز کو ہاتھ اوپر کرنے کو کہا مگر اس سے پہلے کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل کرتے، عقب سے شارپ نے آ کر شاٹ گن کارسن کے سر پر رکھ دی اور بولا۔ "پستول پھینک

دو۔۔۔اور تم بھی۔" اس نے گیری کی طرف دیکھا۔ وہ بہت چالاکی سے ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کارسن نشانے پر تھا اس لیے وہ مجبور ہو گئے تھے انہوں نے اپنے پستول پھینک دیے۔ جیسے ہی وہ نہتے ہوئے شارپ نے عقب سے کارسن کے سر پر شاٹ گن کی نال ماری اور وہ بے ہوش ہو کر لڑھک گیا۔ شارپ، گیری کی طرف بڑھا تھا کہ جونز نے اسے روک دیا۔

"یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔"

انہوں نے عجلت میں اپنا سامان طیارے میں پھینکا اور پھر خود بھی سوار ہو گئے، اس سے پہلے جونز نے بے ہوش کارسن کو برابر میں کھڑے طیارے کے اندر ڈال دیا تھا اب اس کے فوری دریافت ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پائلٹ نے فوراً ہی انجن اسٹارٹ کیے اور طیارے کو رن وے پر لے آیا۔ اجازت لے کر اس نے طیارے کو فضا میں بلند کیا۔ سورج کی پوزیشن سے گیری نے اندازہ کیا کہ وہ جنوب کی طرف جا رہے تھے۔ کیا ان کی منزل میکسیکو تھا؟ جوائے کی حالت خراب ہو رہی تھی وہ نیم غشی میں ایک طرف سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ شارپ گیری کی نگرانی کر رہا تھا اور جونز پیراشوٹ اور رقم کے بیگ تیار کر رہا تھا۔ گیری نے کہا۔ "تم لوگ امریکا سے فرار ہو رہے ہو؟"

"مجبوری ہے ہم یہاں آزادی سے نہیں رہ سکتے۔" جونز نے جواب دیا۔ وہ تھیلوں سے رقم نکال کر ایسے بیگوں میں رکھ رہا تھا جو پشت پر پہنے جا سکتے تھے۔ گیری نے نوٹ کیا کہ وہاں صرف تین پیراشوٹ تھے۔ ایک ایک بیگ اور پیراشوٹ جونز اور شارپ نے پہنا اور تیسرا جوائے کو پہنایا۔ گیری نے پوچھا۔

"تم نے آخری موقع پر یہ رسک کیوں لیا؟"

"ایڈونچر۔" جونز مسکرایا۔ "پھر بہت بڑی رقم ہاتھ لگی ہے ہمیں آج تک کسی ڈاکے میں تین ملین ڈالرز کی رقم نہیں ملی ہے۔ یہ ہمارا آخری ڈاکا تھا اب ہم کبھی ڈکیتی نہیں کریں گے۔"

"اب تم کیا کرو گے؟"

جونز مسکرایا۔ "ہم تمہیں اسی طیارے میں چھوڑ کر کود جائیں گے اور تم واپس جاؤ گے لیکن جب تک تم دوبارہ یہاں آؤ گے ہم میکسیکو جا چکے ہوں گے۔"

گیری حیران ہوا تھا۔ "تم مجھے ایسے ہی چھوڑ جاؤ گے؟"

"ہاں، ہم تمہارے سامنے نکل جائیں گے اور تم کچھ نہیں کر سکو گے۔"

"کیرن کہاں ہو گی؟"

"جہاں ہم اتریں گے۔" جونز نے کہا۔ "میں تمہیں بتایا تھا کہ وہ ہماری انشورنس پالیسی ہے۔ اگر روکا گیا تو وہ پہلے ماری جائے گی۔"

پائلٹ نے پیچھے دیکھ کر کہا۔ "ہم پہنچ گئے ہیں ... منٹ میں کود جاؤ ورنہ میکسیکو میں اترو گے۔"

جونز نے دروازہ کھول دیا اور سب سے پہلے ... کو پکڑ کر لایا۔ "جوائے ہوش کرو۔۔۔ بس ذرا سی ... ہے۔ پیراشوٹ کھول لینا۔"

جوائے کو باہر دھکیل کر اس نے شارپ کو اشارہ ... بھی باہر نکل گیا۔ اب جونز اور گیری رہ گئے تھے۔ جونز ... اپنا پستول کیبن کے کونے میں پھینک دیا اور اسے ... سے سلام کرتا باہر نکل گیا۔ اس دوران میں پائلٹ طیار... کو گھما رہا تھا۔ گیری نے پستول اٹھا کر چیک کیا۔ یہ ... طرح لوڈ تھا۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ پائلٹ ... پولیس کو کال کرنے کو کہے لیکن پھر اسے جونز کی بات ... گئی۔ کیرن ان کے پاس تھی۔ اس نے سوچا اور پھر خود ... کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ پستول اس کے ہاتھ ... تھا۔ شارپ اور جوائے کے پیراشوٹ کھلے ہوئے تھے ... جونز نے ابھی تک پیراشوٹ نہیں کھولا تھا۔ اسے خطروں ... کھیلنا پسند تھا اس لیے وہ بالکل آخری حد میں جا کر ہی ... کھولتا تھا۔ گیری نے سر نیچے کیا اور جسم سمیٹ لیا اس طرح ... تیزی سے نیچے جانے لگا تھا اور رفتہ رفتہ جونز کے قریب ... جا رہا تھا۔ جونز اس کی آمد سے بے خبر تھا۔ اس لیے جب ... اچانک اس سے لپٹا تو وہ کچھ نہیں کر سکا تھا۔ گیری گھوم کر ... سامنے آیا اور اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے چلا کر کہا۔ "... شوٹ کھول دو۔"

گیری نے الٹے ہاتھ سے مضبوطی سے جونز کو ... میں کر لیا تھا اور دائیں ہاتھ سے پستول اس کے سر سے ... تھا۔ جونز مسکرایا اور چلا کر بولا۔ "تم کھول دو۔"

ڈوری بائیں طرف پہلو میں تھی اور گیری اسے ... دائیں ہاتھ سے کھول سکتا تھا۔ مگر دائیں ہاتھ سے اس ... پستول تھام رکھا تھا ڈوری کھینچنے کے لیے اسے پستول چھوڑنا ... پڑتا۔ جونز اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور اس کی ... میں چیلنج تھا۔ گیری نے سختی سے پستول کی نال اس کی ... میں گڑا دی اور چلایا۔ "تم ڈوری کھینچتے ہو یا میں تمہارا ... اڑا دوں۔"

مگر جونز مسکراتا رہا۔ زمین تیزی سے نزدیک آ...

تھی۔ گیری جانتا تھا کہ دو افراد کے بوجھ سے پیراشوٹ ویسے ہی تیزی سے نیچے جائے گا اور ان کی رفتار کم نہ ہوئی تو ان کی ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔ مجبوراً اس نے پستول چھوڑ دیا اور ڈوری کھینچ لی۔ ایک جھٹکے سے پیراشوٹ کھلا اور دونوں آہستگی سے نیچے جانے لگے۔ اس کے باوجود جب ان کے پیر زمین سے ٹکرائے تو گیری کے گھٹنے میں درد کی لہر اٹھی تھی اور وہ زمین پر گر گیا۔ جونز فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔ جوائے کچھ دور زمین پر پڑا تھا اور شارپ اسے دیکھ رہا تھا۔ جونز اس کی طرف بڑھا۔ شارپ نے نفی میں سر ہلایا۔ جونز کا چہرہ ست گیا تھا۔ میٹ کے بعد جوائے بھی ان کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ ان کا میکسیکو جانے کا بندوبست ہو گیا تھا۔ ایک ماہی گیر کشتی انہیں چند میل دور واقع میکسیکو کی سمندری حدود میں لے جاتی اور وہاں سے ایک میکسیکن کشتی انہیں چھپا کر میکسیکو کے ساحل تک پہنچا دیتی۔ شارپ نے غصے سے گیری کی طرف دیکھا اور چلایا۔ "یہ سب اس کا حرامی پن ہے، میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

"نہیں۔" جونز نے اسے روک لیا تھا۔ "ایف بی آئی ایجنٹ کا قتل ٹھیک نہیں ہے۔ اب رقم لو اور یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔"

یہ جگہ ویران صحرائی تھی لیکن سمندری ہوا کی مہک بتا رہی تھی کہ سمندر یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ گیری نے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن درد کی وجہ سے اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ جونز اس کی طرف آیا۔ "ہم میکسیکو کی طرف جا رہے ہیں۔"

"کیرن کہاں ہے؟"

"وہ آنے والی ہے۔" جونز نے پلٹ کر دیکھا تو دور صحرا میں گرد اڑتی نظر آئی۔ کوئی گاڑی ان کی طرف آ رہی تھی۔ جونز اس کی طرف مڑا۔ "اب تم سے کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتے ہیں۔" گیری نے سنجیدگی سے کہا۔

جونز نے سر ہلایا۔ شارپ نے جوائے کا بیگ اتار لیا تھا اس دوران میں آنے والی گاڑی قریب آ گئی تھی یہ خاص صحرائی اور ناہموار راستوں پر چلنے والی چوڑے ٹائروں کی جیپ تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جونز کا پانچواں ساتھی سیمسن بیٹھا تھا، وہ کوور کا کام کرتا تھا اور ان لوگوں کے لیے سہولتیں مہیا کرتا تھا۔ ان کے فرار کا بندوبست بھی اسی نے کیا تھا اس کے برابر والی سیٹ پر کیرن بیٹھی تھی۔ جیپ کے رکتے ہی وہ اتر کر بھاگتی ہوئی آئی اور گیری سے لپٹ گئی۔ وہ کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ گیری نے بے تابی سے پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "مجھے تمہاری فکر تھی۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا اور جونز کی طرف دیکھا۔ "اب تم کیا کرو گے ہمارے ساتھ؟"

"کچھ نہیں میں تم دونوں کو یہاں چھوڑ جاؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔ "یہاں سے کوئی پانچ میل دور سڑک ہے اگر تم لوگ چلتے رہے تو ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤ گے۔ سڑک سے تمہیں مدد مل جائے گی۔"

جونز جیپ کی طرف بڑھا اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر گیری کی طرف ہاتھ ہلایا۔ جیپ آگے بڑھ گئی۔ وہ ایک بار پھر اسے ناکامی دے گیا تھا۔ لیکن اسے کیرن زندہ سلامت واپس مل گئی تھی۔ یہ اس کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ کیرن نے اس سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے یہ سمندر کے راستے فرار ہوں گے۔ سیمسن کسی سے بات کر رہا تھا اس کا خیال تھا کہ میں سن نہیں رہی ہوں لیکن میں نے سن لیا تھا۔ اگر ہم جلدی کسی ایسی جگہ پہنچ جائیں جہاں سے کال کی جا سکے تو ان لوگوں کو روکا جا سکتا ہے۔"

مگر گیری نے کیرن کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس نے کہا۔ "ہمیں چلنا چاہیے پہلے سڑک تک پہنچ جائیں اس کے بعد دیکھیں گے۔"

وہ ڈیڑھ گھنٹے بعد سڑک تک پہنچے تھے اور اتفاق سے انہیں ایک ٹرک والا مل گیا جو میکسیکو سے سامان لے کر آ رہا تھا۔ اس نے انہیں نزدیکی قصبے تک لفٹ دی۔ وہ ایک بار میں پہنچے اور گیری نے ایف بی آئی کا حوالہ دے کر فون حاصل کیا۔ کیرن کاؤنٹر پر بیٹھ گئی تھی۔ گیری فون کر کے آیا تو اس نے پوچھا۔ "تم نے پولیس کو ان کے بارے میں بتا دیا ہے؟"

گیری نے سر ہلایا۔ "ہاں لیکن اب اس موضوع پر بات مت کرنا۔ یہ آفیشلی معاملات ہیں۔"

کیرن نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے مجھے یقین ہے وہ پکڑے جائیں گے۔"

گیری نے کارسن کو کال کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ جونز اور اس کے ساتھی میکسیکو فرار ہونے والے ہیں لیکن اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ سمندر کے راستے فرار ہو رہے تھے۔ اس لیے اس کا امکان کم تھا کہ وہ پکڑے جائیں۔ گیری کے خیال میں جونز کو اتنا چانس تو ملنا چاہیے تھا کیونکہ طبعاً وہ کھلاڑی تھا اور کھلاڑی کو چانس ملنا چاہیے۔ اسے امید تھی کہ یہ آخری موقع ہو گا جب اسے کیرن سے جھوٹ بولنا پڑا۔

# مجرم محرم

ملک صفدر حیات

اکثر گھر کو آگ لگ جاتی ہے گھر کے چراغ سے... زیرِ نظر تحریر بھی اس حقیقت کی مثال ہے... انسان اپنی حقیقت کو فراموش کرکے جانے کیسے انتہائی قدم اٹھالیتا ہے۔ عشق اگر سچا ہو تو رستہ دکھاتا ہے اور اگر ہوس ہو تو زندگی کے تمام رستوں پر بدنامی کا پہرا بٹھا دیتا ہے مگر اتنی سی بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی جو جائز رشتوں کو ٹھکرا کر غلط رستوں کا انتخاب کر بیٹھے تھے... کیونکہ کچھ لوگ اندھے اعتماد سے فائدہ اٹھا کر آنکھوں میں دھول جھونکنے کے ماہر ہوتے ہیں... ان کے خیال میں یہ دنیا کا سب سے آسان کام ہوتا ہے مگر... کیا خبر تھی کہ یہی آسان کام ان کی زندگی کو مشکل بنا دے گا... ملک جی کا سکہ یونہی تو نہیں چلتا تھا... بالآخر ان کی تفتیش رنگ لائی اور ان کے رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔

**زندہ انسانوں کو مارنے اور**
**مردوں کو جلانے والے**
**مجرموں کی**
**سفاکی**

میں نے جس وقت اپنے کمرے میں قدم رکھا، گھڑی دن کے گیارہ بجا رہی تھی۔ اس روز مجھے ڈیوٹی سنبھالنے میں تھوڑی دیر ہوگئی تھی۔ مجھ سے پہلے تھانے کا عملہ حاضر ہو چکا تھا۔ میں نے نیم دراز ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

وہ موسم گرما کے دن تھے۔ اس روز سورج گویا سوا نیزے پر آگیا تھا۔ ہر جانب چلچلاتی دھوپ کا راج تھا۔ زمین تپ کر تانبا ہو چکی تھی۔ ہوا بھی صبح سے بند تھی جس کے باعث فضا میں گھٹن کا احساس پایا جاتا تھا۔ میں پچھلے دو دن سے ملیریا بخار کی لپیٹ میں تھا۔ وہ بہت ہی سادہ زمانہ تھا، مچھر بھی نہایت ہی تمیزدار اور شریف النفس ہوا کرتے تھے، بس دو چار دن کے لیے سادہ سے ملیریا بخار میں مبتلا کر دیا کرتے تھے۔ آج کل کی طرح جان لیوا ڈینگی فیور نہیں ہوا کرتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک کانسٹیبل میرے کمرے میں آیا اور سیلوٹ کرنے کے بعد یہ اطلاع دی۔ "ملک صاحب! ادھر ساتھ والے محلے میں ایک عورت کی مو
واقع ہوگئی ہے......"

"موت واقع ہوگئی ہے......؟" میں نے چونکتے
ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "کس طرح...... اور اس
موت کا پولیس، تھانے سے کیا تعلق ہے؟"

"وہ جل کر مری ہے جناب۔" کانسٹیبل نے بتایا۔

"اوہ...... یہ کب کی بات ہے؟"

"ہمیں تھوڑی دیر پہلے ہی پتا چلا ہے ک
صاحب۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔ "اطلاع دینے
بندہ باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔"

"ابھی تک کوئی کارروائی وغیرہ بھی ہوئی یا
میں نے سوالیہ نظر سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

"آپ کی آمد کا انتظار تھا جناب......!"

"ٹھیک ہے، اطلاع کنندہ کو اندر بھیجو۔" میں
تحکمانہ انداز میں کہا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد مذکورہ شخص میرے سا

حاضر تھا۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس نے اپنا نام فرید بتایا۔ فرید اس عورت کے پڑوس میں رہتا تھا جس کی موت جل جانے سے واقع ہوئی تھی۔ میں نے فرید سے دو چار ضروری سوالات کیے اور حوالدار کو اپنے ساتھ لے کر جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہوگیا۔

میں نے موقع پر پہنچ کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ آگ باورچی خانے میں لگی تھی۔ میری آمد سے قبل محلے والوں نے اس خوف ناک آگ پر قابو پالیا تھا اور مذکورہ بدنصیب عورت کی سوختہ لاش کو باورچی خانے سے نکال کر صحن میں پہنچا دیا گیا تھا۔ متوفی کا نام فردوس بی بی معلوم ہوا۔ فردوس کی سوختہ لاش اس وقت گھر کے صحن میں ایک چارپائی پر، چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔

میں نے چادر کا ایک کونا اٹھا کر لاش کا جائزہ لیا تو ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس کا ویسے تو پورا بدن ہی کباب کی طرح بھن چکا تھا تاہم چہرے کی حالت بڑی ہیبت ناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی۔ اس کے خال و خد کو وحشی آگ نے مسخ کر کے اس قدر بگاڑ دیا تھا کہ دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر معائنے کے بعد لاش کو دوبارہ چادر سے ڈھانپ دیا اور گھوم پھر کر جائے وقوعہ اور اس کے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔

جیسا کہ میں نے بتایا، آگ باورچی خانے کے اندر لگی تھی اور یہ باورچی خانہ گھر کی شمالی دیوار کے ساتھ بنا ہوا تھا اور باورچی خانے کے ساتھ ہی غسل خانہ واقع تھا۔ اس کے سامنے یعنی جنوبی دیوار کے ساتھ دو تین پھل دار پیڑ ایستادہ تھے۔

آگ کو سب سے پہلے فردوس بی بی کے پڑوسی فرید نے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت اپنے گھر کی چھت پر موجود تھا۔ فرید چونکہ اس واقعے کا چشم دید گواہ تھا لہٰذا میں نے سب سے پہلے اسی سے پوچھ گچھ کی۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''تھانے دار صاحب! میں اس وقت کسی ضروری کام سے اپنے گھر کی چھت پر چڑھا تھا۔ مجھے ساتھ والے گھر کے باورچی خانے سے دھواں سا اٹھتا نظر آیا۔ میں نے اس دھوئیں پر پہلے تو کوئی توجہ نہیں دی لیکن جب اس نے کالے بادلوں کی طرح خوف ناک صورت اختیار کرلی تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے اپنی چھت کے آخری سرے پر جا کر دوسرے گھر کے صحن میں جھانکا تو یہ دیکھ کر میں گھبرا گیا کہ فردوس بی بی کے گھر کا باورچی خانہ خوف ناک آگ کی لپیٹ میں تھا۔ میں فوری طور پر چھت سے نیچے اترا اور باہر گلی میں جا کر محلے والوں کو اس اندوہناک واقعے کے بارے میں بتایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میری پکار پر گلی میں درجن بھر افراد جمع ہوگئے۔ فردوس کے گھر کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم آناً فاناً اندر پہنچے اور یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ باورچی خانے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ بہرحال...... ہم نے کسی نہ کسی طرح اس خوف ناک آگ پر قابو پایا اور باورچی خانے کا دروازہ کھول کر فردوس کی لاش کو باہر نکال لیا پھر اس افسوس ناک واقعے کی اطلاع دینے تھانے کی طرف روانہ ہوگیا تھا......''

فرید کا بیان دیکھنے میں نہایت ہی سیدھا سادا لگتا تھا لیکن مجھے اس بیان کے اندر متعدد سنسنی خیز انکشافات نظر آگئے تھے اور فرید کی بات سن کر میرا ذہن بہ یک وقت کئی زاویے پر سوچنے لگا تھا۔ یہ نہ تو خودکشی کا کیس تھا اور نہ ہی اتفاقیہ آتش زنی کا واقعہ نظر آتا تھا۔ مطلب یہ کہ اگر باورچی خانے میں اتفاق سے آگ بھڑک اٹھی ہوتی تو ایسی صورت میں فردوس بی بی چپ چاپ اپنی جان نہ دے دیتی۔ وہ خود کو بچانے کے لیے چیخ پکار اور بھاگ دوڑ ضرور کرتی۔ کیونکہ انسان کے لیے اس کی اپنی جان بڑی قیمتی ہوتی ہے۔ وہ اسے بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے جس کا یہاں کوئی ثبوت نظر نہیں آتا تھا۔

دوسرا امکان خودکشی کا ہوسکتا تھا۔ یعنی یہ سوچا جاسکتا تھا کہ فردوس نے اپنی جان لینے کے لیے خود کو آگ لگائی ہوگی۔ ایسی صورت میں باورچی خانے کے دروازے کو باہر سے نہیں بلکہ اندر سے بند ہونا چاہیے تھا جبکہ فرید کے بیان کے مطابق جب وہ لوگ گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ باورچی خانے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اگر فردوس نے خودکشی کی نیت سے خود کو باورچی خانے میں بند کیا تھا تو باورچی خانے کا دروازہ باہر سے کیسے بند ہوگیا؟ فرید کے علاوہ دیگر لوگوں نے بھی مجھے یہی بتایا تھا کہ باورچی خانے کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔

مجھے تو یہ سیدھا سادا قتل کا کیس نظر آرہا تھا۔ میں نے نہایت ہی باریک بینی سے جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے بعد مشیر نامہ تیار کیا اور موقع پر موجود گواہوں کے بیانات قلم بند کرنے لگا۔ ان گواہوں میں، میری نظر میں سب سے زیادہ اہمیت متوفی کے پڑوسی فرید کی تھی لہٰذا میں نے سب سے آخر میں ٹرائی کرنے کا فیصلہ کیا۔

چار پانچ افراد کے بیانات لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان سے مجھے تفتیشی معاملات میں کوئی مدد ملنے والی نہیں تھی۔ آگے بڑھنے سے قبل میں متوفی فردوس بی بی اور اس کے گھر کے حوالے سے آپ کو مختصراً بتاتا چلوں تاکہ آپ کو آگے کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔







حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس گھر میں صرف تین افراد رہتے تھے۔ نمبر ایک، متوفی فردوس بی بی۔ نمبر دو، فردوس کی بوڑھی ساس سلطانہ اور ان کا کرایے دار جمشید۔ وہ پانچ مرلے قطعہ اراضی پر بنا ہوا ایک درمیانے سائز کا مکان تھا۔ کراچی کے رہائشی مکان کے رقبے کو تقریباً ایک سو بیس گز تصور کرلیں۔ گھر کے عقبی حصے میں پہلو بہ پہلو دو بڑے کمرے بنے ہوئے تھے جن کے آگے دس فٹ کا ایک برآمدہ تھا۔ اس کے بعد کچا صحن تھا جس کی شمالی دیوار کے ساتھ ایک قطار میں باتھ روم اور کچن بنے ہوئے تھے جبکہ جنوبی دیوار کے ساتھ چند پھل دار درخت لگے ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں لیکن یاد پڑتا ہے کہ وہ امرود اور شہتوت کے پیڑ تھے۔ مکان کے سامنے والے حصے میں بیٹھک نما ایک بڑا سا کمرا بنا ہوا تھا جو جمشید نامی ایک شخص نے کرایے پر لے رکھا تھا۔ جمشید کسی اور علاقے کا رہنے والا تھا اور مقامی پرائمری اسکول میں پڑھاتا تھا۔ وہ پورے گاؤں میں ماسٹر جمشید کے نام سے مشہور تھا۔ وہ مہینے، دو مہینے میں اپنے گھر کا ایک چکر لگا آتا تھا۔

متوفی فردوس بی بی کا شوہر پچھلے دو سال سے بیرونِ ملک مقیم تھا۔ یعقوب شادی کے فوراً بعد ہی عراق روانہ ہوگیا تھا اور ابھی چند روز پہلے ہی وہ گھر والوں سے ملنے، چھٹی پر پاکستان آیا تھا۔ یعقوب عراق کی ایک آئل کمپنی میں ملازمت کرتا تھا جس کا ذکر کرنا غیر متعلق ہے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات جو مجھے پتا چلی وہ یہ تھی کہ جب فردوس بی بی کو یہ خوفناک حادثہ پیش آیا، وہ گھر میں اکیلی تھی۔ یعقوب اور اس کی بوڑھی ماں سلطانہ کے بارے میں کوئی حتمی بات تو معلوم نہیں ہوئی کہ وہ لوگ اس وقت کہاں تھے تاہم بعض لوگوں کا قیاس تھا کہ یعقوب اپنی ماں کو اسپتال لے گیا ہوگا۔ سلطانہ جوڑوں کے درد کی دائمی مریضہ تھی۔

ایک تو گرمی جہنم کی تپش پر سبقت لے جانے میں مصروف تھی، دوسرے اس گھر کے در و دیوار خصوصاً صحن میں انسانی گوشت کی سڑاند چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں پر کھڑے رہ کر سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا لہٰذا میں نے حوالدار کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

''مولا بخش! تم متوفی فردوس کی سوختہ لاش کو سرکاری اسپتال پہنچوانے کے انتظامات کرو جب تک میں فرید کا انٹرویو کرلیتا ہوں۔ موسم کی شدت اور لاش کی حالت کا تقاضا ہے کہ اسے جلد از جلد اسپتال پہنچا دینا ہی مناسب ہوگا۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' حوالدار فرماں برداری سے بولا۔ ''آپ اس طرف سے بے فکر ہوجائیں۔ میں سارا بندوبست کرلوں گا۔''

میں بے فکر ہوکر فرید کے ساتھ متوفی کے گھر سے نکل آیا۔ ہم چلتے ہوئے گلی کے کونے پر پہنچے جس کے آگے تھوڑے فاصلے سے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا اور کھیتوں کے آغاز پر ہی ایک سایہ دار شیشم کا تناور درخت کھڑا تھا۔ ہم دونوں مذکورہ درخت کے نیچے آگئے۔ فرید کے چہرے پر الجھن کے تاثرات سجے ہوئے تھے۔

''کیا بات ہے فرید؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تم خاصے پریشان نظر آرہے ہو......؟''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا، آپ مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہیں......؟'' اس نے متوحش انداز میں میری طرف دیکھا۔

''اس لیے کہ تم میری نظر میں بہت اہم ہو!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی......'' اس کی الجھن دوچند ہوگئی۔ ''کیا مطلب جناب......؟''

''فرید......!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''تم متوفی کے پڑوسی ہو اور تم ہی وہ شخص ہو جس نے سب سے پہلے متوفی کے باورچی خانے کو آتش کی لپیٹ میں دیکھا، گویا تم ایک لحاظ سے اس واقعے کے عینی شاہد ہو۔ میں اس الگ تھلگ جگہ پر تمہارا بیان لینے آیا ہوں......''

اس سے پہلے کہ فرید کچھ کہتا، ایک آدمی چارپائی سر پر اٹھائے ہمارے قریب پہنچ گیا، پھر اس نے شیشم کی گھنی چھاؤں میں چارپائی بچھانے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے ادب سے کہا۔

''سرکار! آپ ادھر آرام سے بیٹھ کر بات کریں۔ میں کسی بچے کے ہاتھ لسی پانی بھی بھیجتا ہوں۔''

اس شخص کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ میں نے اس کے عمل کے نتیجے میں تشکرانہ انداز میں پوچھا۔

''چاچا! تمہارا نام کیا ہے؟''

"میں اللہ رکھا ہوں تھانے دار صاحب۔" اس نے جواب دیا۔ "اسی محلے، بلکہ اسی گلی میں رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے......" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "تمہارا شکریہ۔"

وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں دوبارہ فرید کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"ہاں بھئی فرید......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے جو بھی پوچھوں گا، اس کا سیدھا اور سچا جواب دو گے نا......؟"

"مائی باپ!" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر منت ریز لہجے میں بولا۔ "میں نے پہلے آپ سے کوئی جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی اب بولوں گا۔ آپ پوچھیں جو بھی پوچھنا ہے۔"

میں اس وقت اللہ رکھا کی لائی ہوئی چارپائی پر براجمان تھا جبکہ فرید میرے سامنے باادب باملاحظہ کھڑا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"فرید! کیا تم یہ بات جانتے تھے کہ فردوس بی بی گھر میں اکیلی تھی؟"

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں جناب، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔"

"کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ فردوس بی بی کا خاوند روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور چند روز پہلے ہی اس کی واپسی ہوئی ہے......؟"

"جی، یہ بات مجھے پتا تھی......" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا۔ "یہ یعقوب کس مزاج کا بندہ ہے؟"

"آپ کا مطلب کیا ہے جناب؟" وہ محتاط انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یعقوب پچھلے دو سال سے عراق میں نوکری کر رہا ہے۔ اس سے پہلے تو وہ ادھر ہی ہوتا تھا۔ تم بھی سال ہا سال سے ادھر رہ رہے ہو۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں، تم نے یعقوب کو کیسا پایا ہے؟ وہ تمہارا پڑوسی ہے، ظاہر ہے کہ تمہارا اس کے ساتھ میل جول رہا ہوگا۔"

"بس جی......" اس نے ذومعنی انداز میں گردن ہلائی اور بولا۔ "بندہ تو وہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے......"

"فرید!" میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔ "کیا تمہیں واقعی اس بات کا علم نہیں کہ تمہاری پڑوسن سلطانہ اور اس کا عراق پلٹ بیٹا یعقوب صبح ہی صبح کہاں غائب ہو گئے ہیں؟"

"رب دی سوں۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میری بھی وہی رائے ہے جو محلے والوں نے بیان کیا ہے۔ ہو سکتا ہے یعقوب اپنی ماں کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے گیا ہو......"

"تمہارے ان لوگوں کے ساتھ کیسے تعلقات تھے؟"

"کن لوگوں کے ساتھ جی......؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"میں سلطانہ، اس کی جل کر ہلاک ہونے والی بہو فردوس بی بی کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی بتاؤ کہ یعقوب کے ساتھ تمہارے مراسم کس نوعیت کے رہے ہیں؟"

اس سے پہلے کہ فرید میرے سوال کا جواب دیتا، اللہ رکھا کا بھیجا ہوا ایک بندہ ہمارے لیے ٹھنڈی ٹھار لسی سے بھرا ہوا ایک جگ اور دو سٹیل کے گلاس لے کر وہاں آ گیا۔ مذکورہ بندے کو واپس بھیجنے کے بعد فرید نے ایک گلاس میں لسی بھری پھر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"تھانے دار صاحب! آپ لسی پئیں جناب......"

"مجھ سے زیادہ اس وقت تمہیں لسی کی ضرورت ہے فرید بخش!" میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تاکہ تم میرے سوالات کے ٹھنڈے ٹھار جواب دے سکو۔"

اس نے میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے لیے بھی لسی کا ایک گلاس تیار کر لیا پھر میری سوالیہ نظر کے جواب میں بولا۔

"تھانے دار صاحب! یہ لوگ میرے پڑوسی تھے، اچھے پڑوسی...... ان کے ساتھ میرے تعلقات ہمیشہ اچھے ہی رہے ہیں اور جہاں تک یعقوب کا تعلق ہے جناب......" وہ سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"وہ جب یہاں تھا تو اس کے ساتھ میرا اٹھنا بیٹھنا بھی تھا۔ پھر وہ عراق چلا گیا۔ اب دو سال بعد واپس آیا ہے تو بھی بہت اچھی طرح ملا ہے۔"

"پڑوسی ہونے کے ناتے تم نے یعقوب کے گھر پر گہری نظر رکھی ہوگی۔" میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ "یعقوب تو یہاں تھا نہیں اور اس کی بیوی فردوس بی بی گھر میں اکیلی ہوتی تھی......"

"جناب......!" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں فردوس بی بی کو اپنی بہن کی طرح سمجھتا ہوں۔ میں اس پر بری نظر ڈالنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"اوئے بری نظر کے گھوڑے......" میں نے اسے ڈانٹا۔ "میں نے کب کہا ہے کہ تم یعقوب کی غیر موجودگی میں فردوس پر میلی نظر ڈالتے ہو گے؟"

"پھر جناب......؟" وہ بھونچکا نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"میرا اشارہ ماسٹر جمشید کی طرف ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "سلطانہ نے ایک نامحرم کو بھی تو اپنے گھر میں کرایے دار بنا کر رکھا ہوا ہے......؟"

اس کے چہرے پر ایک سنسنی خیز رنگ آ کر گزر گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس کے ذہن میں جو کچھ بھی تھا، تہلکہ ڈال دینے والا تھا۔ اسے ہچکچاہٹ میں مبتلا دیکھ کر میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔

"فرید بخش! اگر تم نے کوئی چھوٹی سے چھوٹی سچائی بھی مجھ سے چھپانے کی کوشش کی تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی تمہیں ڈھیر ساری شرم آئے گی۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کانوں کو پکڑتے ہوئے توبہ کرنے والے انداز میں بولا۔ "سرکار! میری توبہ جو میں آپ سے کوئی غلط بیانی کروں......"

"تو پھر مجھے بتاؤ، حقیقت کیا ہے۔" میں نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ "جب میں نے ماسٹر جمشید کا ذکر کیا تو تمہارے چہرے کے تاثرات میں ہنگامی تبدیلی کیوں پیدا ہوئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں، ماسٹر جمشید کی ذات کے حوالے سے تمہارے دل و دماغ میں بہت کچھ چھپا ہوا ہے...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نن...... نہیں جناب۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ "کیسے زبان کھولوں جناب...... پڑوس کا معاملہ ہے اور......"

"تو پھر میں تمہیں اپنے ساتھ تھانے لے چلتا ہوں۔" میں نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔ "وہاں پہنچ کر تمہاری زبان "فرفر" چلنے لگے گی۔"

"مائی باپ!" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ ظلم نہ کریں سرکار، میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیتا ہوں لیکن وعدہ کریں کہ آپ یعقوب کو، میرے بارے میں نہیں بتائیں گے کہ میں نے اس کی بیوی کے حوالے سے آپ سے کوئی بات کی ہے۔"

"میں اس وقت تک ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا جب تک اصل معاملہ میرے علم میں نہ آ جائے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "بتاؤ، متوفی فردوس بی بی کے حوالے سے تم کون سا انکشاف کرنے والے ہو؟"

چند لحات تک تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "ماسٹر جمشید کوئی پچھلے ایک سال سے سلطانہ کی بیٹھک میں کرایے دار کی حیثیت سے رہ رہا ہے۔ جب سلطانہ، ماسٹر کو یہ بیٹھک کرایے پر دے رہی تھی تو اس وقت میں نے سلطانہ کو سمجھایا تھا کہ وہ ماسٹر کو اپنے گھر میں نہ رکھے۔ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں لیکن سلطانہ نے میری ایک نہ سنی اور وہی کیا جو اس کے ذہن میں سمایا ہوا تھا......"

"کیا مطلب......" وہ سانس لینے کے لیے تھما تو میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ "تم نے ماسٹر جمشید کی کس بات سے یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں۔"

"جناب! یہ بندہ مجھے شکل ہی سے ٹھیک نہیں لگا تھا۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "اسی لیے میں نے سلطانہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس کا، جوان بہو کا ساتھ ہے۔ کسی نامحرم کو یوں گھر میں رکھ لینا اچھی بات نہیں لیکن جب اس نے کرایے کے لالچ میں میری بات پر توجہ نہیں دی تو میں بھی خاموش ہو گیا......"

آخری جملہ اس نے مجھ سے نگاہ چراتے ہوئے ادا کیا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ کوئی اہم بات مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کڑک دار آواز میں کہا۔

"لگتا ہے، تمہیں حوالات کی ہوا کھلائے بغیر بات نہیں بنے گی......؟"

"تھانے دار صاحب! میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" وہ گھگیانے لگا۔ "آپ مجھے تھانے کچہری کے چکر میں نہ ڈالیں۔"

"اگر تم واقعی ان چکروں سے بچنا چاہتے ہو تو الف کی طرح سیدھے ہو جاؤ۔" میں نے غراہٹ آمیز انداز میں کہا۔ "میں اچھی طرح جانتا ہوں اور یہ جان کاری مجھے تمہاری آنکھوں نے دی ہے کہ سلطانہ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد تم نے صبر کیا تھا اور نہ ہی خاموش ہو کر بیٹھے تھے بلکہ تم مسلسل اس ٹوہ میں لگے رہے تھے کہ ماسٹر اور فردوس بی بی کے درمیان کیا چکر چل رہا ہے اور...... تم نے

اس سلسلے میں بہت سی کارآمد باتیں بھی جان لی تھیں......'' میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟''

''نہیں سرکار!'' میں چونکہ غلط نہیں کہہ رہا تھا اس لیے وہ انکار کی ہمت نہ کرسکا اور جلدی سے بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے فردوس اور ماسٹر کے حوالے سے اچھی خاصی تحقیق کی ہے۔''

''کیسی تحقیق......'' میں نے استفساریہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہاری کارکردگی کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں؟''

''اچھا جی!'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار جی! میں سلطانہ کو سمجھانے سے تو باز آ گیا تھا لیکن میں نے فردوس کے معاملات پر گہری نظر رکھی تھی۔ جلد ہی یہ بات میرے علم میں آ گئی کہ یعقوب تو محنت مزدوری کرنے ملک سے باہر گیا ہوا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں فردوس، ماسٹر جمشید کے ساتھ ایک خطرناک کھیل، کھیل رہی تھی۔ فردوس پوری طرح ماسٹر کی طرف مائل ہو چکی تھی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ سلطانہ سے بات کروں لیکن اس خیال سے خاموش رہا کہ وہ میری بات کا یقین نہیں کرے گی۔ وہ الٹا مجھی کو لتاڑ ڈالے گی کہ میں خوامخواہ اس کی بہو پر الزام لگا رہا ہوں۔ یہ تو میں دیکھ رہا تھا کہ سلطانہ، ماسٹر جمشید پر اندھا بھروسا کرنے لگی تھی لہٰذا میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے۔'' میں نے سوال کیا۔ ''سلطانہ اپنی بہو اور ماسٹر جمشید کے تعلق سے بے خبر ہی تھی......؟''

''میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا جناب۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ دونوں بہت ہاتھ پاؤں بچا کر یہ کھیل، کھیل رہے تھے ورنہ سلطانہ انہیں جان بوجھ کر ایسا موقع نہیں دے سکتی تھی۔ ساس، بہو میں چاہے کتنی بھی نااتفاقی کیوں نہ ہو مگر سلطانہ اپنے بیٹے کے گھر کو تو آگ نہیں لگا سکتی تھی۔''

فرید بخش کی ایک بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا سلطانہ اور فردوس کے درمیان اتفاق نہیں تھا؟''

''بالکل نہیں جناب۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اکثر ان کے گھر سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنائی دیتی رہتی تھیں۔''

''ہوں......!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یعقوب کو یہاں آئے چند روز ہو گئے [...] نے فردوس اور ماسٹر والے معاملے کے بارے میں [...] کچھ بتایا تھا؟''

''نہیں جی......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ [...] نے اسے کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ خوامخواہ میاں بیوی [...] درمیان جھگڑا کرانے کی مجھے کیا ضرورت پڑی تھی۔''

''لیکن یعقوب تمہارا پڑوسی اور پرانا جاننے [...] ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ [...] تمہارے اس کے ساتھ بہت اچھے تعلقات بھی رہے [...] تمہارا تو فرض بنتا تھا کہ پہلی فرصت میں یعقوب کو [...] حال سے آگاہ کر دو۔ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟''

''میں نے سوچا تھا، یعقوب واپس آ ہی گیا [...] سارا معاملہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔'' اس [...] لاتعلقی کے انداز میں جواب دیا۔ ''فردوس بی بی بھی [...] ہے اور ماسٹر جمشید بھی۔ میں خوامخواہ خود کو کیوں برا [...] لیکن......!''

''لیکن کیا فرید بخش؟'' وہ بولتے بولتے رکا تو [...] نے پوچھا۔

''لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ یعقوب کو اپنی بیوی [...] پریم کہانی کی خبر ہو گئی تھی۔'' فرید نے جواب دیا [...] چونک اٹھا۔

''تمہیں کس بات سے ایسا لگا؟'' میں نے پوچھا [...]

''پچھلی رات دونوں میاں بیوی کے بیچ زور [...] جھگڑا ہوا تھا۔''

''تمہیں ان کے جھگڑے کے بارے میں کیسے پتا [...]

''میرے اور یعقوب کے گھروں کی درمیانی [...] خاصی نیچی ہے جناب۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے [...] ''اتنی نیچی کہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بڑی [...] کے ساتھ بات سنی جا سکتی ہے۔ رات کو میں پیشاب [...] کے لیے اٹھا تو دیوار کی دوسری جانب مجھے یعقوب [...] فردوس کے تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں [...] یہی محسوس ہوا کہ وہ آپس میں جھگڑا کر رہے تھے۔''

''پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ لوگ کس [...] جھگڑا کر رہے تھے۔'' میں نے تیکھے لہجے میں سوال کیا [...] ہو نہیں سکتا کہ تم نے ان کے جھگڑنے کی آوازوں کو [...] کر دیا ہو اور اطمینان سے جا کر سو گئے ہو......؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب!'' وہ شرمندہ [...] صورت بنا کر بولا۔ ''میں نے کان لگا کر بڑے دھیان [...] ان کی باتیں سنی تھیں اور ان کے جھگڑنے کا سبب میری سمجھ میں آ گیا تھا......''

''فرید بخش، پہیلیاں مت بجھاؤ!'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوا تو میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ صاف اور واضح الفاظ میں حقیقت مجھے بتاؤ۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ میاں بیوی کس بات پر جھگڑا کر رہے تھے؟''

آنے والے دس منٹ میں فرید بخش نے مجھے جو تفصیل سنائی اس کا خلاصہ اتنا سا ہے کہ یعقوب کو ماسٹر جمشید کے حوالے سے اپنی بیوی متوفی فردوس بی بی کے کردار پر شک ہو گیا تھا۔ میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''یہ ماسٹر جمشید بھی کہیں نظر نہیں آ رہا۔ پتا نہیں، اسے فردوس بی بی کی الم ناک موت کی خبر ہوئی ہے یا نہیں......؟''

''خبر کیسے نہیں ہوگی جناب۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''اس وقت پورے محلے کو پتا چل چکا ہے کہ فردوس بی بی باورچی خانے کے اندر جل کر مر گئی ہے اور اس کا اسکول بھی اسی محلے میں ہے۔ پھر جب کسی علاقے میں پولیس آتی ہے تو پھر کچھ بھی چھپا نہیں رہ سکتا۔''

اس کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اتنی بڑی خبر سن کر ماسٹر جمشید یہاں کیوں نہیں پہنچا......؟''

''ہو سکتا ہے، اسے فردوس کی موت کا علم ہو گیا ہو اور وہ جان بوجھ کر کہیں اِدھر اُدھر کھسک گیا ہو۔'' فرید نے خیال ظاہر کیا۔ ''کل تک تو وہ ادھر ہی تھا۔ میں نے جمعہ کی نماز کے بعد اسے محلے میں دیکھا تھا۔''

آج یعنی جس روز متوفی فردوس بی بی کو وہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا، ہفتے کا دن تھا۔ اس حساب سے فرید کا کہنا درست تھا کہ اس نے گزشتہ روز یعنی جمعہ کے دن ماسٹر جمشید کو محلے میں دیکھا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اچانک سوال کیا۔

''فرید بخش! تمہارے خیال میں فردوس بی بی کو کس نے قتل کیا ہو گا؟''

''قتل......!'' وہ وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''لیکن جناب، وہ تو جل کر مری ہے...... یہ ایک اتفاقیہ حادثہ تھا......''

''ہرگز نہیں فرید بخش!'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے وضاحت کی۔ ''تم نے مجھے بتایا ہے کہ جب تم لوگ آگ اور دھواں دیکھ کر سلطانہ کے گھر کے اندر پہنچے تو باورچی خانے کو آگ کی لپیٹ میں پایا اور جب تم لوگوں نے باورچی خانے کے اندر داخل ہونا چاہا تو اس کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ فردوس گھر میں اکیلی تھی لہٰذا وہ باورچی خانے میں بند ہو کر باہر سے کنڈی نہیں لگا سکتی تھی، چنانچہ اس کی خودکشی کے امکان کو سو فیصد خارج کرنا ہو گا......'' میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں اس حوالے سے بھی نہیں سوچ سکتا کہ [...] بی بی باورچی خانے میں کام کاج میں مصروف تھی اور کسی نے شرارت سے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی اور پھر اتفاق سے اس کے کپڑوں میں آگ بھڑک اٹھی کیونکہ اس تھیوری میں بہت سے نقائص ہیں۔ نمبر ایک...... آج کل جس شدت کی گرمی پڑ رہی ہے، اس میں باورچی خانے کا دروازہ بند کر کے کام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نمبر دو...... اگر فردوس کپڑوں میں آگ بھڑکنے سے جل مری ہوتی تو موت کے منہ میں جانے سے پہلے وہ چیخ چلا کر خود کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ کیا تم لوگوں نے فردوس کی ایسی کوئی پکار یا فریاد سنی؟''

اس کے چہرے پر تعجب کا ایک رنگ آ کر گزر گیا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب...... ایسا تو کچھ نہیں ہوا تھا......''

''تو پھر ایک ہی امکان باقی رہ جاتا ہے......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وہ کیا......؟'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تکنے لگا۔

''فردوس کو پہلے قتل کیا گیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پھر باورچی خانے میں پھینک کر اسے سپردِ آگ کیا گیا اور جب آگ نے پوری طرح اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تو باورچی خانے کو باہر سے بند کر دیا گیا......''

''لل...... لیکن......'' وہ بے حد حیرت سے بولا۔ ''ایسا کس نے...... کیا ہو گا......؟''

''فردوس کے قاتل نے!'' میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔

''قاتل...... کون......؟''

''میں نہیں جانتا مگر مجھے اسی کی تلاش ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''فرید بخش! کیا تم قاتل کے بارے میں جانتے ہو؟''

''نن...... نہیں...... جناب!'' وہ شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل نہیں سرکار......!'' بات

ختم کرتے ہی وہ اس راستے کی جانب دیکھنے لگا جو اس محلے کی طرف آتا تھا۔
میں نے فرید بخش کی نگاہ کا تعاقب کیا اور مذکورہ کچے راستے پر مجھے ایک تانگا اپنی طرف آتا نظر آیا۔ میں نے فرید بخش سے استفسار کیا۔
"کیا کوئی خاص بات ہے؟"
"مجھے لگتا ہے، یعقوب اور سلطانہ واپس آگئے ہیں۔" اس نے بتایا۔
"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" میں نے گہری سانس خارج کی۔ "مجھے بھی انہی کا انتظار تھا۔"
"تو پھر میں جاؤں سرکار۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں کافی دیر سے گھر سے نکلا ہوا ہوں......"
"جاؤ......" میں نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن کہیں ادھر ادھر نہیں ہو جانا۔ آج کا دن تم محلے سے باہر قدم نہیں نکالو گے۔ مجھے کسی وقت بھی تمہاری ضرورت پیش آسکتی ہے۔"
"جو آپ کا حکم سرکار......!" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔
محلے والوں کا اندازہ درست تھا کہ یعقوب اپنی والدہ سلطانہ کو جوڑوں کے ایک ڈاکٹر کو دکھانے شہر لے گیا تھا۔ سلطانہ کی عمر پچاس سے متجاوز تھی اور وہ جوڑوں کے دائمی مرض میں مبتلا تھی۔ وہ شکل سے ایک تیز طرار اور چلتا پرزہ قسم کی عورت نظر آتی تھی۔ یعقوب کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس کے اریب قریب قائم کیا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور پستہ قامت شخص تھا۔ اس کے سر کے بال اڑنا شروع ہو چکے تھے۔
میں دوبارہ جائے وقوعہ پر آ گیا تھا۔ اب متوفی فردوس کے سوختہ بدن سے سڑاند کے بھبکے نہیں اٹھ رہے تھے لہٰذا میں شہتوت کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر موقع کی کارروائی کو آگے بڑھانے لگا۔
سلطانہ اور یعقوب کو اس سانحے کی خبر ہوئی تو گویا ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سلطانہ نے تو اس واقعے کے بارے میں سنتے ہی واویلا شروع کر دیا تھا۔ یعقوب کی حالت بھی خراب ہو رہی تھی تاہم اس نے خود کو بڑی مضبوطی سے سنبھال رکھا تھا۔ سلطانہ نے تو باقاعدہ رونا بھی شروع کر دیا تھا۔
اسی وقت حوالدار مولا بخش میرے پاس آیا اور کہا۔ "ملک صاحب! میں نے اس تانگے والے کو روک رکھا ہے جو ان ماں بیٹے کو لے کر شہر سے یہاں پہنچا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اسی تانگے میں فردوس بی بی کی لاش کو سرکاری اسپتال لے جاتا ہوں۔"
"نیکی اور...... پوچھ پوچھ۔" میں نے اجازت دینے والے انداز میں کہا۔ "تم لاش کو لے کر فوراً اسپتال کی طرف روانہ ہو جاؤ۔"
یعقوب بھی میرے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ میں متوفی فردوس کی سوختہ لاش کو سرکاری اسپتال بھجوا رہا ہوں تو وہ جلدی سے بولا۔
"جناب! آپ میری بیوی کی لاش کو اسپتال کیوں بھیج رہے ہیں؟"
"پوسٹ مارٹم کے لیے......!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
"خدا کا خوف کریں سرکار۔" وہ خفگی بھرے انداز میں بولا۔ "اب اس بے چاری کے بدن میں بچا ہی کیا ہے جس کی چیر پھاڑ کریں گے......؟"
"پوسٹ مارٹم کا معاملہ مردے کی چیر پھاڑ تک محدود نہیں ہوتا یعقوب۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بدن کی ہڈیاں بھی بہ زبان میڈیکل بہت سی ان کہی ان سنی کہانیاں بیان کرتی ہیں......"
شاید وہ میری بات کی تہ تک نہ پہنچ سکا، جلدی سے بولا۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟"
"مطلب یہ کہ......" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بیوی کو کوئی اتفاقی حادثہ پیش نہیں آیا۔ میری ابتدائی تحقیق کے مطابق، فردوس بی بی کو باقاعدہ قتل کیا گیا ہے۔ اس کی ہڈیوں کا تجزیہ اس راز کو کھول دے گا کہ فردوس کی موت کس نوعیت کی صورت حال میں واقع ہوئی ہے۔"
اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟"
"میں سچ کہہ رہا ہوں یعقوب۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "تمہاری بیوی کو باقاعدہ قتل کیا گیا ہے۔"
"اسے کون قتل کرے گا......؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔
"کوئی بھی۔" میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اور وہ "کوئی" تم بھی ہو سکتے ہو یعقوب......!"
"کک...... کیا......" وہ اچھل پڑا۔
میں نے اس کی حیرتوں پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ متوفی فردوس بی بی کی سوختہ لاش کو حوالدار مولا بخش کی نگرانی میں پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔ ان ماں بیٹے نے میری اس کارروائی پر واویلا تو بہت مچایا لیکن کارروائی





کے دوران میں، میں نے ان کی کسی بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ پھر لاش کو وہاں سے روانہ کرنے کے بعد ان ماں بیٹے کی جانب متوجہ ہو گیا۔
ان کے ابتدائی بیان سے مجھے پتا چلا کہ وہ دونوں آج صبح لگ بھگ سات بجے گھر سے نکلے تھے اور فردوس بی بی کو بالکل ٹھیک ٹھاک گھر میں چھوڑ کر وہ شہر کی طرف گئے تھے اور یہ کہ انہیں فردوس کو پیش آنے والے اس افسوس ناک واقعے کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا۔
یہ بیان چونکہ میرے لیے تسلی بخش نہیں تھا لہٰذا میں نے انہیں الگ الگ تنہائی میں گھیرنے کا فیصلہ کر لیا اور یعقوب کو وہاں سے جانے کا کہہ کر خود سلطانہ کو لے کر بیٹھ گیا۔ شہتوت کے پیڑ کے نیچے اتنی چھاؤں تھی کہ ہم بہ سہولت وہاں بیٹھ کر بات چیت کر سکتے تھے۔
میں نے اخلاقی طور پر، پہلے تو سلطانہ سے اس اندوہناک واقعے کے حوالے سے دلی ہمدردی اور گہرے رنج و غم کا اظہار کیا پھر سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔
"سلطانہ! مجھے پتا چلا ہے، تم نے اپنے گھر کی بیٹھک کسی کو کرائے پر دے رکھی ہے؟"
"جی تھانے دار صاحب۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اس بندے کا نام ماسٹر جمشید ہے جی...... وہ ہمارے محلے کے اسکول میں بچوں کو پڑھاتا ہے جناب۔"
"پچھلے دو سال سے تمہارا بیٹا یعقوب ملک سے باہر روزی کمانے گیا ہوا تھا۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "جوان بہو کا ساتھ تھا۔ تمہیں یعقوب کی عدم موجودگی میں کسی نامحرم مرد کو اپنے گھر کے اندر جگہ نہیں دینا چاہیے تھی......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معنی خیز لہجے میں اضافہ کیا۔ "سلطانہ! تم میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہو......؟"
"جی، میں آپ کی بات تو سمجھ رہی ہوں تھانے دار صاحب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "لیکن ماسٹر جمشید بہت ہی شریف اور باکردار بندہ ہے جناب۔ میں نے ایسے ہی اس پر بھروسا نہیں کر لیا جناب۔ وہ پچھلے ایک سال سے ہمارے گھر کی بیٹھک میں رہ رہا ہے لیکن مجال ہے سلطانہ بڑے... کبھی کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔"
سلطانہ بڑے اعتماد کے ساتھ جو کچھ بیان کر رہی تھی وہ اس کے برعکس تھا جو فرید بخش کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا۔ یا تو سلطانہ انتہائی بے وقوف اور احمق قسم کی عورت تھی یا پھر وہ جان بوجھ کر کسی خاص مقصد کے تحت، فردوس اور ماسٹر جمشید والے معاملے پر پردہ ڈال رہی تھی۔ تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ فرید بخش ہی نے مجھ سے غلط بیانی کی ہو۔
"میں پچھلے دو، ڈھائی گھنٹے سے یہاں تمہارے گھر میں موجود ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "پورا محلہ یہاں آکر صورت حال کا جائزہ لے چکا ہے لیکن ماسٹر ابھی تک غائب ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ اتنے بڑے واقعے کے بعد وہ اسکول میں خاموش کیوں بیٹھا ہوا ہے......؟"
"جی ضرور بتا سکتی ہوں۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولی۔ فردوس والے واقعے نے اگرچہ اسے رنجیدہ اور ملول کر رکھا تھا مگر اس کی فطری تیزی اور طراری اپنی جگہ برقرار تھی۔ "وہ بے چارہ اس وقت اسکول میں ہو گا تو یہاں آئے گا نا......!"
"کیا مطلب ہے......؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"مطلب یہ جی کہ وہ پچھلی رات کو ہی اپنے پنڈ روانہ ہو گیا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "ماسٹر جمشید موضع رسول پور کا رہنے والا ہے جناب جو یہاں سے چودہ پندرہ میل شمال میں واقع ہے۔"
میں نے موضع رسول پور دیکھ رکھا تھا۔ سلطانہ نے فاصلے کے حوالے سے جو بتایا تھا وہ بالکل درست تھا۔ میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔
"سلطانہ! آج ہفتہ ہے۔ اسکول کی چھٹی صرف اتوار کو ہوتی ہے پھر وہ جمعہ ہی کو کیسے اپنے گاؤں چلا گیا۔ کیا کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی......؟"
وہ اپنے ہاتھوں کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔ "کوئی ایمرجنسی نہیں تھانے دار صاحب۔ وہ تو ہر مہینے دو دن کے لیے اپنے گھر والوں سے ملنے جاتا ہے۔ کبھی جمعہ کی رات کو اور کبھی ہفتہ کی رات کو۔ جب اسے ہفتہ کی چھٹی کرنا ہوتی ہے تو جمعہ کی رات کو نکل جاتا ہے اور جب ہفتہ کی رات کو جاتا ہے تو پھر وہ سوموار کی چھٹی ضرور کرتا ہے......" وہ لمحے بھر کے لیے رکی پھر ایک بوجھل سانس خارج کرنے کے بعد بتایا۔
"اب وہ سوموار کی صبح سیدھا اسکول پہنچے گا اور اسکول کی چھٹی کے بعد وہ یہاں آئے گا۔"
"میں ماسٹر جمشید کا کمرا یعنی تمہارے گھر کی بیٹھک

دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے سپاٹ انداز میں کہا۔

''آئیں میرے ساتھ۔'' وہ بے ساختہ بولی۔ ''ماسٹر اپنے گاؤں جانے سے پہلے بیٹھک کو تالا لگا کر چابی مجھے دے جاتا ہے۔''

چند لمحات کے بعد میں سلطانہ کی معیت میں اس گھر کی بیٹھک کے درمیان کھڑا تھا۔ وہ بیٹھک اپنی سیٹنگ کے اعتبار سے کسی چھڑے چھانٹ شخص کے کمرے کا نمونہ پیش نہیں کرتی تھی بلکہ وہاں کے سامان، غرض ہر چھوٹی بڑی شے سے سلیقہ جھلکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، کسی عورت کے ہاتھوں نے اس بیٹھک کا خاص طور پر خیال رکھا ہو اور...... اس گھر میں صرف دو ہی عورتیں تھیں۔ ایک سلطانہ اور دوسری متوفی فردوس بی بی!

مزید پوچھ گچھ کے لیے میں اسی بیٹھک میں بیٹھ گیا اور سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''سلطانہ! اب میں تم سے انتہائی نازک سوال کرنے والا ہوں۔ مجھے امید ہے، تم میرے سوال کا سیدھا اور سچا جواب دو گی......؟''

وہ زبان سے کچھ نہیں بولی تاہم منتظر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

''سلطانہ! کیا ماسٹر جمشید راتوں کو چھپ چھپ کر تمہاری بہو فردوس سے ملاقاتیں کیا کرتا تھا؟''

اس نے کچھ ایسے انداز میں چونک کر مجھے دیکھا جیسے اس سوال پر اس کے ذہن میں کوئی خاص الخاص خیال پیدا ہوا ہو۔ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے پوچھا۔

''آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے......؟''

''اس معاملے پر بعد میں بحث کی جا سکتی ہے کہ میری معلومات کا ذریعہ کیا ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''تمہارے چونکنے کا انداز مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کر رہا ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے...... ہیں نا؟''

وہ بڑی تیزی سے سنبھلتے ہوئے بولی۔ ''نن...... نہیں جی...... ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ نے جو بھی سنا ہے وہ بالکل جھوٹ ہے۔''

''وہ جھوٹ نہیں ہو سکتا سلطانہ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میری اطلاعات بالکل پکی اور لوہے توڑ ہیں......!''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، اضطراری لہجے میں بولی۔ ''آپ کو...... یقیناً...... فرید نے کچھ الٹا سیدھا...... بتایا ہوگا......؟''

''میں نے کسی کا نام نہیں لیا۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''پھر تمہارا دھیان اپنے پڑوسی فرید بخش کی طرف کیوں گیا؟''

سلطانہ کے ردعمل نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا۔ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے جب اسے گھورا تو وہ گڑبڑاتے ہوئے انداز میں بولی۔

''وہ اس لیے کہ...... اس قسم کی بکواس...... فرید کے سوا...... اور کوئی کر نہیں سکتا...... وہ بہت ہی بدذات اور کمینہ آدمی ہے جی......''

''فرید بخش کی تم سے یا تمہاری بہو سے کیا دشمنی ہو گئی ہے؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ''وہ تمہارا پڑوسی ہے اور تمہارے بیٹے یعقوب سے بھی اس کے اچھے تعلقات ہیں......؟''

''وہ نامراد اچھے تعلقات کا ڈھنڈورا ابھی پیٹتا ہے اور پیٹھ پیچھے چھرا بھی گھونپتا ہے۔'' وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''ابھی چند دن پہلے پتا ہے، اس فتنہ پرور آدمی نے کیا کیا ہے......؟''

''مجھے بالکل نہیں پتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ بتانے لگی۔ ''اس نے یعقوب کے آتے ہی سب سے پہلے تو اس کے کان بھرے۔ فردوس اور ماسٹر کے تعلقات کے حوالے سے ایسی شرم ناک باتیں کیں کہ ہمارے گھر میں ایک فساد اٹھ کھڑا ہوا ہے......''

''کیسا فساد سلطانہ......؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''اس شیطان نے فردوس کے کردار کے حوالے سے یعقوب کے دماغ میں بہت سارا زہر بھر دیا ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''روز رات کو دونوں میاں بیوی کے درمیان خوب لڑائی ہوا کرتی تھی۔ میں پچھلے دو تین روز سے یہی تماشا دیکھ رہی ہوں۔''

گویا...... فرید بخش نے مجھے متوفی فردوس اور اس کے شوہر یعقوب کے لڑائی جھگڑے کے بارے میں جو بتایا تھا وہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ اب میرے لیے یہ انتہائی ضروری ہو گیا تھا کہ آیا فرید بخش نے سلطانہ کے کہنے کے مطابق، فردوس اور ماسٹر جمشید کے تعلقات کے حوالے سے محض یعقوب کے کان بھرے تھے یا اس واقعے میں کوئی حقیقت تھی اور اس سلسلے میں سلطانہ بھی میری مدد کر سکتی تھی۔

''تم جو کچھ بتا رہی ہو اگر میں اس کو سچ مان بھی لوں تو





پھر میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ فرید تمہاری بہو سے ایسی دشمنی کیوں کر رہا تھا......؟''

اگر سلطانہ اس سوال کا ٹھیک طرح سے جواب دے دیتی تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا۔ ایک طرف مجھے ماسٹر اور فردوس کے تعلقات کی حقیقت کا علم ہو جاتا اور دوسری جانب فرید بخش کا جھوٹ بھی کھل جاتا کہ اس نے یعقوب کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں منتظر نگاہ سے سلطانہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے تھوک نگل کر اپنے حلق کو تر کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تھانے دار صاحب...... جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، یہ فرید بہت ہی کمینہ اور بدذات ہے۔ اب جب فردوس موت کے منہ میں جا چکی ہے اور آپ اس کی موت کے بارے میں تفتیش کر رہے ہیں تو میں آپ کو سچ اور جھوٹ کی پہچان کرنے کا ضرور موقع دوں گی......''

''وہی تو میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔'' وہ لمحے بھر کے لیے تھمی تو میں نے کہا۔ ''میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ جب فردوس اور ماسٹر جمشید کے درمیان کوئی قابل اعتراض تعلق نہیں تھا تو پھر فرید بخش کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے کا سبب کیا ہو سکتا ہے......؟''

''یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھانے دار جی۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''جب سے فردوس نے اس کی بے عزتی کی تھی، وہ بڑی تکلیف میں مبتلا تھا اور ڈسنے کا موقع تلاش کر رہا تھا، پھر جیسے ہی یعقوب عراق سے واپس آیا، اسے وار کرنے کا موقع مل گیا۔''

سلطانہ کی باتیں سنسنی خیز ہونے کے ساتھ انکشاف انگیز بھی تھیں۔ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''فردوس نے فرید بخش کی بے عزتی کیوں کی تھی۔ وہ تو فردوس کو اپنی بہن سمجھتا تھا۔''

''یہی تو اس کی منافقت ہے جی۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''وہ فردوس کو بہن اور یعقوب کو بھائی کہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یعقوب کی غیر موجودگی میں فردوس پر بری نگاہ بھی ڈالتا تھا......''

''کیا مطلب سلطانہ؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ فرید بخش میری بہو فردوس کو میلی نظر سے دیکھتا تھا۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''پہلے پہل تو وہ آتے جاتے فردوس پر چھچھورے جملے کستا رہتا تھا۔

## اشتہار

☆ایک عورت جس کی عمر 75 سال تھی اس نے ضرورت رشتہ کا نیٹ پر اشتہار دیا۔ ایک طرف سے جواب آیا جس پر درج تھا۔

''محترمہ شاید آپ ''ف'' لکھنا بھول گئی ہیں، آپ کو ضرورت رشتہ نہیں ضرورت فرشتہ کی ضرورت ہے۔''

## سرداریاں

پولیو کی دوا پلانے والا سردار کے گھر آ گیا اور دروازے پر دستک دی۔ سردار باہر آیا اور بولا۔ ''جی فرمایئے'' پولیو والے نے کہا۔ ''میں بچوں کو پولیو کی دوائی پلانے آیا ہوں۔''

سردار نے اندر جھانک کر بیوی سے کہا۔ ''جانو، بندوق اور کارتوس باہر لے آؤ۔''

پولیو والے نے جیسے ہی یہ سنا تو فوراً بھاگنے لگا۔ سردار نے کہا۔ ''ابے کدھر بھاگ رہا ہے، بندوق میری بیٹی اور کارتوس میرے بیٹے کا نام ہے؟''

☆☆☆

دو لال بیگ آئی سی یو میں ایڈمٹ ہو گئے۔
پہلا۔ ''تو یہاں کیسے آیا؟''
دوسرا۔ ''ارے یار یہ پاگل لڑکیاں مجھے دیکھ کر اتنا چلاتی ہیں کہ ہارٹ اٹیک ہو گیا۔''

حسیب احمد چنائے کی شرارت، الگڈی کرک

☆☆☆

ایک لڑکے نے اپنے باپ کو خط لکھا کہ میں اب اردو میں بہت ''کابل'' ہو گیا ہوں۔

باپ نے جواب میں لکھا۔ ''بیٹا کابل سے واپسی کے بعد مجھے دوسرا خط لکھ دینا۔''

مرسلہ: محمد کامران، چھچھ

فردوس نے مجھے اس کی حرکتوں کے بارے میں بتایا تو مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے فرید سے پوچھا تو وہ صاف مکر گیا۔ اس کے جواب نے مجھے اور غصہ دلایا اور میں نے فردوس کو اجازت دے دی کہ اب اگر وہ کوئی حرکت کرے تو فردوس اسے کھری کھری سنا ڈالے۔ چند روز بعد ہی ایک افسوس ناک واقعہ پیش آگیا......"

یہاں تک بتانے کے بعد وہ متوقف ہوئی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "ایسا کیا ہوگیا تھا سلطانہ؟"

"فردوس محلے کے مین بازار سے گزر رہی تھی کہ فرید بخش نے اسے ایک جگہ روک لیا اور الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔" سلطانہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے بتایا۔ "اس وقت بازار میں اور بھی لوگ موجود تھے۔ فرید نے جیسے ہی بکواس شروع کی، فردوس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، گھما کر ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کردیا اور اس کے ساتھ ہی فرید کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فردوس کی طرف سے اس نوعیت کے ردعمل کا مظاہرہ دیکھنے کو ملے گا۔ وہ اپنے منہ پر سے فردوس کے تھوک کو صاف کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا فردوس......!"

"تم تو اس سے بھی زیادہ برے سلوک کے قابل ہو۔" فردوس نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا۔

فرید نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم نے جو بھی کیا ہے، میں اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔ تمہیں بھی مزہ نہ چکھایا تو میرا نام فرید نہیں......"

"کیا کرلو گے تم......؟" فردوس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

"بہت جلد...... تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا......!"

یہ کہہ کر وہ ایک طرف چلا گیا تھا۔

"یہ کتنا عرصہ پہلے کا واقعہ ہے؟" سلطانہ کے خاموش ہوتے ہی میں نے پوچھا۔

"کوئی دو مہینے ہوئے ہیں اس بات کو......" اس نے جواب دیا۔

"ہوں......" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو اس کا مطلب ہے کہ فرید کی لگائی ہوئی آگ کی وجہ ہی سے میاں بیوی میں جھگڑا رہنے لگا تھا؟"

فرید کے مطابق، اس نے یعقوب کو فردوس اور ماسٹر جمشید کے تعلقات کے حوالے سے کچھ نہیں بتایا تھا جبکہ سلطانہ کا بیان اس کے برعکس تھا اور یہ بھی طے تھا کہ دونوں میں کوئی ایک ہی سچا ہوسکتا تھا۔

"تھانے دار جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ میرے سوال کے جواب میں سر کو تائیدی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "یعقوب تو یہ سنتے ہی غصے میں لال پیلا ہوگیا تھا۔ پہلے دو دن تک تو میاں بیوی میں خفیہ ہی خفیہ نوک جھوک چلتی رہی پھر پچھلی رات گرماگرمی بہت زیادہ بڑھ گئی تو مجبوراً مجھے مداخلت کرنا پڑی۔ رات کو چونکہ ماسٹر جمشید گھر اِدھر نہیں تھا اس لیے یعقوب کھل کھلا کر بول رہا تھا......"

موقع محل دیکھتے ہوئے میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ "سلطانہ! مجھے پتا چلا ہے کہ پچھلی رات میاں بیوی میں جھگڑا اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ غصے میں آکر یعقوب نے فردوس کو طلاق کی دھمکی بھی دے دی تھی......؟"

میرا تیر نشانے پر لگا، وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی۔ "یعقوب اس وقت بہت طیش میں تھا مگر میں نے سمجھا بجھا کر اس کا غصہ ٹھنڈا کردیا تھا......"

گویا سلطانہ نے میرے استفسار کی تصدیق کردی تھی۔ میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد سلطانہ کو فارغ کردیا اور اس کے بیٹے یعقوب کو بیٹھک میں بلالیا۔ ابتدائی سوالات کے ذریعے میں نے سلطانہ کے بیان کی تصدیق کرلی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا یہ بات تم فرید بخش کے سامنے بھی کہہ سکتے ہو کہ اسی نے تمہیں فردوس اور جمشید کے تعلقات کے بارے میں بتایا تھا؟"

"جی ہاں، کیوں نہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ایک بار نہیں، سو بار کہہ سکتا ہوں۔"

"تم آج صبح جب اپنی ماں کو لے کر شہر کی جانب روانہ ہوئے تھے تو گھر میں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا جناب۔" وہ بڑے رسان سے بولا۔

"اور پچھلی رات......؟" میں نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"جی......!" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ "پچھلی رات...... کیا جی؟"

"جب پچھلی رات تم دونوں میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہورہا تھا تو تم نے فردوس کو قتل کی دھمکی بھی دی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟" میں نے دانستہ "طلاق" کے بجائے "قتل" کا لفظ استعمال کیا تھا۔







وہ میرے داؤ میں آگیا اور جلدی میں ایک اہم بات کو تسلیم کرلیا۔

"جناب! اس وقت میں بہت غصے میں تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "فرید کی باتوں نے میرا دماغ گرم کردیا تھا اور جب میں نے اس سلسلے میں فردوس کو کریدا تو اس نے مجھے تسلی بخش جواب نہیں دیا بلکہ میرے سوالات کے جواب میں جب اس نے چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا تو مجھے بھی طیش آگیا اور میں نے اسی طیش کے عالم میں اسے جان سے مارنے کی دھمکی دے ڈالی تھی لیکن......" وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بولا۔

"لیکن اماں نے بیچ بچاؤ کرکے میری غلط فہمی دور کردی تھی۔ اماں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں جیسا کہ میں سوچ رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ فردوس کا کردار بے داغ ہے اس لیے میں ماسٹر جمشید کے حوالے سے اس کی ذات پر کوئی شک نہ کروں۔"

"اماں نے سمجھایا اور تم سمجھ گئے......" میں نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ "کیا یہ اتنا ہی آسان ثابت ہوا تھا؟"

"جی ہاں۔ میں اماں کی بات کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔"

"لیکن برخوردار......!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "بیوی کا معاملہ بڑا عجیب و غریب ہوتا ہے۔ اس کے کردار کے حوالے سے پیدا ہونے والا شک یا غلط فہمی اتنی آسانی سے دور نہیں ہوا کرتا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے کہا۔ "یعقوب! تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا......"

"میں...... تھانے چلوں......" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

"جناب! میری بیوی جل کر مرگئی۔" وہ احتجاجی انداز میں بولا۔ "اور آپ مجھی کو تھانے لے جانے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ تو سراسر ظلم ہے......"

"ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو یعقوب!" میں نے اس کے احتجاج کو نظرانداز کرتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

وہ ہکا بکا نظر سے مجھے تکنے لگا۔ "کون سی بات جی......؟"

"یہ بات کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "......کہ تمہاری بیوی کی موت جلنے سے واقع نہیں ہوئی......!"

"تت...... تو...... پھر......؟" وہ ہکلایا۔

میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ "فردوس بی بی کو باقاعدہ قتل کیا گیا ہے...... اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد آگ کے سپرد کیا گیا ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ فردوس کی موت کے راز کو منکشف کردے گی...... بہت جلد!"

"تو...... آپ یہ سمجھ...... رہے ہیں کہ...... فردوس کی موت کا ذمے دار...... میں ہوں......؟" وہ ہراساں نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"میں ایسا سوچنے میں حق بجانب ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیونکہ گزشتہ رات تم اسے جان سے مارنے کی دھمکی دے چکے ہو......!"

"وہ تو وقتی اشتعال تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں آپ کو پورا واقعہ سنا چکا ہوں۔ اماں نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا اور......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اور صبح جب میں اور اماں شہر کی طرف گئے ہیں تو فردوس بھلی چنگی گھر میں موجود تھی۔ ہم اسے جیتا جاگتا گھر میں چھوڑ کر گئے ہیں اور جب واپس آئے ہیں تو سب کچھ ختم ہوچکا تھا لہٰذا یہ سمجھنا کہ فردوس کو میں نے یا اماں نے موت کے گھاٹ اتارا ہوگا، بالکل غلط ہے جناب...... اور ویسے بھی وہ جل کر مری ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے، اس نے خودکشی کرلی ہو۔"

"فردوس کی موت کو قاتل نے رنگ تو ایسا ہی دیا ہے کہ وہ خودکشی کا واقعہ نظر آئے۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "لیکن میں اس حقیقت کی تہ تک پہنچ چکا ہوں کہ تمہاری بیوی کو قاتل نے پہلے کسی بھی طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا ہے اور اس کے بعد آگ بھڑکا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس نے خود کو جلا کر جان دی ہے......"

پھر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں یعقوب کو ان تیکنیکی امور سے آگاہ کیا جو اس بات کا بین ثبوت تھے کہ فردوس کی موت خودکشی یا آتش زدگی کا شاخسانہ نہیں بلکہ سوچی سمجھی قتل کی واردات تھی۔ آخر میں، میں نے کہا۔

"یعقوب! دیکھ لینا، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں نا، پوسٹ مارٹم رپورٹ چیخ چیخ کر اس کی تصدیق کرے گی۔"

"لل...... لیکن جناب......" وہ بے حد الجھے ہوئے

انداز میں بولا۔ ”فردوس کو کون قتل کرسکتا ہے؟“

”یہی جاننے کے لیے تو میں تمہیں اور فرید بخش کو اپنے ساتھ تھانے لے جارہا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوسکے۔“

پھر میں نے اپنے ان خیالات کو عملی جامہ پہنادیا جن کا یعقوب کے سامنے اظہار کیا تھا۔ اس موقع پر سلطانہ نے بہت واویلا مچایا اور یہاں تک بھی کہہ دیا کہ پولیس کی جانب سے ان لوگوں کے ساتھ زیادتی ہورہی ہے لیکن میں نے اس کی کسی بھی مزاحمت اور احتجاج کی قطعاً کوئی پروانہ کی اور فرید بخش کے ساتھ ہی یعقوب کو بھی تھانے پہنچادیا۔

اسی تمام تر کارروائی سے نمٹتے ہوئے دوپہر ہوگئی تھی۔ میں نے اطمینان سے دن کا کھانا کھایا اور ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد دوبارہ اپنے کمرے میں آبیٹھا، پھر میں نے اے ایس آئی شکور کو اپنے کمرے میں بلالیا۔

شکور کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ وہ سانولی رنگت کا مالک ایک دراز قامت اور سخت گیر پولیس والا تھا۔ اس نے کمرے میں آکر مجھے سیلیوٹ کیا اور میرے اشارے پر ایک کرسی سنبھال لی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔

”شکور! تم ابھی موضع رسول پور روانہ ہوجاؤ۔ چاہو تو اپنے ساتھ ایک آدھ کانسٹیبل بھی لے جاؤ۔ تمہیں آج ہی ماسٹر جمشید کو لے کر واپس آنا ہے...... رات ہوجائے یا...... اس سے بھی زیادہ دیر ہوجائے۔ کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ماسٹر مجھے تھانے میں چاہیے۔“

”آپ بے فکر ہوجائیں ملک صاحب۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں بولا۔ ”آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی جناب......!“

”اور ہاں......“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ماسٹر کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ یہاں کیا حالات پیش آچکے ہیں۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ شکور نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”اگر وہ پوچھے کہ اسے یوں ایمرجنسی میں واپس کیوں بلایا جارہا ہے تو کیا جواب دوں؟“

”کوئی بھی بہانہ کردینا......!“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”تم اس سے کہہ سکتے ہو کہ اسکول میں آگ لگ گئی ہے۔ وہاں ریکارڈ کی بہت سی چیزیں رکھی ہوئی تھیں، ان میں سے بیشتر جل کر خاک ہوگئی ہیں اس لیے اسے فوراً بلایا جارہا ہے۔ یہاں کے تمام ماسٹرز تو موجود ہیں، بس اس کی ضرورت ہے تاکہ اسکول کے اہم کاغذات کو سنبھالا جاسکے۔“

”ہاں...... یہ بہانہ بہت ہی معقول ہے۔“ اے ایس آئی نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

میں نے اسے مزید چند ہدایات دیں اور نیک خواہشات کے سائے میں رسول پور کی جانب روانہ کردیا۔ شکور کے جانے کے بعد میں نے فرید بخش کو اپنے پاس بلالیا۔ اسے لے کر آنے والا کانسٹیبل جب واپس جانے لگا تو میں نے اسے اشارے سے روک لیا۔ وہ فرید کے عقب میں تن کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ کانسٹیبل نے میرا اشارہ کماحقہ، سمجھ لیا تھا۔

فرید کی حالت خاصی خراب ہورہی تھی۔ میں نے تھانے پہنچاتے ہی اسے دو ہٹے کٹے کانسٹیبلو کے حوالے کردیا تھا، اس ہدایت کے ساتھ کہ...... یہ کافی دنوں سے بھوکا ہے لہٰذا اس کی خاطر تواضع کی جائے۔ چنانچہ ان اہلکاروں نے فرید کی خوب ”آؤ بھگت“ کی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ پھر منت ریز لہجے میں بولا۔

”سرکار...... ان لوگوں نے مجھے بہت مارا ہے۔“

”اوئے کھوتے دے کھر......!“ میں نے اسے جھڑکا۔ ”انہوں نے تو تمہیں دال روٹی کھلا کر ”مہمان داری“ کا ایک چھوٹا سا نمونہ دکھایا ہے۔ میں تمہیں جو مرغ پلاؤ کھلانے والا ہوں نا...... اس کا ذائقہ تمہارے حلق میں اٹک کر رہ جائے گا......“

وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ ”مجھے معاف کردیں جناب۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“

”تم نے جرم نہیں بلکہ جرائم کیے ہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”لہٰذا یہ خیال تو ذہن سے جھٹک دو کہ میں تمہیں یہاں سے جانے دوں گا......“

وہ رونے والے انداز میں منت سماجت کرنے لگا۔ میں نے اس کے پیچھے کھڑے سپاہی کو اشارہ کیا۔ کانسٹیبل نے فرید کی پنڈلی پر ایک ٹھڈا رسید کیا اور خاصے جارحانہ انداز میں کہا۔

”اوئے لکڑی کے باندر...... سیدھا کھڑا ہوجا۔ ملک صاحب جو پوچھیں اس کا سیدھا اور سچا جواب دینا ورنہ چمڑی ادھیڑ کر رکھ دوں گا......!“

فرید وحشت زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔





”کیا یہ بات درست ہے کہ دوماہ پہلے محلے کے مین بازار میں [illegible] فردوس بی بی نے تمہارے منہ پر ایک زناٹے دار طمانچہ مارنے کے بعد نفرت سے تھوک دیا تھا؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، وہ انکار کرنے جارہا ہے۔ میں نے جلدی سے ٹوک کر کہا۔

”سوچ سمجھ کر جواب دینا فرید بخش...... اگر تم نے غلط بیانی سے کام لیا تو یہاں سے اپنے قدموں پر چل کر نہیں جاسکو گے اور ہوسکتا ہے...... چار کندھوں پر اٹھ کر سیدھے قبرستان کا رخ کرو......؟“

اس کی آنکھوں میں سراسیمگی پھیل گئی، قدرے کم زور آواز میں بولا۔ ”وہ جناب...... اس میں میرا کوئی قصور نہیں...... فردوس خوامخواہ غصہ کھاگئی تھی۔“

”اسے کس بات پر غصہ آیا تھا۔“ میں نے استفسار کیا۔ ”تم نے کچھ تو ایسا ویسا ضرور کہا ہوگا......؟“

”کچھ نہیں سرکار......“ وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اس سے اپنے دل کی بات کہی تھی......“

”ایسی کون سی بات تھی؟“ میں نے کھا جانے والی نظر سے اسے گھورا۔ ”ذرا میں بھی تو سنوں......“

”جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ......“ وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ”فردوس مجھے بہت اچھی لگتی تھی، میں چپکے چپکے اسے چاہنے لگا تھا۔“

”اوئے چاہت کے گھوڑے!“ میں نے ڈانٹا۔ ”تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ تم یعقوب کو اپنا دوست اور فردوس کو اپنی بہن سمجھتے ہو اور اب...... تم مجھے محبت کی کوئی کہانی سنا رہے ہو...... کیا یہی تمہاری شرافت کا بھرم ہے؟“

”جناب! میں فردوس کو ویسے تو بہن ہی سمجھتا تھا......“ وہ شرمندگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن...... دل پر مجھے اختیار نہیں تھا...... دل اس کی محبت میں مچلتا تھا۔“

”اوئے بھونڈے عاشق کی اولاد......!“ میں نے اسے دبکا مارا۔ ”جس سے محبت کی جاتی ہے، اسے بیچ بازار بدمعاشوں کی طرح روک کر فضول بکواس نہیں کی جاتی......؟“

”سرکار! میں نے تو بڑی شرافت سے بات کی تھی۔“ وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کرنے لگا۔ ”اس نے میری پوری بات نہیں سنی اور فوراً جلال میں آگئی۔ بس......“

”تم جتنے شریف اور جلیبی کی طرح سیدھے ہو نا وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم نے فردوس کا راستہ روک کر اس سے بے ہودہ مذاق کیا تھا۔ جب اس نے ڈانٹ ڈپٹ کی تو تم بڑے واہیات انداز میں اسے سینے سے لگانے کے لیے آگے بڑھے تھے۔ اسی وقت اس نے پہلے تمہیں تھپڑ رسید کیا پھر تمہارے منہ پر تھوک دیا...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”آپ میری بات کا یقین کریں سرکار......!“

اس نے کچھ کہنے کی کوشش شروع کی ہی تھی کہ کانسٹیبل نے اس کی گردن پر دوہتڑ رسید کردیا۔ یہ کانسٹیبل کی ایک پیشہ ورانہ خودکار حرکت تھی۔ میں نے کسی کارروائی کا اشارہ نہیں دیا تھا۔

فرید بخش کے حلق سے ایک اذیت ناک سسکاری خارج ہوئی۔ میں نے کانسٹیبل کو حکم دیا۔

”قادر علی! اگر یہ بدبخت جھوٹ بولنے کی کوشش کرے تو مار مار کر اس کا کچومر نکال دینا......“

فرید گڑگڑا کر معافی تلافی کے لیے فریاد کرنے لگا۔

”میں بہت شرمندہ ہوں جناب...... مجھ سے غلطی ہوگئی تھی...... آپ مجھے معاف کردیں......“

”کیا غلطی ہوگئی تھی، وضاحت کرو۔“ میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ”میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں؟“

”وہ جناب......“ وہ اٹک اٹک کر بتانے لگا۔ ”میں نے فردوس سے کہا تھا...... بتاؤ، مجھ میں کیا کمی ہے...... جب تم راتوں کو چھپ چھپ کر ماسٹر جمشید سے ملتی ہو تو میں تمہیں...... برا کیوں لگتا ہوں...... مجھ سے بھی ملا کرو...... تم مجھے اچھی لگتی ہو...... بہت پیاری لگتی ہو......!“

”اوئے کسی نیولے کی نسل......!“ میں نے غصیلی نظر سے اس کم بخت کو گھورا۔ ”ایک طرف تو تم یعقوب کو اپنا دوست اور بھائی کہتے ہو...... اور دوسری طرف اس کی گھر والی سے بدتمیزی بھی کرتے رہے ہو...... تمہیں یہ حرکت کرتے ہوئے ذرا سی بھی شرم نہیں آئی تھی؟“

”میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوگیا تھا سرکار۔“ وہ گھگیانے لگا۔ ”مجھے معاف کردیں۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔“

”آئندہ تمہیں ایسا موقع ملے گا تو غلطی کا سوال پیدا ہوگا نا......“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ پھر دھمکی بھرے انداز میں اضافہ کیا۔ ”میں تمہیں ایسا فٹ کرنے والا ہوں کہ باقی کی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے گی۔“

”رحم...... سرکار، رحم......“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔ ”بس ایک بار معاف کردیں جناب۔ میں ایک اچھا انسان بن کر رہوں گا۔“

"تم اگر اچھا انسان نہیں بھی بننا چاہو گے تو ہم تمہیں بنا دیں گے۔" میں نے اٹل انداز میں کہا۔ "ہم نے تھانے میں "بندے دا پتر" بنانے کی مشین لگا رکھی ہے جو جھوٹے سے جھوٹے انسان کو بھی سچ بولنے پر مجبور کر دیتی ہے......"

میں نے لمحاتی توقف کر کے فرید بخش کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا ایک اور سنگین جھوٹ بھی میرے سامنے آچکا ہے......!"

"کون سا جھوٹ تھانے دار صاحب؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"یہ جھوٹ کہ تم نے یعقوب کو متوفی فردوس اور ماسٹر جمشید کے تعلقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا...... میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

اپنی بات کے اختتام پر میں نے تیز نظر سے اسے گھورا تو وہ جلدی سے بولا۔ "جناب...... وہ تو...... میں نے......!"

کانسٹیبل نے اس کی تشریف پر ایک زوردار لات رسید کی۔ وہ ایک کراہ کے ساتھ، میرے سامنے رکھی چوبی میز کے ساتھ ٹکرایا تو اس کی باقاعدہ چیخ نکل گئی۔ کانسٹیبل کسی وحشی چیل کے مانند اس پر جھپٹا پھر آن واحد میں کالر سے کھینچ کر اسے سیدھا کھڑا کر دیا اور اس کے گال پر زناٹے دار طمانچہ مارتے ہوئے خونخوار انداز میں غرایا۔

"سیدھی طرح ملک ہوراں دے سوال دا جواب دے ورنہ بکرے کی طرح الٹا لٹکا کر کھال اتار دوں گا......!"

وہ سہم کر دہشت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے دہاڑ کر کہا۔ "زبان کھولتے ہو یا قادر علی کے حوالے کر دوں......؟"

"سرکار......!" وہ اضطراری انداز میں بولا۔ "فردوس نے بھرے بازار میں مجھے چانٹا مار کر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا...... میں اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا تھا اسی لیے...... اسی لیے میں نے یعقوب کو ماسٹر جمشید اور اس کے تعلقات پر کھل کر بتا دیا تھا......"

"اور جب تمہاری لگائی ہوئی آگ کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو تم نے فردوس کو موت کے گھاٹ اتار کر آتش انتقام کو ٹھنڈا کر لیا...... اور بعد میں فردوس کی لاش کو باورچی خانے میں بند کر کے آگ بھڑکا دی تاکہ یہ خودکشی کا واقعہ نظر آئے......؟"

"نہیں سرکار......" وہ تیزی سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "میں نے فردوس کو قتل نہیں کیا...... آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں......"

"تم ساری قسمیں اپنے پاس رکھو۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں تمہیں زیادہ سے زیادہ ایک دن کی مہلت دے سکتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو...... اگر تم اقبال جرم کر لو گے تو میں تمہیں کوئی نرم سزا دلوانے کی کوشش کروں گا......"

پھر میرے اشارے پر کانسٹیبل قادر علی کھینچتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ بار بار یہی دہائی دے رہا تھا۔ "میں بے گناہ ہوں...... بے قصور ہوں...... میں نے فردوس کو قتل نہیں کیا......"

فرید بخش کی منت خوشامد اور قسمیں مجھے متاثر نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کے دو تین بڑے جھوٹ میری پکڑ میں آچکے تھے لہٰذا مجھے اس کی بات کا اعتبار نہیں رہا تھا۔ جب تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نہ آجاتی اور جب تک فردوس کے قاتل کے حوالے سے مجھے اور کوئی ٹھوس سراغ مل نہ جاتا، میں فرید بخش کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

شام سے پہلے یعقوب کی ماں سلطانہ میرے پاس آئی اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کے بیٹے کو چھوڑ دوں۔ میں نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں اسے بتا دیا۔

"سلطانہ! اگر تمہارا بیٹا بے گناہ و بے قصور ہے تو سمجھو اس کا ایک بال بھی بانکا نہیں ہوگا۔ میں اپنی تسلی کرنے کے بعد اسے چھوڑ دوں گا۔"

"تھانے دار صاحب!" وہ منت ریز لہجے میں بولی۔ "یعقوب آج صبح میرے ساتھ شہر گیا تھا اور ہم آپ کے سامنے ایک ساتھ ہی واپس آئے ہیں۔ میری بات کا یقین کریں، جب ہم صبح گھر سے نکلے تو فردوس اچھی خاصی اور بھلی چنگی تھی۔ اس کی موت میں یعقوب کا ہاتھ ہو ہی نہیں سکتا......!"

"اللہ کرے، ایسا ہی ہو۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں اپنے فرض کے آگے مجبور ہوں سلطانہ۔ بغیر تفتیش کے اسے چھوڑ نہیں سکتا۔"

"آپ نے وہاں گھر میں اتنی کڑی پوچھ گچھ تو کی ہے اس سے۔" وہ شاکی لہجے میں بولی۔ "اب اور کون سی تفتیش باقی ہے؟"

"مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور اس کے ساتھ ہی ماسٹر جمشید کا بھی......!"

"ماسٹر جمشید؟" اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"ہاں...... ماسٹر جمشید!" میں نے پُرسوچ انداز میں

کہا۔ ”میں نے اسے لانے کے لیے اپنا ایک اہلکار رسول پور کی جانب روانہ کیا ہوا ہے۔ وہ رات کسی وقت بھی ماسٹر کو لے کر تھانے پہنچ سکتا ہے۔“

”لل...... لیکن...... ماسٹر جمشید کا فردوس والے واقعے سے کیا تعلق؟“ اس کی الجھن میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

میں نے گول مول جواب دیا۔ ”یہ تو اس کے آنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔“

”ماسٹر جمشید تو پچھلی رات سے پہلے ہی اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔“ وہ متذبذب انداز میں بولی۔ ”اور فردوس کی موت والا واقعہ آج صبح پیش آیا ہے۔“

”کچھ بھی ہے......“ میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ”میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اس کیس کے چار کھونٹ ہیں۔ نمبر ایک فردوس بی بی جواب اس دنیا میں باقی نہیں رہی۔ نمبر دو یعقوب، نمبر تین فرید بخش۔ یہ دونوں افراد اس وقت میری تحویل میں ہیں اور نمبر چار ماسٹر جمشید......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ چوتھا کھونٹ ماسٹر جمشید میرے ہتھے چڑھ جائے تو پھر ہی میں کوئی فیصلہ کر سکوں گا کہ ان تینوں میں سے کس نے پہلے کھونٹ یعنی فردوس بی بی کو موت کے گھاٹ اتارا ہے......!“

جب سلطانہ نے میرے رویے میں کوئی لچک نہ دیکھی تو مایوس ہو کر واپس چلی گئی۔ میرا یہ پورا دن نہایت ہی افراتفری میں گزرا تھا اور جیسا کہ میں کہانی کی ابتدا میں بتا چکا ہوں، ان دنوں میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی لہٰذا میں تھانے میں بیٹھ کر اے ایس آئی شکور کا انتظار کرنے کے بجائے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ ان لمحات میں، میں بہت زیادہ تھکاوٹ اور نقاہت محسوس کر رہا تھا۔

اگلی صبح جب میں سو کر اٹھا تو ہشاش بشاش اور چاق و چوبند تھا۔ معمولات سے فارغ ہونے کے بعد میں وردی پہن کر جب تھانے پہنچا تو پتا چلا، کوئی آدھا گھنٹا پہلے اے ایس آئی شکور رسول پور سے واپس آیا تھا۔ رسول پور نامی یہ چھوٹا سا گاؤں میرے تھانے سے لگ بھگ پندرہ میل کے فاصلے پر شمال میں واقع تھا۔ میں نے فوراً شکور کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

اس نے آ کر مجھے سیلوٹ کیا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پوچھا۔ ”شکور رسول پور کی کیا رپورٹ ہے؟“

”رپورٹ اچھی نہیں ہے ملک صاحب......!“ اس نے مایوسی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم ماسٹر جمشید کو اپنے ساتھ لے کر نہیں آئے؟“

”جناب! ماسٹر جمشید وہاں ہوتا تو میں اسے اپنے ساتھ لے کر آتا نا!“ اے ایس آئی نے جواب دیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا......!“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ تو پرسوں شام سے پہلے یہاں سے اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔ رسول پور پہنچتے ہوئے اتنی دیر تو نہیں لگتی؟“

”ملک صاحب! جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کر دی۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”میں رسول پور سے، ماسٹر کے چھوٹے بھائی اور چاچے کو اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ باقی کی تفصیل آپ ان سے پوچھ لیں۔“

میں نے فوراً مذکورہ دونوں افراد کو اپنے پاس بلا لیا۔

ماسٹر جمشید کے چھوٹے بھائی کا نام حنیف اور عمر بیس کے آس پاس تھی جبکہ ماسٹر کا چاچا باسط علی پچاس سے متجاوز نظر آتا تھا۔ ان دونوں کے بیان کے مطابق ماسٹر جمشید جمعہ کی رات رسول پور نہیں پہنچا تھا۔ حنیف نے بڑے واضح اور یقینی انداز میں مجھے بتایا کہ ماسٹر جمشید کا ان دنوں رسول پور جانے کا کوئی پروگرام بھی نہیں تھا......!

اس صورتِ حال نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا۔ سلطانہ کے بیان کے مطابق، ماسٹر جمشید جمعہ کی شام اپنے گاؤں جانے کا بتا کر اس کے گھر سے نکلا تھا اور اب اسے پیر کی دوپہر کو واپس آنا تھا۔ یعنی وہ پیر کی صبح براہ راست اسکول پہنچتا اور پھر اسکول کی چھٹی کے بعد وہ سلطانہ کے گھر آتا لیکن یہاں تو ساری کہانی ہی الٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ یا تو ماسٹر جمشید نے سلطانہ سے جھوٹ بولا تھا اور وہ رسول پور کے بجائے کسی اور طرف نکل گیا تھا اور یا پھر سلطانہ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا......!

سلطانہ کی غلط بیانی کے بارے میں سوچتے ہوئے لامحالہ ذہن ایک خطرناک زاویے پر مڑ جاتا تھا اور خود بخود یہ خیال جنم لیتا تھا کہ کہیں یعقوب نے اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ اس کے آشنا یعنی ماسٹر جمشید کو بھی تو ٹھکانے نہیں لگا دیا اور...... یہ بھی ممکن ہے، اس کام میں سلطانہ بھی اس کی شریک کار رہی ہو۔

میں نے ماسٹر جمشید کے چھوٹے بھائی اور چاچے سے تفصیلی پوچھ گچھ کی لیکن ماسٹر کی پُراسرار گمشدگی کے سلسلے میں کوئی سرا میرے ہاتھ نہ لگ سکا۔ بالآخر مایوس ہو کر میں نے انہیں فارغ کر دیا۔ وہ دونوں اس سلسلے میں بھی میری راہنمائی کرنے سے قاصر تھے کہ اگر ماسٹر جمشید رسول پور نہیں پہنچا تھا تو پھر وہ کہاں جا سکتا تھا۔ ان دونوں کے مطابق، ماسٹر کی زندگی اسکول اور رسول پور تک ہی محدود تھی۔

یہ بڑی عجیب و غریب اور الجھن زدہ صورتِ حال تھی جس میں، ابھی تک میری تفتیش کی گاڑی زیرو پوائنٹ پر کھڑی تھی۔ اب تک میں نے اس کیس سے متعلق لوگوں سے جو بھی پوچھ گچھ کی تھی اس کے نتیجے میں کوئی کارآمد بات نکل کر سامنے نہیں آئی تھی۔ اب آ جا کر مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی کا انتظار کرنا تھا۔

مذکورہ رپورٹ پیر کی صبح فردوس بی بی کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش کے ساتھ مجھے موصول ہو گئی۔ میں نے رپورٹ کو کھول کر پڑھا تو حیرتوں کا گویا ایک نیا در مجھ پر کھل گیا۔ میں نے وہ رپورٹ اوپر سے نیچے تک دو، تین مرتبہ پڑھی لیکن اس کے الفاظ اور الفاظ کے مفہوم میں سرمو فرق واقع نہ ہوا۔ میں سر پیٹ کر رہ گیا۔

پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق، متوفی فردوس بی بی کی موت جل کر نہیں بلکہ پیٹ کے کسی مرض کے سبب واقع ہوئی تھی اور یہ واقعہ چار روز پہلے کا تھا...... میرا سر چکرا کر رہ گیا۔

یہ بات ہی ایسی تھی۔ میری جگہ اور بھی کوئی ذی ہوش شخص اس رپورٹ کا مطالعہ کرتا تو اس کی بھی دماغی کیفیت وہی ہوتی جو ان لمحات میں میری تھی۔ میری معلومات اور شواہد کے مطابق، فردوس بی بی کی موت ہفتے کی صبح واقع ہوئی تھی جبکہ پوسٹ مارٹم رپورٹ اس کی موت کے لیے جمعرات کا دن مقرر کر رہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند چمکا...... میں جس سوختہ لاش کو متوفی فردوس بی بی سمجھ رہا ہوں کہیں وہ کسی اور بدنصیب کی لاش تو نہیں؟

اس سوال کے ساتھ ہی، ایک اور سوال نے بڑے خطرناک انداز میں سر ابھارا...... اگر سلطانہ کے باورچی خانے سے ملنے والی سوختہ لاش فردوس بی بی کی نہیں تو پھر فردوس بی بی کہاں ہے؟

اس سنسنی خیز سوال کا جواب اسی وقت مل سکتا تھا جب یہ پتا چل جاتا کہ جمعرات کو پیٹ کے مرض سے موت کو گلے لگانے والی عورت کون تھی اور اس نوعیت کا جواب مجھے ایک ہی جگہ سے مل سکتا تھا۔ میں نے ایک ہنگامی خیال کے تحت اے ایس آئی سے کہا۔

”شکور! فوراً ایک تانگے کا بندوبست کرو۔ ہم قبرستان جا رہے ہیں۔“

”ملک صاحب! فردوس کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش تو تھانے میں رکھی ہے۔“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کی تدفین ہماری ذمے داری تو نہیں۔“

”کیا تم قانونی ذمے داریوں اور محکمہ جاتی فرائض کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا ملک صاحب......!“

”بس تو پھر میں جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو...... فوراً!“ میں نے کہا۔

”او کے ملک صاحب!“ اس نے فرماں برداری سے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم قبرستان میں تھے۔ گورکن عنایت اللہ نے مجھے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے میرے پاس آیا اور تشویش بھرے لہجے میں، سلام کرنے کے بعد بولا۔

”خیریت تو ہے جناب...... آج صبح ہی صبح ادھر کا چکر کیسے لگ گیا؟“

میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”عنایت اللہ! میں تمہیں گرفتار کرنے آیا ہوں۔“

اس کا رنگ اڑ گیا، بے حد ہراساں لہجے میں بولا۔ ”سرکار...... مجھ سے ایسی کیا خطا ہو گئی؟“

”مجھے پتا چلا ہے، تم مردوں کا کاروبار کرتے ہو......!“

”میں کچھ سمجھا نہیں جناب؟“ وہ ہکا بکا مجھے دیکھتا چلا گیا۔

میں نے راستے میں اے ایس آئی شکور کو اپنی قبرستان آمد کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا لہٰذا اس کے ذہن میں کوئی الجھن باقی نہیں تھی۔ اس نے کڑک دار آواز میں عنایت اللہ سے کہا۔

”تم سب سمجھ جاؤ گے جب تھانے میں لے جا کر تمہیں تفتیش کی چکی میں ڈالا جائے گا......!“

عنایت اللہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گھگھیانے لگا۔ ”مائی باپ! میں نے ساری زندگی اسی قبرستان میں گزاری ہے۔ مجھ سے پہلے میرا باپ اور اس سے پہلے میرا دادا اس قبرستان

کا گورکن ہوا کرتا تھا۔ ہم نے کبھی کسی لاش کا کفن تک نہیں چرایا، مردے بیچنا تو بہت دور کی بات ہے......!''

میں اس کے الفاظ کی سچائی سے سمجھ گیا کہ وہ دروغ گوئی سے کوئی کام نہیں لے رہا تھا لہٰذا اسے ڈرانے دھمکانے کے انداز کو ترک کر کے میں نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''عنایت اللہ! ذرا سوچ کر بتاؤ...... پچھلے ایک ہفتے میں تم نے اس قبرستان میں کتنے مردوں کو دفن کیا ہے؟''

''اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے سرکار۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''پچھلے ایک ہفتے میں صرف ایک ہی مردہ یہاں لایا گیا ہے اور میں نے وہی ایک لاش دفن کی ہے۔''

''کیا وہ کسی عورت کی لاش تھی؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں......!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''اس مرنے والی کا نام کیا تھا؟''

''رضوانہ......!'' عنایت اللہ نے بتایا۔ ''وہ اشتیاق نامی ایک چھوٹے زمیندار کی بیوی تھی۔''

''رضوانہ کا انتقال کیسے ہوا تھا؟''

میرے سوالات نے گورکن کو بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، وہ ٹھیک ٹھاک رات کو سوئی تھی۔ آدھی رات کے وقت اس کے پیٹ میں شدید قسم کا درد اٹھا۔ فوراً حکیم صاحب کو بلایا گیا۔ حکیم صاحب نے درد قولنج بتایا اور کھانے کے لیے دوا دے دی۔ قصہ مختصر، حکیم صاحب کی دوا نے کام نہیں کیا اور قولنج کے درد نے رضوانہ کی جان لے لی......''

گورکن کا بیان، پوسٹ مارٹم رپورٹ میں درج وجہ موت کی تصدیق کر رہا تھا۔ ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ میں نے عنایت اللہ سے کہا۔

''مجھے فوراً رضوانہ کی قبر پر لے چلو اور اس فوراً سے پیشتر رضوانہ کے گھر والے کو یہاں بلانے کے لیے کسی بندے کو اس کی طرف روانہ کر دو۔''

''اچھا جی...... ابھی کرتا ہوں۔'' وہ جلدی سے میرے احکام کی تعمیل میں لگ گیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں، اے ایس آئی شکور اور گورکن عنایت اللہ ایک تازہ بنی ہوئی قبر کے پاس موجود تھے۔ میری عقابی نگاہ نے دیکھتے ہی اندازہ قائم کر لیا کہ اس قبر کو کھولنے کے بعد دوبارہ بند کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے اس اندازے کی تصدیق جب عنایت اللہ سے چاہی تو وہ تشویش ناک نظر سے مذکورہ قبر کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''مجھے بھی یہی لگ رہا ہے سرکار......!''

''تم جلدی سے قبر کھودنے کے آلات لے کر یہاں آجاؤ۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ رضوانہ کی قبر کے اندر کیا ہے؟''

گورکن نے متعجب نظر سے مجھے دیکھا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''جناب! رضوانہ کی قبر میں اس کی لاش کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ ابھی چار دن پہلے ہی میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے یہاں دفن کیا ہے......!''

''اور تم اس امر کی بھی تصدیق کر رہے ہو کہ رضوانہ کی قبر کو کھولا گیا ہے؟''

''جی...... ہاں...... ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔'' وہ قبر کو گھورتے ہوئے بولا۔

''بس تو پھر تم مجھ سے کوئی بحث نہ کرو۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں یہاں اپنا قیمتی وقت برباد کرنے نہیں آیا ہوں۔ تم سے جو کہا جا رہا ہے، فوراً اس پر عمل کرو۔''

''اچھا جی......'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''کرتا ہوں سرکار!''

جب تک عنایت اللہ اپنے مخصوص کمرے میں سے کدال اور پھاؤڑا وغیرہ لے کر آتا، درد قولنج سے ہلاک ہونے والی رضوانہ کا گھر والا یعنی اشتیاق زمیندار بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ جب اشتیاق کو یہ پتا چلا کہ میں اس کی بیوی کی قبر کو کھدوانے کا ارادہ رکھتا ہوں تو وہ سراپا احتجاج بن گیا۔

''تھانے دار صاحب......!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ابھی تو میری بیوی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا۔ آپ یہ کیا ظلم کر رہے ہیں......؟''

''اشتیاق!'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم میرے جس عمل کو ظلم کا نام دے رہے ہو وہ انتہائی ضروری تفتیش ہے۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے کہ کسی نے تمہاری بیوی کی لاش کو غائب کر دیا ہے۔ اب اس قبر میں کچھ بھی باقی نہیں رہا......''

''جج...... جی......'' وہ مارے حیرت کے ہکلا کر رہ گیا۔ ''یہ...... یہ آپ کیا...... کہہ رہے ہیں؟''

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تمہاری آنکھوں کے سامنے میرے اس یقین کی تصدیق ہو جائے گی۔''

''لل...... لیکن...... رضوانہ کی لاش کہاں جا سکتی ہے؟'' وہ بے بسی کے عالم میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''اسے نوچ کھسوٹ کر کون چرائے گا......!''

''اشتیاق احمد......!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جہاں تک تمہاری بیوی کی لاش کا تعلق ہے تو وہ اس وقت تھانے میں رکھی ہے۔ تمہیں آج ہی اسے دوبارہ دفنانا پڑے گا......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور جہاں تک لاش کو چرانے والے کا سوال ہے، اس کا سراغ بھی میں بہت جلد لگا لوں گا......!''

پھر میں نے گورکن کو اشارہ کیا کہ وہ کھدائی کا کام شروع کر دے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اشتیاق احمد کو تمام تر حالات کے پس منظر سے آگاہ کر دیا۔ وہ فردوس بی بی کے گھر میں ہونے والی آتش زنی کے واقعے سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب اسے پوسٹ مارٹم رپورٹ اور ماسٹر جمشید کی پُراسرار گمشدگی کے بارے میں بتایا گیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس دوران میں عنایت اللہ نے رضوانہ کی قبر بڑی مہارت سے کھول ڈالی تھی اور...... میرے اندازے کے عین مطابق، وہ قبر رضوانہ کی لاش سے خالی تھی۔

اس صورتِ حال نے جہاں مجھے ایک نتیجے پر پہنچا دیا تھا، وہیں اشتیاق کو گہری تشویش میں ڈال دیا تھا۔ میں نے دوستانہ انداز میں اس سے کہا۔

''اشتیاق! فردوس بی بی کو مردہ ثابت کرنے کے لیے تمہاری بیوی کی لاش کی، بڑی بے دردی سے بے حرمتی کی گئی ہے لیکن تم فکر نہ کرو...... میں اس کے ذمے دار کو ایسی عبرت ناک سزا دلواؤں گا کہ تمہارا کلیجا ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

اس کے آنسو نکل آئے، گلوگیر آواز میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! ایک تو رضوانہ پہلے ہی قیامت خیز تکلیف اٹھا کر مری تھی، اوپر سے اس کی لاش کو جلا کر کوئلا بنا دیا گیا۔ میں بھی جناب بی بی فردوس کی سوختہ لاش کو دیکھنے اس کے گھر گیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا، وہ میری ہی بیوی کی لاش تھی......'' بات کرتے کرتے اس کی سسکاری نکل گئی۔

میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''جو ہوا اسے قدرت کی مرضی سمجھ کر برداشت کرنا ہے گا لیکن یہ میرا تم سے وعدہ ہے......'' میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''کہ میں بہت جلد اس شخص کو قانون کی گرفت میں لا کر نمونۂ عبرت بنا دوں گا جس نے تمہاری بیوی کی لاش کی یہ بے حرمتی کی ہے۔''

''جناب! اب تو ساری بات کھل چکی ہے۔'' وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''یہ سارا کیا کرایا اس نامراد ماسٹر جمشید ہی کا ہے......!''

''ہاں، حالات و واقعات تو اسی جانب قوی اشارہ کرتے ہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ماسٹر جمشید فی الحال مفرور ہے۔ وہ ہتھے چڑھ جائے تو پھر ہی کوئی حتمی بات کہی جا سکے گی......''

''اچھا جی!'' وہ ویران آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم ابھی میرے ساتھ تھانے چلو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ضروری کارروائی کے بعد رضوانہ کی لاش تمہارے حوالے کر دوں گا۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے مائی باپ؟'' گورکن عنایت اللہ کا استفسار میری سماعت سے ٹکرایا تو میں نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔

## کہاوتیں یا دل کا غبار

☆ آدمی آدمی انتر، کوئی ہیرا کوئی کنکر
(سب آدمی ایک جیسے نہیں ہوتے، کوئی اچھا کوئی برا ہوتا ہے)
☆ آدمی ہو یا بے دال کی بودم
(بالکل ہی بے وقوف ہو۔ بودم کی دال الگ کی جائے تو بوم رہ جاتا ہے یعنی نرے الو ہو)
☆ آغا میر کی دوائی، سب سیکھی سکھائی
(اس عورت کے متعلق جو سب گنوں کی پوری ہو)
☆ آگ کھائے منہ جلے، ادھار کھائے پیٹ جلے
(قرض کی رقم سے پیٹ بھر کر سخت تکلیف ہوتی ہے)
☆ آگ لگے تو بجھے جل سے، جل میں لگے تو بجھے کیسے۔
(بچے کی اصلاح ممکن مگر عادی مجرم کی ناممکن ہے)
☆ آنکھ نہ دیدہ، کاڑھے کشیدہ
(لیاقت کچھ نہیں، دعوے بڑے بڑے)
☆ آئی بی عاقلہ، سب کاموں میں داخلہ
(ناواقف مگر کام میں دخل دینے والی عورت)

مرسلہ: ثمرہ عروج، کراچی

وہ ایستادہ کدال کے ہتھے پر ہاتھ جمائے کھڑا تھا۔
میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''یہیں رک کر تھوڑا انتظار کرو۔ اشتیاق اپنی بیوی کی لاش کے ساتھ دوبارہ قبرستان آنے والا ہے۔ تمہیں نہایت ہی ادب واحترام کے ساتھ رضوانہ کی ایک بار پھر تدفین کرنا ہے......''

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

میں اشتیاق کو لے کر تھانے آ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں پورے علاقے میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ کسی کمبخت نے رضوانہ کی لاش، اس کی قبر میں سے نکال کر جلا ڈالی ہے۔ اس خبر کے ساتھ مذکورہ ''کمبخت'' کا نام بھی ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر چڑھ گیا اور یہ بھی کہ...... یعقوب کی دوہتی ماسٹر جمشید کے ساتھ نس گئی ہے!

جی ہاں...... یہی وہ تلخ نتائج تھے جو میری اب تک کی تحقیق کے بعد سامنے آئے تھے۔ ماسٹر جمشید بڑے پُراسرار انداز میں غائب ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی فردوس بی بی کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ ماسٹر جمشید ہی فردوس بی بی کو کہیں بھگا لے گیا تھا اور...... اس کے علاوہ بھی سوچ کے آگے ایک راہ کھلی نظر آتی تھی اور یہ بڑی خطرناک راہ تھی یعنی...... یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ یعقوب نے غیرت میں آ کر ماسٹر جمشید اور فردوس بی بی کو خفیہ طور پر ٹھکانے لگانے کے بعد ان کی لاشیں کہیں دبا دی ہوں...... کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔

تازہ ترین حالات کی روشنی میں، میں نے فی الحال یعقوب کو تو سرکاری مہمان خانے ہی میں رکھا اور فرید بخش کو چھوڑ دیا۔ یہ بات اب واضح ہو چکی تھی کہ اس معاملے میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

اب مجھے سب سے پہلے تو ماسٹر جمشید کی تلاش تھی۔ وہ ہاتھ لگ جاتا تو پھر فردوس کا کھرا کھوج لگانا بھی آسان ہو جاتا۔ میں نے آج تک ماسٹر جمشید سے ملاقات نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے کہیں دیکھا تھا البتہ، میں نے سلطانہ کی بیٹھک میں ایک دیوار پر اس کی تصویر ٹنگی دیکھی تھی۔ میں نے اس فریم کے بارے میں جب سلطانہ سے سوال کیا تو اس نے بتایا تھا کہ وہ ماسٹر جمشید کی فوٹو تھی۔

پہلی فرصت میں، میں نے ایک فوٹو گرافر کے تعاون سے ماسٹر جمشید کی تصویر کے چار پانچ پرنٹ تیار کروا لیے تاکہ ان کی مدد سے ماسٹر کی تلاش کے کام میں تیزی لائی جا سکے۔

ماسٹر جمشید کو علاقے کا ہر بچہ اور بڑا بہ خوبی پہچانتا تھا۔ وہ وہاں کے اکلوتے پرائمری اسکول میں پڑھاتا تھا اس لیے بھی سب اس کے صورت آشنا تھے چنانچہ علاقے کے اندر مجھے اس کی فوٹوز سے مدد لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ابتدائی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ گزشتہ جمعہ کی شام ماسٹر جمشید کسی تانگے پر بیٹھ کر اپنے گاؤں کی طرف گیا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے اس تانگے والے کا پتا چلا لیا جو ماسٹر جمشید کو لے کر گیا تھا۔ اس کا نام نیاز تھا۔ میں نے نیاز کو تھانے بلا لیا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔

میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پوچھا۔ ''نیاز! کیا یہ سچ ہے کہ جمعہ کی شام ماسٹر جمشید تمہارے تانگے میں بیٹھ کر رسول پور گیا تھا؟''

''یہ بات آدھی سچ ہے جناب......!'' وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا۔

''آدھی سچ؟'' میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''جناب...... مطلب یہ کہ ماسٹر جی میرے تانگے پر سوار تو ہوئے تھے لیکن وہ رسول پور نہیں گئے۔''

''رسول پور نہیں گئے تو پھر کہاں گئے......!'' میں نے چونک کر پوچھا۔ ''اس کا گھر تو رسول پور میں ہے اور وہ جب بھی جاتا ہے، اسکول سے سیدھا رسول پور ہی جاتا ہے۔''

''یہ بات مجھے پتا ہے جناب۔ میں نے خود کئی بار انہیں رسول پور تک پہنچایا ہے۔ یہ گاؤں میرے روٹ پر پڑتا ہے۔'' نیاز کوچوان وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب فیض آباد اترنے لگے تو میں نے پوچھا بھی تھا......''

''اچھا تو وہ فیض آباد پر اترا تھا؟'' نیاز کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے سوال کر دیا۔

فیض آباد رسول پور کے راستے میں پڑنے والا پہلا گاؤں تھا اور یہ میرے تھانے سے صرف تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ نیاز نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''جی تھانے دار صاحب۔ وہ فیض آباد ہی میں اترے تھے۔''

''فیض آباد میں اتارتے وقت تم نے اس سے کچھ پوچھا تھا؟'' میں نے نیاز کوچوان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''ابھی تم نے بتایا ہے نا......''

''جی...... جی......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ان سے پوچھا کہ وہ رسول پور کیوں نہیں جا رہے تو انہوں نے بتایا کہ کل اسکول ہے۔ رسول پور وہ ہفتہ دس دن کے بعد جائیں گے......''

"اوہ......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "تم نے پوچھا نہیں، فیض آباد میں وہ کس کے پاس جارہا ہے۔"

"نہیں جناب......" اس نے بڑی سادگی سے نفی میں گردن ہلادی۔ "نہ میں نے پوچھا...... نہ انہوں نے بتایا۔"

میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد نیاز کوچوان کو فارغ کردیا۔

اس کے بعد میں نے دو دو اہلکاروں پر مشتمل تین پارٹیاں ترتیب دیں اور انہیں ماسٹر جمشید کی تصویر دے کر آس پاس کے علاقوں میں پھیلا دیا تاکہ وہ ماسٹر کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔

اسی روز سہ پہر کے بعد میں حوالدار مولا بخش کے ساتھ ایک تانگے میں بیٹھ کر فیض آباد کی جانب روانہ ہوگیا جیسا کہ میں نے اوپر بتایا ہے، فیض آباد میرے تھانے سے محض تین میل کی دوری پر واقع تھا۔ جلد ہی ہم فیض آباد پہنچ گئے، تانگے کو میں نے ایک جگہ رکوا کر ماسٹر جمشید کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ چند منٹ کی کوشش کے بعد میں یہ جاننے میں کامیاب ہوگیا کہ فیض آباد میں ماسٹر، ایاز مہر نامی ایک کاشت کار سے ملنے آیا تھا۔ میں مولا بخش کے ہمراہ ایاز مہر کے گھر پہنچ گیا۔

وہ ایک متوسط درجے کا گھر تھا۔ ایاز مہر اس وقت گھر پر ہی مل گیا۔ میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد اس سے پوچھا۔

"مہر صاحب! کیا ماسٹر جمشید جمعہ کے روز رات میں آپ سے ملنے آیا تھا؟"

"جی ہاں...... آیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"وہ آپ کے پاس سے واپس کب گیا تھا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "اور یہ بھی بتائیں، وہ کہاں گیا تھا؟"

میرے پے درپے سوالات نے مہر کو تشویش میں مبتلا کردیا۔ جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔ "تھانے دار صاحب...... خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت نہیں ہے مہر صاحب۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتایا۔ "ورنہ میں ماسٹر کی تلاش میں یہاں نہ آتا......!"

اس کے چہرے پر نظر آنے والی تشویش اور گہری ہوگئی۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں سلطانہ کے گھر میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں اسے بتایا۔ یہ تو مجھے پتا چل چکا تھا کہ ایاز مہر کے ساتھ ماسٹر کے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ گاہے بگاہے اس سے ملنے آتا رہتا تھا۔

"اوہ......!" میری بات کے اختتام پر اس نے کہا۔ "ماسٹر نے مجھ سے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ جمعے کے دن رات کو میرے پاس آیا اور دوسری صبح یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ اسے اسکول پہنچنا ہے۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا۔"

میں نے ایاز مہر کو فردوس اور ماسٹر جمشید کے خفیہ تعلقات کے بارے میں بھی بتایا اور آخر میں کہا۔ "رضوان کی لاش کو قبر سے نکال کر اور سلطانہ کے گھر کے باورچی خانے میں رکھ کر اس لیے جلایا گیا ہے تاکہ یہ تاثر ملے کہ فردوس بی بی جل کر ہلاک ہوچکی ہے اور یہ خطرناک کام وہی شخص کرسکتا ہے جو فردوس بی بی میں دلچسپی رکھتا ہو۔ میری نظر میں وہ بندہ ماسٹر جمشید کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ مجھے بڑی شدت سے ماسٹر کی تلاش ہے۔"

"آپ کی باتوں سے مجھے سخت حیرت ہورہی ہے تھانے دار صاحب......" وہ تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں ماسٹر کو ایسا نہیں سمجھتا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ وہ ایسی گھناؤنی حرکت بھی کرسکتا ہے۔"

"یہ یقین تو وہاں کے بیشتر افراد کو بھی نہیں آرہا مہر صاحب۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "خاص طور پر سلطانہ تو اس بات کو ماننے کے لیے قطعاً تیار نہیں کہ ماسٹر جمشید اس کی بہو کو کہیں بھگا لے گیا ہوگا......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"مہر صاحب...... آپ ماسٹر جمشید اور فردوس بی بی کے درمیان جاری عشق کے بارے میں تو بہت کچھ جانتے ہوں گے...... اس کے ساتھ آپ کی اچھی خاصی دوستی تھی؟"

"دوستی والی بات میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں جناب۔" وہ ایک ٹھہری ہوئی سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ بات آپ کی زبان سے مجھے پتا چل رہی ہے کہ وہ محبت کے کسی معاملے میں بھی الجھا ہوا تھا......"

"حیرت ہے مہر صاحب......؟" میں نے شک زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جو حقیقت تھی، وہ میں نے آپ کو بتا دی جناب......!"

میں لگ بھگ آدھا گھنٹا ایاز مہر کے پاس رکا اور گھما پھرا کر مختلف زاویوں سے ماسٹر جمشید کے بارے میں سوال کرتا رہا۔ جب کام کی کوئی بات میرے حصے میں نہ آئی تو میں نے واپسی کی راہ اختیار کی۔

میرا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ ماسٹر جمشید جمعہ کے روز سلطانہ کو یہ بتا کر گھر سے نکلا تھا کہ وہ دو دن کے لیے اپنے گاؤں رسول پور جارہا ہے۔ وہ پیر کی صبح اپنے گھر سے سیدھا اسکول پہنچے گا اور چھٹی کے بعد گھر آئے گا۔

ایک بات کا ذکر میں بھول گیا کہ میں نے پرائمری اسکول کے باقی اساتذہ سے بھی ماسٹر جمشید کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی۔ ان میں سے بھی کسی کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ ماسٹر دو روز کے لیے اپنے گاؤں جارہا ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے سلطانہ سے غلط بیانی کی تھی۔

جب کوئی انسان جھوٹ کا سہارا لیتا ہے تو بنیادی طور پر اس کے پیش نظر دو باتیں ہوتی ہیں یا کم از کم دو میں سے ایک بات ضرور ہوتی ہے۔ نمبر ایک، وہ اپنے کسی سرزد جرم کی پردہ پوشی کے لیے جھوٹ بول رہا ہوتا ہے۔ نمبر دو، وہ کوئی جرم کرنے جارہا ہوتا ہے اور غلط بیانی کے ذریعے اپنے جرم کو آسان بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ میرے خیال میں ماسٹر جمشید کے معاملے میں یہ دونوں صورتیں ممکن تھیں۔

اگلے روز ایک اہم اطلاع مجھ تک پہنچی۔ میں نے گزشتہ روز دو دو پولیس اہلکاروں پر مشتمل جو تین پارٹیاں ترتیب دی تھیں ان میں سے ایک پارٹی نے تھانے آکر مجھے بتایا کہ ہفتے کی دوپہر ایک شخص نے ماسٹر جمشید کو لاری اڈے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک برقع پوش عورت بھی تھی۔ یہ اطلاع خاصی چونکا دینے والی تھی۔ میں نے مذکورہ پارٹی سے پوچھا۔

"وہ بندہ کون ہے جس نے انہیں لاری اڈے کی طرف جاتے دیکھا تھا؟"

"جناب! اس کا نام طفیل ہے۔" مجھے بتایا گیا۔ "ہم اسے اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔"

"طفیل کو فوراً میرے سامنے پیش کرو۔" میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد طفیل نامی وہ بندہ میرے سامنے حاضر تھا۔ طفیل کی اس علاقے میں کریانے کی دکان تھی اور وہ سودا لینے اکثر و بیشتر شہر کی طرف جاتا رہتا تھا۔ وہ تھوک کی دکانوں سے سودا لاکر اپنے کریانہ اسٹور پر بیچا کرتا تھا۔ میں نے گہری نظر سے سرتاپا طفیل کا جائزہ لیا پھر قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

"ہاں بھئی طفیل...... تم نے ہفتہ کی دوپہر ماسٹر جمشید کو لاری اڈے کی طرف جاتے دیکھا تھا؟"

"جناب! صرف دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ وہ میرے ساتھ ہی شہر تک گیا تھا۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "مجھے سودا لینے شہر جانا تھا۔ میں جس بس پر سوار تھا اسی میں دو سیٹیں تھیں آگے ماسٹر جمشید بھی بیٹھا ہوا تھا۔"

"اوہ......" میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔ "تمہیں یقین ہے کہ وہ ماسٹر جمشید ہی تھا؟"

"جی جناب...... پکا یقین ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "آپ کے سپاہیوں نے مجھے جو تصویر دکھائی ہے۔ وہ وہی بندہ تھا۔ میں ویسے بھی ماسٹر جمشید کو شکل سے پہچانتا ہوں۔"

"اور اس کے ساتھ ایک برقع پوش عورت بھی تھی......؟"

"جی ہاں......!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"ان لوگوں نے تمہیں بھی دیکھا تھا......؟"

"نہیں جناب۔" اس نے نفی میں گردن ہلادی۔ "وہ دونوں اس وقت بس میں سوار ہوئے جب بس چلنے والی تھی۔ انہوں نے کسی پر دھیان نہیں دیا اور جلدی سے دو والی ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔"

"اور وہ دونوں تمہارے ساتھ ہی شہر پہنچے تھے؟"

"جی...... تھانے دار صاحب......!"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ شہر پہنچ کر انہوں نے کس طرف کا رخ کیا تھا؟" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"جناب! آخری بار میں نے انہیں ایک تانگے والے کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔" طفیل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "ماسٹر جمشید کوچوان سے شریف کالونی جانے کا کہہ رہا تھا اور وہ سالم تانگا لے کر جانا چاہتا تھا۔ کوچوان کا اصرار تھا کہ اگر وہ ان کے علاوہ کسی اور سواری کو نہیں بٹھائے گا تو انہیں زیادہ کرایہ دینا ہوگا۔ ان میں کرایے کے معاملے پر بات چیت چل ہی رہی تھی کہ میں آگے بڑھ گیا......"

"یعنی تم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ لوگ اسی تانگے میں بیٹھے تھے یا نہیں......؟" میں نے پوچھا۔

"جی...... میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کیا تم اس تانگے والے کو جانتے ہو؟"

"نہیں جناب۔" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ "میں اپنے علاقے کے تمام کوچوانوں کو تو جانتا ہوں مگر شہر میں چلنے والے کوچوانوں سے میری واقفیت نہیں اور اس کی ایک خاص وجہ ہے......" تھوڑی دیر کو رک کر اس نے سانس درست کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے کبھی شہر کے تانگوں میں بیٹھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں سودا وغیرہ لینے شہر جاتا ہوں اور یہ ساری

دکانیں لاری اڈے کے نزدیک ہی ہیں۔ میں پیدل ہی چلتے ہوئے وہاں پہنچ جاتا ہوں۔"

"تم اس کوچوان کا حلیہ اور وضع قطع تو بیان کر سکتے ہو جس کے ساتھ ماسٹر جمشید اس دن مول تول کر رہا تھا؟" میں نے اہم نکتے کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "اس کو تو تم نے اچھی طرح دیکھا ہوگا......"

"جی ہاں...... بالکل!" اس نے بڑے وثوق سے سر ہلایا پھر ایک ہی سانس میں بتاتا چلا گیا۔ "عمر پچاس کے اریب قریب، رنگت گندمی، دبلا پتلا اور اونچا لمبا۔ سر کے بال اڑے ہوئے، درمیان سے جھلکتی ٹنڈ اور...... سب سے خاص اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کا ایک بازو کٹا ہوا ہے یعنی وہ ٹنڈا کوچوان ہے......"

"بس، بس...... کام ہوگیا۔" میں نے طفیل کے بیان کردہ حلیے کو نوٹ کرتے ہوئے جوش بھرے انداز میں کہا۔ "میں تمہاری بتائی ہوئی نشانیوں کی مدد سے بڑی آسانی کے ساتھ اس کوچوان تک پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے طفیل کے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔

ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد میں اے ایس آئی شکور کے ہمراہ، بس میں بیٹھ کر شہر کی جانب رواں دواں تھا۔ ہم پوری تیاری کے ساتھ تھانے سے روانہ ہوئے تھے۔ شکور نے ہاتھ میں ایک تھیلا پکڑا ہوا تھا۔ جس کے اندر دو ہتھکڑیاں تھیں۔ پتا نہیں کیوں، میرے اندر سے ایک آواز اٹھ رہی تھی کہ میں اس مشن میں کامیاب لوٹوں گا۔

دوپہر کے وقت ہم شہر پہنچ گئے۔ گرمی اس روز بھی اپنی انتہاؤں کو چھو رہی تھی لیکن میرے پیش نظر ایک اہم کام تھا اس لیے موسم کی سختی میرے عزائم کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کر پا رہی تھی۔ اس وقت مجھے ذرا سی بھی کمزوری یا نقاہت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے اے ایس آئی شکور کو ایک خاص مقصد کے تحت اپنے ساتھ رکھا تھا اور وہ مقصد یہ تھا کہ وہ ماسٹر اور فردوس کا صورت آشنا تھا۔

شہر پہنچتے ہی میں نے سیدھا تانگا اسٹینڈ کا رخ کیا۔ وہاں اس وقت دو تین تانگے کھڑے تھے۔ میری متلاشی نظر نے پہلی فرصت میں ان کوچوانوں کے بازوؤں کو "ٹٹولا" ان میں سے کوئی بھی ٹنڈا نہیں تھا۔ میں اور شکور اس وقت عوامی لباس میں تھے لہٰذا ہمیں دیکھ کر کسی نے کچھ عجیب محسوس نہیں کیا تھا۔ میں ایک کوچوان کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"آئیں جی...... بیٹھیں...... تانگا خالی ہے۔"

"تانگے میں بھی بیٹھ جائیں گے مگر تمہارے سے میں کچھ چاچا......" میں نے کہا۔

اس نے حیرت بھری نظر سے ہمیں دیکھا اور بولا۔

"کیوں جناب، میرے تانگے سے آپ کی کیا ناراضی ہے......؟"

"ناراضی کوئی نہیں۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "ہمیں شریف کالونی جانا ہے لیکن اس سے پہلے کچھ ضروری معلومات چاہئیں......؟"

"جی...... بتائیں۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا پوچھنا ہے آپ کو؟"

"ہمیں ایک ایسے کوچوان کی تلاش ہے جس کا ایک بازو کٹا ہوا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ...... تو آپ بشیر کوچوان کی بات کر رہے ہیں......!"

"ہم اس کے نام سے واقف نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کا حلیہ کچھ اس طرح کا ہے......"

"بس جناب، میں اچھی طرح سمجھ گیا۔" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "وہ بشیر کوچوان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ آپ کو کیا کام ہے اس سے...... سب خیریت تو ہے نا......؟"

"ہاں...... خیریت ہی ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "بتاؤ چاچا، بشیر کوچوان کہاں ملے گا؟"

"آج تو وہ اپنے گھر ہی میں ملے گا جناب۔" اس نے بتایا۔ "اسے رات سے بخار چڑھا ہوا ہے اسی لیے آج اس نے تانگا بھی نہیں جوتا۔"

"اور بشیر کوچوان کا گھر کہاں پر واقع ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"جناب! وہ بصیر آباد کا رہنے والا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ محلہ شریف کالونی کے ساتھ ہی جڑا ہوا ہے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے تانگے کے پائے دان پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "تم ہمیں بصیر آباد میں، بشیر کوچوان کے گھر تک ہی پہنچا دو......"

میری دیکھا دیکھی اے ایس آئی شکور بھی تانگے پر سوار ہو گیا۔ بصیر آباد لاری اڈے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد تانگے والے نے ہمیں بشیر کوچوان کے گھر پہنچا دیا۔ میں نے تانگے والے کو رکنے کے لیے کہا اور

شکور کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔

بشیر کوچوان سے ملاقات خاصی سودمند ثابت ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ پچھلے ہفتے کی دوپہر اس کے تانگے میں ایک مرد کے ساتھ ایک برقع پوش عورت سوار ہو کر شریف کالونی میں رانا ظفر کے گھر پہنچی تھی۔ میں نے جب اسے ماسٹر جمشید کی فوٹو دکھائی تو وہ نگاہ پڑتے ہی بول اٹھا۔ ”جی جناب...... میں نے اسی بندے کو ایک برقع پوش عورت کے ساتھ رانا ظفر کے گھر پہنچایا تھا۔“

”ہمیں بھی رانا صاحب کے گھر جانا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم دونوں آپس میں فیصلہ کر لو کہ ہمیں وہاں کون پہنچائے گا......؟“

”میں چلتا ہوں جی آپ کے ساتھ۔“ بشیر کوچوان نقاہت بھرے انداز میں بولا۔ ”لیکن یہ تو بتائیں کہ آخر معاملہ کیا ہے......؟“

میں نے بشیر کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا۔ یہ جان کر کہ ہم پولیس والے ہیں وہ دونوں اٹین شن ہو گئے۔ میں نے بڑے واشگاف الفاظ میں انہیں بتایا تھا کہ وہ بندہ برقع پوش عورت کو بھگا کر یہاں لایا تھا۔

ٹھیک بیس منٹ کے بعد ہم رانا ظفر کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے تانگے والے کو تھوڑے فاصلے پر کھڑا کر دیا تھا۔ بشیر کوچوان بھی تانگے کے اندر ہی بیٹھا رہا تھا۔ اس نے اشارے کی مدد سے رانا ظفر کے گھر کی نشاندہی کر دی تھی۔

اس وقت رانا ظفر گھر میں موجود نہیں تھا۔ میری دستک پر آٹھ سالہ ایک بچے نے دروازہ کھولا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے اور پوچھا۔

”رانا صاحب کو باہر بلاؤ۔“

”ابا جی تو گھر پر نہیں ہیں۔“ اس نے بڑی معصومیت سے بتایا۔

”احمد نگر والے دونوں مہمان تو گھر میں موجود ہیں نا؟“ میں نے اپنے علاقے کا نام لیتے ہوئے استفسار کیا۔

اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی اور یہ کہتے ہوئے اندر چلا گیا۔ ”میں امی کو بھیجتا ہوں......“

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اے ایس آئی شکور کو ایکشن کا اشارہ دیا اور اس سے پہلے کہ رانا ظفر کی گھر والی صورتِ حال کو سمجھ پاتی، ہم بھرا مار کر گھر کے اندر داخل ہو گئے۔

معصوم بچے کی اطلاع بالکل درست تھی۔ ماسٹر جمشید اور فردوس بی بی گھر کے اندر موجود تھے۔ اے ایس آئی نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا اور پھر اگلے ہی لمحے ان دونوں کی گرفتاری عمل میں آ گئی۔

رانا ظفر کی بیوی ہماری کارروائی پر ورطۂ حیرت میں رہ گئی اور جب میں نے اسے بتایا کہ ماسٹر جمشید، فردوس کو بھگا کر لایا ہے تو اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”نہیں جناب...... یہ دونوں تو میاں بیوی ہیں... ماسٹر جی نے تو ہمیں یہی بتایا تھا کہ انہوں نے فردوس سے شادی کی ہے......“

”ان دونوں نے آپ لوگوں کو جو بھی بتایا وہ جھوٹ اور بکواس تھی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”حقیقت وہی ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے۔ فردوس کا شوہر ادھر احمد نگر میں موجود ہے۔ یہ بدذات......“ میں نے فردوس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نفرت انگیز انداز میں کہا۔ ”اپنے خصم سے بے وفائی کر کے اس یار کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی اور ماسٹر نے وہاں احمد نگر میں ایک لاش کی بے حرمتی کر کے جو سنگین جرم کیا ہے نا...... اس کے لیے تو اسے کڑی سے کڑی سزا ملنا چاہیے......“

رانا ظفر کی بیوی توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔ ہم دونوں مجرموں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے آئے۔ جب میں اپنے تھانے پہنچا تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

تھانے پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے یعقوب کو آزاد کیا اور ماسٹر جمشید و فردوس کو حوالات میں پہنچا دیا۔ جب یعقوب کو اپنی بیوی کے کالے کرتوتوں کا پتا چلا تو اس نے نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

میں نے ماسٹر جمشید اور فردوس بی بی کو ان کے جرائم کے ٹھوس ثبوت کے ساتھ گرفتار کیا تھا لہٰذا ان کی بچت کا کوئی پہلو نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک مضبوط چالان کے ساتھ انہیں عدالت کے حوالے کر دیا۔

یہ مقدمہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ چلا ہوگا۔ عدالت نے ان دونوں کو لمبی سزائیں سنا کر جیل کی راہ دکھا دی۔

یعقوب کا ہنستا بستا گھر اجڑ گیا اور ان دونوں کے حصے میں بھی زندگی بھر کی ذلت ہی آئی۔ برے کام کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوا کرتا ہے۔

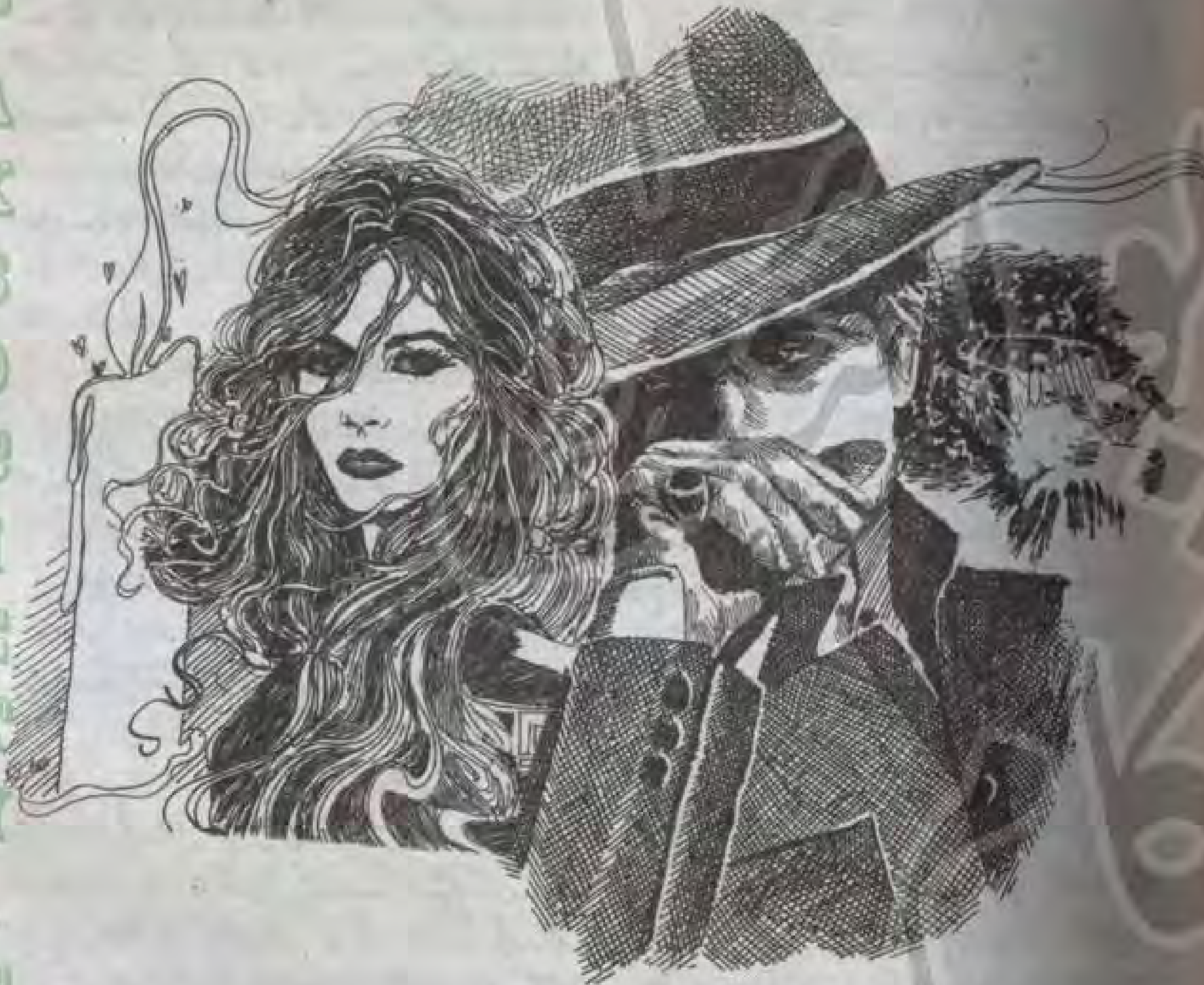
(تحریر: حُسام بٹ)



# رشک گزیدہ

امجد رئیس

ستم گروں کا تجربہ کہتا ہے کہ وار جتنا قریب سے ہوگا اتنا ہی کاری ہوگا... اسی اصول پر اس نے بھی انتہائی سمجھداری سے عمل کیا جو بہ ظاہر نادان مگر اندر سے شاطر تھا... جو اس کا جگری یار تھا مگر جگر کے آرپار خنجر اتارنے کا فن جانتا تھا چونکہ وہ اس کے قریب تھا اس لیے ہر منظر واضح تھا... اندھا اعتماد انسان کو سچ مچ اندھا کر دیتا ہے... اور وہ بھی بہت پیار سے اسی اندھیرے کا شکار ہو گیا۔



**لکڑی کے مانند دھیرے دھیرے سلگنے والے ایک حاسد کا کارنامہ**

ہم بیورلے ہلز میں تھے جب ڈچ کو وہ خیال سوجھا۔ رات تیزی سے گزر رہی تھی۔ نصف شب کا وقت تھا۔ ہر گلی کے ساتھ سناٹا، قبر کے مانند لگ رہا تھا۔ بس ہم تینوں کے قدموں کی آہٹ تھی۔ میں، ڈچ اور روزا۔ روزا کی عمر سترہ برس تھی۔ اس کا حسن و شباب مسحور کن تھا۔ وہ کھلونوں کی دکان میں سجی ہوئی خوب صورت گڑیا کے مانند دکھائی دیتی تھی۔ روزا، ڈچ کی درجنوں محبوباؤں میں سے ایک تھی۔ ڈچ، جب بھی اسے آؤٹنگ کے لیے بلاتا وہ

اپنے حسن وجوانی کو مزید اجاگر کرنے کے لیے نہایت ہیجان خیز لباس استعمال کرتی۔

ڈچ کی اپنی عمر اٹھارہ سال تھی۔ اس کا سراپا کسی مووی اسٹار کے مانند تھا۔ لڑکیوں کو رجھانے میں اسے کسی خاص قسم کی محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ اس کی وجاہت پر لڑکیاں خود ہی اس طرح گرتی تھیں جیسے شہد پر مکھیاں۔

میں، ایڈی کونر...... میں ان دونوں کے مقابلے میں کوئی خاص کشش نہیں رکھتا تھا۔ میں، ڈچ کا ہم عمر ہی تھا لیکن اس کے بالمقابل قدرے پستہ قد اور چہرے پر موٹے شیشوں کا چشمہ لگا رہتا تھا۔ ڈچ ہمیشہ اس چشمے کو مذاق کا نشانہ بناتا تھا۔ میری آنکھوں کو وہ موٹے شیشوں کے پیچھے تیرتی ہوئی دو بدنما مچھلیوں سے تشبیہ دیتا۔ جواباً میں مسکراہٹ کے ساتھ خاموش رہتا۔ لڑکیوں کے لیے میرے اندر کوئی کشش نہیں تھی۔ پلٹ کر دیکھنا تو دور کی بات وہ میرے قریب سے ایسے گزر جاتی تھیں جیسے میں کوئی بے جان کھمبا ہوں یا پھر کوئی سنگی ستون۔ میں انہیں کوئی الزام بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں عام سی شکل صورت کا نوجوان تھا۔

جب کبھی ہم ڈبل ڈیٹ پر نکلتے تو ڈچ میرے لیے کسی نہ کسی لڑکی کا بندوبست کر دیتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ میری ہم نشین کی توجہ زیادہ تر ڈچ کی مقناطیسی شخصیت کی جانب رہتی۔

ہماری اچھی دوستی تھی۔ لڑکیوں کے معاملے میں، میں اس کا ممنون بھی تھا۔ تاہم میں غیر محسوس انداز میں حسد کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ میرا دل کرتا کہ کبھی روزا یا اس جیسی کسی لڑکی کے ساتھ ڈیٹ لگاؤں لیکن ایسا کوئی امکان ایک خواب ہی تھا۔ روزا ایک فتنہ تھی، ایک شعلہ خوش رنگ تھی۔ حتیٰ کہ اس کی آواز میں بھی بلا خیز آہنگ تھا اور ناز و انداز کے تو کیا کہنے۔ اسے اپنے حسن کی سحر کاریوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ کبھی کبھی ڈچ کے لیے رشک وحسد کی ایک تیز لہر میرے سینے میں اٹھ کر اچانک غائب ہو جاتی۔

☆☆☆

خیر اس رات ڈچ کو خیال سوجھا کہ مل ہالینڈ ڈرائیو پر ریس لگائی جائے۔

"میں اور تم، ایڈی۔" اس نے دانت نکالے۔ "مزہ آئے گا۔"

"یقیناً۔" میں نے کہا۔ "لیکن گاڑیاں ایک جیسی ہونی چاہئیں۔"

"ہاں، چلو دیکھتے ہیں۔"

روزا نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ڈچ جس بات کو منظور کر لیتا وہ بھی منظور کر لیتی تھی۔

مارٹن ڈیل بک اسٹور کے قریب ہمیں دو نئی فورڈ کاریں دکھائی دیں۔ ڈچ نے ہم دونوں کو ایک عمارت کے سائے میں رکنے کا کہا اور اطمینان سے گاڑیوں کی جانب چلا گیا۔ اس کا ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔ گاڑیاں اٹھانا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ اور بات کہ وہ چور نہیں تھا۔ شغل پورا کر کے وہ کم وقت میں گاڑیاں اصل مقام تک پہنچا دیتا تھا۔

روزا میرے قریب کھڑی تھی، اس کے بدن سے اٹھنے والی اشتعال انگیز مہک میرے حواس مختل کر رہی تھی۔ بہر حال کچھ دیر بعد گاڑیاں ہمارے قبضے میں تھیں۔ روزا ظاہر ہے ڈچ کے ساتھ اس کی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر تھی اور میں دوسری فورڈ میں اکیلا۔

گاڑیاں اسٹارٹ تھیں۔ نئی گاڑیوں کے طاقتور انجن دیو قامت بلیوں کے مانند ہلکی آواز میں غرا رہے تھے۔ مجھے ڈچ کے الفاظ یاد آئے۔

"اب سنو۔" اس نے کہا تھا۔ "تم کولڈ واٹر سے مل ہالینڈ تک میری گاڑی کے پیچھے رہو گے پھر ہم دوڑ کے لیے مل ہالینڈ پر متوازی حالت میں آجائیں گے اور تیسرے چکر میں تم مجھ سے بہت پیچھے رہ جاؤ گے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ روزا مسکرائی، میں خاموش رہا تاہم مجھے یہ دعویٰ اور روزا کی مسکراہٹ دونوں برے لگے تھے۔

بالآخر میں بولا۔ "ٹھیک ہے ڈچ، دیکھتے ہیں کہ تم کتنا آگے جاتے ہو۔" میں نے آواز نرم رکھی پھر ہم دونوں آگے پیچھے روانہ ہو گئے۔ نئی کار کا مزہ ہی اور تھا۔ مجھے ڈرائیونگ میں لطف آرہا تھا لیکن ڈچ کے الفاظ نے میرے رشک وحسد کی عمر بڑھا دی تھی۔ مجھے بدمزگی کا احساس ہو رہا تھا۔

فی الحال وہ دونوں میری بدمزگی کو محسوس نہیں کر رہے تھے۔ میں سامنے دیکھ رہا تھا۔ روزا کا ریشمی بازو ڈچ کی گردن میں حمائل تھا۔

اچانک میں نے تصور میں روزا کو اپنے پہلو میں محسوس کیا۔ بہت قریب...... اس کا سر میرے شانے سے لگا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے بدن اور لباس سے اٹھنے والی خوشبو مجھے مست کیے دے رہی تھی۔ روزا کا سراپا



واقعی ہوشربا تھا۔ حتیٰ میں واپس حقیقی دنیا میں آ گیا، اب پھر میں اپنی گاڑی میں اکیلا تھا۔

ہم ٹاؤن کے گرد چکر کاٹ کر بیورلے ہلز سے قدرے دور آگئے۔ بیورلے ہلز کی پولیس سے بچنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ تصور سے باہر آنے کے باوجود میں روزا کی خوشبو محسوس کر رہا تھا۔ دفعتاً میں نے آگے ڈچ کی فورڈ کے انڈیکیٹرز کو جلتے بجھتے دیکھا۔ وہ رات بھر کھلے رہنے والے ایک پیٹرول پمپ میں داخل ہو رہا تھا۔

"یہ کیا کرنا چاہ رہا ہے؟" میں نے سوچا تاہم مجھے بھی اس کے پیچھے جانا پڑا۔

"کیا مسئلہ ہے؟" میں نے آواز دھیمی رکھی۔

"ٹائرز۔" اس نے جواب دیا۔ "جب ہم چٹانی سڑک پر آئیں گے اور ٹائروں میں ہوا پوری نہیں ہوگی تو...... سمجھ رہے ہو؟"

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"اپنی گاڑی کا فیول چیک کر لینا اور دونوں گاڑیوں کی ہوا بھی چیک کر لو۔" گویا اس نے حکم جاری کیا۔

میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ وہ دونوں بوس و کنار میں مگن تھے۔ میں نے فیول گیج پر ایک نظر ڈالی اور نیچے اتر آیا۔ میں نے اسٹیشن پر موجود لڑکے کو ہاتھ ہلا کر واپس اندر روانہ کیا اور فورڈ کے ٹائروں کا دباؤ جانچنے لگا۔ اپنی گاڑی سے مطمئن ہو کر میں ڈچ کی کار پر آ گیا۔ میں نے ایک نظر ان دونوں پر ڈالی اور نیچے بیٹھ گیا اور فورڈ کے چاروں ٹائر چیک کیے۔

"سب ٹھیک ہے؟" ڈچ کی بہکی بہکی آواز آئی۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "بس میرے بائیں سمت کے ٹائر میں ہوا کم تھی۔ اچھا ہوا چیک کر لیا۔"

"گڈ، میں غیر ضروری رسک لینے کا قائل نہیں ہوں۔" ڈچ نے جواب دیا۔

گاڑیاں اسٹیشن سے نکل کر پھر آگے پیچھے دوڑنے لگیں۔ ہم کئی بار 25 پونڈ کے پریشر کے ساتھ سفر کر چکے تھے لیکن وہ جوائے رائڈ تھے۔ اس لیے اس فرق کا پتا نہیں چلتا تھا لیکن یہ مل ہالینڈ ڈرائیو کی ریس تھی جہاں کئی مشکل موڑ بھی آتے تھے۔

ہم کولڈ واٹر پر پہنچ کر رک گئے۔ میں نے فورڈ کو اندرونی جانب روکا۔ ڈچ کی گاڑی پہاڑی کنارے کی جانب تھی۔ میں نے چوکس ہو کر گاڑی کو ریس دی اور انجن کی رواں غراہٹ سن کر مطمئن ہو گیا۔ دو تین بار ریس دے کر میں تیار ہو گیا۔ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر جمے تھے۔ مجھے ہتھیلیوں پر پسینے کا احساس ہوا۔ سب کچھ پاگل پن اور غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ ہمارے سامنے سڑک بل کھاتی بلندی کی طرف جا رہی تھی۔

"تیار ہو جاؤ ایڈی۔" اس نے ہاتھ ہلایا اور دلکش انداز میں مسکرایا۔ "روزا تین تک گنتی گنے گی اور شوں...... ں...... ں......!"

"ایک منٹ رکو۔" میں نے کہا۔ "روزا کا سو پونڈ وزن تمہارے لیے ایڈوانٹیج کا کام کرے گا ہم دونوں کو اپنی گاڑیوں میں اکیلا ہونا چاہیے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہمیں برابری کی بنیاد پر ریس لگانی چاہیے۔ روزا کا وزن ہر بائیں موڑ پر تمہاری گاڑی کے توازن کو سہارا دے گا چاہے یہ ایڈوانٹیج معمولی سا ہی کیوں نہ ہو۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ اس حالت میں، میں دوڑ نہیں لگا سکتا۔"

"تم ہار تو پھر بھی جاؤ گے۔" ڈچ نے طنز کیا۔

"یہ بعد کی بات ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم نروس لگ رہے ہو؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے اصولی بات کی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈچ نے ہاتھ بڑھا کر روزا کی سائڈ والا دروازہ کھول دیا۔ اس کے اشارے پر روزا گاڑی سے اتر گئی۔ "بے بی، تم یہاں رکو۔ ہم رائل کینین (canyon) سے گھوم کر واپس آئیں گے۔"

"او کے ڈارلنگ۔" وہ ایک ادائے دلبری سے لب کشا ہوئی۔ "اپنا خیال رکھنا، سڑک تنگ ہے۔"

اس کی آواز میٹھی میٹھی اور سیکسی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے آواز کو بھی سیکسی بنانے کی مشق کر رکھی تھی۔

"بے فکر رہو۔" ڈچ نے روزا کو فلائنگ کس کی اور میری جانب دیکھ کر دانت نکالے۔

"ایڈی تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نروس ہو؟"

"میں نروس کیوں ہوں گا؟ زیادہ سے زیادہ ہار جاؤں گا۔" میں نے پھر تردید کی اور سگریٹ سلگائی۔ یہ اور بات ہے کہ میں واقعی نروس تھا۔ ریس جیتنے کے لیے

میں نے جو منصوبہ بندی کی تھی۔ وہ کسی کو بھی نروس کرنے کے لیے کافی تھی۔ یہاں تو ہم حریف نہیں، دوست تھے۔

ڈچ نے پہلا گیئر ڈال کر کلچ پکڑا اور ایکسی لریٹر کو زور سے پش کیا۔ فورڈ کی گرج دار آواز بلند ہوئی۔

میں بھی تیار تھا۔ باہر روزا نے ایک ہاتھ بلند کیا ہوا تھا۔ وہ فلیگ آؤٹ کا اشارہ دینے کے لیے تیار تھی۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس روشن ہوگئیں۔

وہ ہمیشہ کے مانند پُراعتماد انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی مخصوص مسکراہٹ میں اس یقین کا عکس شامل تھا کہ وہ مجھے بہ آسانی ہرا دے گا۔ رات کے وقت مل ہالینڈ ڈرائیو پر تیز رفتاری آسان نہیں تھی۔ اگرچہ پتھریلے راستے کے ناہموار حصوں کی نہایت صفائی سے ہموار کارپٹنگ کی گئی تھی لیکن کہر کی چادر اور راہ کے خطرناک موڑ کا کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سوائے رفتار کم کرنے کے جبکہ میری سنجیدگی نے دوستانہ دوڑ کو غیر محسوس انداز میں چیلنج کا رنگ دے دیا تھا۔ ڈچ ایک ماہر ڈرائیور تھا، یہی چیز مجھے پریشان کررہی تھی۔

''تیار ہوجاؤ۔'' روزا چلائی۔ میں نے سگریٹ باہر اچھال دی۔

☆☆☆

دونوں انجن آواز بدل بدل کر غرا رہے تھے۔ روزا کا ہاتھ نیچے گرا۔ دونوں گاڑیوں کے ٹائر بھی اس بار چیخ پڑے تھے۔ دونوں گاڑیاں کمان سے نکلے تیر کے مانند روانہ ہوئیں۔ کہر کی وجہ سے سڑک پر نمی نے ریس کو مزید خطرناک بنا دیا تھا۔ ریس ایکٹی ویٹی ہم نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔

میں نے پہلے گیئر کی طاقت آخری حد تک استعمال کی اور ایکسی لریٹر دباتا چلا گیا۔ گاڑیاں ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ دوسرے گیئر میں جاتے ہوئے میں نے انتہائی پھرتی دکھائی تھی۔ کلچ دبا کر چھوڑنے میں، میں نے سیکنڈ کا بہت کم وقت لیا تھا لیکن غالباً ڈچ نے بجلی کی رفتار سے گیئر تبدیل کیا تھا۔ اس کی گاڑی آگے نکلتی چلی گئی۔ پہلا موڑ آنے والا تھا۔ موڑ اتنا خطرناک نہیں تھا لیکن تیز رفتار گاڑیوں کے لیے سہل بھی نہیں تھا۔

میں نے ایکسی لریٹر پر معمولی دباؤ کم کردیا۔ میں ڈچ کو موڑ پر دیکھ رہا تھا، وہ مچھلی کے مانند بل کھا کر موڑ سے گزر کر سڑک کے درمیان آگیا۔ اگر اس وقت میں اس کے برابر ہوتا تو لازمی اسے رفتار کم کرنی پڑتی۔ میں نے موڑ سے گزر کر پھر رفتار میں اضافہ کرنا شروع کیا لیکن ڈچ شاید جنونی کیفیت میں تھا۔ وہ اڑا جا رہا تھا۔ کوشش کے باوجود میں درمیانی فاصلہ کم کرنے میں ناکام رہا۔

میں نوٹ کررہا تھا کہ پتھریلی سڑک پر جہاں کار پٹنگ کے نفیس ٹکڑے آتے وہاں نمی کے باعث ٹائر پھسلنا شروع ہوجاتے تاہم ہم دونوں کو اس امر کا پورا ادراک تھا۔ دوسرا موڑ اتنا مشکل نہیں تھا ہم دونوں آگے پیچھے زناٹے سے گزر گئے لیکن آنے والا تیسرا موڑ مشکل ریس ٹریک کے مانند ہیئر پن ٹرن تھا۔ ڈچ جس رفتار سے جا رہا تھا مجھے یقین تھا کہ وہ اس پیچیدہ موڑ کو عبور نہیں کر سکے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اس کی گاڑی کا پچھلا حصہ بے قابو ہو کر کنارے کی جانب پھسل رہا تھا۔ میں نے ڈچ کو اسٹیئرنگ وہیل سے لڑتے دیکھا لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ گاڑی جس طرح بے قابو ہو کر پھسلی تھی اسے کھائی میں ہی جانا تھا۔ کنارے پر چھوٹی سی ریلنگ سے ٹکراتی ہوئی فورڈ کار گہرائی میں غائب ہوچکی تھی۔

میری رفتار کم ہوتی چلی گئی۔ ڈچ کی کار کے چٹانی پتھروں سے ٹکرانے اور درختوں سے الجھنے کی آوازیں جلد ہی نابود ہوگئیں۔

میں نے گاڑی ایک جانب کھڑی کی اور انجن بند کردیا۔ مجھے بدن میں کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے سگریٹ نکال کر سلگائی اور گہرا کش لے کر اعصاب پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ اس کی کار دور گہرائی میں آگ کی لپیٹ میں تھی۔ اس کی ہلاکت میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی۔ رنگین مزاج ہیرو مر چکا تھا۔

میں جس چیز پر حیران تھا وہ اس کی بے پروائی تھی۔ احمقانہ، بے فکری ...... اس کو جان لینا چاہیے تھا کہ ٹریک پر برق رفتار ریس کے لیے اس کی گاڑی فٹ نہیں تھی۔ اسے رک کر چیک کرنا چاہیے تھا لیکن اس کے اندر مجھے روزا کے سامنے بری طرح ہرانے کا بخار چڑھا ہوا تھا اور مجھے بہ خوبی احساس تھا کہ وہ راستے میں نہیں رکے گا۔ سوئمنگ پول ہو، حسیناؤں کا جھرمٹ ہو، بائیک ریس ہو یا کچھ اور...... بس ایڈی کو شکست دینی ہے۔

''ڈچ، اس مرتبہ تم ہار گئے۔ فتح کے نشے میں سرشار تم یہ محسوس ہی نہیں کر سکے کہ عقبی ٹائروں میں پندرہ پونڈ پریشر کم ہے۔'' میں نے سگریٹ بجھا دی۔



# رقصِ اجل

منظر امام

جب انسان دُہری فطرت کا مالک ہو تو اپنے پرائے میں تمیز نہیں کرپاتا ہمیشہ ''دوسروں کو نصیحت خود کو فضیحت'' والے فارمولے پر عمل کرتا ہے... وہ تمام تر اصول، قواعد وضوابط دوسروں کے لیے ترتیب دیتا ہے اور خود کو بری الذمہ قرار دے کر مطمئن ہوجاتا ہے مگر... ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا ہے اصولی کا دائرہ جب مکمل ہوتا ہے تو اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ دائرہ کتنی خاموشی سے اس کے گرد حصار کھینچتا جارہا ہے کچھ یہی حال ان لوگوں کا تھا جو بہ ظاہر اپنے عیش کدوں میں مصروف تھے مگر دھیمے دھیمے مکافاتِ عمل کی جانب گامزن بھی تھے۔

**اونچی دیواروں میں رہنے والے پست ذہنیت کے شکاریوں کا ماجرا**



چاند کو دیکھنے کا عمل چاند کو روشن تو نہیں کرسکتا۔ لیکن محبت کرنے والے اس کی طرف دیکھ رہے ہوں تو مزید خوبصورت ہوجاتا ہے۔ وہ دونوں بھی اس وقت شاندار حویلی کی چھت پر بیٹھے تھے۔ چندا کے بالوں سے اٹھتی خوشبو دلشان کو بے خود کررہی تھی۔

یہ رانا مکرم کی شاندار حویلی تھی۔ اس کے اردگرد دور دور تک پھیلی ہوئی زمینیں اس کی تھیں۔ بہت کچھ تھا اس کے پاس۔ دولت، طاقت اور شہرت۔ اس نے عرصہ ہوا زمین پر چلنا

چھوڑ دیا تھا۔ اب اس کے پاؤں اپنے کسانوں، ہاریوں اور رعیت کے سینوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔

چندا اس کی اکلوتی بیٹی تھی...... اس سے بڑے دو بھائی تھے، رانا فیاض اور رانا ریاض۔ وہ بھی اپنے باپ ہی کی طرح بے رحم تھے۔ حویلی میں وفادار ملازمین کی پوری فوج ہوا کرتی تھی۔ اگر کوئی بھی مالک کسی سے کہتا۔ "دیکھ، میں نے تیری بہن یا بیٹی کو دیکھا ہے، اچھے ہاتھ پاؤں نکالے ہیں اس نے۔ کل سے خدمت کے لیے حویلی بھیج دینا۔" تو اس کی مجال نہیں تھی کہ وہ انکار کر سکے۔

رانا دلشان۔ رانا مکرم کے سگے بھائی کا بیٹا تھا۔ دلشان کے والدین کا اس کے بچپن ہی میں انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی پرورش اسی حویلی میں ہوئی تھی لیکن اس کی حیثیت گھر کے ملازمین سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ رانا مکرم نے اس کے باپ کی ساری جائداد دیکھ بھال اور نگرانی کے بہانے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ دلشان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے چچا سے اپنے حق کا مطالبہ کر سکے۔ اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ وہ اس حویلی میں رہتا ہے اور اس کے تعلیمی اخراجات پورے ہو جاتے تھے۔

اس کا خیال تھا کہ قسمت جس پر مہربان ہو، اس کی عزت کرنی چاہیے۔ جیسے قسمت اس کے چچا، چاچی اور ان کے بیٹوں پر مہربان تھی، وہ ان کی عزت کرتا تھا۔

وہ چندا کی بھی عزت کرتا تھا، اپنے چچا کی بیٹی چندا کی طرف وہ اس خوف سے نہیں دیکھتا تھا کہ کہیں اس کی یہ حرکت گستاخی نہ سمجھی جائے جبکہ چندا اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ بہت خوبصورت بھی تھی۔

ایک دن خود چندا نے ہی اس سے کہا۔ "دلشان! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم اس حویلی کے ملازم تو نہیں ہو کہ ہر وقت اپنی گردن جھکائے رہتے ہو۔"

"چندا، اس کے علاوہ میں اور کیا ہوں؟" دلشان نے پوچھا۔

"پاگل ہو تم۔ میرے ابا تمہارے چچا ہیں۔ اس حویلی پر تمہارا بھی حق ہے۔ تم بھی برابر کے حقدار ہو۔"

"یہ تو تم کہہ رہی ہو نا...... لیکن وقت کی آنکھیں کسی اور انداز سے دیکھ رہی ہیں۔"

"ان آنکھوں کے زاویے کو تمہاری ہمت، تمہاری طرف بھی کر سکتی ہے۔"

"ایسا ہی تو نہیں ہو سکتا ...... کیونکہ وقت بھی صاحب اختیار اور صاحبِ اقتدار کا ساتھ دیا کرتا ہے۔"

"تم بھی کوشش کر کے وقت کو ساتھ دینے کے لیے تیار کیوں نہیں کرتے؟"

"اس کے لیے وقت کو بہت پیچھے لے جانا ہوگا۔ جب بابا زندہ تھے اور بہت کچھ ہمارے پاس بھی تھا۔"

چندا نے پہلی بار اس سے ایسی باتیں کی تھیں۔ خود دلشان کے لیے بھی چندا کی ایسی باتیں بہت حوصلہ افزا اور خوش گوار تھیں۔ رات تنہا ہوتے ہی وہ چندا کو اپنے دل کے اس گوشے سے باہر نکال کر سامنے والی کرسی پر بٹھا لیتا اور اس سے جی بھر کر باتیں کیا کرتا۔

اس کے چچا رانا مکرم نے حویلی کی دیکھ بھال کا کام اسی کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ اپنی تقدیر پر راضی رہنے والا شخص تو لیکن چندا کی باتوں نے اس کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی برپا کر دی تھی۔ اسے احساس ہونے لگا کہ جس قسم کا جذبہ اس نے چندا کے لیے اپنے دل میں چھپا رکھا ہے، شاید ایسا ہی جذبہ چندا کے دل میں بھی پیدا ہو رہا ہے لیکن اس سرکش جذبے کو کچل دینا ہی زیادہ بہتر ہوگا، کیونکہ وقت اس کے ساتھ نہیں تھا اور جب وقت ساتھ چھوڑ جائے تو سر جھکا دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

اس نے چندا کے پاس جانے میں احتیاط شروع کر دی۔ چندا اگر بلاتی بھی تو وہ کسی کام کا بہانہ کر کے اِدھر اُدھر ہو جاتا۔ وہ جانتا تھا کہ چندا وہ دیوی ہے جس کو اپنے دل کے مندر ہی میں رکھا جا سکتا ہے۔

ایک بار چندا نے حویلی کی چھت کی طرف جاتے ہوئے سیڑھیوں کے پاس رک کر اس سے کہا۔ "دلشان! تم میرے لیے سیب کاٹ کر اوپر لے آؤ۔"

"چندا! میں کسی کے ہاتھ بھیج دیتا ہوں۔"

"نہیں، تم خود لاؤ گے۔" چندا جھلا گئی تھی۔ "میں تم سے کہہ رہی ہوں...... ورنہ کسی اور سے بھی کہہ سکتی تھی۔"

چندا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر چلی گئی۔

حویلی کی چھت اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ وہ چھتری کے نیچے کرسیاں، میز اور اپنی کتابیں وغیرہ رکھ کر بیٹھ جایا کرتی۔

اس کی ہدایت پر دلشان ایک خوبصورت پلیٹ میں اس کے لیے سیب کاٹ کر لے گیا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ اسی وقت چندا نے اچانک اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "بیٹھ جاؤ میرے سامنے۔"

چندا کے ہاتھ کا لمس ایسا تھا کہ دلشان کو کرنٹ سا لگا۔ اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "میں چچا کے پاس بیٹھا ہوں۔" اس نے کہا۔

"بابا کے پاس نہیں، اس وقت میرے پاس بیٹھو۔" چندا کو مجبور کر دینے والا تھا۔

دلشان اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "ہاں کہو، کیا بات ہے؟"

"دلشان! ایسا لگ رہا ہے جیسے تم مجھ سے کترانے لگے ہو؟"

"نہیں تو...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" دلشان جلدی سے بولا۔ "بس فرصت نہیں مل رہی تھی۔"

"بہانے مت بناؤ اور یہ سن لو کہ کل سے تم ہر شام کم از کم گھنٹے بھر، اسی جگہ میرے ساتھ بیٹھا کرو گے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو چندا!" دلشان بوکھلا گیا تھا۔

"ہاں میں نے بابا اور ماما سے بات کر لی ہے۔" چندا نے بتایا۔ "تمہاری انگلش اچھی ہے۔ تم مجھے انگلش پڑھایا کرو گے۔"

"چندا! یہ تم شاید میری موت کا سامان پیدا کر رہی ہو۔" دلشان نے دھیرے سے کہا۔

"کیسی بات کر رہے ہو، کون مارے گا تمہیں؟ جب تک میں زندہ ہوں، کوئی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ بابا نے بھی اجازت دے دی ہے۔ تم چاہو تو ان سے جا کر پوچھ سکتے ہو۔"

دلشان خود تو نہیں گیا تھا لیکن رانا مکرم نے خود ہی اسے اپنے دربار میں بلا لیا تھا۔

یہ دربار حویلی کا باہری بڑا کمرا تھا۔ یہاں زمینوں اور جائداد وغیرہ کے معاملات نمٹائے جاتے تھے۔ اس کمرے کی شان ہی نرالی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ ایک اونچا سا تخت تھا جس پر سفید قالین بچھا رہتا تھا۔ یہ قالین رانا مکرم نے ایران سے منگوایا تھا۔ تخت کے برابر میں کرسیاں تھیں جن پر اس کے خاص لوگ بیٹھا کرتے۔ ان خاص لوگوں میں دلشان کو بھی یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ بھی کسی ایک کرسی پر بیٹھ سکے۔

اس وقت بھی وہ ایک کرسی پر براجمان تھا جبکہ اس کا چچا رانا مکرم تخت پر بیٹھا گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"دلشان!" رانا مکرم کی بھاری بھر کم آواز گونجی۔

"جی چچا!" دلشان نے اس کی طرف دیکھا۔

"دیکھو بھائی، میں تو لڑکیوں کی تعلیم وغیرہ کے سخت خلاف ہوں۔" رانا مکرم نے کہا۔ "لیکن چندا کے سامنے مجبور ہو گیا ہوں۔ اگر اس کو تعلیم نہیں دلواتا تو یہی کہا جاتا کہ رانا مکرم نے اپنی بیٹی کو گھر میں بند کر کے رکھا ہوا ہے۔"

"جی چچا! میں سمجھ رہا ہوں۔"

"اس نے شاید تم سے بات کر لی ہوگی، اگر نہیں کی ہے تو مجھ سے سن لو۔ کل سے تم اسے انگریزی پڑھاؤ گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

"جی چچا! سمجھ گیا ہوں، کل سے میں چندا کو انگریزی پڑھاؤں گا۔" دلشان نے اس کی بات دہرا دی۔

"اور اس کے سامنے بیٹھ کر تم اپنی آنکھوں اور اپنی زبان کو اپنے قابو میں رکھو گے۔" رانا مکرم نے کہا۔

دلشان پہلو بدل کر رہ گیا۔ یہ کہتے ہوئے رانا مکرم کے لہجے میں ایک طرح کی دھمکی تھی۔

چندا نے دلشان کی بات سننے کے بعد ہنستے ہوئے کہا۔ "بس...... بابا کی اتنی سی بات پر تم اتنے پریشان ہو گئے؟"

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے چندا!"

"بزدل ہو تم۔" چندا ناراضی سے بولی۔ "ابھی سے تمہارا یہ حال ہے تو آگے چل کر کس طرح میرا ساتھ دو گے؟"

دلشان کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ چندا نے یہ کیا کہہ دیا تھا...... پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "چندا! کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تم مجھ سے کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں، میں نے یہ بات بہت سوچ سمجھ کر کہی ہے۔" چندا نے ایک گہری سانس لی۔ "تمہیں معلوم ہے میری کیا حیثیت ہے۔ میں سونے کے پنجرے میں قید ایک خوبصورت پرندہ ہوں جس کے پاس سب کچھ ہے سوائے محبت کے...... کیونکہ جہاں میں پڑھتی ہوں، وہاں سب جانتے ہیں کہ میں کس کی بیٹی ہوں...... میری طرف دیکھنے والوں کی آنکھیں نکال لی جائیں گی اسی لیے کوئی میری طرف نہیں دیکھتا۔"

دلشان کو اندازہ ہو رہا تھا کہ چندا کے سینے میں کیسی آگ لگی ہے جو سب کو جلا کر خاک کر سکتی ہے۔

"اور جانتے ہو کہ میں نے اپنی زندگی کے ساتھی کے لیے تمہارا انتخاب کر لیا ہے۔" چندا نے بتایا۔

"چندا! ایسا شاید ممکن نہ ہو سکے۔" دلشان نے کہا۔

"کیوں ممکن نہیں ہے؟" چندا جھلا کر بولی۔ "تم چاہے زبان سے کچھ نہ کہو لیکن تمہاری آنکھیں بہت کچھ بتاتی ہیں۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔"

"چندا! مجھے اپنی حد معلوم ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ آج سے نہیں، برسوں سے۔ تمہیں اپنے خیالوں اور خوابوں میں بہت احتیاط سے رکھا ہوا ہے۔ اس کے باوجود حالات نے میرے اور تمہارے درمیان ایک لکیر کھینچ رکھی ہے۔"

"میں ایسی باتوں کو نہیں مانتی۔" چندا بولی۔ "دلشان، ہمارے یہاں کیا دیکھا جاتا ہے، یہی نا کہ فلاں کا تعلق کس

خاندان سے ہے۔ جبکہ تمہارے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہے، بابا تمہارے سگے چچا ہیں...... انہیں اور کیا چاہیے۔"
"اور بھی بہت کچھ چاہیے۔" دلشان دھیرے سے بولا۔ "وسیع وعریض زمینیں چاہئیں، شاندار حویلی، دولت چاہیے اور یہ سب کچھ تمہارے خالہ زاد شوکت کے پاس ہے۔ شوکت شاہ، جو خود بھی ایک بڑا جاگیردار ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے پہلے بھی شادی کر رکھی تھی لیکن اس سے کیا ہوتا ہے......"
"کیا تمہارے نزدیک محبت، پسند وناپسند کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟" چندا نے پوچھا۔
"میری بات مت کرو، چچا اور چاچی کے پوائنٹ آف ویو سے دیکھو۔" دلشان نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے تمہارے لیے شوکت شاہ کا انتخاب کر رکھا ہے۔"
"یہ تمہیں کیسے معلوم؟" چندا نے حیرت اور دکھ سے پوچھا۔
"میں نے ان دونوں کی باتیں سنی ہیں۔" دلشان نے بتایا۔

☆☆☆

شوکت شاہ جھول کر رہ گیا تھا۔ اگر نیلم کے بازو اسے سہارا نہ دیتے تو شاید وہ لڑکھڑا کر گر پڑتا۔ "شاہ جی۔ اب اتنی بھی نہ پی لیا کریں کہ آپ کو سنبھالنا پڑ جائے۔"
"جانتا ہوں میں......" شوکت شاہ کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ "لیکن جب تم جیسا سنبھالنے والا ہو تو پھر کسے پروا ہوتی ہے۔"
نیلم مسکرا کر رہ گئی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے ٹھوکریں کھانے کے بعد یہ سیکھ لیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ قیمت کس طرح وصول کی جاتی ہے۔ اسی لیے اب یہ شاندار سجا ہوا اپارٹمنٹ اس کا اپنا تھا۔ نیچے کھڑی ہوئی ایک خوبصورت گاڑی تھی اور اس کے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے تھے کہ وہ اپنی زندگی بہ آسانی گزار سکتی تھی۔
یہ سب کچھ شوکت شاہ نے اسے دیا تھا۔
"ایک پیگ اور دیدے یار!" شوکت شاہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔
"نہیں شاہ جی! اب نہیں۔" نیلم نے کہا۔ "ورنہ میں واپس جانے کے قابل نہیں رہوں گی۔"
"میری جان! اب یہاں سے واپس کون جانا چاہتا ہے۔" شوکت شاہ اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔
شوکت شاہ کے مزاج میں ہرجائی پن بھی تھا۔ بہت دولت تھی اس کے پاس۔ اس کے باپ نے اس کی شادی خاندان کی ایک لڑکی صوفیہ سے کرادی تھی۔ شوکت شاہ اس شادی سے بیک وقت بےزار بھی تھا اور مطمئن بھی۔ بےزار اس لیے تھا کہ صوفیہ اس کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی، گھریلو لڑکی تھی۔
شوکت شاہ کو اطمینان اس لیے تھا کہ شادی کے بعد بھی اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ صوفیہ سے اپنا رشتہ ختم نہیں کرے گا۔ اس پر بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ صوفیہ اس کی بیوی بن کر ایک طرف حویلی میں پڑی ہوئی تھی لیکن یہ کیفیت سال دو سال ہی رہی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ سب کچھ بدلنا شروع ہوگیا۔
نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی، کون سا لمحہ تھا جب صوفیہ شوکت شاہ کے دل میں اترنا شروع ہوگئی، شاید اس کا صبر رنگ لا رہا تھا۔ شاید شوکت شاہ کو احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ زیادتیاں کرتا آ رہا ہے یا اسے یہ احساس ہوگیا تھا کہ زندگی کے سفر میں جائز رشتے ہی ساتھ دیا کرتے ہیں اور ایک وقت ایسا آیا جب شوکت شاہ نے باہر کے سارے رشتے ختم کردیے، وہ صوفیہ ہی کا ہو کر رہ گیا۔ اس کے گھر والے بھی اس کی اس تبدیلی سے بہت خوش تھے جبکہ صوفیہ کا یہ حال تھا کہ اس کے قدم زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ اسے اس کی وفاؤں کا صلہ ملنے لگا تھا۔ اور جب شادی کو دو سال ہوگئے تو اچانک صوفیہ کی موت واقع ہوگئی۔ کسی کو اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ اس نے اپنے وجود میں کینسر جیسے مرض کا زہر اتار رکھا ہے۔
اس کی موت نے شوکت شاہ کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی سے اتنی شدید محبت کی تھی۔ لیکن وہی محبت اس سے چھن گئی تھی۔ اس سانحے کے بعد وہ بہت دنوں تک سنبھل نہ سکا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے دوستوں نے اسے زندگی کی طرف واپس بلا لیا تھا۔ اس کی نیلم سے کراچی میں ملاقات ہوئی پھر اس کے لیے اس نے ایک اپارٹمنٹ خرید لیا تھا۔
اسی دوران اس نے ایک بار چندا کو دیکھا اور چونک اٹھا۔
چندا اس کے لیے غیر نہیں تھی، اس کی خالہ کی بیٹی تھی۔ کبھی کبھی تقریبات میں بھی ملاقات ہوجایا کرتی۔ لیکن اس دن جب وہ اس کے سامنے آئی تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ اسی وقت اس نے فیصلہ کرلیا کہ تفریح کے لیے تو نیلم بہتر ہے لیکن بیوی کے لیے اسے چندا سے اچھی کوئی نہیں مل سکتی۔
اس نے یہ بات اپنی ماں تک پہنچائی۔ اس کی ماں نے اپنی بہن چندا کی ماں سے یہ رشتہ مانگ لیا تھا۔ چندا کی ماں کو اس لیے اعتراض نہیں تھا کہ شوکت شاہ کا باپ، عظمت شاہ اس کے شوہر رانا مکرم سے کسی طور کم نہیں تھا۔
نیلم نے شوکت شاہ کے سر کو دباتے ہوئے پوچھا۔ "شاہ صاحب! اگر آپ نے شادی کرلی تو پھر میری کیا حیثیت ہوگی؟"
"وہی جو آج ہے۔" شوکت شاہ نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بتایا۔ "تم اپنی جگہ، وہ اپنی جگہ۔"
"ہائے......" نیلم نے ایک گہری سانس لی۔ "خدا جانے مردوں کے دل میں اتنی گنجائش کہاں سے ہوجاتی ہے۔ بیک وقت میں کئی مہمان رکھ لیتے ہیں۔ ویسے ایک بات بتائیں شاہ جی! آپ کی یہ خالہ زاد ہے کیسی؟"
"اس کا نام ہے چندا...... اور چندا ہی جیسی ہے۔" شوکت شاہ نے اپنی آنکھیں بند کرلیں جیسے وہ تصور میں چندا کو اپنے روبرو دیکھ رہا ہو۔

☆☆☆

چاند روشن تھا اور اس وقت بھی دلشان اور چندا دونوں چھت پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہیں چاند پر تھیں۔
دلشان نے اب پوری طرح چندا کی محبت قبول کرلی تھی۔
چندا کی محبت اتنی طاقت ور تھی کہ دلشان اس جذبے کے سامنے بےبس ہو کر رہ گیا تھا۔ دلشان کو آنے والے کل سے کوئی خوف نہیں تھا۔
دونوں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت دربار میں ان کی محبت کے خلاف کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔ اس وقت چندا کے والدین اور دونوں بھائی چندا اور شوکت شاہ کے رشتے کے سلسلے میں غور کر رہے تھے۔
"مصیبت یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں شوکت شاہ کے علاوہ کوئی لڑکا بھی نہیں ہے۔" رانا مکرم نے کہا۔ "اگرچہ وہ عمر میں بہت بڑا ہے۔ اس کی ایک شادی بھی ہوچکی تھی۔ اس کے علاوہ ہماری نگاہیں اسی کی طرف جا رہی ہیں۔"
"میں بھی تو یہی کہہ رہی تھی۔" چندا کی والدہ نگہت نے کہا۔ "ویسے تو دلشان بھی ہے......"
"ماما! وہ تو ہمارے ٹکڑوں پر پل کر جوان ہوا ہے۔" رانا فیاض بول پڑا۔
رانا مکرم پہلو بدل کر رہ گیا۔ شاید دل کے کسی گوشے میں احساس جاگا ہو کہ دلشان کے باپ کے پاس بھی بہت کچھ تھا پھر اس نے اپنے اس احساس کو تھپک کر سلا دیا۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ "تم نے عظمت شاہ سے بات کی تھی؟"
"ہاں، میں ان سے بات کرچکی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں۔"
"اور خود چندا کا کیا خیال ہے؟" فیاض نے پوچھا۔
"کیا پاگل ہوگئے ہو؟" رانا مکرم نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ "ہمارے خاندان میں لڑکیاں اپنی پسند ناپسند نہیں بتاتیں، صرف گردنیں جھکاتی ہیں۔"
"ماما! میں ایک بات کہوں؟" فیاض اپنی ماں سے مخاطب ہوا۔ "یہ آپ نے دلشان کے ذمے چندا کو پڑھانے کا کام سونپ کر اچھا نہیں کیا۔ وہ دونوں گھنٹوں چھت پر تنہا بیٹھے رہتے ہیں۔"
"تو کیا ہوا؟ دلشان میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ کچھ الٹا سیدھا سوچ سکے۔" ماں نے تسلی دی۔
"نہیں ماما! یہ آگ اور پیٹرول کا ملاپ ہے۔" ریاض بھی بول پڑا۔ "الگ کریں دونوں کو۔"
"میرے بیٹے ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" رانا مکرم نے ہنکارا بھرا۔ "منع کردو اس کو۔"
کچھ دیر بعد دلشان، رانا مکرم کے سامنے گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ "جی چچا! کیسے یاد کیا آپ نے؟"
"تم آج سے چندا کو پڑھانا ختم کردو۔" رانا مکرم نے کہا۔
"چچا۔ اس کا امتحان سر پر ہے۔"
"جہنم میں ڈالو اس کے امتحان کو۔" نگہت بول پڑی۔ "ہم نے اس کی شادی طے کردی ہے شوکت شاہ سے۔ ان لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ تم چندا کو پڑھانے کے لیے اس کے پاس بیٹھے رہتے ہو تو وہ برا مان جائیں گے۔"
دلشان اپنے ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

☆☆☆

اس دن کے بعد سے دونوں پر پابندی لگادی گئی تھی۔ جبکہ ایک شام دونوں کو تھوڑا سا موقع مل گیا تھا۔
"شاید میں ایسا نہ کرسکوں۔"
"بزدل مت بنو۔ محبت کی ہے تو اس کو نبھانا بھی سیکھ لو۔"
دلشان نے گردن جھکالی۔ وہ اس روز حویلی کی چھت پر بیٹھے آنے والے خدشات سے ایک دوسرے کو آگاہ کر رہے تھے کہ اسی وقت حویلی کی چھت بھاری قدموں کی آہٹ سے لرز اٹھی۔ دونوں بھائی ان سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ انہیں ان کے آنے کا احساس بھی نہ ہوسکا تھا۔
دونوں کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ وہ غصے سے

لرز رہے تھے۔ "کیا کر رہی تھی تو......؟" رانا ریاض زور سے دہاڑا۔

"کچھ نہیں بھائی!" چندا کا لہجہ پرسکون تھا۔ "دلشان کسی بات پر رو رہا تھا، میں اسے چپ کرا رہی تھی۔"

"اب تو اسے ساری زندگی رونا ہی ہے۔" رانا ریاض نے کہا پھر اپنے بھائی فیاض کی طرف دیکھا۔ "بھائی، ان دونوں کو کھینچتے ہوئے بابا کے پاس لے چلو۔"

ذرا سی دیر میں ان دونوں کو رانا مکرم کے دربار میں پہنچا دیا گیا۔ رانا اس وقت کسی شیر کی طرح دہاڑ رہا تھا۔ اس کے حکم پر چندا کو اس کے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا جبکہ اس کے سامنے صرف دلشان کھڑا رہ گیا تھا۔

"میں نے تجھ سے کہا تھا ناں کہ اپنی آنکھوں اور اپنی زبان کو قابو میں رکھنا۔" رانا مکرم نے کہا۔

"چچا! میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے جس سے آپ کی عزت پر حرف آتا ہو۔" دلشان ہمت کر کے بولا۔

"بابا! اس نے جو کچھ کیا ہے، یہ اسے جرم ہی نہیں سمجھ رہا۔" رانا فیاض نے غصے سے کہا۔

محبت کی طاقت نے دلشان کے منہ میں زبان دے دی تھی۔ "میں نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا۔ میں نے چندا سے محبت کی ہے، میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں بھی اسی خاندان کا فرد ہوں۔ میں بھی رانا ہوں، رانا دلشان۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اب تک خود کو اپنی حد میں رکھا ہے۔"

"اوہ...... بولنا آ گیا ہے تجھے۔" رانا مکرم غرایا "جا...... تو اپنے کمرے میں جا۔ تیرا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ اس وقت تو ہٹ جا میرے سامنے سے ورنہ میں غصے میں کوئی بھی فیصلہ کر سکتا ہوں۔"

دلشان کے جانے کے بعد نگہت نے کہا۔ "دیکھ لیا...... میں نے کہا تھا ناں کہ یہ آستین کا سانپ نکلے گا۔ اب میں شوکت شاہ کو کیا جواب دوں گی؟"

"ماما! آپ کو کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" رانا فیاض جلدی سے بولا۔ "یہ کہانی اس حویلی سے باہر نہیں جانی چاہیے۔" نہ جانے رانا فیاض نے کیا سوچا تھا۔

"تو پھر اس کم بخت کا کیا، کیا جائے؟" ماں نے پوچھا۔

"ماما، ہمارے یہاں ایک کام بہت زیادہ ہوا کرتا ہے۔" اب کی دفعہ ریاض نے کہا۔ "اور وہ ہے غیرت کے نام پر قتل۔" فیصلہ ہو گیا تھا کہ رشتے سے زیادہ غیرت کی اہمیت ہے اور غیرت سے زیادہ دولت کی۔

نصیبن نام تھا اس بوڑھی ملازمہ کا جس نے اتفاقاً وہ فیصلہ سن لیا تھا اور اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ وہ برسوں سے اس حویلی میں کام کر رہی تھی۔ اسی نے دلشان کو اپنی گود میں کھلایا تھا۔ جب اس نے یہ سنا کہ اس کے لیے کیا فیصلہ کیا گیا ہے تو اس سے برداشت نہیں ہو سکا۔ وہ دلشان کے پاس پہنچ گئی۔ نصیبن کو دیکھ کر اس نے احترام سے پوچھا۔ "خیریت تو ہے اماں، اس وقت کیسے آ گئیں؟"

"بیٹا۔ میں تمہارے لیے ایک بری خبر لے کر آئی ہوں۔ تمہاری جان کو خطرہ ہے۔"

"کیسا خطرہ اماں!" دلشان کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ ویسے اسے اندازہ ہو گیا تھا۔

"بیٹا۔ ان لوگوں نے تمہاری موت کا سامان کر لیا ہے۔" نصیبن نے جو باتیں سنی تھیں وہ سب دلشان کو بتا دیں۔

دلشان کو اندازہ تو تھا کہ اس کے ساتھ سختی کی جائے گی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ بات اس حد تک آگے چلی جائے گی۔

"تمہارے پاس سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ اپنی جان بچا کر یہاں سے نکل جاؤ۔" وہ پریشانی میں بولیں۔ "ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

"اماں، ایک کام کر سکتی ہو...... صرف دس منٹ کے لیے، صرف دس منٹ کے لیے، چندا سے کہو کہ وہ مجھ سے مل لے۔"

"کہاں مل لے؟"

"پچھلے باغ میں۔" دلشان نے بتایا۔ "وہ باغ میں آ جائے، میں اس سے آخری ملاقات کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"ویسے بیٹا، یہ بہت مشکل ہوگا لیکن میں کوشش کرتی ہوں۔"

دلشان نے جلدی جلدی اپنی تمام اہم چیزیں سمیٹ لیں۔ فی الحال ان لوگوں نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ دلشان فرار بھی ہو سکتا ہے اسی لیے ابھی اس پر کوئی پہرا نہیں لگایا گیا تھا۔ وہ تمام چیزیں سمیٹ لینے کے بعد اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

اسے پچھلے باغ تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔

اس وقت مسئلہ اپنی زندگی بچانے کا تھا۔

کوئی خشک پتوں پر چلتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ چوکنا ہو گیا۔ آنے والی چندا تھی جس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ بھی تھا۔ وہ دلشان کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ "چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔" اس نے کہا۔

"تم......!" دلشان حیران رہ گیا تھا۔ "تم میرے ساتھ کہاں جاؤ گی؟"

"جہاں تم جاؤ گے۔" چندا نے کہا۔ "جس وقت اماں نے آ کر بتایا، میں نے بھی اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا۔ یہاں ہر طرف موت ہے اور دولت اور جائداد کی ہوس رقص کر رہی ہے۔ رشتے ختم ہو گئے ہیں۔"

"کیا تم میرے ساتھ رہ سکو گی؟"

"ہم نے وعدہ تو یہی کیا ہے ناں؟" چندا نے کہا۔ "اب چلو سوچنے اور بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ کسی وقت بھی انہیں خبر ہو سکتی ہے۔"

انہوں نے باغ کے پچھلے گیٹ کی طرف قدم بڑھائے اور اسی وقت رانا ریاض اور رانا فیاض ان کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

☆☆☆

اس وقت رانا مکرم کے دربار کی کارروائی بہت اہم تھی۔ اس دربار میں دلشان کے ساتھ ساتھ چندا بھی گردن جھکائے کھڑی تھی۔ وہ ایک مجرم تھی، اس وقت تمام رشتے ختم ہو گئے تھے۔ نام نہاد غیرت کا بھوت ان کے سروں پر مسلط ہو گیا تھا۔

"ذلیل لڑکی!" رانا مکرم دہاڑا تھا۔ "تو نے اس خاندان اور اس حویلی کی عزت کو برباد کرنے کی کوشش کی ہے، تجھے معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

"بابا! جب اس حویلی میں آپ کے یہ دونوں لاڈلے عیاشیاں کرتے ہیں تو اس وقت حویلی کی عزت کہاں چلی جاتی ہے؟" چندا بے خوف ہو کر بول رہی تھی۔

"خاموش ہو جا۔" ماں غصے سے بولی۔

"واہ ماما، واہ! کیا ہے تمہارا انصاف۔ اس حویلی کے لڑکے جب عیاشیاں کرتے پھریں تو کوئی بات نہیں اور جہاں کسی لڑکی نے جائز طور پر اپنی محبت کی طرف قدم بڑھایا وہاں [illegible] ہونے لگیں...... کیوں؟"

"بے شرم!" فیاض تڑخ کر بولا۔ "ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آئی تجھے۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا ہے بھائی!" چندا نے کہا۔ "تم ذرا ایمانداری کے ساتھ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔"

"بابا! اس کی زبان کھینچ لیں۔" ریاض کسی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔

"نہیں، ہم ایسا نہیں کر سکتے...... کیونکہ آخر یہ ہماری بیٹی ہے۔ اس کے لیے اب یہی بہتر ہے کہ ہم اس کی شادی اسی دلشان سے کرا کے حویلی اور بستی سے باہر نکال دیتے ہیں...... لیکن اس کو ہماری جائداد اور دولت میں سے ایک پائی بھی نہیں ملے گی۔"

"مجھے منظور ہے بابا!" چندا جلدی سے بولی۔ "مجھے ایسی دولت سے ایک پائی بھی نہیں چاہیے۔"

"بابا۔ یہ کیسا فیصلہ ہے؟" رانا ریاض احتجاج کر رہا تھا۔ "یہ تو کوئی سزا نہیں ہوئی؟"

"میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔" رانا مکرم [illegible]ا۔ "ان دونوں کی شادی شکارگاہ والے مکان میں ہوں اور وہیں سے ان دونوں کو باہر نکال دیا جائے گا۔"

شکارگاہ والا مکان حویلی سے بہت فاصلے پر تھا۔ اس کے چاروں طرف اونچے اونچے درخت تھے۔

ان دونوں کو اسی رات شکارگاہ والے مکان میں پہنچا دیا گیا تھا۔ دلشان اس صورت حال سے بہت الجھا ہوا تھا۔ ان دونوں کو ایک ہی کمرے میں رکھا گیا تھا۔ مکان کے باہر رانا مکرم کے آدمی پہرا دے رہے تھے۔

"چندا! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ چچا نے کچھ ایسا فیصلہ کیا ہوگا۔" دلشان بے یقینی سے بولا۔ "یہاں تو ہماری حیثیت قیدیوں جیسی ہے۔"

"دلشان! تمہارا اندیشہ غلط نہیں ہے۔" چندا دھیرے سے بولی۔ "معاملہ کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔ بابا کے تیور میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ ان کی مسکراہٹ میں بلا کی بے رحمی دکھائی دے رہی تھی۔"

"آخر یہ لوگ ہمارے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" دلشان جھلا کر بولا۔

"دلشان، کسی طرح یہاں سے نکلنے کی سوچو۔" چندا نے کہا۔ "مجھے آثار اچھے نہیں دکھائی دے رہے۔ میں نے ابھی کھڑکی سے رشیدا کو دیکھا ہے۔"

"کون رشیدا؟"

"وہی، بابا کا وفادار۔ نہ جانے بابا کے حکم پر وہ کتنے آدمیوں کو قتل کر چکا ہے۔"

"لیکن وہ یہاں کیوں آیا ہے؟" دلشان بوکھلا کر بولا۔

"اتنی سی بات سمجھنے کے لیے زیادہ عقل کی ضرورت نہیں ہے دلشان۔ بابا کا منصوبہ سمجھ میں آ گیا ہے۔ انہوں نے رشیدا کے ہاتھوں ہم دونوں کو مارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پتا نہیں کیسے ماں باپ ہیں جنہوں نے اپنی بیٹی کی محبت کو بھی اپنے دل اور ذہن سے جھٹک دیا ہے۔ اب یہ لوگ صرف اندھیرا پھیلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔" چندا نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''ہاں، شاید ایسا ہی ہے۔'' دلشان نے دھیرے سے کہا۔

''اب بتاؤ، ہم اب کیا کر سکتے ہیں؟'' چندا نے پوچھا۔

ابھی دونوں سوچ ہی رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ جاں نثار رشیدا اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ کھڑا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد رشیدا نے دونوں ساتھیوں کو کچھ کہہ کر باہر بھیج دیا اور اپنی جیب سے پستول نکال کر اس کا رخ ان دونوں کی طرف کر دیا۔ فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا تھا لیکن اس کے برعکس رشیدا چندا سے کہہ رہا تھا۔ ''بی بی! یہ پستول لو اور مجھے گولی مار دو۔''

''کیا......!'' دلشان اور چندا دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔

''ہاں بی بی! یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میں تم دونوں کو مار کر تمہاری لاشیں کہیں دفن کر دوں۔'' رشیدا نے کہا۔ ''تم دونوں میری اولاد کی طرح ہو۔ خدا جانے رانا صاحب نے ایسا حکم کیوں دیا...... لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ تم دونوں یہاں سے بھاگ جاؤ، کہیں دور چلے جاؤ۔''

''رشیدے! ہم تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھلائیں گے۔'' دلشان نے کہا۔

''اب دیر مت کرو رانا دلشان! نکل لو...... اور جاتے جاتے مجھے گولی مار جاؤ۔ تاکہ میں ان لوگوں کو یہ بتا سکوں کہ تم دونوں نے مجھ پر قابو پالیا تھا اور مجھے زخمی کر کے چلے گئے۔''

دلشان نے کانپتے ہاتھ سے پستول لے لیا تھا۔

''رشیدا! تم کیسے آدمی ہو۔'' چندا کہہ رہی تھی۔ ''ایک وہ ہے، میرا اپنا سگا باپ جو میرا خون کروانا چاہتا ہے اور ایک تم ہو کہ اپنی جان پر ظلم کر کے ہمیں بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

اگلے ہی لمحے کمرے میں فائر کی آواز گونج اٹھی۔

☆☆☆

وہ دونوں کسی نہ کسی طرح کراچی آنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

یہ شہر ان دونوں کے لیے نیا نہیں تھا۔ چندا کے باپ رانا مکرم کی ایک شاندار کوٹھی یہاں بھی تھی۔ وہ لوگ جب تفریح کے لیے کراچی آیا کرتے تو اپنی ہی کوٹھی میں ان کا قیام ہوتا تھا۔

وہ جس وقت کراچی کینٹ پر اترے، اس وقت رات ہو چکی تھی۔ ''دلشان! اب ہم کہاں جائیں؟''

''ظاہر ہے، کسی ہوٹل ہی میں جا سکتے ہیں۔'' دلشان نے کہا۔

''نہیں، میرا خیال ہے کہ ہم بابا کی کوٹھی پر چلتے ہیں۔'' چندا نے کہا ''وہاں ملازمین تو ہیں لیکن ابھی انہیں کیا معلوم ہوگا کہ ہم کن حالات میں یہاں تک آئے ہیں؟ اس کے بعد آگے دیکھی جائے گی۔''

''یہ اچھا آئیڈیا ہے۔'' دلشان نے کہا۔ ''چلو وہیں چلتے ہیں۔''

وہ ایک ٹیکسی میں رانا مکرم کی شاندار کوٹھی میں آ گئے۔ اس کوٹھی میں کئی ملازمین ہر وقت رہا کرتے تھے لیکن اس وقت وہ دونوں گیٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی رک گئے۔

''ٹھہرو......'' دلشان نے چونکتے ہوئے کہا تو چندا کے بڑھتے قدم رک گئے۔

''کیا ہوا دلشان؟''

''ہمارا اس کوٹھی میں جانا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو......'' چندا نے بھی اس کے خیال کی تائید کی۔

پھر دونوں اپنی ہی کوٹھی کے گیٹ سے آگے بڑھ گئے۔ ان کے لیے گو تمام دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ انہیں فرار ہوئے دوسرا دن ہو چکا تھا۔ ممکن تھا کہ انہوں نے رشیدا کی بات پر یقین نہ کیا ہو۔ بہرحال ان دونوں کی تلاش شروع کر دی گئی ہوگی۔

''چندا! میں ایک بات بتاؤں۔'' دلشان نے کسی خیال کے تحت کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ انہیں یقین ہوگا کہ ہم یہاں ضرور آئیں گے۔''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''یہ میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ ایک آدمی بہت دیر سے ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔'' دلشان نے بتایا۔

''کہاں؟'' یہ سن کر چندا بوکھلا گئی تھی۔

''پریشان مت ہو۔'' دلشان نے کہا۔ ''وہ اکیلا آدمی ہے۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔''

''کیوں نہ ہم ٹیکسی کر لیں؟''

''لیکن ہم جائیں گے کہاں؟ ہماری تو کوئی منزل ہی نہیں ہے۔''

اسی دوران اس آدمی کی رفتار تیز ہو گئی۔ وہ ان کے قریب آتا جا رہا تھا۔ چندا نے دلشان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''رک جائیں صاحب، رک جائیں۔'' اس آدمی نے آواز دی۔

وہ ان کے قریب آ گیا تھا۔ ''کیا بات ہے؟'' دلشان نے پوچھا۔

''دلشان صاحب آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا۔ میں نفیسہ کا چھوٹا بھائی ہوں۔''

اس وقت دلشان اور چندا دونوں کو یاد آ گیا تھا کہ یہ کون



کبھی کبھی حویلی میں آیا کرتا تھا، جس بوڑھی ملازمہ نصیبن نے ان دونوں کو رانا مکرم کے ارادوں کے بارے میں بتایا تھا، یہ شخص اسی بوڑھی ملازمہ کا بیٹا تھا۔

''ہاں، میں نے پہچان لیا ہے۔'' دلشان نے کہا۔ ''تم بوا نصیبن کے بیٹے ہو...... اور تمہارا نام شاید دلدار ہے۔''

''خدا آپ کا بھلا کرے صاحب! میں وہی ہوں۔ اماں نے آپ کی طرف بھیجا تھا۔ انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ لوگ اگر شہر کی طرف آئے تو سیدھے کوٹھی کی طرف آئیں گے۔ میں یہاں آ کر آپ لوگوں کے انتظار میں ایک طرف چھپا ہوا کھڑا تھا۔ آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟''

''کہیں بھی چلے جائیں گے۔'' چندا نے کہا۔

''نہیں بی بی! اس طرح تو نہیں جانے دوں گا۔ اس شہر میں میرا ایک کوارٹر ہے۔ آپ ہی لوگوں کا دیا ہوا۔ وہاں کوئی بھی نہیں ہوتا۔ جب تک دل چاہے وہاں رہیں۔''

چندا اور دلشان ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ دلدار!'' دلشان نے اس کی طرف دیکھا ''اس وقت تم فرشتہ بن کر ہم سے ملے ہو۔''

☆☆☆

وہ دو کمروں کا ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا۔

اس میں ضرورت کی بہت کم چیزیں تھیں۔ اس کے باوجود وہ ان دونوں کی خدمت میں بچھا جا رہا تھا۔

اس نے ایک کمرا ان دونوں کے لیے صاف کر دیا تھا۔ پلنگ پر دری اور سفید چادر بچھا دی تھی۔ ان دونوں کے لیے جلدی جلدی چائے بنائی تھی اور قریب کی بیکری سے ناشتے کا سامان بھی لے کر آ گیا تھا۔

''دلدار! تم یہ سب کیا کرنے لگے؟'' چندا نے کہا۔

''پہلی بار تو آپ دونوں کی خدمت کا موقع مل رہا ہے بی بی جی۔ خدا کے لیے کسی بات پر منع مت کیجیے گا۔ ورنہ دل ٹوٹ جائے گا۔''

''اچھا چلو، منع نہیں کرتے۔'' دلشان ہنس کر بولا۔

''ایک بات اور ہے صاحب جی، اگر آپ برا نہ مانیں تو......''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ جب تک یہاں رہیں، بہت چھپ کر رہیے گا۔'' اس نے کہا۔ ''آپ دونوں کو مجھ غریب کے کوارٹر میں دیکھ کر لوگ نہ جانے کیسی باتیں کرنے لگیں۔ بس دن کے وقت باہر نکلنے میں احتیاط کیجیے گا۔''

دلدار ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس بستی میں آنے کے بعد دلشان اور چندا دونوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ یہاں کے باسیوں سے میچ نہیں کرتے۔

ایک دو گھنٹوں کی بات اور تھی لیکن کچھ دنوں کے لیے یہاں رہ جانا ان کے لیے ضرور مسئلہ پیدا کر سکتا تھا۔

''دلدار! تم میرے لیے ایک کام کرو۔'' دلشان نے کہا۔ ''تم کسی اچھے علاقے میں کرائے کا کوئی مکان ڈھونڈ دو بلکہ فلیٹ مل جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ اتنے پیسے ہیں ہمارے پاس کہ کرایہ اور ایڈوانس وغیرہ ادا کر سکیں۔''

''پھر تو کوئی پرابلم ہی نہیں صاحب! میں کل ہی فلیٹ کا بندوبست کر دیتا ہوں۔''

''تمہاری مہربانی ہوگی۔''

دلدار فلیٹ کا بندوبست کرنے اسی وقت چلا گیا تھا۔

''چندا! یہ زندگی بھی کیا چیز ہوتی ہے۔'' دلشان نے کہا۔ ''ہم اس کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا کیا جتن کرتے ہیں، صرف ایک امید پر کہ شاید ہمارا کل آج سے بہتر ہو۔''

''مجھے یقین ہے کہ ضرور بہتر ہوگا۔'' چندا ایک عزم کے ساتھ بولی۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ آج ہمارے پاس کچھ نہیں ہے لیکن ہمارے پاس محبت کی طاقت ہے۔ ہم اس کے سہارے زندگی گزار سکتے ہیں۔''

''اور محبت ہی ہے جس کا ہاتھ تھام کر ہم اتنی دور نکل آئے ہیں۔'' دلشان نے کہا۔

''دلشان! اگر ممکن ہوتا تو ہم قریب کی مارکیٹ سے ضرورت کی چیزیں خرید لیتے مگر افسوس کہ ہم باہر نہیں نکل سکتے۔''

وہ اس وقت چونک اٹھے جب دروازے کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ ''چندا! لگتا ہے ہم دلدار سے دھوکا کھا گئے۔'' دلشان نے کہا۔

''کھڑکی سے دیکھو۔'' چندا گھبرا کر بولی۔

کھڑکی سے باہر گلی کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ تین آدمی تھے جو دروازے پر زور زور سے دستک دے رہے تھے۔ ان میں دلدار نہیں تھا۔

دروازے کے سامنے ایک ہائی روف بھی کھڑی تھی۔ دستک کے جواب میں دروازہ نہ کھلنے پر وہ تینوں آپس میں کچھ باتیں کرنے لگے پھر اسی وین میں جا کر بیٹھ گئے اور وین ایک طرف روانہ ہو گئی تھی۔

''یہ معاملہ تو کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے چندا!'' دلشان گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''اگر دلدار نے دھوکا دیا ہوتا تو آنے والے دروازہ کھلنے یا نہ کھلنے کی پروا نہیں کرتے۔''

"ویسے بھی دلدار باہر سے تالا لگا کر گیا ہوگا۔" چندا نے کہا۔ "خدا جانے ان لوگوں نے اس کی طرف دھیان کیوں نہیں دیا۔"

کچھ دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ دلدار ہاتھوں میں شاپرز لیے اندر آرہا تھا۔ شاید وہ ان دونوں کے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر آیا تھا۔

"لیں صاحب! آپ کا کام بن گیا۔" اس نے شاپرز ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "کل صبح، فلیٹ دیکھنے جانا ہے۔"

"بہت اچھے۔ یہ تو بہت اچھا کام کیا۔" دلشان نے کہا۔

لیکن دوسری صبح کہیں جانے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی۔ وہ ابھی ناشتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ اچانک کچھ مسلح افراد دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ انہوں نے ذرا سی دیر میں چندا اور دلشان کو قابو میں کرلیا تھا۔ جبکہ دلدار کچھ فاصلے پر کھڑا ہنس رہا تھا۔

"کمینے!" دلشان دہاڑا۔ "یہ سب تیری سازش ہے۔ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تو ہمیں دھوکا دے گا۔"

"تو پھر دیر کیوں کردی صاحب!" دلدار طنزیہ انداز میں بولا۔ "جب سمجھ ہی گئے تھے تو اسی وقت بھاگ جاتے!"

"نمک حرام!" چندا زور سے چلائی۔ "یاد رکھ۔ تجھے اس نمک حرامی کی سزا ضرور ملے گی۔"

"کون دے گا سزا؟" دلدار ہنس کر بولا۔ "تم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے نمک حرامی کی ہے لیکن جب پانچ لاکھ مل رہے ہوں تو پھر کون نمک حرامی اور نمک حلالی کی پروا کرتا ہے۔"

"کیا بکواس کررہا ہے کتے!" دلشان دہاڑا۔

"دلشان صاحب، میں نے تمہاری محبوبہ کو ان لوگوں کے ہاتھوں پانچ لاکھ میں بیچ دیا ہے۔"

دلشان نے اس کی طرف جست لگانے کی کوشش کی لیکن اس کے سر پر پستول کا دستہ اتنی زور سے مارا گیا کہ وہ بے ہوش ہوکر ایک طرف لڑھک گیا۔

☆☆☆

آنسو خشک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

وہ مسلسل رو رہی تھی۔ نہ جانے موت اس وقت اس سے اتنے فاصلے پر کیوں چلی گئی تھی جب دو ہٹے کٹے لوگ باری باری اس کے جسم کو روند رہے تھے۔

وہ بدن جس پر کبھی پھول کی چھڑی نہیں ماری گئی تھی، وہ لڑکی جس کے پاس ایک شاندار حویلی تھی۔ ایک شاندار زندگی تھی جس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی، جسے حسن کی دولت ملی تھی، جس کے خیالات خوبصورت تھے، جس کی ادائیں دلکش تھیں جس کو حاصل کرنے کی تمنا نہ جانے کتنے دلوں میں ہوگی۔

وہی لڑکی روند دی گئی تھی۔ دو وحشی، درندوں نے اسے کچھ ہی دیر میں کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے محبت کی تھی اور اس قصور پر اس کے ماں باپ اور بھائی اس کے دشمن بن گئے تھے۔ اسے مار دینا چاہتے تھے اور اس نے خود کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ بس اتنا سا قصور تھا اس کا۔ وہ پانچ لاکھ میں فروخت کردی گئی تھی اور اسے خریدنے والوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ چیختی اور تڑپتی رہ گئی تھی لیکن وہ اسے بے آبرو کرتے ہوئے ہنستے رہے تھے۔

وہ دونوں وحشی اسے نڈھال چھوڑ کر کمرے سے چلے گئے تھے۔ اس کی روح پر ان گنت زخم تھے اور اس کا پورا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اسے کوئی یاد نہیں آرہا تھا۔ اس کے ذہن پر صرف اپنی بربادی کی کہر چھائی ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک اسی طرح پڑی رہی ہوگی۔ جب ایک بار پھر دروازہ کھلا اور کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ "چلو، اٹھ جاؤ، کھانا کھالو۔" وہ اسی طرح لیٹی رہی۔

"کب تک بھوکی رہو گی؟"

اس بار چندا کو آنکھیں کھولنی پڑی تھیں۔ ایک عورت اس کے سامنے تھی۔ تیس پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔

"نہیں، مجھے کچھ نہیں کھانا۔" چندا اٹھ بیٹھی۔ "چلی جاؤ یہاں سے۔ مرنے دو مجھے۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" اس عورت نے کہا۔ "یہاں آنے والی لڑکیاں اسی طرح روتی اور چلاتی ہیں۔ بھوکی رہتی ہیں پھر ان کو بری طرح مارا جاتا ہے، پھر وہی کرتی ہیں اس لیے تمہارے بھوکے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"ہاں ہاں، میں مرجاؤں گی۔" چندا پھر رونے لگی۔

"تم کو آسانی سے مرنے بھی نہیں دیا جائے گا۔" اس عورت نے کہا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ ابھی تو اس گھر میں ان جیسے درجنوں موجود ہیں۔"

"خدا کے لیے مجھے کہیں سے زہر لادو۔" چندا نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"یہاں موت بھی آسانی سے نہیں آتی۔" اس عورت نے کہا۔ "ورنہ میں بھی مرنا چاہتی ہوں لیکن زندہ رہنے پر مجبور کردی گئی ہوں۔"

"کیا تم بھی......؟"

"ہاں میں بھی۔" اس عورت نے ایک گہری سانس لی۔



"میں بھی تمہاری طرح یہاں لائی گئی تھی۔ میں بھی تمہاری طرح چیخی اور فریاد کرتی رہی۔ پھر میرے جسم کو مار مار کر ادھیڑ دیا گیا۔ اس کے بعد میں تھک گئی، مجھ میں حوصلہ نہ رہا۔ میں نے اپنے آپ کو ان کے حوالے کردیا کیونکہ میرے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا۔"

چندا خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ کتنا دکھ تھا اس کی باتوں میں۔ "کیا تم نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی؟" چندا نے پوچھا۔

"میں ایک لڑکی کا حشر دیکھ چکی تھی۔" اس نے بتایا "اس بے چاری نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے پورے جسم پر تیزاب ڈال دیا گیا تھا۔"

"او خدا!" چندا کانپ کر رہ گئی۔ "یہ ایسے لوگ ہیں؟"

"ہاں، یہ انسان نہیں، جانور ہیں۔" اس عورت نے کہا۔ "یہاں تو پولیس بھی نہیں آتی۔ کوئی ان پر ہاتھ نہیں ڈالتا کیونکہ یہاں آنے والے سب دولت مند اور طاقتور لوگ ہوتے ہیں۔ افسر، حکام، وزیر، وڈیرے...... کون ہے جو یہاں نہیں آتا۔ اسی لیے یہ سب اتنے منہ زور ہوچکے ہیں۔"

"اور یہاں کا مالک کون ہے؟ کون ہے جو یہ سب چلا رہا ہے؟"

"تم کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس کو چلانے والا ایک کھسرا ہے۔"

"کھسرا......؟" چندا واقعی حیران رہ گئی تھی۔

"ہاں...... ہیجڑا!" عورت نے بتایا "لیکن اس کا اثر و رسوخ بہت ہے۔ انتہائی بے رحم اور خطرناک ہے۔ بے شمار دولت ہے اس کے پاس۔ معاشرے سے نہ جانے کس بات کا بدلہ لے رہا ہے۔"

"خیر...... جو بھی ہو، میں مرنا چاہتی ہوں۔" چندا نے کہا۔ "تم مجھے مرنے کا کوئی راستہ بتادو۔ تمہارا احسان ہوگا۔"

"بے وقوف نہ بنو۔ میری بات اور ہے، میں تو اپنے آپ کو پوری طرح ان کے حوالے کرچکی ہوں۔ میں نے ان حالات سے سمجھوتا کرلیا ہے، لیکن تمہاری بات اور ہے، تم میں ابھی ہمت ہے۔ اس لیے تم مرنے کی بات نہ کرو، یہاں سے نکلنے کی بات کرو۔"

"لیکن کیسے...... کیسے نکل سکتی ہوں میں۔ نہ جانے...... نہ جانے میرا کیا حشر ہوگا؟" چندا پھر رونے لگی تھی۔

"نہیں نہیں، رونا نہیں۔" اس عورت نے اس کا بازو تھام لیا۔ "اپنے آپ کو کمزور مت کرو۔ شاباش، ہمت رکھو...... اب کچھ کھالو کیونکہ ابھی مہارانی تمہیں دیکھنے کے لیے آئے گی۔ اگر اس نے تم کو روتے ہوئے یا اداس دیکھ لیا تو غصے سے پاگل ہوجائے گی۔"

"کون مہارانی؟"

"وہی...... یہاں کا مالک، وہی ہیجڑا جو شیطان کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔"

اس عورت نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ مہارانی کمرے میں داخل ہوگئی۔ چندا اسے دیکھ کر کانپ اٹھی۔ وہ واقعی ایک شیطان صفت اور شیطان صورت انسان تھا۔

اس نے عورتوں والا گھا گھرا پہن رکھا تھا، جسم پر کسی ہوئی چولی تھی۔ بالوں کو چوٹیاں بنا کر آگے کی طرف لے آیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بے رحمانہ سی مسکراہٹ تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"ہوش ٹھکانے آئے شہزادی کے؟" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں ہنکارا۔ "یا اور دو چار کو بھیجوں؟"

"نہیں مہارانی، اس طرح نہیں۔" وہ عورت جلدی سے بولی۔ "بے چاری نئی نئی آئی ہے۔ تھوڑا سا ٹائم دو اس کو۔"

"اور کتنا ٹائم لے گی۔" مہارانی نے کہا۔ "اس کے چاہنے والوں نے تو لائن لگا دی ہے۔"

"ٹھیک ہوجائے گی، تم ذرا انتظار کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تو اس کی گارنٹی لے رہی ہے تو میں چپ ہوجاتی ہوں۔"

☆☆☆

وہ بہت دیر سے بے ہوش تھا۔

اس کے سر پر وار ہی ایسا ہوا تھا کہ وہ خود کو سنبھال نہیں پایا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کمرے میں کیسے آیا تھا۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جہاں وہ چندا کے ساتھ تھا اور دلدار اپنے ساتھ کچھ غنڈوں کو لے آیا تھا۔

یہ کوئی اور کمرا تھا۔ خوبصورتی سے سجا ہوا اور وہ خود بھی ایک نرم بستر پر تھا۔ اس نے اپنے سر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے سر پر بندھی ہوئی پٹی نے اسے یہ احساس دلایا کہ کسی نے اس کی دیکھ بھال کی ہے اور وہی اسے اٹھا کر یہاں تک لایا ہے۔

دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

ایک خوبصورت عورت ہاتھ میں ٹرے لیے کمرے میں داخل ہورہی تھی۔ وہ دلشان کو ہوش میں دیکھ کر خوش ہوگئی تھی۔

"خدا کا شکر ہے، آپ ہوش میں آگئے۔"

اس نے ٹرے ایک طرف رکھ دی۔

”میں...... میں اس وقت کہاں ہوں؟“ دلشان نے پوچھا۔

”ہمارے گھر پر۔“ عورت نے جواب دیا۔ ”میرا نام زہرہ ہے دلشان صاحب۔ آپ مجھے بھی بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”آپ کو؟“ دلشان اپنے ذہن پر زور دینے لگا۔ پھر اس کے ذہن پر چھائی ہوئی دھند آہستہ آہستہ صاف ہوتی جارہی تھی پھر اسے یاد آگیا کہ وہ کون تھی۔

”زہرہ بھابی!“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”آپ......؟“

”خدا کا شکر ہے کہ آپ کو یاد ہے۔ عدنان ہی آپ کو اٹھا کر لائے تھے۔“ اس نے بتایا۔

”کہاں ہے عدنان؟“ اس نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”وہ آپ کے لیے دوائیں لینے گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیں لکھ دی تھیں۔“

دلشان نے آنکھیں بند کرلیں۔ عدنان اس کے بچپن کا دوست تھا۔ دونوں نے ایک ہی اسکول میں تعلیم پائی تھی پھر کالج میں بھی ایک ساتھ تھے۔ اسی دوران عدنان نے شادی کرلی تھی۔ وہ زہرہ کو بھابی کہا کرتا تھا۔ وہ عدنان کے لاہور والے گھر میں کئی کئی دنوں تک رہا کرتا تھا۔ پھر عدنان اپنی بیوی کو لے کر انگلینڈ چلا گیا تھا۔ دلشان کو اس کے کراچی آنے کا معلوم ہی نہیں تھا ورنہ وہ اسٹیشن سے سیدھا عدنان ہی کے پاس آجاتا اور دلدار جیسے کمینے کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

”دلشان بھائی، چلیں پہلے یہ یخنی پی لیں، اس سے کچھ فائدہ ہوگا۔“

دلشان بہت مشکلوں سے اٹھ سکا تھا۔ زہرہ نے ٹرے اس کے سامنے لاکر رکھ دی تھی۔ یخنی پی لینے کے بعد اسے کچھ توانائی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی دوران عدنان بھی اس کی دوائیں لے کر واپس آگیا تھا۔ دلشان کو بیٹھا ہوا دیکھ کر وہ چہک اٹھا تھا۔ ”خدا کا شکر ہے یار کہ تم کو اس حال میں دیکھ رہا ہوں ورنہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تم شاید اوپر پہنچ چکے ہو۔“

دلشان نے کہا۔ ”تم یہ بتاؤ، تم مجھے کہاں سے لائے تھے؟“

”یار، میں کورنگی انڈسٹریل ایریا میں ایک پروجیکٹ کا سودا کررہا ہوں۔ وہاں میرا آنا جانا رہتا ہے۔ میں نے تمہیں فٹ پاتھ پر پڑا ہوا دیکھا۔ میں ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ دل میں خیال آیا کہ شاید کوئی ایکسیڈنٹ کیس ہے۔ سوچا کہ آگے بڑھ جاؤں کیونکہ یہاں تو یہی ہوتا ہے۔ ذرا سی ہمدردی مہنگی پڑ جاتی ہے لیکن میرا دل نہیں مانا، میں نے قریب جا کر دیکھا تو وہ تم تھے۔ تم بہت بری طرح زخمی تھے لیکن یہ ماجرا کیا ہے، کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟“

”یہ بہت طویل کہانی ہے میرے دوست!“ دلشان نے کہا۔ ”اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تم کراچی میں ہو تو شاید وہ سب کچھ نہیں ہوتا جو ہو چکا ہے۔“

پھر دلشان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں آہستہ آہستہ بتانا شروع کیا۔ چندا سے اپنی محبت، رانا مکرم کا رویہ، نفرتیں، سازشیں، مارنے کا منصوبہ، فرار ہونا پھر دلدار کے ہاتھوں یرغمال بننا، وغیرہ وغیرہ۔ ”اب میں نہیں جانتا کہ چندا کہاں ہے؟ وہ کم بخت اسے اٹھا کر کہاں لے گئے ہیں؟“

”اوہ میرے خدا! کیا کیا گزر چکی ہے تم پر؟“ عدنان نے کہا۔

”یقین نہیں آتا دلشان بھائی کہ سگے ماں باپ بھی ایسے ہوسکتے ہیں۔“ زہرہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ”نہ جانے بے چاری چندا پر کیا گزری ہوگی، اس کے ساتھ کیا سلوک ہورہا ہوگا۔“

”لعنت ہو ایسی زمین اور جائداد پر!“ عدنان نے کہا۔ ”رشتے تو اب کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے۔“

”عدنان! چندا کے لیے سوچو۔ اسے ہر حال میں تلاش کرنا ہے۔“

”کیا تمہیں وہ گھر یاد ہے، جہاں دلدار تمہیں لے گیا تھا؟“ عدنان نے پوچھا۔

”اچھی طرح یاد ہے۔“ دلشان نے کہا۔ ”وہ محلہ بھی یاد ہے مجھے۔ ہمیں سب سے پہلے اسی کم بخت پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔ اس کی میں دھجیاں اڑا دوں گا۔“ عدنان نے کہا۔ ”یہاں میرے تعلقات ایسے لوگوں سے بھی ہیں جو دلدار کی بوٹیاں کردیں گے۔“

”عدنان چلو، ابھی اس کے گھر چلتے ہیں۔ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

”تم ابھی کمزور ہو۔“ عدنان نے کہا۔ ”ایک دن رک جاؤ۔“

”نہیں میرے دوست! چندا کے لیے ایک ایک لمحہ قیامت کا ہوگا۔“ دلشان نے کہا۔

”آپ لوگ جانے سے پہلے کھانا کھالیں۔ وہاں جانے کتنی دیر لگ جائے۔“ زہرہ بولتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دلدار کو تم دونوں کی اور تمہاری حیثیت کا اندازہ تھا، اس کے باوجود اس نے اتنی بڑی جرأت کیسے کی؟“

”اب کہاں ہماری طاقت اور ہماری حیثیت!“ دلشان نے کہا۔ ”اب تو ہم جانیں بچانے کے لیے بھاگتے پھر رہے ہیں، ہم تو مفرور ہیں۔“

عدنان نے اپنے دوستوں کو فون کردیا تھا۔ انہیں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ انہیں مسلح ہو کر کسی مہم پر چلنا ہے۔ عدنان کے دوست آدھے گھنٹے کے اندر کئی گاڑیوں میں پہنچ چکے تھے۔

ان کی روانگی کے وقت زہرہ نے کہا۔ ”دلشان بھائی! آپ پریشان نہ ہوں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ یہ کوئی گاؤں نہیں ہے، شہر ہے اور یہاں رانا مکرم جیسے سیکڑوں رہتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بھابی! لیکن رانا مکرم جیسے لوگ ہر جگہ طاقت رکھتے ہیں۔“

”پروا مت کرو۔ ہم بھی چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھے۔“ عدنان نے کہا۔ ”آؤ، اب چلتے ہیں۔“

چار گاڑیوں پر مشتمل یہ قافلہ روانہ ہوگیا۔

بارہ افراد تھے اور سب کے سب مسلح ہو کر آئے تھے۔

عدنان نے اپنے دوستوں کو پوری صورت حال بتادی تھی۔ وہ سب دلشان کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر وہ کم بخت مل گیا تو ہم اس کی وہ حالت کریں گے کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔“

لیکن وہ کم بخت گھر پر نہیں مل سکا تھا۔ اس کے پڑوسیوں نے بتایا کہ دو دنوں سے اس کے گھر پر تالا پڑا ہوا ہے اور کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟

یہ قافلہ ناکام لوٹ آیا تھا۔

انہوں نے واپس آکر زہرہ کو بتایا تو وہ بھی پریشان ہوگئی تھی۔ ”ویسے مجھے یہ اندازہ تھا کہ وہ شخص وہاں نہیں ملے گا۔ اب اس کے پاس پانچ لاکھ روپے آگئے ہوں گے۔ وہ اب وہاں کیوں رہے گا؟“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟“ دلشان نے کہا۔ ”چندا کو کہاں تلاش کیا جائے؟“

☆☆☆

مہارانی کے کہنے پر چندا کو چمڑے کی بیلٹ سے مارا جارہا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی لیکن اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ ”مہارانی۔ تم چاہے مجھے جان سے مار دو لیکن میں اس آدمی کے پاس نہیں جاؤں گی۔“

”آخر کیوں نہیں جائے گی؟“

”مہارانی، یہ میری ضد نہیں ہے، مجبوری ہے۔“ چندا روتے ہوئے بولی۔ ”اس کے علاوہ تم جس کے پاس کہو چلی جاؤں گی لیکن اس کے پاس نہیں۔ کم از کم میری اتنی سی بات تو مان لو۔“

”اچھا اچھا، چھوڑ دے اس کو۔“ مہارانی کچھ سوچ کر بولی۔ ”اس کے زخموں پر مرہم لگا دے۔“

مہارانی کے جانے کے بعد اسی عورت نے اس کے زخموں پر مرہم لگانا شروع کردیا جس نے اپنا نام سلطانہ بتایا تھا۔ اس دوران چندا مسلسل روتی اور کراہتی رہی تھی۔

”خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔“ سلطانہ مرہم لگاتے ہوئے بولی۔ ”کتنی بے دردی سے مارا ہے۔“

”ان لوگوں نے نہیں مارا سلطانہ۔ میری قسمت نے مارا ہے۔“ چندا نے کہا۔ ”یہ لوگ تو تقدیر کے مہرے ہیں۔ ان کو وہی کرنا تھا جو تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔“

”خدا جانے کیسی تقدیر لے کر آئی ہو۔ جب تمہیں کسی گاہک پر اعتراض نہیں ہے تو پھر اتنی مار کیوں کھائی، چلی کیوں نہیں گئیں؟“

”نہیں سلطانہ! میں کم از کم اس شخص کے پاس تو نہیں جاسکتی۔“ چندا نے کہا ”چاہے مہارانی میری کھال ادھیڑ دے۔“

”سمجھ گئی، شاید تم اس گاہک کو جانتی ہو۔“

”بہت اچھی طرح۔“ چندا نے اقرار کرلیا۔ ”اب یہ مت پوچھنا کہ وہ کون ہے اور میں نے اس کے لیے کیوں انکار کیا ہے؟“

اس کے تصور میں وہ منظر اجاگر ہوگیا جب چندا کو شام ہی سے سنوارا جارہا تھا۔ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ آج رات وہ ایک رات کے لیے ایک بہت دولت مند آدمی کی دلہن بننے جارہی ہے جس سے مہارانی نے پورے دو لاکھ روپے وصول کرلیے ہیں۔

چندا کو دلہن ہی جیسا روپ دے دیا گیا تھا۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ کیا تقدیر تھی اس کی۔ اسے تو دلشان کی دلہن بننا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ خود اپنی حویلی میں دلہن بنتی تو کتنا جشن ہوتا۔ اس کا باپ پانی کی طرح دولت بہا دیتا۔

بہت کچھ ہوتا لیکن اب یہ سب تو اس کے لیے صرف ایک خوبصورت خواب کی طرح تھا۔ سچائی تو یہی تھی جو اس کے سامنے مہارانی بن کر کھڑی تھی اور اس گاہک کی شکل میں بھی جو بہت بے چینی سے اس کا انتظار کررہا ہوگا۔

رات دس بجے اسے سجا سنوار کر ڈرائنگ روم میں جانے

کے لیے کہا گیا۔ دلہن اکیلی ہی اپنے ایک رات کے دلہا کی طرف جارہی تھی۔

لیکن دروازے کے پاس پہنچتے ہی اس کے پاؤں رک گئے۔ وہ اندر سے آنے والی آواز کو پہچان گئی تھی۔ یہ اس کے بھائی کی آواز تھی، رانا ریاض کی۔ وہ اس آواز کو ہزاروں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ دوڑ کر اپنے بھائی کے پاس پہنچ جاتی، اس کی پناہ میں چلی جاتی لیکن یہ کیسی بدقسمتی تھی کہ وہ اس کے پاس جا بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ اس کی آواز سن کر کرچی کرچی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ خود اپنے بھائی کے پاس اس کی ایک رات کی دلہن بن کر جارہی تھی۔

نہ جانے کتنے دکھ اس پر ایک ساتھ حملہ آور ہو گئے تھے۔

کتنے دکھ کی بات تھی کہ اس کے گھر والوں کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کے بھائی اپنے معمول کے مطابق اپنی عیاشیوں میں لگے ہوئے تھے۔

وہ بھی رانا ریاض کی آواز سن کر الٹے قدموں اپنے کمرے میں واپس آگئی۔ اس نے مہارانی کو بھی نہیں بتایا کہ وہ کیوں انکار کررہی تھی۔

اس جرم پر اس کی کھال ادھیڑ دی گئی تھی۔ پھر مہارانی اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر واپس چلی گئی تھی اور اب سلطانہ اس کے زخموں پر مرہم لگارہی تھی۔

"سلطانہ! میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے لیے کہیں سے زہر لا دو لیکن تم نے حالات سے لڑنے کی بات کی تھی۔ تم خود دیکھ لو، میرا کیا حال ہوا ہے۔ کیا مجھ جیسی لڑکی حالات سے لڑسکتی ہے؟ بتاؤ، کیا میں لڑنے کے قابل رہ گئی ہوں؟"

"صبر کرو۔" سلطانہ کی آواز کھوکھلی تھی۔ "میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی ہوں۔ ویسے ایک بات بتاؤ، اس گاہک کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔ تم اس کے پاس کیوں نہیں جانا چاہتیں؟"

"نہیں سلطانہ، میں تمہیں یہ نہیں بتاسکتی۔"

"بتادو تو شاید تمہارے حق میں بہتر ہو۔" سلطانہ نے کہا۔

"سننا چاہتی ہو تو سنو...... لیکن شرط یہ ہے کہ تم کسی کو نہیں بتاؤ گی۔ میرا حوالہ بھی نہیں دو گی۔"

"بتاؤ تو سہی۔"

"وہ گاہک جس کے پاس مجھے بھیجا جارہا ہے۔ وہ میرا سگا بھائی ہے۔" چندا نے بتادیا۔

"کیا!" سلطانہ گنگ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ "میرے خدا۔ تمہاری تقدیر تمہیں کیسے دن دکھارہی ہے۔"

"اب تم ہی بتاؤ، کیا میں اس کے سامنے ایک جسم فروش بن کر جاسکتی ہوں۔ کیا آسمان ٹوٹ نہیں پڑے گا۔ کیا زمین نہیں پھٹ جائے گی۔"

"نہیں، تم جسم فروش بن کر تو نہیں جاؤ گی لیکن ایک بہن بن کر اپنے بھائی کے پاس ضرور جاسکتی ہو۔"

"پاگل ہو تم...... کس بھائی کے پاس بھیج رہی ہو، جو میرے خون کا پیاسا ہے، جو مجھے دیکھتے ہی گولی ماردے گا۔" چندا نے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ تم بھی تو مرنا ہی چاہتی ہو نا...... تمہاری یہ خواہش اسی طرح پوری ہوجائے گی۔ یہ خودکشی سے تو بہتر ہوگا کہ تمہارا بھائی تمہیں جان سے ماردے۔ دیکھو، تمہارا بھائی تمہاری موت تو برداشت کرسکتا ہے لیکن تمہارا طوائف بن جانا اسے کبھی منظور نہیں ہوگا۔ میری بات مانو، یہ ایک اچھا موقع ہے۔ وہ اس وقت بھی یہیں بیٹھا ہوگا۔ تم مجھے اجازت دو کہ میں اس کے پاس جاکر تمہارے بارے میں بتاسکوں۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"اس کے بعد یہ ہوگا کہ وہ تمہیں مہارانی سے چھڑا کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اس کے بعد چاہے وہ تمہارا جو بھی حشر کرے لیکن یہاں سے تو نجات ملے گی تمہیں؟" سلطانہ نے کہا۔

"کاش ایسا ہوجائے۔" چندا کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے تھے۔ "میں بہت تھک چکی ہوں۔"

"تو پھر جانے دو مجھے۔ اس سے بات کرنے دو۔"

لیکن جب سلطانہ اس کمرے میں پہنچی تو رانا ریاض دس منٹ پہلے ہی وہاں سے جاچکا تھا اور خود مہارانی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے۔ رانا ریاض مہارانی تک اپنے ایک پولیس آفیسر دوست کے حوالے سے آیا تھا۔

☆☆☆

بھاگ دوڑ کا کوئی فائدہ نہیں ہورہا تھا۔

دلدار کہیں غائب ہوچکا تھا۔ دلشان عدنان کی گاڑی لیے دن بھر اسے تلاش کرتا رہتا لیکن وہ شاید شہر ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

زہرہ نے بھی اسی خدشے کا اظہار کیا تھا کہ پانچ لاکھ لینے کے بعد وہ اب یہاں دکھائی نہیں دے گا۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے تھے۔

ایک دن عدنان نے اس سے کہا۔ "دلشان۔ اس طرح تو تم خود بھی مرجاؤ گے۔ دیکھو، مان لیا کہ تمہارا دکھ بہت زیادہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنی طرف سے بھی غافل ہوجاؤ۔"

"تو پھر کیا کروں میں؟"

"زندگی کی طرف واپس آجاؤ۔ اگر قسمت میں ہے تو چندا تمہیں ضرور مل جائے گی ورنہ اسی طرح بھٹکتے بھٹکتے تباہ ہوجاؤ گے۔"

"کیسے واپس آؤں زندگی کی طرف۔ میرے پاس ہے کیا؟"

"تمہارے پاس میں ہوں۔ میرا بزنس ہے۔ تم اس میں میرا ساتھ دو۔ میرا ہاتھ بٹاؤ۔ اپنے آپ پر دھیان دو۔"

زہرہ نے بھی اسے یہی سمجھایا تھا۔

کچھ سوچنے کے بعد دلشان نے ہامی بھر لی تھی۔ "ٹھیک ہے۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

"شاباش، یہ بات ہوئی نا۔ اب چلو میں تمہیں عارف صاحب سے ملوادوں۔" عدنان نے کہا۔ "انہیں تم جیسے شخص کی ضرورت ہے۔ وہ اس ملک کے چند بڑے بلڈرز میں سے ایک ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کئی کارخانوں کے مالک ہیں۔ یوں سمجھ لو کھرب پتی آدمی ہیں۔ مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں اور میں تم پر اعتماد کرتا ہوں۔ اس طرح تمہاری مصروفیت کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔"

"او کے، لے چلو تم مجھے ان کے پاس۔" دلشان نے کہا۔

بانو پلازا شہر کی ایک خوبصورت عمارت تھی۔ یہ بارہ منزلہ عمارت عارف ہی کی تھی۔ جس کا نام اس نے اپنی بیٹی بانو کے نام پر رکھا تھا۔ اس بارہ منزلہ عمارت میں عارف ہی کے دفاتر تھے۔ عارف ٹاپ فلور پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے دفتر آکر دلشان کو احساس ہونے لگا تھا کہ پیسا کس طرح بولتا ہے۔ اس کے خیال میں عارف اس کے چچا رانا مکرم اور اس کے باپ دادا سے بھی کہیں زیادہ دولت مند تھا۔ عارف نے بہت گرم جوشی سے عدنان کا استقبال کیا تھا۔ عدنان نے بہت اچھے الفاظ میں دلشان کا تعارف کروایا تھا۔

"بہت خوب!" عارف نے پسندیدگی کی نگاہوں سے دلشان کی طرف دیکھا۔ "مجھے بھی ایسے ہی نوجوان کی ضرورت تھی۔"

"اور آپ کی ضرورت میں نے پوری کردی ہے۔" عدنان ہنستے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے مسٹر! تم کل سے ہمیں جوائن کرلو۔" عارف نے کہا۔ "فی الحال تم ایک ہفتہ تک ہمارے معاملات کو سمجھو۔ یہاں مختلف شعبے ہیں۔ کنسٹرکشن سے لے کر ٹیکسٹائل اور شوگر فیکٹری تک۔"

"عارف صاحب! کل تو بہت دور ہے۔ آج مجھے کیا کرنا ہے۔ اسی لیے کیوں نہ میں آج ہی سے اپنا کام شروع کردوں۔"

"I like this. Good"

عدنان واپس چلا گیا تھا۔ عارف صاحب نے دلشان کو اپنے نگراں کے سپرد کردیا۔ اس نے دلشان کو مختلف شعبوں کے بارے میں بتایا۔ دلشان کے لیے دلچسپی اور مصروفیت کا اچھا بہانہ مل گیا تھا۔

شام کے وقت عارف نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر پوچھا۔ "دلشان۔ میرا خیال ہے کہ تم نے ہمارا کام تھوڑا بہت سمجھ ہی لیا ہوگا۔"

"جی جناب! خوشی اس بات کی ہے کہ جو بھی ہے وہ بہت آرگنائزڈ ہے۔" دلشان نے کہا۔ "مختلف لوگوں سے باتوں کے بعد پتا چلا کہ آپ نے ہر شعبے میں مناسب ترین افراد کا انتخاب کیا ہے۔"

"ہاں، کیونکہ میں کام کو عبادت سمجھتا ہوں۔ ہم فی الحال آپ کو پچاس ہزار سیلری پر رکھ رہے ہیں۔" عارف نے بتایا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کے لیے یہ سیلری شروع میں مناسب ہوگی۔"

"بالکل مناسب ہے جناب!" دلشان نے کہا۔ "کیونکہ میں تو خود کو مصروف رکھنا چاہتا ہوں اور آپ نے اس کا موقع فراہم کردیا ہے۔"

"گڈ، تو تم کل صبح سے باقاعدہ آجاؤ۔"

عدنان اور زہرہ نے بھی یہ خبر بہت خوش ہو کر سنی تھی۔ یہ بہت اچھی ابتدا تھی۔ دلشان کو صرف ایک اندیشہ لاحق ہورہا تھا کہ وہ کہیں ملازمت کی مصروفیت میں پھنس کر چندا کی تلاش سے غافل نہ ہوجائے۔

اس کے اندیشے پر عدنان نے کہا۔ "تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے دلدار کی تلاش کے لیے کچھ لوگوں کی ڈیوٹی لگادی ہے، وہ اس کی تلاش میں ہیں اور جیسے ہی وہ دکھائی دیا، تمہاری چندا بھی تم کو مل جائے گی۔"

دوسری صبح دلشان دفتر پہنچ گیا تھا۔

اس کے لیے ایک کمرا مخصوص کردیا گیا تھا۔ اس کمرے میں عارف اسٹیٹ کا نگراں سلیم بھی موجود تھا۔ یہ ایک خوش اخلاق اور صاف دل کا انسان تھا۔ اس نے دلشان کو کام کے بارے میں بتانا شروع کردیا۔

دلشان کا وہ دن بھی بہت مصروف گزرا تھا۔

دفتر سے پانچ بجے اٹھ کر وہ اس عمارت سے باہر آ گیا۔ عدنان نے اپنی ایک گاڑی اس کے حوالے کر دی تھی۔ اسی لیے اسے آنے جانے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔

وہ پارکنگ سے باہر آیا تو اتفاقاً اسے چندا دکھائی دے گئی۔ وہ سیاہ رنگ کی ایک قیمتی کار میں تھی۔ اس کار کو باوردی شوفر چلا رہا تھا۔

دلشان نے اپنی گاڑی اس سیاہ گاڑی کے پیچھے لگا دی تھی۔ اس وقت اس کے دل کی حالت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ چندا کو اس طرح اچانک دیکھ کر اس کے اعصاب ہیجانی کیفیت سے دوچار تھے۔ وہ گاڑی میں جا رہی تھی۔ اس کا مطلب ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے والدین کے پاس واپس چلی گئی ہو۔ اس نے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ لی ہو اور انہوں نے اسے معاف کر دیا ہو۔ یا پھر...... پھر کیا...... کوئی اور بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ آگے والی گاڑی شہر کے ایک پوش علاقے میں سفر کر رہی تھی۔ پھر وہ ایک بہت ہی خوبصورت اور شاندار مکان کے گیٹ پر رک گئی۔ دلشان نے بھی اپنی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی تھی۔

اچانک اگلی گاڑی کا ڈرائیور گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آ گیا۔ اس کے تیور کچھ خطرناک معلوم ہو رہے تھے۔ ''کیا بات ہے، تم ہمارا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟''

''بھائی، میں کسی کی تلاش میں ہوں۔'' دلشان نے کہا۔

''تم بی بی کے پاس چلو۔'' ڈرائیور غصے سے بولا۔ ''وہ تمہیں بلا رہی ہیں۔''

دلشان بجلی کی سی تیزی سے گاڑی سے اترا۔ اس نے اگلی گاڑی تک تقریباً دوڑ ہی لگا دی تھی لیکن کار میں بیٹھی ہوئی وہ لڑکی چندا نہیں کوئی اور تھی۔

دور سے وہ چندا ہی دکھائی دی تھی۔ اس کا سائیڈ پوز بالکل چندا کی طرح تھا۔ دلشان اسے دیکھ کر بس کھڑا رہ گیا تھا۔

''کیا بات ہے مسٹر! تم کیوں ہمارا پیچھا کر رہے ہو؟'' اس لڑکی نے غصے سے پوچھا۔

''محترمہ، میں کسی کی تلاش میں ہوں اور اسی کی غلط فہمی میں آپ کا تعاقب کرتا رہا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ کو پریشانی ہوئی اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔''

''آدمی مہذب معلوم ہوتے ہو۔ اس کے باوجود ایسی حرکت کر رہے ہو؟''

''آپ یقین کریں، میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ میں اپنے دفتر سے باہر نکلا تھا کہ آپ پر نگاہ پڑی اور میں اس کی آپ سے مشابہت پر آپ کے پیچھے آ گیا۔''

''کس دفتر میں کام کرتے ہو؟'' اس لڑکی نے پوچھا۔

''بانو انٹر پرائزز میں۔'' دلشان نے بتایا۔

''جھوٹ بولتے ہو تم۔ بانو انٹر پرائزز سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔'' اس لڑکی نے کہا۔ ''میں وہاں کام کرنے والے ایک ایک فرد کو جانتی ہوں۔''

''آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ میں وہاں کام نہیں کرتا؟''

''اس لیے کہ بانو انٹر پرائزز میرے ہی نام سے ہے۔'' اس لڑکی نے بتایا۔ ''اتفاق سے میں ہی بانو ہوں۔''

''اوہ!'' دلشان اس اتفاق پر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''پھر عارف صاحب تو آپ کے فادر ہوئے۔''

''ہاں، وہ ڈیڈی ہیں میرے۔'' بانو نے بتایا۔ ''اور یہ مکان ان ہی کا ہے۔''

''پھر تو آپ کو یقین کر لینا چاہیے کہ میں آپ سے غلط بیانی نہیں کر رہا۔'' دلشان نے کہا۔ ''میں نے آج ہی آپ کی کمپنی جوائن کی ہے اور میں جس کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا ہوں، وہ بالکل آپ ہی جیسی ہے اسی لیے مجھے غلط فہمی ہوئی۔''

''کیا میں فون کر کے ڈیڈ سے تمہارے بارے میں پوچھ لوں؟''

''ضرور پوچھ لیں تاکہ آپ کو پتا چل جائے کہ میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔'' دلشان نے کہا۔

بانو چند لمحوں تک ہونٹ بھینچے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر کہا۔ ''آؤ تم اندر آ جاؤ۔''

''محترمہ، اس وقت مجھے فرصت نہیں ہے۔''

''نہیں۔ تم اندر آؤ گے، کچھ دیر بیٹھ کر چلے جانا۔''

بانو کی گاڑی اندر چلی گئی۔ دلشان نے اپنی گاڑی باہر چھوڑ دی۔ کوٹھی کا ایک ملازم اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا۔

کمرے کی سجاوٹ بتا رہی تھی کہ اس کی خوبصورتی میں پیسوں کے ساتھ ساتھ سلیقے کا بھی بہت دخل ہے۔ پورے کمرے کی سجاوٹ بے مثال تھی۔

''یہ سجاوٹ میں نے ہی کی ہے۔'' بانو نے بتایا۔ وہ اس دوران اس کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی تھی۔

''بہت خوبصورت، بہت ہی آرٹسٹک۔'' دلشان نے تعریف کی۔

''میں نے انٹیریئر ڈیکوریشن میں ڈگری لی ہے۔'' بانو نے بتایا۔ ''تم بیٹھو، میں Change کر کے آتی ہوں۔''

''آپ مجھے اجازت دے دیتیں تو اچھا تھا۔'' دلشان نے کہا۔

''چائے پی کر ہی جانا۔'' بانو نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی پر انگلی رکھ دی تھی۔

چائے پینے کے دوران میں عارف دفتر سے لوٹ آیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں دلشان کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

''ارے...... تم یہاں؟''

اس سے پہلے کہ دلشان کچھ بول سکتا، بانو نے بتایا ''ڈیڈ! یہ میرے دوست ہیں، کالج میں ہم ایک ساتھ ہوا کرتے تھے۔''

''گڈ!'' عارف مسکرایا پھر اس نے دلشان کی طرف دیکھا۔ ''یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی کہ تم بانو کے دوست ہو؟''

دلشان کی طرف سے بانو ہی نے جواب دیا تھا۔ ''ڈیڈ! دلشان صاحب ذرا خوددار ٹائپ کی چیز ہیں۔ اسی لیے انہوں نے میرے سہارے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہو گی۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ مجھے بھی ایسے ہی نوجوان پسند ہیں۔'' عارف نے کہا۔

عارف کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد دلشان نے الجھ کر پوچھا ''بانو صاحبہ! میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ نے یہ غلط بیانی کیوں کی؟''

''اس لیے کہ جب ڈیڈ نے آتے ہی تمہیں پہچان لیا تو اس سے تمہاری بات کنفرم ہو گئی۔ اب تعاقب والی کہانی سنا کر میں نہیں چاہتی تھی کہ ڈیڈی کا امپریشن خراب ہو، اسی لیے میں نے بات بنائی تھی۔''

''اوہ...... پھر تو آپ نے بہت اچھا کیا۔'' دلشان نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب تو مجھے جانے کی اجازت ہے نا؟''

''ہاں، اب تم جا سکتے ہو۔''

وہ عدنان کے گھر پہنچا تو عدنان اور زہرہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ''خیریت تو ہے، کیا دفتر کا پہلا دن بہت مصروف گزرا؟''

''نہیں یار! بات کچھ اور ہو گئی تھی۔'' دلشان نے پوری کہانی سنا دی۔

''مبارک ہو دلشان بھائی!'' زہرہ نے کہا۔ ''پہلے ہی دن آپ کے ساتھ ایک کہانی ہو گئی۔''

''دلشان! اس لڑکی کو میں جانتا ہوں۔'' عدنان نے بتایا ''اس کی شادی ہو چکی تھی...... لیکن ایک سال بعد ہی شوہر کا انتقال ہو گیا۔''

☆☆☆

چندا کو رقص کی تربیت دی جا رہی تھی۔

مہارانی نے اس سے کہا تھا۔ ''دیکھ، تیرے حسن کے جلووں نے آگ لگا دی ہے۔ اسی لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ تو ڈانس سیکھ لے۔ پھر تیری لگائی ہوئی آگ بہت دور تک پھیلتی جائے گی۔''

''میری تذلیل کے لیے کیا یہی رہ گیا تھا مہارانی!'' چندا نے بہت دکھ سے کہا۔

''نخروں سے بات نہیں بنے گی۔'' مہارانی غصے سے بولی۔ ''جو میں فیصلہ کر لوں، وہی ہوتا ہے۔ تو ناچے گی، دیکھ...... تو بکنا تو شروع ہو گئی ہے نا...... تو کیوں نہ مہنگے داموں فروخت ہو۔''

چندا اس کے بعد کیا بول سکتی تھی، اس نے اپنی گردن جھکا دی۔ سلطانہ نے بھی اسے یہی سمجھایا تھا۔ ''دیکھو، مہارانی کے چنگل سے نکلنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کی بات مانتی جاؤ۔''

''اس سے کیا ہو گا، کیا میں بازار میں بکنا بند ہو جاؤں گی؟''

''نہیں، اس سے یہ ہو گا کہ تم پر اسے بھروسا ہو جائے گا۔ تمہیں آنے جانے کی تھوڑی آزادی مل جائے گی۔ کیونکہ ابھی تو تم جیسے جیل میں ہو۔ اس چہار دیواری سے باہر نہیں جا سکتیں۔ تھوڑی پابندی ختم ہو جائے تو پھر تم بازار وغیرہ کے لیے نکل سکتی ہو۔''

''میں تمہاری بات سمجھ گئی۔'' چندا نے کہا۔ ''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں نکلوں اور فرار ہو جاؤں۔ بھاگ جاؤں...... لیکن مجھے بھاگ کر جانا کہاں ہے؟ کوئی نہ کوئی دلدار پھر مل جائے گا۔ پھر میں کسی اور مہارانی کے پاس چلی جاؤں گی۔''

''کوئی ضروری تو نہیں ہے چندا کہ ہر بار ایک جیسی کہانی ہو۔'' سلطانہ جلدی سے بولی۔ ''ہو سکتا ہے اس بار کچھ مختلف ہو۔ اچھے لوگ مل جائیں یا ہو سکتا ہے کہ خود وہی مل جائے جس کے ساتھ کراچی آئی تھیں۔''

''سلطانہ، دلشان تو میرے لیے اب ایک خواب بن کر رہ گیا ہے۔'' چندا نے ایک گہری سانس لی۔ ''خدا جانے وہ زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے۔''

''خدا کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔'' سلطانہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے سلطانہ! میں تمہارے مشورے پر عمل کروں گی۔'' چندا نے یقین دلایا۔

اس کے بعد اس نے مہارانی کے کہنے پر عمل شروع

کردیا۔ مہارانی نے حکم دیا۔ ''ڈانس سیکھو۔'' اس نے استادجی سے ڈانس کی ٹریننگ لینی شروع کردی۔ مہارانی نے حکم دیا ''فلاں شخص آرہا ہے، اس کو قابو میں کرنا ہے۔'' اور اس نے فلاں شخص کو قابو میں کرلیا۔ مہارانی بھی اب اس پر کچھ مہربان ہونے لگی تھی۔ اس کا رویہ نرم ہوگیا تھا۔ استادجی بھی چندا کی تعریف کرنے لگے تھے۔ ''اس کے بدن میں بے پناہ لوچ ہے اور یہی لوچ اسے ماہر رقاصہ بنادے گا۔''

''کسی قسم کے نخرے تو نہیں کرتی؟''

''نہیں، اس جیسی شاگرد تو آج تک نہیں ملی۔'' استادجی نے بتایا۔

پندرہ دن گزر گئے۔ پندرہ دنوں میں چندا نے اچھی خاصی تربیت لے لی تھی بلکہ اب اسے رقص میں خود بھی مزہ آنے لگا تھا۔ استادجی اپنے فن میں مہارت رکھنے والا شخص تھا۔

مہارانی نے چندا کے ساتھ ایک یہ رعایت کردی تھی کہ گاہک ہفتے میں صرف ایک بار آیا کرتا تھا۔ وہ بھی چندا کی مرضی کا۔ چندا جس کو انکار کردیتی، مہارانی بھی اسے انکار کردیتی۔ اس نے خود چندا سے کہا تھا۔ ''شہزادی! نہ جانے کیا بات ہے، تجھے دیکھ کر مجھے رحم آنے لگتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ تجھے پیار کرتی رہوں۔ دیکھ لے، میں نے اپنے یہاں اتنی رعایت کسی کو نہیں دی جتنی تجھے دیتی ہوں۔''

''مجھے اندازہ ہے مہارانی! اسی لیے تو میں نے خود کو پوری طرح تمہارے حوالے کردیا ہے۔ کیونکہ میں نے جان لیا ہے کہ اب میرا سب کچھ یہی ہے۔ یہاں سے باہر میرے لیے دنیا ختم ہوچکی ہے۔''

''شاباش! میں لڑکیوں کو یہی تو سمجھاتی رہتی ہوں کہ جو کچھ ہے، وہ یہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قسمت نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے لیکن جب زیادتی ہو ہی چکی ہے تو پھر اس کو پوری ہمت سے برداشت کرو۔''

''مہارانی، میرے دل میں بس ایک خلش ہے۔'' چندا نے کہا۔ ''اگر وہ مٹ جائے تو پھر باہر نکلنے کی خواہش بھی ختم ہوجائے گی۔''

''وہ کیا ہے رے چندا!'' مہارانی نے پوچھا۔

''میں اس آدمی کو سزا دینا چاہتی ہوں جس نے دھوکے سے میرا سودا کیا ہے۔'' چندا نے بتایا۔ ''بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتی۔''

''شہزادی! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم خود اس سے تنگ آچکے ہیں۔ ایک نمبر کا بدمعاش ہے۔ لالچ روز بہ روز بڑھتا ہی جارہا ہے۔ میں تو اس کو ادھیڑ کر رکھ دوں گی۔''

''اس کو بلالو مہارانی! اس کو خود میں اپنے ہاتھوں سے ادھیڑوں گی۔'' چندا نے کہا۔

''کل ہی اس نے تیری فرمائش کی تھی۔'' مہارانی نے بتایا۔ ''لیکن میں نے انکار کردیا تھا۔''

''اب اسے بلالو اور مجھے اس کے پاس بھیج دو۔''

''لڑکی! میں ایسے نخرے نہیں پالتی...... لیکن تیری وجہ سے یہ ضرور کروں گی۔'' مہارانی نے کہا ''وہ آج رات ہی کو یہاں آجائے گا۔''

''بس مہارانی، یہ تمہارا احسان ہوگا۔''

چندا، دلدار کے لیے کانٹوں پر چل رہی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے چندا کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ جاہل، احسان فراموش، نمک حرام، جس کی ساری زندگی حویلی والوں کے تلوے چاٹتے گزری تھی۔

وہ شام بہت دیر کے بعد آئی تھی۔ یہ انگاروں پر کروٹیں بدلنے والی شام تھی۔ دلدار کو مہارانی نے بلوالیا تھا۔ وہ چندا کو پامال کرنے آیا تھا۔

اس کی بے قراری دیکھنے کے قابل تھی۔ چندا اس کے لیے جنت کی حور کی طرح تھی۔ وہ برسوں سے حویلی میں چندا کو دیکھتا آرہا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت کبھی نہیں رہی تھی کہ وہ ایک نگاہ کے بعد دوسری بار اسے دیکھ سکے اور اب تو وہ چندا کو ایک رات کے لیے خرید سکتا تھا۔ اسی نے کمینی فطرت سے کام لے کر چندا کو بازار میں بکنے والی جنس بنادیا تھا۔

چندا بہت بن سنور کر اس کے پاس پہنچی تھی۔ دلدار اسے دیکھ کر خوش ہوگیا تھا۔ ''واہ بی بی! قسمت ہو تو ایسی ہو۔ میں تو شروع ہی سے تم پر عاشق تھا لیکن اتنی ہمت کہاں تھی کہ تمہیں جی بھر کر دیکھ بھی سکتا۔ میں ٹھہرا ایک غریب اور تم جاگیردار، سرمایہ دار۔ تمہیں یاد ہے، ایک بار مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی تھی اور تم نے میری توہین کی تھی۔ بس اسی دن میں نے اپنے دل میں یہ سوچ لیا تھا کہ تم سے بدلہ ضرور لوں گا۔''

''اور تم نے اس طرح بدلہ لیا کہ کوٹھے کی زینت بنادیا مجھے؟''

''ہاں...... اور اس کے بدلے پانچ لاکھ بھی تول گئے۔ بدلے کا بدلہ اور پیسے الگ کھرے ہوگئے۔''

''یہ بتاؤ، اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' چندا نے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے ساتھ زندگی کے مزے اٹھانے ہیں۔ آؤ، میرے پاس آجاؤ۔'' اس نے اپنے دونوں بازو پھیلادیے۔



چندا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھی اور اس کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے لباس سے ایک بوتل نکالی اور اس سے پہلے کہ دلدار کچھ سمجھ سکتا، چندا نے وہ تیزاب اس کے چہرے پر پھینک دیا تھا۔

دلدار کی چیخ اتنی بھیانک تھی کہ پورا کمرا لرز اٹھا تھا۔ وہ کٹے ہوئے مرغ کی طرح اپنی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے فرش پر تڑپ رہا تھا۔

چیختے چیختے وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس کی خاموشی کے بعد مہارانی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کے دو آدمی بھی تھے۔ اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''اس مردار کو کسی کچرا کنڈی میں پھینک آؤ۔''

☆☆☆

بانو اپنے ظاہر میں تیز و طرار تھی لیکن اندر سے وہ ایک معصوم اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ زندگی نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ سب کچھ تھا اس کے باپ کے پاس، اس کے باوجود بانو محبت سے محروم رہی تھی۔ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوگئی تھی جو اپنی فطرت میں ایک گھٹیا انسان ثابت ہوا تھا۔ جس کے لیے عارف ہمیشہ بانو کے سامنے شرمندگی ظاہر کرتا تھا۔

''بیٹا، میں نے شاید اپنی زندگی میں ایک ہی غلط فیصلہ کیا ہوگا لیکن یہ غلط فیصلہ ہی اتنا بڑا ہے کہ تمہاری زندگی کو روگ لگ گیا۔''

''تو ڈیڈا کوئی روگ نہیں لگا۔'' بانو اس کی دل جوئی کے لیے کہتی۔ ''سب ٹھیک ہے بلکہ اچھا ہی ہوا کہ ایسے شخص سے میری جان چھوٹ گئی۔''

بہت مشکلوں سے اس شخص سے جان چھوٹ سکی تو اب اداسی، تنہائی اور دکھ۔ اس کی زندگی میں یہی تین ہمسفر رہ گئے تھے۔ پھر ایک دن ایک نوجوان اس کی گاڑی کا تعاقب کرتا ہوا اس کے گھر تک پہنچ گیا اور یہاں سے اس کی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی۔

یہ دلشان تھا، اس کے باپ ہی کی فرم کا ملازم لیکن کبھی کبھی بانو کو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ بات کرتے کرتے کہیں گم ہوجاتا ہے، نہ جانے کہاں؟

اس عرصے میں ان کے درمیان اچھی خاصی دوستی ہوچکی تھی۔ بانو کبھی خود عدنان کے ہاں آجاتی یا کبھی دلشان کو اپنے ہاں بلالیتی۔ دلشان کو اس کی بات ماننی پڑتی تھی۔ وہ اس کے [illegible] تھی لیکن اس سے گفتگو کرتے وقت بھی وہ چندا کے [illegible] اپنے دل سے نکال نہیں پاتا تھا۔

ایک دن بانو نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ ''دلشان۔ ایک بات بتاؤ، یہ تم مجھ سے باتیں کرتے ہوئے کہیں گم کیوں ہوجاتے ہو؟''

''نہیں تو، میں تو تمہارے سامنے ہی رہتا ہوں۔''

''ایسا لگتا ہے جیسے تم نے اپنی کوئی قیمتی چیز گم کردی ہو۔''

''ہاں، بہت قیمتی۔''

''بتاؤ، کیا ہے...... کون ہے؟''

''بانو...... میں کئی دنوں سے خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ تمہیں سب کچھ بتادیا جائے تاکہ تمہیں یہ اندازہ ہوسکے کہ میں کون ہوں، میرا بیک گراؤنڈ کیا ہے...... اور میں کس طرح اس حال کو پہنچا ہوں۔''

''چلو، بتادو تو اچھا ہی ہوگا۔''

''بانو، میرے باپ دادا کے پاس اتنی زمینیں اور جائداد تھی کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

''کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟''

دلشان نے اس دن بانو کو اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ چندا کی محبت سے لے کر دلدار کی بے وفائی تک کی کہانی سنادی تھی۔ بانو حیرت اور دکھ سے یہ سب کچھ سنتی رہی تھی

''میرے خدا، تمہارے ساتھ تو بہت بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے۔''

''ہاں بانو...... اور اب میں اسی المیے کے سائے میں زندگی گزار رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ وہ بدنصیب کہاں ہوگی۔ اپنی زندگی کہاں اور کن حالات میں گزار رہی ہوگی۔ زندہ بھی ہے یا مرچکی ہے؟ یہ سب میں نہیں جانتا۔''

''میں اس تلاش میں تمہارا ساتھ دوں گی۔'' بانو نے کہا۔ ''فی الحال تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ آؤ، ہم کہیں باہر سے ہوکر آتے ہیں۔'' بانو نے کہا۔ ''مجھ سے تمہارا اداس چہرہ نہیں دیکھا جاتا۔''

بانو نے اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنا شروع کردیا تھا۔ دلشان کو احساس ہوتا جارہا تھا کہ بانو ایک مخلص اور بہت اچھی لڑکی ہے اور اس کے ساتھ زندگی گزاری جاسکتی ہے۔

عدنان اور زہرہ نے بھی اسے یہی مشورہ دیا تھا۔

''دلشان، جب وہ لڑکی خود تمہاری طرف بڑھ رہی ہے تو اسے اپنالو...... اور اچھی بات یہ ہے کہ خود عارف صاحب بھی تمہیں پسند کرنے لگے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن چندا کے لیے کیا کروں؟''

''اس کی تلاش جاری رکھو۔'' عدنان نے کہا۔ ''سچائی تو

یہی ہے نا کہ وہ تمہارے لیے ایک خواب، ایک پرچھائیں بن چکی ہے اور خواب یا پرچھائیں کے ساتھ زندگی تو نہیں گزر سکتی ہے نا۔"

"فرض کریں اگر وہ مل بھی گئی تو بانو کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ آپ اسے بھی اپنالیں۔" زہرہ نے کہا۔ "وہ بہت معصوم اور اچھی لڑکی ہے، وہ محبت کرنا اور ساتھ نبھانا جانتی ہے۔"

"یہ تو ہے۔" دلشان نے تائید کی۔ "بانو واقعی بہت اچھی ہے۔"

"اور اب میں تم سے ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں جو میں نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔" عدنان نے کہا۔ "دیکھو، کیا تم اور چندا اتنے بڑے مجرم تھے کہ تمہیں اس حال کو پہنچا دیا جاتا۔"

"نہیں، ہم نے ایسا کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔"

"اس کے باوجود تمہارے ساتھ ایسا سلوک ہوا۔ تم کو مارنے تک کی سازش کرلی گئی۔ تمہاری قسمت تھی کہ تم بچ کر نکل آئے۔ بدقسمتی بے چاری چندا کے ساتھ رہ گئی۔ تو کیا تم اس معصوم کی بربادی کا بدلہ نہیں لو گے؟"

"بدلہ۔" دلشان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں بدلہ!" عدنان نے اپنی بات دہرائی۔ "یاد رکھو دلشان! تمہیں بدلہ لینا ہے کیونکہ وہ لوگ تم دونوں کے قاتل ہیں۔ انہوں نے مار دیا ہے تمہیں۔ کیا تمہارے سینے میں کوئی آگ نہیں بھڑک رہی؟"

"ہاں بھڑک رہی ہے۔" دلشان نے کہا۔ "لیکن میں کس طرح بدلہ لے سکتا ہوں؟"

"طاقت کے ذریعے...... اور طاقت دولت سے آتی ہے...... اور دولت بانو کے پاس ہے۔ تم اسے اپنا کر طاقت ور بن جاؤ۔ اس کے بعد چھا جاؤ ان لوگوں پر۔ انہیں احساس دلا دو کہ تم بھی ان سے کم نہیں ہو۔"

"عدنان، میں نے تو اس انداز سے سوچا ہی نہیں تھا۔" دلشان نے کہا۔

"تو اب سوچ لو۔ تم تو صرف دلدار کے چکر میں پڑے ہو جبکہ تمہارے اصل مجرم تو تمہارے چچا اور ان کا خاندان ہے۔ تم نے ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سوچا؟"

"اس لیے کہ میں ان کے مقابلے پر بے بس ہوں۔"

"لیکن بانو کو اپنا کر تم بے بس نہیں رہو گے۔" عدنان نے کہا۔ "وہ ایسی لڑکی ہے جو اس معاملے میں بھی تمہارا ساتھ دے گی۔"

"ٹھیک ہے یار!" دلشان نے ایک گہری سانس لی۔

"تمہارا یہ مشورہ بھی درست ہے۔ مجھے طاقت حاصل کرنی ہے۔ تمہاری باتوں نے میرے سینے میں دبی ہوئی چنگاری کو بھڑکا دیا ہے۔"

"اب جائیں، بانو آپ کا انتظار کررہی ہے۔" زہرہ نے بتایا "جس وقت اس کا فون آیا آپ واش روم میں تھے۔"

"او کے۔" دلشان مسکرا دیا۔

اس نے جب عدنان کی دی ہوئی گاڑی باہر نکالی تو گیٹ کے قریب ہی ایک آدمی اس کی گاڑی سے ٹکرا کر ایک طرف گر پڑا۔ اسے چوٹ نہیں آئی تھی لیکن وہ اٹھنے کی جدوجہد کررہا تھا۔ دلشان گاڑی سے اتر کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

وہ ایک نابینا شخص تھا اور دلشان ہزاروں میں بھی اسے پہچان سکتا تھا، وہ دلدار تھا۔ وہ دلدار کو سہارا دے کر گھر کے اندر لے آیا تھا۔ دلدار اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولے جارہا تھا۔

"پتا نہیں لوگ اندھے ہوکر گاڑی کیوں چلاتے ہیں۔ دیکھتے ہی نہیں۔"

دلشان اسے سہارا دے کر اسٹور روم کی طرف لے آیا تھا۔

عدنان اور زہرہ حیرت زدہ ہوکر اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ دلشان نے دھکا دے کر دلدار کو اسٹور روم میں پھینک دیا تھا۔ فرش پر گر کر وہ اور بھی واویلا کرنے لگا تھا۔

"ارے، یہ کیا ظلم کررہے ہو میرے ساتھ۔ ایک اندھے نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟"

"خاموش!" دلشان زور سے دہاڑا پھر اس نے زہرہ اور عدنان کی طرف دیکھا۔ "یہی کمینہ دلدار ہے۔"

اپنا نام سن کر دلدار کو چپ لگ گئی۔ وہ واویلا کرنا بھول گیا تھا۔

"دلشان ...... کیا تمہیں یقین ہے کہ یہی دلدار ہے؟" عدنان نے کہا۔

"ہاں، سو فی صد یقین ہے یہی دلدار ہے۔ میں اس کے مکروہ چہرے کو زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اب اس سے یہ پوچھنا ہے کہ یہ اندھا کیسے ہوگیا؟"

"کک...... کون ہو تم؟" دلدار نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری موت، دلشان!" دلشان نے بتایا۔

دلدار ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ وہ کانپنے جارہا تھا۔

"اس کم بخت سے پوچھو تو سہی، اس نے چندا کو کس کے ہاتھ بیچا ہے؟" عدنان نے کہا۔



دلشان نے دلدار کے بال پکڑ کر اسے جھٹکے دینے شروع کردیے "بتا...... کہاں ہے چندا؟ جلدی بتا ورنہ تیرا گلا کاٹ کر رکھ دوں گا۔"

"خدا کے لیے دلشان بابو!" دلدار نے کچھ کہنا چاہا۔

"خاموش!" دلشان نے پوری قوت سے اس کے گال پر تھپڑ رسید کردیا۔ "جس وقت تو نے ہم پر حملہ کروایا تھا، اس وقت خیال نہیں آیا کہ میں کون ہوں؟"

"غلطی ہوگئی...... مجھے معاف کردو۔" دلدار نے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔

"یہ بتا تو اندھا کیسے ہوگیا؟"

"مجھ پر بی بی نے تیزاب پھینک دیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "دونوں آنکھیں چلی گئیں میری۔"

"کس بی بی نے؟"

"چندا بی بی نے۔" دلدار نے بتایا۔

"کہاں ہے چندا!" دلشان نے پوچھا۔ "کیا سلوک کیا ہے تو نے اس کے ساتھ؟"

"میں نے جی...... پانچ لاکھ میں ان کا سودا کردیا تھا۔" دلدار نے بتایا۔

دلشان کے دوسرے تھپڑ نے اس کی گردن گھما دی تھی۔ "ذلیل! تجھے شرم نہیں آئی...... ایسی لڑکی کا سودا کردیا جس کی حویلی کے ٹکڑوں پر پلتا رہا ہے۔"

"مجھے معاف کردیں دلشان صاحب! معاف کردیں۔" اس نے پھر ہاتھ جوڑ لیے۔

"کیا تو معاف کیے جانے کے قابل ہے؟ بتا، کہاں ہے چندا کس کے پاس ہے؟" عدنان نے پوچھا۔

"وہ جی مہارانی کے پاس ہے۔" دلدار نے بتا دیا۔

"کون مہارانی؟"

"وہ ایک خسرا ہے جی۔ بہت خطرناک، بہت بڑا اڈا ہے اس کا۔"

"پورا پتا بتا اس کا۔"

دلدار نے پتا بتا کر پھر رونا دھونا شروع کردیا۔ "خدا کے لیے معاف کردیں مجھے۔ میں نے اپنی سزا پالی ہے۔ اندھا ہوچکا ہوں، اب اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے۔"

"عدنان! اب بتاؤ...... کیا، کیا جائے؟" دلشان نے پوچھا۔

"تم پریشان نہ ہو۔ میں اپنے دوست ایس ایس پی جاوید کو فون کرتا ہوں۔" عدنان نے کہا "اس کم بخت کو تو حوالات میں بند کرواتا ہوں، اس کے بعد مہارانی کے اڈے پر چھاپا مار کر چندا کو بازیاب کراتے ہیں۔"

ایس ایس پی جاوید پندرہ منٹ کے اندر ہی پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ پولیس کی پوری ٹیم لے کر آیا تھا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں اس کم بخت مہارانی کو۔" جاوید نے کہا۔ "بہت مشہور اڈا ہے اس کا۔ میں تو بہت دنوں سے اس کے چکر میں تھا لیکن بدقسمتی سے ہمارے کئی نام نہاد شرفا اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔ اب تمہاری چندا کے حوالے سے اس پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جائے گا۔"

"تو پھر جلدی کرو۔" عدنان نے کہا۔ "ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہوچکی ہے۔"

روتے دھوتے اور فریاد کرتے ہوئے دلدار کو پولیس والے کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد ایک قافلہ مہارانی کے اڈے کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس قافلے میں عدنان اور دلشان بھی موجود تھے۔

مہارانی کا اڈا ایک بہت بڑا جدید طرز کا مکان ثابت ہوا تھا جس کے گیٹ پر باقاعدہ مسلح گارڈ موجود تھا جس نے پولیس کو دیکھتے ہی اندر کی طرف دوڑ لگادی تھی۔ پولیس والے دندناتے ہوئے اندر آگئے تھے۔ پورے مکان میں چیخ و پکار مچ گئی تھی۔ کئی مسلح افراد کے ساتھ ساتھ ایک درجن کے قریب لڑکیاں بھی برآمد ہوئی تھیں۔

مہارانی تالیاں بجا بجا کر دھمکیاں دیے جارہا تھا۔ اپنے تعلقات بتا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک فون پر جاوید کی وردی اتر جائے گی۔ جاوید کے اشارے پر دو پولیس والوں نے اس کی دھنائی کردی تھی۔ عدنان اور دلشان پورے مکان میں چندا کو تلاش کرتے پھر رہے تھے لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔

"بتا...... چندا نام کی لڑکی کہاں ہے؟" دلشان نے مہارانی سے پوچھا۔

"ارے...... یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔" مہارانی واویلا کرنے لگا تھا۔ "اس نے پہلے تو دلدار پر تیزاب پھینک کر اسے اندھا کیا پھر موقع پا کر بھاگ گئی یہاں سے۔"

"جھوٹ بولتا ہے تو۔" جاوید نے ایک چھڑی رسید کردی۔

مہارانی بلبلا کر رہ گئی تھی "ارے میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ کم بخت بازار جانے کے بہانے یہاں سے نکلی اور اچانک بھاگ گئی۔ میں نے تو بڑے پیار سے رکھا تھا اس کو۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا سما گئی تھی۔"

"خاموش۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو لڑکیوں کو کتنے پیار سے رکھتی ہے۔" جاوید نے کہا۔ "دیکھ اب بھی وقت ہے،

چندا کے بارے میں بتادے۔ تونے اس کو یہاں سے کس کے پاس بھیج دیا ہے...... ورنہ الٹا لٹکا کر تیری کھال اتروادوں گا۔“

”تم چاہے جو بھی کرو...... لیکن سچ یہی ہے جو میں بتا رہی ہوں، تم چاہو تو یہاں کی لڑکیوں سے پوچھ سکتے ہو۔“

پھر وہاں موجود لڑکیوں نے بھی اس بات کی تصدیق کردی کہ چندا واقعی فرار ہوگئی تھی۔ دوسری لڑکیاں تو بازیاب ہوگئیں لیکن چندا کا کہیں پتا نہیں چلا۔

☆☆☆

اس نے ایک دکان کی آڑ سے چھپ کر ان لوگوں کو دیکھا۔

وہ دو آدمی تھے جو مہارانی نے چندا کے ساتھ کردیے تھے۔ مہارانی کو اس پر بھروسا تو ہوگیا تھا، اس کے باوجود اس نے دو آدمی ساتھ کردیے تھے جو سائے کی طرح اس کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔

چندا بہت دیر تک مارکیٹ میں بھٹکتی رہی۔ وہ موقعے کی تلاش میں تھی۔ بالآخر اسے موقع مل ہی گیا۔ وہ دونوں ذرا سی دیر کے لیے ہجوم میں پھنسے اور چندا لپک کر ایک دکان کی آڑ میں ہوگئی۔

وہ دونوں پاگلوں کی طرح چندا کو تلاش کرتے ہوئے ایک طرف نکل گئے تھے۔

چندا بہت دیر تک اسی دکان کی آڑ میں چھپی رہی۔ پھر ایک لڑکی اس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ بہت اسمارٹ اور خوبصورت لڑکی تھی۔ مغربی طرز کے لباس میں۔ اس نے چندا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ، وہ دونوں ابھی تک مارکیٹ میں تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”تم کون ہو؟“ چندا نے پریشان ہوکر پوچھا۔

”گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ مجھ پر بھروسا کرو۔“

بوکھلائی ہوئی چندا اس کے ساتھ ہولی تھی۔ مارکیٹ کے پیچھے اس لڑکی کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ ”چلو بیٹھ جاؤ۔“ اس نے دروازے کھولتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہاں سے نکل گئے تو ان کا باپ بھی تمہیں نہیں پکڑ سکے گا۔“

چندا پریشان ہوکر اس لڑکی کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس لڑکی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور چندا کا ایک نیا سفر شروع ہوگیا۔

چندا مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

”گھبراؤ نہیں۔ اب ہم دور نکل آئے ہیں۔“ اس لڑکی نے کہا۔ ”وہ تمہیں ابھی تک وہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔“

”تمہیں کیسے معلوم کہ کوئی مجھے ڈھونڈ رہا ہے؟“

”سب جانتی ہوں میں۔ گھر پہنچ کر بتاؤں گی۔“

گاڑی پوش علاقے کے شاندار اپارٹمنٹس کی ایک بلڈنگ کے اندر آکر رک گئی۔ ”چلو اترو۔“ اس لڑکی نے کہا۔ ”میں دوسری منزل پر رہتی ہوں۔“

لفٹ کے ذریعے وہ اوپر آگئے۔

بہت خوبصورت اپارٹمنٹ تھا۔ اس کی آرائش بھی بہت اچھی تھی۔ لڑکی وہاں تنہا ہی معلوم ہوتی تھی۔ ”تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“

”پہلے میری بات کا جواب دو۔“ چندا نے کہا۔

”سب بتادوں گی، پہلے چائے پی لو۔ اور چاہو تو کچن میں آکر میرا ہاتھ بھی بٹا سکتی ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ چندا مسکرادی۔ نہ جانے کتنے دنوں کے بعد اس کے ہونٹ مسکرائے تھے۔ یہ بے تکلف سی لڑکی اسے اچھی لگی تھی۔

یہ ماحول مہارانی کے گھٹے ہوئے ماحول سے کتنا مختلف تھا۔ وہ خود بھی کبھی اسی قسم کے ماحول کا حصہ رہی تھی لیکن اب ...... نہ جانے کیا بن کر رہ گئی تھی۔ کچن میں چائے بنانے کے دوران اس لڑکی نے بتایا۔ ”میں نے مارکیٹ میں ہی تمہیں دیکھ لیا تھا۔ میں تمہیں تو نہیں جانتی ...... لیکن ان دونوں کو ضرور پہچانتی ہوں جو سائے کی طرح تمہارے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ وہ دونوں مہارانی کے آدمی تھے۔ کیوں ...... میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟“

”نہیں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ چندا نے کہا۔ ”لیکن تم کیسے ان لوگوں کو جانتی ہو؟“

”اس لیے کہ میں خود بھی اسی بزنس سے منسلک ہوں جس سے تم ہو۔“ لڑکی مسکرا کر بولی۔ ”ہاں، میں اسے بزنس ہی کہتی ہوں۔ لڑکیاں اس بزنس میں یا تو جبر سے لائی جاتی ہیں یا پھر ان کی مجبوری انہیں خود ہی اس طرف لے آتی ہے۔ میں بھی انہی میں سے ہوں جو اپنی مرضی سے آتی ہیں۔ اسی لیے میں آزاد ہوں۔ مجھ پر کسی کا دباؤ نہیں ہے، کوئی مجھ پر ظلم یا جبر نہیں کرسکتا۔ میں اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتی ہوں اور گزار رہی ہوں۔“

”اب سمجھی!“ چندا نے ایک گہری سانس لی۔

”میں جانتی ہوں کہ تمہاری کیا کہانی ہوگی۔“ لڑکی نے کہا۔ ”تم اس جبر کا ایک حصہ بن گئی ہو۔ مہارانی کے آدمیوں کے تمہارے ساتھ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ تم پھنسی ہوئی ہو۔“



”ہاں، بہت بری طرح۔“ چندا نے بتایا۔ ”بہت ہی دردناک کہانی ہے میری۔ میں اپنے زخموں کو چاٹتی پھر رہی ہوں۔ میرے ساتھ وہ ہوا ہے جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔“

”اندازہ ہورہا ہے مجھے۔ لو، یہ کیک کھالو۔“ لڑکی نے کیک اس کی طرف بڑھادیا۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“

”چندا!“

”یہ نام ان لوگوں نے دیا ہے یا واقعی یہ تمہارا اصل نام ہے؟“

”یہ میرا اصل نام ہے۔“ چندا نے بتایا۔ ”کیونکہ میں کسی زمانے میں اپنے والدین کی بہت لاڈلی ہوا کرتی تھی۔“

”اور اب تمہارے والدین کہاں ہیں؟“

”اسی ملک میں ...... لیکن وہ مجھے اپنے طور پر مار چکے ہیں۔“ چندا نے بتایا۔ ”ہوسکتا ہے کہ تمہاری کہانی میں اتنے دکھ نہ ہوں جتنی میری کہانی میں ہیں۔ میں پھولوں کے درمیان تھی پھر اچانک مجھے کانٹوں میں گھسیٹ لیا گیا اور کانٹے بھی ایسے جنہوں نے نہ صرف میرے جسم کو بلکہ میری روح کو بھی لہولہان کردیا ہے۔“

”ہمارے معاشرے میں کچھ اسی قسم کے کھیل ہوتے ہیں۔“ اس لڑکی نے کہا۔

”تم مجھے اپنا نام تو بتاؤ۔“

”نیلم نام ہے میرا۔“ اس نے بتایا۔ ”پہلے میرا نام کچھ اور تھا۔ بہت پاکیزہ اور مقدس نام تھا میرا۔ پھر میں نے یہ محسوس کیا کہ میں اس نام کے لائق نہیں رہی، اسی لیے اسے بدل کر نیلم ہوگئی۔“

”اچھا ہی کیا تم نے۔“ چندا نے ایک گہری سانس لی۔ ”ہم جیسوں کے تو نام ہونے ہی نہیں چاہئیں۔ ہم تو بے نام سے لوگ ہیں۔“

”مگر بتاؤ تو سہی، تمہارے ساتھ کیا گزری ہے؟“

چندا نے اسے اپنی کہانی سنادی۔ کہانی سناتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آگئے۔ وہ بہت دنوں سے نہیں روئی تھی لیکن نیلم کے سامنے اسے خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔ نیلم نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

”چندا! واقعی تم کس طرح زندہ ہو، مجھے اس بات پر حیرت ہورہی ہے۔“ نیلم نے کہا۔ ”اب یہ بتاؤ، اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میں نے سب کچھ تمہیں بتادیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ، اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں کہاں جاسکتی ہوں ...... نہ تو میری کوئی منزل ہے اور نہ ہی میرے سامنے کوئی راستہ ہے۔“

”چندا! اگر تم مناسب سمجھو تو یہیں، میرے پاس رہ جاؤ۔“ نیلم نے کہا۔ ”تمہارے رہنے سے مجھے حوصلہ ملتا رہے گا اور ہم دونوں اپنی کوئی منزل بھی تلاش کرلیں گے۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ چندا جلدی سے بولی۔ ”تم کم از کم ان تمام لوگوں سے بہت بہتر ہو جنہوں نے میری زندگی میں کوئی کردار ادا کیا ہے۔“

☆☆☆

اب وہ ایک بڑی حیثیت کا مالک ہوچکا تھا۔

عارف نے اپنی بیٹی بانو کی شادی دلشان سے کردی تھی۔ آہستہ آہستہ دلشان کو کاروبار کے رموز و اسرار آتے چلے گئے۔ وہ ایک بہت بڑے بزنس ٹائی کون کا داماد تھا۔ بانو اس سے نباہ کرنے کا ثبوت دے رہی تھی۔ وہ اس سے بہت پیار کرتی تھی۔ ایک مخلص بیوی ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔

عارف ایک دن کھانا کھانے کے دوران کرسی سے گر پڑا۔ اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور اسپتال جاتے جاتے اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی موت کے بعد اس گھر پر کچھ دنوں تک موت کی سوگواری طاری رہی پھر آہستہ آہستہ زندگی معمول پر آتی چلی گئی۔ ہر جگہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اب پورے بزنس اور ساری جائداد کی مالک بانو تھی اور بانو کے حوالے سے دلشان سیاہ سفید کا مالک ہوگیا تھا۔ اس کے شب و روز اب کچھ اور ہوچکے تھے۔ گزرے ہوئے دن اس کی یادداشت سے محو ہوتے جارہے تھے۔ کبھی کبھی اسے چندا کا خیال آجاتا اور وہ اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دینے کی کوشش کرتا۔ اس کے پاس کسی اور طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ اب خود اس کا چچا رانا مکرم بھی اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے دو بچے ہوچکے تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ یہ ایک امیر ماں باپ کی اولادیں تھیں اسی لیے ان کی پرورش بھی پوری شان سے ہورہی تھی۔

عدنان اور زہرہ کبھی کبھی ان سے ملنے کے لیے آجایا کرتے۔ خود دلشان کے پاس اب اتنی فرصت نہیں رہی تھی کہ وہ ان سے ملنے کے لیے جاسکتا۔ ایک دن عدنان اس سے ملنے اس کے دفتر آگیا۔ وہ ایک خبر لے کر پہنچا تھا۔ ”دلشان! چندا کا پتا چل گیا ہے۔“ عدنان نے اسے بتایا۔

”اچھا!“ دلشان نے فائل سے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

”کیا بات ہے...... تمہارے رویے میں اس کے لیے

کوئی گرم جوشی پیدا نہیں ہوئی؟" عدنان نے پوچھا۔ "ورنہ یہ خبر سن کر تم کو تو اچھل جانا چاہیے تھا۔"

"دیکھو بھائی! انسان کو حقیقت پسند ہو جانا چاہیے۔" دلشان نے کہا۔ "ہاں، یہ ٹھیک ہے کہ میں اس کے لیے پاگل رہا ہوں، کیونکہ اس زمانے میں وہی میری کائنات تھی۔ میں اسے تلاش کرتا رہا لیکن اب سب کچھ بدل چکا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ پل کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے، اب اس کی دنیا کچھ اور ہو چکی ہے۔"

"اور تمہاری دنیا کچھ اور ہے۔" عدنان تلخی سے بولا۔ "اس مظلوم لڑکی نے تمہاری محبت کے لیے اتنے دکھ برداشت کیے تھے۔"

"بالکل درست۔ اگر اس وقت وہ مجھے مل جاتی تو میری کائنات وہی ہوتی...... لیکن اب میرے پاس بانو ہے، میری بیوی...... میرے بچے ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو کہ میں ان سب کو چھوڑ دوں؟"

"میری جان! تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم اپنی نام نہاد قسم کی عزت کے پجاری ہو گئے ہو۔" عدنان کے لہجے میں نامعلوم سی تلخی تھی۔ "اگر کوئی کال گرل یا طوائف تمہارے گھر پر آ کر رہنے لگی تو تمہاری عزت دو کوڑی کی ہو جائے گی۔ کیوں، یہی سب سوچ رہے ہو نا؟"

"تم یہ بتاؤ، کیا میرا یہ سوچنا غلط ہے؟"

"نہیں میرے دوست! اس مرحلے پر بالکل درست ہے۔" عدنان نے کہا۔ "اچھا، مجھے اجازت دو۔"

"کم از کم یہ تو بتا دو کہ چندا ہے کہاں؟" دلشان نے پوچھا۔

"کیا فائدہ بتانے کا۔" عدنان تلخی سے بولا۔ "اب وہ بے چاری تمہارے کس کام کی۔"

"دیکھو۔ میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا...... لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں اسے وہاں، اس گندگی میں تو نہیں رہنے دوں گا۔"

"چلو۔ اس بے چاری کے لیے اتنا ہی بہت ہوگا۔"

عدنان نے تفصیلاً نیلم کے گھر کا پتا اسے سمجھا دیا جہاں چندا رہائش پذیر تھی۔

☆☆☆

چندا نے گھنٹی کی آواز پر جب دروازہ کھولا تو اپنے دروازے پر دلشان کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

دلشان بھی گم صم سا اس لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا جو مغربی لباس میں کل سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی۔ کل والی چندا اتنی فیشن ایبل کبھی نہیں تھی۔ پہلے اس کے چہرے پر معصومیت کا نور ہوا کرتا تھا لیکن اب گندے تجربات کی پختگی دکھائی دے رہی تھی۔

"دلشان! یہ...... یہ تم ہو؟" چندا نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، یہ میں ہوں...... دلشان!"

"دلشان......!" چندا تقریباً بے ہوش سی ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ دلشان نے سہارا دے کر اسے صوفے پر بٹھا دیا تھا۔ چندا اس دوران مسلسل روئے جا رہی تھی۔ "کہاں چلے گئے تھے تم...... کیوں چلے گئے تھے؟ تم کیا جانو مجھ بدنصیب پر کیا گزر چکی ہے۔ میں زندہ نہیں ہوں دلشان! زندہ نہیں ہوں، مر چکی ہوں میں۔"

دلشان خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ چندا بولے جا رہی تھی۔ اس نے اپنے اوپر گزرنے والی ساری کہانی سنا دی۔ کمر کھول کر اپنی چوٹوں کے نشانات تک دکھا دیے۔ اپنی تقدیر کا شکوہ کر رہی تھی۔ "آخر کیوں...... میرے ساتھ سب کیوں ہوا۔ میں ایسی تو نہیں تھی۔ دلشان تم تو جانتے ہو میں ایسی کبھی نہیں تھی۔"

"ہاں چندا، تم ایسی کبھی نہیں تھیں......" دلشان کے الفاظ ٹوٹ گئے، وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

اس دوران نیلم بھی آ گئی تھی۔ دلشان کو دیکھ کر اس نے کہا۔ "بہت دکھ اٹھائے ہیں تمہاری چندا نے۔ ایسا کوئی دن نہیں جاتا تھا جب یہ تمہیں یاد نہ کرتی ہو۔"

"دلشان! میں تمہیں تلاش کرتی تو کہاں کرتی؟" چندا اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "میری نگاہیں ہر وقت، ہر جگہ تمہیں تلاش کرتی رہتی تھیں۔"

"میرا بھی یہی حال تھا چندا!" دلشان نے کہا۔ "میں چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ میں اس کم بخت کی تلاش میں تھا جس نے تمہیں فروخت کیا تھا۔ وہ مل بھی گیا تھا لیکن شاید تم نے اسے نابینا کر دیا تھا۔"

"ہاں، میں نے اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا۔"

"ہم نے مہارانی کے اڈے پر بھی چھاپا مارا لیکن تم وہاں سے نکل چکی تھیں۔"

"ہاں...... چندا مجھے مل گئی تھی۔" نیلم نے بات آگے بڑھائی۔ "میں اسے اپنے پاس لے آئی۔ میرے پاس کوئی شرافت کی زندگی تو نہیں تھی لیکن حالات کا جبر بھی نہیں تھا۔ یہ اپنی مرضی کی مالک تھی اور آج بھی اپنی مرضی کی مالک ہے۔"

"دلشان، تم نے میری کہانی سن لی...... سوائے آنسوؤں اور آہوں کے اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تم اپنے بارے میں



بتاؤ تم نے میرے بغیر یہ دن کس طرح گزارے۔"

دلشان نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سب کچھ بتا دیا۔ چھپائے رکھنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ چندا خاموشی سے سنتی رہی۔ کتنا فرق آ گیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ حویلی سے نکلے تھے۔ دونوں کا ایک ہی جرم تھا، محبت...... لیکن دونوں کی تقدیر کتنی مختلف ہو گئی تھی۔ اس کے حصے میں سوائے دکھوں اور پریشانیوں کے کچھ نہیں آیا تھا جبکہ دلشان کی جھولیوں میں دنیا بھر کی خوشیاں اور نعمتیں ڈال دی گئی تھیں۔

"مبارک ہو دلشان!" چندا نے کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا۔ "تم اپنے سفر میں کامیاب ہو گئے ہو۔"

دلشان خاموش رہا۔ نیلم نے چائے بنانے کے دوران گم صم دلشان سے پوچھا۔ "تم بتاؤ، تم نے چندا کے لیے کیا سوچا ہے؟ کیا تم اسے اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟"

"ہاں، لے جاؤں گا...... لیکن ابھی نہیں۔" دلشان نے جواب دیا۔ "میں اس بارے میں بانو سے بات کر لیتا ہوں۔" پھر اس نے چندا کی طرف دیکھا۔ "چندا! تم میری مجبوری سمجھ رہی ہو نا؟"

"ہاں، میں سب سمجھ رہی ہوں۔" چندا کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔ "کیونکہ اب واقعی میرے اور تمہارے درمیان بہت فاصلہ ہو گیا ہے۔ تمہاری زندگی کچھ اور ہو گئی ہے، میری کچھ اور ہے۔"

"نہیں چندا! ایسی بات نہیں ہے۔" دلشان نے جلدی سے کہا۔ "میں کل ہی تمہارے پاس آ رہا ہوں۔"

☆☆☆

دلشان نے بانو کو چندا کے بارے میں پہلے ہی سب کچھ بتا رکھا تھا۔ اب، جب اس نے چندا کے مل جانے کی خبر سنائی تو بانو خوش ہو گئی تھی۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم اس بدنصیب کو یہاں لے کر آ جاؤ۔"

"بانو! یہ تم کس دل سے کہہ رہی ہو؟"

"بہت کھلے دل سے۔" بانو نے برجستہ کہا۔ "اتنے دنوں میں تم نے بہت اچھی طرح میرا مزاج دیکھ لیا ہے۔ میں کھلی ہوئی کتاب کی طرح تمہارے سامنے ہوں۔ جس وقت تم نے چندا کے بارے میں مجھے بتایا تھا، میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ مل گئی تو میں بہ خوشی اسے قبول کر لوں گی۔"

"بانو! کیا تمہیں احساس ہے کہ میرے اور اس کے درمیان کتنے فاصلے ہو چکے ہیں، ہمارے اسٹیٹس میں کتنا فرق ہو گیا ہے۔"

"دلشان! میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ تم تو بہت کمزور آدمی ثابت ہو رہے ہو۔ ہمارے اسٹیٹس کو چیلنج کرنے والا ہے کون؟ جاؤ اسے لے آؤ۔ وہ ایک بدنصیب لڑکی ہے۔ اس نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ اب اسے تھوڑا سا سکون مل جائے تو اس میں کیا برائی ہے۔"

"ٹھیک ہے بانو!" دلشان نے ایک گہری سانس لی۔ "میں اسے لے آتا ہوں۔"

"اس طرح نہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تم اس کو پوری عزت اور احترام کے ساتھ لاؤ۔"

لیکن جب وہ دونوں نیلم کے یہاں پہنچے تو ایک بھیانک خبر ان کی منتظر تھی۔ چندا کے بھائیوں کو کسی طرح چندا کی خبر ہو گئی تھی اور وہ چندا کو نیلم کے اپارٹمنٹ سے اٹھا کر لے گئے تھے۔

ایک بار پھر سفر جاری تھا۔

پہلے یہ سفر گاؤں سے شہر کی طرف تھا اور اب شہر سے گاؤں کی طرف۔ پہلے اس سفر میں دلشان اس کے ساتھ تھا جبکہ اس بار اس کے دونوں خونخوار بھائی اس کے ساتھ تھے۔

پہلا سفر موت سے زندگی کی طرف تھا اور اب زندگی سے موت کی جانب۔ شاید محبت کبھی کبھی چاہنے والوں کو اسی طرح آزمایا کرتی ہے۔

☆☆☆

چندا کے لیے یہ موت کا سفر تھا۔

لیکن اب وہ کوئی شکوہ نہیں کر رہی تھی اور نہ ہی خوف نے اس کے اعصاب منجمد کیے تھے اور نہ جینے کی خواہش تھی۔ وہ تو پہلے بھی کئی بار مر چکی تھی۔ ہاں اب اتنا ہوا تھا کہ دلشان سے ملنے کے بعد ذرا سی دیر کے لیے زندگی اس کے قریب ضرور آئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے اور دلشان کے درمیان بہت فاصلے ہو چکے ہیں۔ اب وہ کسی اور دنیا کا آدمی ہے۔ محبت کا کیا ہے، وہ تو یادوں میں رہتی ہے اور دلشان کی یادیں بھی اس کے ساتھ ہمیشہ رہیں گی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بہت آلودہ ہو چکی ہے اور ایسی آلودگی کے ساتھ وہ دلشان کے گھر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نیلم کے ساتھ بھی نہیں رہے گی۔ اس نے نیلم کو اپنے ارادوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس وقت وہ اور نیلم دونوں بہت خوش گوار موڈ میں تھے۔ جب دروازے پر دستک ہوئی، نیلم اس وقت چائے پی رہی تھی۔ چندا دروازہ کھولنے دروازے تک گئی مگر اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا ایک خوف زدہ چیخ کے ساتھ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

اس کے دونوں خونخوار بھائی دروازے پر کھڑے تھے۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے چندا کے بال پکڑ لیے، اس کا بھائی ریاض اس کے بالوں کو زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔

ان لوگوں نے نیلم کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔ ان کی ساری توجہ چندا پر تھی۔ نیلم خوفزدہ ہو کر ایک کونے میں دبک گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں، لیکن جب چندا نے گڑگڑانا شروع کیا کہ بھائی ایسا مت کرو، بھائی میری بات تو سنو۔

تب نیلم کی سمجھ میں سب کچھ آگیا کہ آنے والے چندا کے بھائی ہیں۔ ایک شاندار پجیرو ان کے ساتھ تھی، انہوں نے چندا کو اس میں دھکا دے کر بٹھا دیا تھا۔ ''بھائی کہاں لے جارہے ہو مجھے۔'' چندا نے روتے ہوئے پوچھا۔

اس سوال کا جواب اسے ایک زوردار تھپڑ کی صورت میں ملا تھا۔ چندا کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا تھا۔ پھر اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا، کوئی آواز نہیں نکالی۔ اس کے دونوں بھائی دو اور آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان میں سے ایک پجیرو چلا رہا تھا۔ جبکہ دوسرا اگلی سیٹ پر تھا۔ ایک بار پھر سفر جاری تھا، پہلے گاؤں سے شہر کی طرف تھا۔ اس بار یہ سفر شہر سے گاؤں کی طرف تھا۔ پہلے اس سفر میں دلشان اس کے ساتھ تھا اور اب اس کے خونخوار بھائی اس کے ساتھ تھے۔ پہلے اس کے ساتھ محبت تھی۔ آنے والی اس خوشگوار زندگی کے خواب تھے، اس زندگی کے خواب ...... جو وہ دلشان، اپنی محبت کے ساتھ گزارنے جارہی تھی۔

ہوسکتا ہے یہ شاید موت کا سفر بن جائے۔ وہ جانتی تھی کہ اس سفر کا اختتام موت کی منزل کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اب وہ کچھ نہیں بول رہی تھی۔ اس کے آنسو بھی خشک ہوچکے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ ان بے رحم لوگوں کے سامنے رونے اور گڑگڑانے سے پہلے بھی کچھ نہ ہوا اور اب بھی کچھ نہیں ہوگا۔

پھر ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ وہ کیا اپنے ماں باپ کے سامنے جھکی ہوئی گردن کے ساتھ کھڑی ہوسکتی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اس کی موت کا فیصلہ اس کے ماں باپ ہی نے کیا ہوگا۔ کاش، گاؤں پہنچنے سے پہلے اسے موت آجائے اور جب گاؤں کی حویلی کے گیٹ کے اندر جاکر گاڑی کا دروازہ کھولا جائے تو وہ ہمیشہ کی نیند سو چکی ہو۔

پھر چاہے وہ اس کی لاش کے ساتھ کچھ بھی کرتے۔ روح کو اس بات کا افسوس کہاں ہوتا ہے کہ وہ جس جسم کو چھوڑ آئی ہے، اس کے ساتھ کیا سلوک ہورہا ہے۔

لیکن موت تو اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔ اپنی کوششوں، اپنے ارادوں اور خواہشوں سے کہاں ملتی ہے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ خود اپنی جان دیدے۔ چلتی گاڑی سے کود جائے یا ان میں سے کسی کا اسلحہ چھین کر خود کو گولی مار لے۔ ہاں یہ ہوسکتا تھا۔ ان لوگوں کو یہ اندازہ کہاں ہوسکتا تھا کہ وہ ان میں سے کسی کا اسلحہ چھین سکتی ہے۔ اس خیال نے اس میں ایک حوصلہ پیدا کردیا تھا۔ جب اس نے مرنا ہی تھا تو کم از کم ان لوگوں کو سزا دے کر مرے جو اس کی اس حالت کے ذمے دار تھے۔

چندا کے برابر والی سیٹ پر اس کا بھائی ریاض تھا۔ اس نے اپنا پستول بڑی بے پروائی کے ساتھ اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ جیپ اس وقت میدانی علاقوں سے گزر رہی تھی۔ ہر طرف ریت اڑ رہی تھی۔ دور دور تک سوائے ریگستان کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، صرف ہائی وے پر گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ نہ جانے یہ کون سا علاقہ تھا۔ ایک بار اس گاڑی نے اپنی رفتار آہستہ کی۔ اس کے سامنے ایک بڑا سا ٹرالر اس طرح آگیا تھا کہ گاڑی کو نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔

چندا کو کچے میں اترتا ہوا ایک راستہ دکھائی دے رہا تھا اس راستے پر گاڑیوں کے نشانات بتا رہے تھے کہ یہاں گاڑیوں کی آمدورفت ہوا کرتی ہے۔

یہ بہت اچھا موقع تھا۔

بس ایک لمحہ تھا، کچھ کر گزرنے کا۔ گاڑی آہستہ ہوئی اور اس نے جھپٹ کر ریاض کا گود میں پڑا ہوا پستول اٹھالیا۔

ریاض بوکھلا کر رہ گیا۔ ''یہ کیا کررہی ہے؟'' وہ پریشان ہوکر بولا۔

''خبردار بھائی!'' چندا نے پستول کی نال ریاض کی کمر سے لگادی تھی۔ ''تم جانتے ہو کہ مجھے ہر قسم کا اسلحہ چلانا آتا ہے۔ ڈرائیور سے کہو گاڑی کچے راستے میں اتار دے۔''

اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بھی ہوشیار ہوچکے تھے۔

''خبردار۔'' چندا نے دھمکی دی۔ ''اگر کسی نے گڑبڑ کی تو میں بے دریغ گولی ماردوں گی کیونکہ مجھے تو ویسے بھی مرنا ہے۔''

''تو چاہتی کیا ہے؟'' اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے فیاض نے پوچھا۔

''گاڑی کچے میں اتار دو۔'' چندا نے کہا۔ اس کے مضبوط لہجے میں غصہ اور نفرت تھی۔ اس لیے گاڑی کچے میں اتار دی گئی۔

گردوغبار کا ایک طوفان سا اٹھ آیا تھا۔

''آخر کہاں لے جارہی ہے؟'' ریاض نے غصے سے پوچھا۔

''کہیں نہیں، بس تھوڑا سا آگے۔'' اس نے بتایا۔ ''آگے چل کر پھر راستے سے ہٹ کر گاڑی میدان میں لے جانا۔''

''کیا تو پاگل ہوگئی ہے؟''

''جو کہا ہے وہی کرو۔ ورنہ بھائی ریاض تو گیا۔'' اس نے پستول کی نال کا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا تھا۔

سب خاموش ہوگئے۔

اب گاڑی ایک ویرانے میں کھڑی کردی گئی تھی۔ اس نے دوسرا حکم دیا۔ ''اب تم سب اپنا اپنا اسلحہ نیچے رکھ دو، جلدی۔''

وہ اس وقت پروفیشنل کرمنل کی طرح احکامات دے رہی تھی اور عمل بھی کروا رہی تھی۔ زندگی نے اتنے دنوں میں اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

وہ سب مجبور ہوگئے تھے۔ سب نے اپنا اپنا اسلحہ اس کے قدموں کے پاس پھینک دیا۔ ''چلو، اب سب گاڑی سے اتر جاؤ۔'' اس نے دوسرا حکم سنایا۔

وہ سب غصے اور نفرت بھرے تاثرات کے ساتھ گاڑی سے اتر گئے۔

چندا نے ان سب کو اپنے سامنے کھڑا کردیا تھا اور خود گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ ان میں سے کسی کو حرکت کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔

''آخر تو چاہتی کیا ہے؟'' ریاض نے پوچھا۔

اس وقت وہ سب اس کے سامنے غصے اور نفرت کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ ''میرے غیرت مند بھائیو! اونچی پگڑی والو، کیا تم یہ نہیں جانتے کہ مجھے اس حال کو پہنچانے کے ذمے دار کون ہیں، صرف تم۔ تم نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے، تم نے مجھے محبت تو حاصل نہیں کرنے دی لیکن مجھے طوائف ضرور بنا دیا، واہ...... کیا غیرت ہے تمہاری۔''

''چندا!'' ملک فیاض نے کہا۔ ''جو کچھ ہوا اسے بھول جا۔''

''نہیں بھائی، تم اس لیے تو مجھے نہیں لے جارہے تھے کہ میں اپنے ماضی کو چھوڑ کر ایک نئی زندگی شروع کردوں بلکہ اس لیے لے جارہے تھے کہ مجھے اپنی مرضی سے موت کی سزا دے سکو۔ کیونکہ تم بہت غیرت مند لوگ ہو اور میں تم لوگوں کو یہ سنانا چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تمہاری بے رحمی اور سنگ دلی کے بعد میرے ساتھ کیا گزری، سنو...... غور سے سن لو۔''

اس نے اپنی پوری کہانی ان کے سامنے دہراتے ہوئے کہا۔ ''اب تو پتا چل گیا نا، مجھ پر کیا گزری ہے۔''

''ہاں چندا، پتا چل گیا اب گھر واپس چل اور اپنے ہاتھ سے پستول پھینک دے۔''

''نہیں بھائی، میں ایک اور بات کہنا چاہتی ہوں کہ تم لوگ بہت غیرت مند ہو، بہت نیک اور پارسا ہو۔ اپنی مرضی سے چاہے کچھ بھی کرتے رہو، اسے کسی صورت غلط نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن بے چاری ایک کمزور اور بے بس لڑکی کے ساتھ اگر ظلم ہو تو گناہ گار بھی وہی لڑکی ہوتی ہے۔ واہ، کیا اصول ہیں تمہارے، کیا قانون ہے۔''

''چندا، ہم غیرت مند لوگ ہیں۔'' ریاض نے کہا۔ ''ہم کبھی کسی گناہ کی طرف نہیں گئے۔ ہم اپنے دامن پر داغ نہیں لگنے دیتے۔''

''بھائی، میرے سامنے ایسی بات مت کرو۔'' چندا نے نفرت سے تھوک دیا۔ ''کیا تمہیں یاد ہے کہ تم ایک بار عیاشی کے لیے مہارانی کے اڈے پر آئے تھے اور ایک لڑکی نے تمہارے پاس جانے سے انکار کردیا تھا جس پر اس کا جسم ادھیڑ کر رکھ دیا گیا تھا لیکن وہ تمہارے پاس نہیں گئی تھی۔''

''تمہیں، تمہیں کیسے معلوم؟'' ریاض نے بوکھلا کر پوچھا۔

''اس لیے کہ وہ بدنصیب لڑکی میں ہی تھی بھائی۔'' چندا نے بتایا۔ ''اگر کہو تو میں اپنا جسم کھول کر دکھا دوں۔ تمہارے لیے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی کیونکہ تمہارا کام ہی یہی ہے۔ جہاں ہزاروں لڑکیوں کو دیکھ چکے ہو، وہاں اپنی بہن کو بھی دیکھ لو، کیا فرق پڑتا ہے۔''

''خاموش!'' ریاض زور سے چلایا۔

''نہیں بھائی، آگے مت بڑھنا۔'' چندا نے اپنے ہاتھ کو جنبش دی۔ ''جہاں ہو، وہیں کھڑے رہو، میں اب اس کہانی کو ختم کرنے جارہی ہوں۔ الوداع میرے بھائیو، میرے دشمنو! الوداع۔''

اس سے پہلے کہ وہ لوگ کچھ سمجھ سکتے۔ چندا نے پستول اپنی کنپٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا تھا۔

اس ویرانے میں خون میں نہلائی ہوئی ایک لاش پڑی تھی جس کے پاس چار آدمی کھڑے تھے۔ ایک بڑی سی گاڑی کھڑی تھی اور ریت اچھالتی ہوئی ہوائیں تیز ہوتی جارہی تھیں...... ان غیرت مند انسانوں کے دلوں میں سوئے ہوئے ضمیر نے کوئی لہر نہیں اچھالی...... نہ شرمندگی کی نہ غم کی...... وہ جو اپنے نظام کے دائرے میں گھوم رہے تھے...... اسی حصار میں مقید فنا ہونے پر خوش اور مطمئن تھے...... انہیں ایک طرح کا اطمینان محسوس ہورہا تھا کہ ''خس کم جہاں پاک'' اب ان کی غیرت کو قرار مل گیا تھا۔

# محفلِ شعر و سخن



❊ سوہا جی...... حیدرآباد
وہ گئے برس تیرا ساتھ تھا اب کے بس تیری یاد ہے
تو نہیں رہا میرے ساتھ جو، نہ رہے گا ہجر کا سال بھی

❊ محمد رشید سیال...... روہڑی، ضلع سکھر
دشت میں پیاس بجھاتے ہوئے مرجاتے ہیں
ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مرجاتے ہیں
محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن
لوگ کردار نبھاتے ہوئے مرجاتے ہیں

❊ افتخار احمد تارڑ...... کوٹ قادر بخش
دراز پلکیں، غزال آنکھیں، مصوری کا ہے کمال آنکھیں
انہیں دیکھ کر مر نہ جائے کوئی، خدا کی بندی سنبھال آنکھیں



❊ سعدیہ ناز، محمد علی اسد، ایم عماد احمد...... کراچی
جھکی جھکی آنکھوں سے حسین چہرے پر کتنا نور ہے
ظالم تیری سادگی میں بھی کتنا غرور ہے

❊ جنید احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی
زمیں پر کھینچ لاؤں گا میں اِک دن چاند سورج کو
بچھے گا آسماں اور شان سے اس پر چلوں گا میں

❊ حافظ محمد عرفان...... سرگودھا
رسم اُلفت کو نبھائیں تو نبھائیں کیسے
ہر طرف ہے آگ، دامن کو بچائیں کیسے
بوجھ ہوتا جو غموں کا تو اٹھا بھی لیتے
زندگی بوجھ بن جائے تو اٹھائیں کیسے

❊ قیصر اقبال، گل مروت...... کلول، ضلع بھکر
چلے آؤ وفا کی اِک نئی تجدید کرتے ہیں
چلو تم چاند بن جاؤ، ہم پھر سے عید کرتے ہیں

❊ احمد خان توحیدی...... اسٹیل ٹاؤن، کراچی
وطن کا چہرہ لہولہان تم غفلت کی نیند سو رہے ہو
معصوم بے گناہ بے خبر کو خون سے دھو رہے ہو
گمان تم کو یہ کہ یہ راستہ شارٹ کٹ ہے
یقین مجھ کو کامل کہ منزل اپنی کھو رہے ہو

❊ مہرین ناز...... حیدرآباد
اس موڑ سے شروع کریں آ پھر سے زندگی
ہر شے جہاں حسین تھی اور ہم تم اجنبی!

❊ اعجاز احمد راحیل...... حیدرآباد
نظر سے دور رہ کر بھی تیرا روبرو رہنا
کسی کے پاس رہنے کا سلیقہ ہو تو تم سا ہو

❊ مسز بابر عباس، ماہین بابر...... گلیانہ روڈ کھاریاں
تیرے فراق میں دل کی اُداس گلیوں میں
عجیب سا حشر برپا دکھائی دیتا ہے
کتاب کھول کر دیکھوں تو آنکھ روتی ہے
ورق ورق پہ تیرا چہرہ دکھائی دیتا ہے

❊ قاضی عرفان احمد، ماسٹر جمیل احمد...... چکوال
نہ کر طبیب یوں کوششیں میرے درد کو سمجھنے کی
تو عشق کر، پھر چوٹ کھا، پھر لکھ دوا میرے درد کی



❊ بابر عباس...... گلیانہ روڈ کھاریاں
میری خواہش ہے تجھے اپنا مقدر کرلوں
میں تجھے اپنے خیالات کا محور کرلوں
سوچ تجھ سے میری ذات نے کیا مانگا ہے
دے اجازت میں تجھے اپنا تصور کرلوں

❊ ابرار وارث...... سندیلیانوالی
پچھلے موسم میں جو کھلتے تھے گلابوں کی طرح
دل پہ اتریں گے وہی خواب عذابوں کی طرح
کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

❊ محمد امجد ریاض...... چیچہ وطنی، ضلع ساہیوال
ریل گاڑی میں مسافر کی نظر سے جیسے
رات کے وقت کوئی شہر گزر جاتا ہے
اس طرح وقت کے دریائے رواں سے ایک سال
جیسے گزری کوئی لہر، گزر جاتا ہے

❊ راجا افتخار علی انی...... چوآسیدن شاہ (موہڑہ)
عشق سب کچھ چھین لیتا ہے
میری تو صرف مسکراہٹ تھی

❊ محمد جاوید...... علی پور
سب حدیں توڑ کر آج
پھر تیری یاد نے حد کردی

❊ حسیب احمد چنائے...... الگڈی کرک
مت پوچھ کہ صبر کی انتہا کہاں تک ہے
تو ستم کرلے تیری طاقت جہاں تک ہے
وفا کی امید کسی اور کو ہوگی تم سے
ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تو بے وفا کہاں تک ہے

❊ محمد اقبال...... کورنگی، کراچی
عشق اِک دل کو لیے بیٹھے ہو
عشق نسلیں اُجاڑ دیتا ہے

❊ سید عبادت کاظمی...... ڈیرہ اسماعیل خان
وہ ہونٹ اپنے دانتوں میں دبا کر بولی
خود کاٹو تو درد کیوں تم کاٹو تو لطف کیوں

❊ محمد عقیل چٹھہ...... حافظ آباد
موسم کی مثال دوں یا تمہاری دوست
کوئی پوچھ بیٹھا ہے بدلنا کس کو کہتے ہیں

❊ قیصر اعوان...... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
نہ بھولتا ہے نہ دل میں اتارتا ہے مجھے
ہمیشہ مار "محبت" کی مارتا ہے مجھے
میں اس کا لمحۂ موجود ہوں مگر "وہ" شخص
فضول وقت سمجھ کر گزارتا ہے "مجھے"

❊ احسان سحر...... میانوالی
چہرے سے کتاب کا آنکھوں سے غزلوں کا پیام لگتی ہو
تم مجھے خوبصورت شاعری کا منتخب کلام لگتی ہو
جی نہیں بھرتا میرا جتنی بار بھی پڑھوں تمہیں
کہ تم مجھے محبت کے خط میں پیار بھرا پیغام لگتی ہو

❊ ادریس احمد خان...... ناظم آباد، کراچی
اس سے پہلے کہ بے وفا ہوجائیں
کیوں نہ اے دوست ہم جدا ہوجائیں
تو بھی ہیرے سے بن گیا پتھر
ہم بھی نہ جانے کیا سے کیا ہوجائیں

❊ مرزا طاہر الدین بیگ...... میرپور خاص
درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کدھر چلے

❊ حسنین عباس، کمیل عباس...... گلیانہ روڈ، کھاریاں
میری خواہش ہے کہ تجھے خود سے زیادہ چاہوں
میں رہوں یا نہ رہوں، میری وفا یاد رہے

❊ وارث علی...... سندیلیانوالی
فقط کسی کو اک نظر دیکھنے کی خاطر
گلی میں کھیلتے بچوں کو آپس میں لڑا دیا

❊ شبیر نازش...... کراچی
دلِ درویش کچھ بتا تو ہی
عشق آباد ہے کہ آئینہ
کوئی بتلاؤ سامنے میرے
میرا ہمزاد ہے کہ آئینہ

❊ تفسیر عباس بابر...... اوکاڑہ
موت بھی ورطۂ حیرت میں تھی سرِ کرب و بلا
یوں مقتلِ عشق میں راہوار سے پیاسا اترا

❊ سید صادق طاہر مشہدی...... میرشاہ، خانیوال
تلخی بڑھی تو نشۂ صہبا اتر گیا
آنکھیں کھلیں تو عہدِ جوانی گزر گیا

* سلیم کامریڈ.....کھاتاں
حوروں کی طلب اور مے وساغر سے ہے نفرت
زاہد ترے عرفان سے کچھ بھول ہوئی ہے

* زاہد چوہدری.....ٹوبہ ٹیک سنگھ
میرا کیا رشتہ، نومبر، دسمبر، جنوری سے
سب مہینے ظالم ہیں عشق کے فقیروں پر

* انعم ریاض.....نیول کالونی ڈالمیاں، کراچی
میں کیسے کہہ دوں کہ کوئی میرا نہیں رہا
جب تک خدا کی ذات ہے تنہا نہیں ہوں میں

* راجا ثاقب محمود جنجوعہ.....پنڈدادن خان
میں تجھ کو بھول جاؤں مگر ایک شرط ہے
چل کر چمن میں پھول سے خوشبو جدا کرو

* ریاض بٹ.....حسن ابدال
جھوٹ کی پاگل ہوا چہروں کو زخمی کر گئی
خود سے خوف آنے لگے تو آئینہ دیکھے گا کون

* یاسمین کنول.....کراچی
تجھے اب کس لیے شکوہ ہے کہ بچے گھر نہیں رہتے
جو پتے زرد ہو جائیں وہ درختوں پر نہیں رہتے

* کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
قصۂ درد سناتے ہوئے ڈر لگتا ہے
کوئی دشمن پسِ دیوار کھڑا ہو جیسے

* محمد اشفاق سیال.....شورکوٹ سٹی
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

* محمد قدرت اللہ نیازی.....حکیم ٹاؤن، خانیوال
پاس آکے رہو میرے ایسے
کہ سب کشتیاں جلا چکے ہو جیسے

* نور اللہ.....جیکب آباد
بس اِک لامحدود اداسی ہے
اِک بے انتہا محبت کے بعد

* رفیق احمد.....لاہور
کوئی سوال جو پوچھے تو کیا بتاؤں اس کو
بچھڑنے والے سبب تو بتا جدائی کا

* محسن کمال.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
سیاہ رات میں جلتے ہیں جگنوؤں کی طرح
دلوں کے زخم بھی محسن "کمال" ہوتے ہیں

* عاصم اقبال جسپال.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ہم دعا لکھتے رہے وہ دغا پڑھتے رہے
ایک نقطہ نے ہمیں محرم سے مجرم بنا دیا

* عمر دراز.....سرگودھا
ترتیب دے کر انہیں تو غور سے پڑھ لے
چہرے کی خراشوں میں تیرا نام لکھا ہے

* عاقب اقبال جسپال.....سالم
اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

* قاری وقاص ملاح.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
میرے دل کی مسجد میں جب تیری یادوں کی اذان ہوتی ہیں
میں اپنے آنسوؤں سے وضو کر کے تیرے جینے کی دعا کرتا ہوں

* طاہرہ گلزار.....نامعلوم مقام
لے کے ڈوبا ہے ہمیں تفرقۂ رنگ و نسب
چاہے ہم کچھ بھی نہ ہوتے مگر انسان ہوتے

* حاجی احمد شیر ملک.....خوشاب
میں فقط خاک ہوں مگر محمدؐ سے ہے نسبت میری
یہ ایک رشتہ ہے جو میری اوقات بدل دیتا ہے

* زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
آج اِک اور برس بیت گیا اُس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

* حاجی خالد محمود خان.....اسلام آباد
تم سے دور جانے کا ارادہ نہ تھا
سدا ساتھ رہنے کا بھی وعدہ نہ تھا

**مُحفلِ شعر و سُخن**

نام: ----------------------------------------

پتا: ----------------------------------------

کوپن برائے شمارہ جنوری 2014





# تحفہ

طاہر جاوید مغل

اخلاقی بربادی جب عروج پر پہنچ جائے تو معاشرتی تباہی کوئی حیران کن بات نہیں رہتی... خواہش جب ضرورتوں سے آگے نکل جائے... کسی کا ایثار کسی کی خودغرضی میں ڈھل جائے... جب گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے تو ایسے میں قدرت کیوں نہ انتقام لے... ان دنوں وہ بھی ایسے ہی عذاب میں گرفتار تھا۔ اسے بہ ظاہر تمام دنیاوی خوشیاں میسر تھیں مگر پھر بھی... تہی داماں تھا۔

**مخالف سمت میں محو پرواز سوچوں کا عبرتناک انجام**

میں فہد احمد، عمر چالیس سال۔ زندگی میں وہ سب حاصل ہے جس کی خواہش ایک عام انسان کرسکتا ہے۔ ایک پیاری، نیک اور سلیقہ شعار بیوی، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ اچھی رہائش اور باعزت روزگار لیکن ان سب چیزوں کا اصل لطف اور حقیقی خوشی مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس کی وجہ کئی برس پہلے پیش آنے والا وہ واقعہ ہے جس کی شدید کڑواہٹ میں آج بھی اپنے رگ وپے میں محسوس کرتا ہوں۔

میں نے سمن آباد لاہور میں رہائش پذیر ایک متوسط

گھرانے میں آنکھ کھولی۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں اور سب سے بڑے سکندر بھائی مجھ سے سات سال بڑے تھے۔ میں چھ سال کا تھا کہ اس فیکٹری میں آگ لگ گئی جہاں ابا جان کام کرتے تھے۔ اس حادثے میں کئی دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی شدید زخمی ہوئے اور دو دن اسپتال میں رہ کر اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ ایک غم اور مصیبت کا پہاڑ تھا جو امی جان پر ٹوٹا، لیکن ہم بچوں کی خاطر انہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہستی کو سمیٹا اور زندگی کا پہیا پھر سے چلنے لگا۔ امی جان نے سلائی کر کے اور گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر روزمرہ کے اخراجات اور ہماری فیسیں پوری کیں۔ صبح پانچ بجے سے رات بارہ بجے تک ہم انہیں سرگرم عمل دیکھتے رہتے، اس سرگرمی میں گھر کے کام کاج شامل تھے اور ذریعہ معاش بھی۔ امی جان کی خواہش تھی کہ سکندر بھائی جلد از جلد اپنی تعلیم مکمل کر کے عملی میدان میں آجائیں۔ اسی دوران میں بڑی آپی کی شادی ہوگئی اور وہ دبئی چلی گئیں۔ سکندر بھائی نے ایم بی اے مکمل کیا اور انہیں ان کی یونیورسٹی میں ہی مناسب جاب مل گئی۔ میں اس وقت آئی کام کے پہلے سال میں تھا۔ بھائی کی جاب کے بعد امی نے سلائی کا کام چھوڑ دیا تھا۔ بس شام کے وقت امی اور میں گھر میں ٹیوشن پڑھالیا کرتے تھے۔ اس دوران میں چھوٹی آپی کا ایک اچھا رشتہ آیا اور ان کی بھی شادی ہوگئی۔

سکندر بھائی مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ میری چھوٹی چھوٹی خواہشوں اور فرمائشوں کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے جبکہ اس کے لیے کبھی کبھی انہیں امی سے ڈانٹ بھی کھانی پڑتی، ایک دن میں نے کہا۔

”بھائی جان، آپ کو یاد ہے، آپ نے کہا تھا کہ جب اگلی ”پے“ ملے گی تو آپ مجھے ”زنگر“ کھلائیں گے؟“

”زنگر؟ وہ کیا ہوتا ہے؟“ بھائی نے ازراہ مذاق کہا۔

”بھائی جان، دیکھیں آپ مکر رہے ہیں اب۔“

”اچھا بابا! کل آؤں گا تو پھر چلیں گے۔“

”فہد! اپنے بھائی کے فضول کے خرچے کروانا بند کردو۔“ امی جان نے غصے میں کہا۔

”کوئی بات نہیں امی جان! اس کے خرچے نہیں کروں گا تو پھر کس کے کروں گا۔“

”سکندر! میں سوچتی ہوں دو ڈھائی سال تک تمہاری شادی کردوں۔ اس کے لیے کچھ پیسے جوڑنا شروع کروں۔ آمنہ نے بھی اب بی اے میں ایڈمشن لے لیا ہے۔“

آمنہ ہماری اکلوتی پھپھو کی اکلوتی بیٹی تھی۔ امی نے بچپن میں ہی اسے بھائی کے لیے مانگ لیا تھا۔ ہم سب کو یہ بات معلوم تھی۔ ایک دوسرے کے گھر کافی آنا جانا بھی تھا۔

سکندر بھائی بولے۔ ”امی جان! ابھی نہیں، آپ تو جانتی ہیں کہ میری آدھی سے زیادہ تنخواہ فہد کی فیسوں وغیرہ پر خرچ ہوجاتی ہے۔ میں اس کو بہتر سے بہتر تعلیم دلانا چاہتا ہوں اور کسی اچھے مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

سکندر بھائی جہاں میری خواہشات کا خیال رکھتے تھے وہاں انہیں میری تعلیم اور تربیت کی بھی بے حد فکر رہتی تھی۔ آفس سے گھر آکر رات سات بجے سے نو بجے تک وہ مجھے پڑھاتے۔ جن مضامین میں، میں کمزور تھا ان پر خصوصی توجہ دیتے اور اکثر مہنگی ٹیوشن بھی رکھ دیتے۔

وقت یونہی گزرتا گیا۔ میں نے آئی کام اچھے نمبروں میں پاس کیا اور مجھے ایک اچھی یونیورسٹی میں ”بی بی اے“ میں ایڈمشن مل گیا۔ چونکہ سکندر بھائی کا تعلیمی میدان بھی بزنس اسٹڈی ہی تھا، اس لیے مجھے ان سے پڑھائی میں بھرپور مدد ملتی رہتی تھی اور تین سال یونہی گزر گئے۔ پھر یوں ہوا کہ پھپھو کا انتقال ہوگیا۔ امی نے آمنہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے بہو بنا کر گھر لے آئیں۔ گھر میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ گھر کے خرچ کو احسن طریقے سے پورا کرنے کے لیے بھائی نے آفس سے آکر ایک جگہ پارٹ ٹائم جاب شروع کردی۔ اب بھائی کو میرے پاس بیٹھنے باتیں کرنے اور پڑھائی کے بارے میں پوچھنے کا وقت کم ہی ملتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھ سے بے پروا ہوگئے تھے۔ بس ان کی ذمے داریوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔

کچھ دنوں سے ایسا ہورہا تھا کہ یونیورسٹی سے واپسی پر جب میں اپنے گھر کی گلی مڑتا تو گلی کے شروع میں ہی لڑکوں کا ایک ٹولا کھڑا خوش گپیوں میں مصروف ہوتا، تقریباً ان سب کے پاس موٹر یا ٹیکسی تھیں۔ ان میں سے ایک میرا ہم عمر تھا اور دو مجھ سے ذرا بڑے معلوم ہوتے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ کاش ان کی طرح کبھی میرے پاس بھی بائیک ہو۔

ایک دن ان کے پاس سے گزرا تو ان میں سے ایک بائیک کو گھما کر اس کے کرتب دکھا رہا تھا، میں ان کے پاس کھڑا ہوگیا۔ اسی دوران میں میری ان سے سلام دعا ہوئی۔ جو میرا ہم عمر تھا اس کا نام جہانزیب تھا۔ باقی دو میں سے ایک کا نام عامر اور ایک کا لیاقت تھا۔ میں ان کے پاس کوئی آدھ گھنٹا کھڑا رہا۔ اس دوران میں ایک دوسرے سے ہمارا تعارف ہوا اور ہم خوش گپیوں میں مصروف رہے۔

پھر یہ بات روٹین میں آگئی۔ روز یونیورسٹی سے واپسی پر میں کچھ دیر کے لیے ان کے پاس کھڑا ہوجاتا۔ ان کی گفتگو کا موضوع نئی کاریں، نئی فلمیں، نت نئے ریستوران ہوتا تھا۔ ایک دو بار نئے ماڈلز کے پسٹل وغیرہ پر بھی بات ہوئی۔ انہوں نے مجھے بھی بتایا کہ وہ کالج کے دوست ہیں۔ یونیورسٹی سے واپسی پر ان کے ساتھ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا گزارنا مجھے اچھا لگنے لگا۔ لیکن ایک بات میں نے نوٹ کی کہ جب بھی میں ان کے پاس آتا، وہ کسی موضوع پر بات کرتے کرتے خاموش ہوجاتے اور پھر موضوع بدل دیتے۔

ایک دن میں گھر واپس آیا تو بھائی جان گھر پر ہی تھے۔ ”السلام علیکم بھائی جان۔“ میں نے انہیں دیکھ کر سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔ کیا حال ہے؟“

”ٹھیک، آپ کیسے ہیں؟“ بھائی مجھ سے کچھ خفا خفا نظر آرہے تھے۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔ ذرا ڈرائنگ روم میں آنا۔“ بھائی نے کہا۔

میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ ”آپ کے لیے چائے لے آؤں؟“ آمنہ بھابی نے بھائی کو آواز دی۔

”ہاں دو کپ ڈرائنگ روم میں لے آؤ۔“ بھائی جان نے کہا۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ بھائی بولے۔ ”فہد! میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔ تم گلی کے شروع میں کچھ لڑکوں کے ساتھ کھڑے ہوتے ہو۔“

”جی بھائی! بس ان سے بول چال ہے میری۔ کیا اس میں کچھ غلط ہے بھائی؟“

”غلط ہے۔ تمہیں اپنی پڑھائی پر پوری توجہ دینی چاہیے اور اس قسم کی دوستیوں سے بچنا چاہیے۔“

”لیکن بھائی! ہم تو بس اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہیں اور تھوڑا ہنس بول لیتے ہیں۔“

اسی دوران میں آمنہ چائے لے آئی۔ آمنہ کے جانے کے بعد بھائی بولے۔ ”دیکھو جن لوگوں کو ہم اچھی طرح جانتے نہ ہوں ان سے ایسا رابطہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ ان لڑکوں سے تمہارا میل جول مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔“

میں نے بھائی کی اس بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا اور دوستی برقرار رکھی۔ کبھی کبھی ہم چاروں مل کر ایک قریبی ہوٹل میں رات کا کھانا کھانے چلے جاتے۔ میرے کھانے کے پیسے بھی زبردستی جہانزیب وغیرہ ہی دیتے۔ مجھے ان کے ساتھ بائیک پر گھومنے پھرنے میں بڑا لطف آنے لگا تھا۔

☆☆☆

## آثار قدیمہ

ایک شخص نے اپنے دوست کو بتایا۔ ”مجھے ایسی جگہ ملازمت مل گئی ہے، جہاں آثار قدیمہ کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔“

”اچھا وہ کون سی جگہ ہے۔“ دوست نے اشتیاق سے پوچھا۔

”مجھے ایک بیوٹی کلینک میں کام مل گیا ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

## مہارت

لڑکی کے باپ نے نوجوان کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”نکل جاؤ میرے گھر سے، مجھے تو آج معلوم ہوا ہے کہ تم گورکن ہو، حالانکہ تم کہتے تھے کہ میں ڈاکٹر ہوں۔“

”جناب میں نے آج تک خود کو ڈاکٹر نہیں کہا۔“ نوجوان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ ہمیشہ یہی کہتا رہا ہوں کہ میری روزی روٹی کا دارومدار طبی پیشے کی مہارت پر ہے۔“

مرسلہ: شبانہ، لاہور کینٹ

جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ تینوں دوست متوسط گھرانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود اتنی فراخ دلی سے پیسے خرچ کس طرح کرتے ہیں اور ان کے پاس نت نئی چیزیں کہاں سے آتی ہیں۔ یہ بڑا حیران کن بلکہ کسی حد تک پریشان کن انکشاف تھا۔ ایک دن جہانزیب کوئی خاص قسم کا سگریٹ پی رہا تھا اور عجیب سی ترنگ میں تھا۔ اس نے مجھ سے کھل کر باتیں کیں اور مجھے معلوم ہوا کہ میرے یہ سارے دوست غیر قانونی حرکتوں میں ملوث ہیں۔ ان سب کی اصل حقیقت یہ تھی کہ یہ چھوٹی موٹی وارداتیں کرتے تھے، چمن آباد اور اس کے گردونواح کے علاقوں میں راہزنی کرتے تھے۔ خاص طور سے پوش علاقوں کی اندرونی سڑکوں پر راہ چلتے لوگوں سے ان کی قیمتی اشیا گن پوائنٹ پر چھین لیتے تھے۔

میں ان انکشافات پر حیران ہورہا تھا اور کسی حد تک اپنے اندر خوف بھی محسوس کررہا تھا۔ مجھے سکندر بھائی کی تنبیہ بھی یاد آئی تھی...... اور اپنے ان دوستوں پر غصہ بھی آرہا تھا۔

ایک دن میں نے ان سے بات کی۔ ”یار! جو باتیں جہانزیب نے مجھے بتائی ہیں وہ بڑی خطرناک ہیں، تم لوگوں

کو اندازہ ہے کہ کس قدر غلط کاموں میں پڑے ہوئے ہو؟ میں بڑا مایوس ہوا ہوں تم سے۔"

عامر نے کہا۔ "یار مایوس کن ہماری حالت نہیں ہے۔ پیارے! اگر تم اپنی طرف دیکھو تو اپنی حالت تمہیں مایوس کن لگے گی۔"

"عامر صحیح کہہ رہا ہے۔" لیاقت نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، تمہارا بڑا بھائی بہت اچھا اور نیک انسان ہے۔ اس کا ایک صاف ستھرا روزگار ہے اور وہ پوری ایمانداری سے محنت کر کے کما رہا ہے۔ ہم مانتے ہیں...... بالکل مانتے ہیں، لیکن دیکھو، اس کے باوجود تم لوگ بس گزر بسر ہی کرتے ہو۔ جو چیزیں ہمارے پاس ہیں وہ تمہارے بھائی کو بھی میسر نہیں ہیں، تو وہ تمہیں کیا دے گا۔ ہم بھی تمہارے جیسے ہی ہیں لیکن اپنے اندر حسرتیں وغیرہ لے کر نہیں پھر رہے۔ وہ سب کچھ ہمیں ملتا ہے جس کی ہمیں خواہش ہوتی ہے...... سب کچھ۔" اس نے ایک آنکھ میچی۔

جہانزیب بولا۔ "دیکھو جگر! ایسا نہیں ہے کہ ہم تم پر طنز کر رہے ہیں۔ تم یار ہو...... تمہارے لیے دل سے محسوس کرتے ہیں۔ اب دیکھو نو کیا کا جو نیا موبائل آیا ہے...... تم کتنے کریزی ہو اس کے لیے۔ تم روز بات کرتے ہو اس کی۔ تمہاری یونیورسٹی میں کئی لڑکے لڑکیوں کے پاس وہ ہوگا۔ لیکن تم اس کے بارے میں بس سوچ سکتے ہو، خرید نہیں سکتے۔ وہ تم سے اتنی ہی دور ہے جتنی انجلینا جولی...... تم نے موبائل کے بارے میں اپنے بھائی سے کہا...... تو انہوں نے کیا کہا؟ یہی کہا نا کہ دو چار مہینے صبر کر لو۔ ہوسکتا ہے کہ جولائی میں میری "پے" بڑھ جائے تو تمہیں لے دوں۔ جب تک وہ تمہیں لے کے دینے کے قابل ہوں گے تب تک وہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہوگا۔ پنجابی فلموں کی ہیروئن صائمہ آنٹی کی طرح۔"

سب نے طنزیہ قہقہہ لگایا۔

پتا نہیں کیوں، جہانزیب کی بات میرے دل پر ایک اثر چھوڑ گئی۔ چاہتے ہوئے بھی میں اس کو جھٹلا نہیں سکا۔

گھر پہنچا تو آمنہ اور امی رات کا کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ میں تپا ہوا تھا۔ میں نے کچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا۔ "امی جان! میں ایک مہینے سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے نیا موبائل چاہیے۔ مجھے خریدنا ہے وہ۔ ہر صورت میں خریدنا ہے۔"

"جب کمانے لگو گے نا، تب ایسی چیزیں لے لیا کرنا۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ گزارا کیسے ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود تم اس طرح کی فرمائشیں کر رہے ہو۔ میں کچھ عرصے سے دیکھ رہی ہوں فہد! تم بے حس ہوتے جا رہے ہو۔"

"اچھا! اگر میں کوئی چیز خریدنا چاہوں گا تو وہ بے حسی ہوگی اور بھائی جان نے جو تین دن پہلے اٹھائیس ہزار کی بائیک خریدی ہے وہ؟"

"فہد! تمیز سے بات کرو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں ایسی بات کرتے ہوئے...... پانچ سال ہو گئے اسے بسوں میں دھکے کھاتے ہوئے اور اب اس کی شادی ہو گئی ہے۔ اس کی ضرورت ہے سواری۔" امی جان واقعی غصے میں تھیں۔

"امی جان! میرا یہ مطلب نہیں۔"

اچانک ڈور بیل ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سکندر بھائی تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ ہماری آوازیں ذرا بلند تھیں اور بھائی نے سب سن لیا ہے۔ بہرحال انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ بعد میں میں نے امی اور آمنہ کو خاص طور پر کہا بلکہ التجا کی کہ وہ بھائی سے یہ بات نہ کہیں۔

رات کے کھانے کے بعد امی اور آمنہ خریداری کرنے سپر اسٹور گئیں تو بھائی نے مجھے بلا کر ایک مرتبہ پھر سمجھانا شروع کیا۔ انہوں نے کہا کہ پہلے انہوں نے بھی میری کسی دوستی اور میل جول پر اعتراض نہیں کیا لیکن ان لڑکوں کی صحبت انہیں میرے لیے بھلی محسوس نہیں ہوتی۔ انہوں نے مجھے سختی سے منع کیا کہ میں ان لڑکوں کے ساتھ گھومنے پھرنے ہرگز نہ جاؤں۔

رات کو سونے کے لیے لیٹا تو مجھے لگا کہ بھائی کو میرا گھومنا پھرنا اور کسی طرح کی تفریح کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ میں بس گھر میں بیٹھ کر اپنی محرومیوں کو "انجوائے" کروں۔

اگلے دن جب میں اپنے خوش باش اور زندگی سے بھرپور دوستوں کی کمپنی میں پہنچا اور ان سے گپ شپ شروع کی تو مجھے لگا کہ ان سے بڑا محسن اور ہمدرد، میرا کوئی نہیں۔

"یار! تم لوگ واقعی ٹھیک کہتے ہو۔ میرے خیال میں کبھی کبھی انسان کو اپنی خوشیوں کے لیے لڑنا پڑتا ہے۔ قدرت سے اپنے حصے کی خوشیاں چھیننا پڑتی ہیں۔"

جہانزیب کے ہاتھ سے سلگتا ہوا سگریٹ لے کر میں نے اس کا بھرپور کش لگاتے ہوئے کہا۔

"آہاہ...... یہ ہوئی نا بات۔ میں سمجھ گیا تو کیا کہنا چاہتا ہے جگر۔" لیاقت نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں یار! میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ اس مارا ماری کے دور میں خود کو خوش رکھنے کے لیے تم لوگ جو کچھ کر رہے

ہو وہ اتنا غلط بھی نہیں۔" میں نے پُرسوچ نگاہوں سے کہیں دور دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، کل چل ہمارے ساتھ۔ کل کچھ کمانے کا ارادہ ہے۔" جہانزیب نے دوسرے ساتھیوں کو شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! تمہارے ساتھ چلنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہ بڑا جگرے کا کام ہے۔"

"جانے دو پیارے! ہم تمہیں کون سا پسٹل پکڑا رہے ہیں کہ ابھی چلو ہمارے ساتھ اور پھڑکا دو کسی کو۔ بس ساتھ چلو ذرا اور دیکھو کہ "کام" کیسے ہوتا ہے۔" عامر نے کہا۔

"اور ہاں، دل میں ترس لانے کی ضرورت نہیں۔ ہم ان لوگوں پر ہاتھ ڈالتے ہیں جن کا تھوڑا بہت چلا بھی جائے تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔" لیاقت بولا۔

کافی دیر تک ان کے ساتھ بات ہوتی رہی۔ نتیجتاً میں نے اپنے اندر کی آواز کو تھپک تھپک کر گہری نیند سلا دیا۔ شاید میں ان کے گروہ کا حصہ بننے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اگلے ایک ماہ میں، میں نے اپنے ان دوستوں کے ساتھ تین جگہ "کام" کیا، یعنی واردات میں حصہ لیا۔ اگرچہ میں نے صرف بائیک دوڑانے پر اکتفا کیا لیکن مجھے کافی حد تک مشاہدے اور تجربے کا موقع ملا۔ گلبرگ کے علاقے میں ہم نے دو دفعہ کارروائی ڈالی۔ پہلی دفعہ ایک درمیانی عمر کے آدمی سے موبائل اور نقدی چھینی جو غالباً آفس جانے کے لیے اپنے گھر کے گیٹ سے باہر کھڑی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ دوسری مرتبہ ایک عورت کا پرس چھین کر بھاگے جو شاید کسی مہنگے شاپنگ سینٹر سے خریداری کرنے جارہی تھی۔ اس پرس میں سے اچھی خاصی رقم ملی۔ ٹی وی ڈراموں میں چھوٹے موٹے رول کرنے والی ایک جونیئر آرٹسٹ سے جہانزیب کی دوستی تھی۔ اس نے یہ ساری رقم اس آرٹسٹ کے ساتھ رنگ رلیاں منانے پر خرچ کی۔ اس کے بعد ہم نے نیو مسلم ٹاؤن کے علاقے میں ایک ادھیڑ عمر بندے سے کافی مہنگا موبائل گن پوائنٹ پر چھینا جو صبح سویرے سنسان سڑک پر جاگنگ کر رہا تھا۔

"یار، کبھی کسی پر سچ مچ فائر تو نہیں کیا؟" ایک دن میں نے جہانزیب سے پوچھا ہم قریبی ریسٹورنٹ میں شام کی چائے پی رہے تھے۔

"نہیں پیارے۔" لیاقت نے کہا۔ "اب تک کی ہسٹری میں بس دو دفعہ گڑبڑ ہوئی ہے۔ لیکن وہ بھی تب ہوئی جب دوسری طرف سے کچھ زیادہ ہی ہیرو پن دکھایا گیا۔ پھر بھی سیدھا فائر نہیں مارا کسی کو۔ ٹانگ یا بازو پر گھوڑا دبایا ہے۔"

"لیکن گھوڑا تو دبایا نا؟" میں نے کہا۔

عامر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اوئے باگڑ بلے..... تو نے وہ شعر نہیں سنا۔ کبھی گولی بھی چلتی ہے کالی کالی شاموں میں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

دو دن بعد میری سالگرہ تھی۔ جہانزیب وغیرہ نے کہا کہ اس دن چائنیز ریستوران میں ڈنر کریں گے، لیکن میں نے انہیں منع کر دیا۔ سالگرہ والے دن امی جان رات کے کھانے کا خاص اہتمام کرتی تھیں اور سب اکٹھے ہی کھانا کھاتے تھے۔ اگر میں ان کے ساتھ چلا جاتا تو گھر میں سب کو برا لگتا اور وہ میرے حوالے سے مزید شک میں مبتلا ہو جاتے۔

سالگرہ والے دن صبح سویرے یونیورسٹی جانے کے لیے اٹھا تو امی اور آمنہ نے مجھے سالگرہ کی مبارکباد دی۔ امی نے رات کے کھانے میں میری فرمائش پوچھی۔ میں نے چکن بریانی بنانے کو کہا۔ آمنہ دہی بھلے اچھے بناتی تھی۔ میں نے اس سے دہی بھلوں کی فرمائش کی اور یونیورسٹی چلا گیا۔

رات کے کھانے کے لیے تو میں نے دوستوں کو منع کر دیا تھا لیکن انہوں نے مجھے شام کی چائے کے لیے قریبی ریستوران میں مدعو کیا تھا۔ یونیورسٹی سے واپسی میں مین روڈ کی دوسری طرف واقع ریستوران میں پہنچا جہاں پر وہ سب میرے منتظر تھے۔ سب نے مجھے سالگرہ کی مبارکباد دی۔ انہوں نے چائے اور کیک کا آرڈر دے رکھا تھا۔ میں نے کیک کاٹا اور پھر ہم چائے کی چسکیاں لینے لگے۔

"یہ لے جگر! ہم سب کی طرف سے تیری سالگرہ کا گفٹ۔" جہانزیب نے نوکیا کا ڈبا پیک موبائل میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ یہ وہی موبائل تھا جس کے لیے میں آج کل دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ میری خوشی دیدنی تھی۔

"یہ کہاں سے ملا؟" میں نے پوچھا۔

"خون پسینے کی کمائی ہے پیارے۔" جہانزیب نے مخصوص اسٹائل میں کہا۔

میرے اصرار پر لیاقت نے بتایا کہ آج دوپہر ریمبو نے مون مارکیٹ کے علاقے میں "کارروائی ڈالی" تھی۔ ریمبو بھی ان لوگوں کا دوست تھا، لیکن میں اس سے کبھی ملا نہیں تھا۔ بس ایک دو بار موبائل میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ اس کا اصل نام خورشید تھا لیکن ریمبو ریمبو کہتے تھے۔



جہانزیب نے اس کارروائی کی تھوڑی سی تفصیل بتائی۔ آخر میں بولا۔ "دیکھو کیسی گڈ لک ہے۔ آج تمہاری سالگرہ ہے اور آج ہی ریمبو کو یہ موبائل ہاتھ لگ گیا۔ اس کو کہتے ہیں کہ اوپر والا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

مجھے پتا تھا کہ ریمبو کے ساتھ ان لوگوں کا لین دین چلتا رہتا ہے۔ اسی لین دین میں انہوں نے ریمبو سے یہ سیٹ لے کر مجھے گفٹ کر دیا تھا۔ اس کی قیمت سولہ ہزار سے کم نہیں تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ بہرحال کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے اپنا یہ محبوب موبائل سیٹ قبول کر لیا۔ ہم چاروں کچھ دیر تک اس شاندار سیٹ کے فنکشنز وغیرہ ڈسکس کرتے رہے۔ پھر یہ تقریب اختتام کو پہنچی اور میں گھر روانہ ہو گیا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ امی اور بھائی جان کو بعد میں یہی بتاؤں گا کہ میں نے پاکٹ منی جمع کر کے اور ایک جگہ ہوم ٹیوشن پڑھا کے چپکے چپکے کچھ پیسے جمع کیے تھے اور یہ موبائل خریدا ہے۔

گھر پہنچا تو امی اور بھابی کچن میں مصروف تھیں۔ میں شاور لینے کے لیے اپنے کپڑے پکڑ کر باتھ روم کی طرف بڑھا۔ اسی دوران میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ امی جان نے فون ریسیو کیا۔ ایک دلخراش چیخ تھی جو امی جان کے گلے سے نکلی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو امی بے ہوش ہو کر فرش پر پڑی تھیں۔ آمنہ بھی کچن سے دوڑتی ہوئی آئی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے فون اٹھا کر ہیلو کہا۔

"میں انسپکٹر ریاض بات کر رہا ہوں۔ سکندر آصف سے کیا رشتہ ہے آپ کا؟"

"جج..... جی..... میں بھائی ہوں ان کا۔" مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"ہم کافی دیر سے آپ کا اتا پتا ڈھونڈ رہے تھے۔ مجھے افسوس ہے۔ آج ڈھائی تین بجے مون مارکیٹ میں ایک موبائل شاپ کے سامنے سکندر کو گولی ماردی گئی ہے۔"

میں سرتاپا کانپ رہا تھا۔ "اب کہاں ہیں بھائی جان.....؟" میں ہکلایا۔

"ڈاکٹر اس کو نہیں بچا پائے..... آپ فوراً سروسز ہسپتال پہنچیں....." میں بس اتنا ہی سن سکا اور میرے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔

آمنہ رو رہی تھی اور امی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ سکندر کو کیا ہوا ہے۔

میں اور میرے دو کزن بھاگم بھاگ پہلے متعلقہ تھانہ اور پھر سروسز اسپتال پہنچے۔ میرا بھائی ختم ہو چکا تھا۔ اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا تھا۔ متعلقہ پولیس بھی وہاں موجود تھی۔ میں رو رہا تھا۔ ہچکیاں رکنے میں نہیں آرہی تھیں۔ ایک سب انسپکٹر نے تسلی دینے والے انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے بھائی جان کی کچھ ذاتی اشیا دکھائیں۔ یہ ان کی جیبوں سے نکلی تھیں۔ پرس، قلم، کچھ ریزگاری۔ چند رسیدیں بھی تھیں۔ سب انسپکٹر نے دو رسیدیں میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "ان سے ہمیں اندازہ ہو رہا ہے کہ وارداتیے نے موبائل اور نقدی چھیننے کے دوران میں ان پر گولی چلائی۔"

میں نے ایک رسید پر نگاہ ڈالی اور مجھے گرد و پیش گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ یہ اس موبائل کی رسید تھی جو آج چند گھنٹے پہلے لیاقت اور جہانزیب وغیرہ نے مجھے گفٹ کیا تھا۔ دوسری رسید دراصل ایک ڈلیوری لیٹر تھا۔ اس لیٹر سے پتا چلتا تھا کہ بھائی جان نے آج ہی اپنی موٹر بائیک بھی بیچی ہے۔ انہوں نے بائیک بیچ کر میرے لیے موبائل خریدا تھا، جو ان سے مون مارکیٹ کے سامنے چھین لیا گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

☆☆☆

اس اندوہناک واقعے کے بعد مجھ پر جو کچھ بیتا وہ ایک الگ کہانی ہے۔ لیاقت اور جہانزیب وغیرہ روپوش ہو گئے..... پکڑے نہیں گئے لیکن قریباً ایک سال بعد وہ دونوں آپس کی کسی گروہی لڑائی میں مارے گئے۔ عامر اور اصل مجرم خورشید عرف ریمبو کا کبھی کوئی پتا نہیں چلا۔ غالباً وہ پاکستان سے نکل گئے تھے۔ امی جان کو دل کی تکلیف ہو گئی اور کچھ عرصہ بستر علالت پر رہ کر وہ بھی خالق حقیقی سے جا ملیں۔ امی جان کی وصیت کے مطابق میں نے شادی کر لی۔ جی ہاں آمنہ ہی میری شریک حیات ہے۔

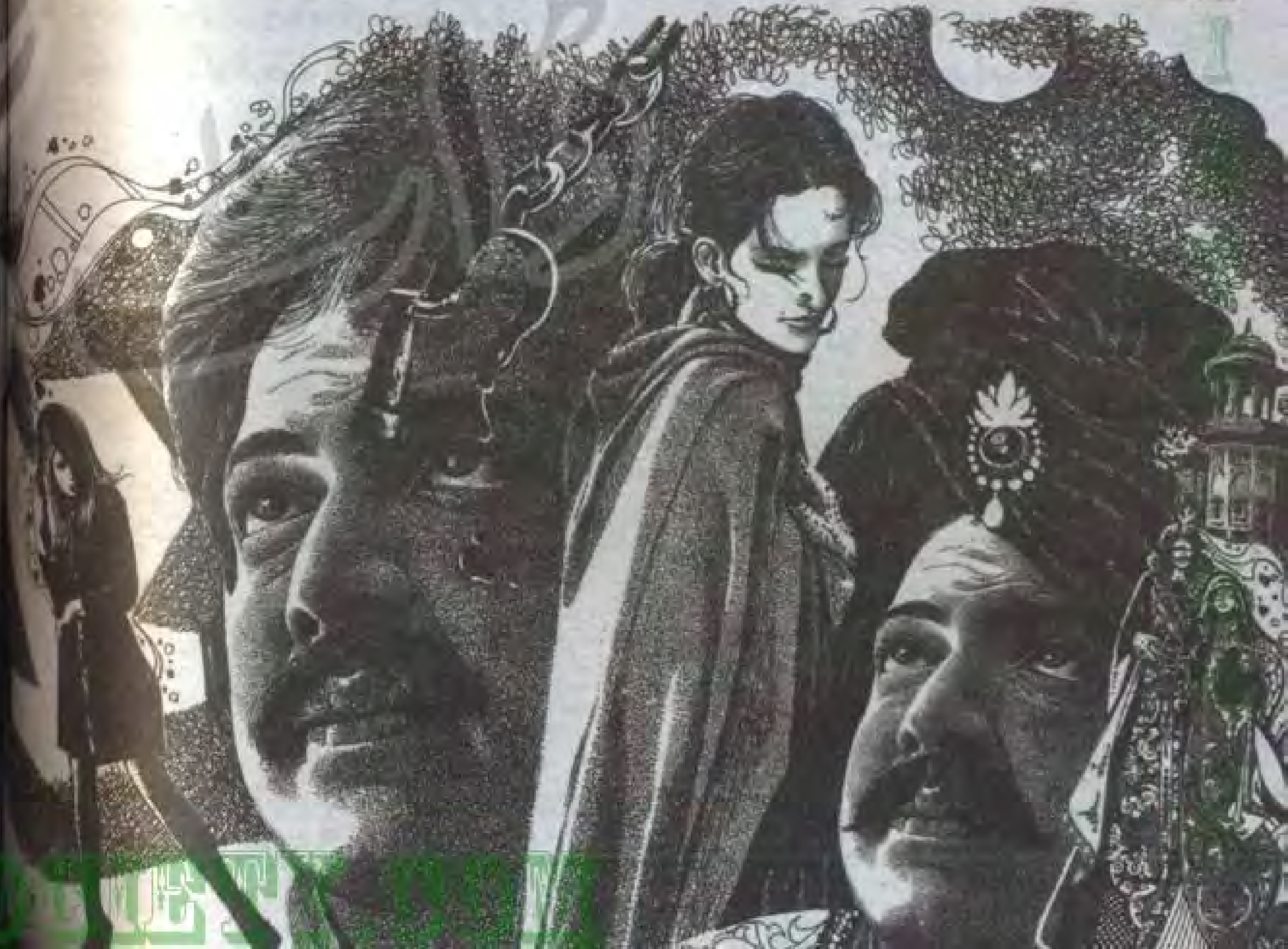
بھائی کے آفس والوں نے ہمدردی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے بھائی کی جگہ مجھے جاب کی آفر کی جو میں نے قبول کر لی..... میں فہد احمد، عمر چالیس سال۔ میرے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی ایک عام انسان خواہش کر سکتا ہے، لیکن میرے احساسِ جرم نے مجھے ان سب چیزوں کی حقیقی لذت سے محروم رکھا ہے۔ کاش میں کبھی آمنہ کو بتا سکوں کہ میں ان لٹیروں کا ساتھی رہا ہوں جنہوں نے بھائی سے ان کی زندگی چھینی۔



محی الدین نواب

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

**ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ**



یہ معمول کے فرائض تھے۔ پہلے وہ گاڑی اور گدھے کو نہلاتا پھر خود غسل کرتا تھا۔ بھلا گدھے کو کون اہمیت دیتا ہے لیکن وہ دیتا تھا۔ گدھا بیمار ہوتا تو اسے کھینچ کر جانوروں کے اسپتال لے جاتا تھا اور وہ بیمار ہوتو گدھا اسے گاڑی میں کھینچ کر انسانوں کے اسپتال پہنچایا کرتا تھا۔ رشتہ دار بعد میں عیادت کو پہنچتے تھے۔

عجیب باہمی تعلق تھا ان کے درمیان۔ ایک روز وہ اچانک چکرا کر گرا تو باپ مکان میں نہیں تھا۔ ماں پہلے ہی جنت مکانی ہوچکی تھی۔

ایک ماروی تھی جو اس کی محبت کا دم بھرتی تھی لیکن وہ بھی نکاح میں نہیں آئی تھی اس لیے گھر میں نہیں تھی۔

دکھ مصیبت ہو تب بھی وہ صرف خیالوں میں آکر مسکراتی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ وہ مصیبت میں ہے۔ بے چاری محبت کی ماری نظروں سے دور رہتی تھی۔ اس وقت پتا نہیں کہاں ہوگی؟ بس خیال میں آتا جاتا لگا رہتا تھا۔

گدھا اتفاق سے گاڑی میں جتا ہوا تھا۔ اسے ہوش آیا تو وہ اٹھ بیٹھا۔ اچھا تگڑا جوان تھا' گر کر سنبھلنا جانتا تھا۔ کراہتا ہوا رینگتا ہوا گاڑی میں آکر لیٹ گیا۔ پھر لگام کا اشارہ دیا تو وہ چل پڑا۔

گدھا کسی کی نہیں مانتا' صرف لگام کو مانتا ہے۔ جیسے بیٹا ماں کی نہیں سنتا' بیوی میکے سے بولے تو دوڑا چلا جاتا ہے۔ دنیا والے روکتے ٹوکتے ہیں۔ ''تجھے شرم نہیں آتی' ماں کو چھوڑ کر بیوی کے پاس بھاگا جارہا ہے؟'' لیکن بیوی کے پاس جانے سے شرم کیسی وہ بھی اپنے مالک کے نہیں' لگام کے اشاروں پر گاڑیوں کی بھیڑ میں دوڑا چلا جارہا تھا۔

ٹریفک سارجنٹ نے گاڑی کو روک کر کہا۔ ''ابے او لاٹ صاحب کی اولاد! یہ گاڑی ہے یا تیرا بیڈ روم؟ آرام سے لیٹ کر گدھے کو بھاگنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔''

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''میں نے کھلا نہیں چھوڑا ہے۔ یہ لگام کے اشارے پر مجھے اسپتال لے جارہا ہے۔''

''اگر کہیں ٹکر ہوگئی تو کیا ہوگا؟ کیا تیرا باپ گاڑیوں کا نقصان بھرے گا۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ گدھا بہت سمجھ دار ہے۔''

سارجنٹ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''گدھا اور سمجھ دار۔ ابے گدھا سمجھ دار ہوتا تو اسے گدھا کیوں کہتے؟''

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''آدمی سمجھ دار ہو تو اسے بھی کسی بھول پر گدھا کہتے ہیں اور گدھا کسی روک ٹوک کے بغیر کسی بیمار کو اسپتال پہنچائے تو اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں۔''

ٹریفک سارجنٹ نے ہونٹوں کو بھینچ کر اسے گھور کر دیکھا۔ پھر کہا۔ ''اچھا اچھا۔ چل بھاگ یہاں سے۔ مگر بیٹھ کر گاڑی چلا۔ یہ تیرے باپ کی سڑک نہیں ہے۔''

اس نے سلام کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ جب تک لگام کا اشارہ نہیں دیا جاتا' گدھا نہیں رکتا۔ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ لوگ خوامخواہ اسے روکتے ہیں' چاہے بیمار کا دم ہی کیوں نہ نکل جائے۔

آگے دو گروہوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ شروع ہوگیا۔ لوگوں کی بھگدڑ کہہ رہی تھی۔ ''اپنی قبر کی طرف نہ جاؤ۔ اسپتال کا راستہ بدل دو۔''

ایسی کسی مصیبت کے وقت ماروی اس سے کہتی تھی۔ ''تجھے میرے لیے زندہ رہنا ہے۔ گدھے کو سیدھے راستے پر چلایا کر۔''

وہ کہتا تھا۔ ''انسان گدھوں کو اور گدھے انسانوں کو سیدھے راستے پر نہیں چلاتے۔ صرف لگام چلاتی ہے۔ گدھے کی طرح کسی آدمی کو لگام دو اور دیکھو وہ سیدھی راہ پر چلنے لگے گا۔''

آئے دن فائرنگ اور دھماکے ہوتے رہتے تھے۔ جان بچانے کے لیے سیدھے راستے جانے والوں کو الٹے راستے پر جانا پڑتا تھا۔ الٹے راستے ہمیشہ لمبے اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اسے مجبوراً لگام موڑنی پڑی۔

واقعی دوسرا راستہ بہت لمبا تھا۔ آدمی بیمار ہو تو لوگ اسے دور تک دوڑاتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی سیاست اور برتری منوانے کے لیے پوری انسانیت کو بیمار بناتے رہتے ہیں۔

وہ بیٹھے بیٹھے گاڑی کے جھٹکے کھاتے کھاتے نڈھال ہوگیا۔ ٹھنڈا پسینا چھوٹنے لگا۔ ٹھنڈا پسینا آنے لگے تو بخار جانے لگتا ہے۔ مشکلیں اس پر اتنی پڑی تھیں کہ آسان ہورہی تھیں۔ کبھی نہ کبھی اسپتال پہنچنا ہی تھا۔ آخر پہنچ ہی گیا۔

ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ آدمی کبھی منزل تک پہنچ کر بھی پہنچ نہیں پاتا۔ گدھے نے اپنا کام کیا تھا' اسے پہنچا دیا۔ اسپتال کے دربان نے روک دیا۔ ''ادھر گاڑیاں پارک ہوتی ہیں۔ گدھا گاڑی کو لانے کی اجازت نہیں ہے۔''

اب اس گدھا گاڑی کو اسپتال کے احاطے کے باہر کہیں باندھنا تھا لیکن دو سپاہیوں نے اسے جھڑک دیا۔ ''ابے او گدھے کی اولاد...! تیرا گدھا فٹ پاتھ پر ڈھینچو ڈھینچو کرے گا تو کیا لوگ تیرے سر پر سے گزریں گے؟ چل بھاگ یہاں سے۔''

اس دنیا میں جو لوگ اپنی حیثیت بنا نہیں پاتے' وہ





گاڑی کے ہوکر رہتے ہیں' ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح روکا جارہا تھا بلکہ رگیدا جارہا تھا کہ جھنجلاہٹ اور بے بسی میں اپنی بیماری کو بھولتا جارہا تھا۔

وہ گدھے کو ہانکتے ہوئے اسپتال کے پچھلے حصے میں آیا۔ وہاں بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ بڑی بڑی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ اسپتال پہنچانے والے گدھے کو وہاں کھڑے رہنے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ ایسے وقت ایک اور مصیبت آگئی۔ بادل گڑگڑا رہے تھے۔ آسمان پہلے ہی دھمکیاں دے رہا تھا۔ خیال تھا کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں... تعجب ہے' آسمان برس پڑا تھا۔

وہ پریشان ہوگیا۔ بارش سے بچنے کے لیے گدھے کی لگام چھوڑ کر کہیں سائے میں نہیں جاسکتا تھا۔ وہ فوری طور پر بچاؤ کے لیے زمین پر جھک کر رینگتا ہوا اپنی گاڑی کے نیچے چھپ گیا۔ اس طرح وہ بھیگنے سے بچ گیا اور لگام بھی اپنے ہاتھ میں رہی۔

اب پتا نہیں کب تک بارش ہوتی رہتی۔ پانی کی بوچھار اسے ادھر ادھر سے بھگو رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر میں پوری طرح بھیگنے والا تھا۔ ایسے وقت اس نے خود کو چھو کر دیکھا۔ یا حیرت...! بخار نہیں تھا جسم ٹھنڈا ہورہا تھا۔

واہ رے مالک...! غریبوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے مشکلیں خود آتی ہیں' خود ہی آسان ہوجاتی ہیں۔ حالات اچھی طرح پٹائی کریں تو آدمی ڈھیٹ بن جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں جھاڑ کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ وہ خود کو اچھی طرح چھو کر دیکھنے لگا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دشمن حالات معالج کیسے بن گئے تھے؟ اس نے جیسے اندیکھی دوا استعمال کی تھی۔ غریبوں سے ایسا ہی مذاق ہوتا رہتا ہے۔ پھر اور ایک مذاق ہوا۔ کراچی کی سڑکیں تو دس پندرہ منٹ کی بارش میں دریا بن جاتی ہیں۔ نیچے سڑکوں پر بھی پانی بہنے لگا۔ وہ جیسے بہتے دریا میں بیٹھا ہوا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ جاتا۔

اس نے یہی کیا۔ اوپر آکر بیٹھ گیا۔ آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجا بنا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ پیدل چلنے والے بھی ایک آدھ ہی تھے۔ ایسے وقت ایک اور مذاق ہوا۔

ایک نہایت ہی قیمتی کار نے آکر ہارن دیا۔ وہ ہارن چیخ چیخ کر ڈانٹ رہا تھا' ڈپٹ رہا تھا' کار وہاں پارک ہونا چاہتی تھی۔ اس کے لیے اور کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔ گدھا گاڑی کو کہیں بھی پھینکا جاسکتا تھا۔ اس کی اوقات ہی کیا تھی؟

وہ اس قیمتی کار کو نفرت سے دیکھنے لگا اور اسے پہچان بھی لیا۔ آج صبح ہی وہ اس پر پانی اور کیچڑ اچھالتی ہوئی گزر گئی تھی اور اس نے جھنجلا کر گالیاں دی تھیں۔ کیسی غربت کیسی مجبوری تھی۔ پیٹھ پیچھے گالیاں دینے سے دل کی بھڑاس نکل گئی تھی۔ اب وہ کیچڑ اچھالنے والا سامنے آیا تھا اور وہ منہ پر گالیاں نہیں دے سکتا تھا۔

بارش کی وجہ سے کار کے شیشے تر بتر تھے۔ وہ مغرور فرعون نظر نہیں آرہا تھا۔ جھنجلا کر ہارن پر ہارن دے کر دھمکیاں دے رہا تھا۔ اگر وہ جگہ نہ دیتا تو بڑے آدمی کی حمایت میں سپاہی کہیں سے بھی بھیگتے ہوئے ڈنڈے مارنے آجاتے۔

اس نے لگام کا اشارہ دیا۔ گدھا آگے بڑھا پھر دوسرے اشارے پر ٹھیک اسٹیئرنگ سیٹ کی کھڑکی کے پاس رک گیا۔ کار والے نے شیشہ نیچے کیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو باتیں سنانا چاہتے تھے۔ لیکن عجیب سی بات ہوگئی۔ دونوں ایکدم سے چپ ہوگئے۔ حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

انہیں قدرت کا کرشمہ دکھائی دیا۔ گدھے کو ہانکنے والا خود کو کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر دیکھ رہا تھا اور کار چلانے والا اپنے آپ کو گدھا گاڑی میں بیٹھا بھیگتے دیکھ رہا تھا۔

قدرت کا کرشمہ تھا' جو صورت وہاں تھی' وہ یہاں تھی اور جو یہاں تھی' وہ وہاں تھی۔

دونوں کی صورتیں' آنکھ' ناک' منہ' پیشانی اور جبڑے بالکل ایک جیسے تھے۔ وہ ان لمحات میں جیسے آئینہ دیکھ رہے تھے۔ سامنے ایک ہی چہرہ تھا۔ صرف لباس بدلا ہوا تھا۔ ایک نے سندھی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ دوسرا سوٹ اور نکٹائی میں تھا۔

ان لمحات میں ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے دونوں ایک ہی ہوں اور دو حصوں میں تقسیم ہوگئے ہوں۔

کار والے نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''سائیں! کیا بتاؤں' کون ہوں؟ خدا کا بندا ہوں۔ گدھے پر بیٹھنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔''

''کیا اسی شہر میں رہتے ہو؟''

''آدھا شہر میں اور آدھا گاؤں میں رہتا ہوں۔ کیونکہ میرے پاس شہر کی کوٹھی نہیں' گاؤں کی جھگی اسی شہر میں ہے۔''

''تم پہلے کبھی دکھائی نہیں دیے۔''

''سائیں ہوا کی رفتار سے کیچڑ اچھالتے گزرتے ہیں۔ بھلا دیکھیں گے کیسے؟''

''کیا میں نے تم پر کیچڑ اچھالی ہے؟''

”آج صبح ملیر ہالٹ کی سڑک پر....“
وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں صبح میں وہاں سے گزرا تھا۔ سڑکوں پر پانی بھرا ہوا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ شہری انتظامیہ قصوروار ہے۔ پھر بھی مجھے افسوس ہے۔“
”جہاں کیچڑ اور پانی ہو وہاں گاڑی آہستہ چلا سکتے ہیں۔“
”ہم کاروباری لوگ ہیں۔ ہمیں صحیح وقت پر صحیح جگہ پہنچنا ہوتا ہے۔ ہمارے لیے تیز رفتاری ضروری ہے۔“
پھر وہ ناگواری سے بولا۔ ”میں چھوٹے لوگوں سے کبھی بات نہیں کرتا۔ لیکن تعجب ہے، تم نے ہمشکل ہو کر مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔“
”میرے لیے اچھا سوچ رہے ہیں یا برا؟“
”میں نہیں جانتا۔ تنہائی میں بیٹھ کر سوچوں گا۔ میرے اندر کچھ ہو رہا ہے۔ تم کہاں رہتے ہو؟“
”ادھر ملیر سے آگے میمن گوٹھ میں ہمارے بہت سے سندھی بھائی رہتے ہیں ادھر میں بھی رہتا ہوں۔“
”تمہارا نام کیا ہے؟“
”مراد علی منگی۔“
”کیا کرتے ہو؟“
”میرے جیسے لوگ گدھے کے بغیر کچھ نہیں کرتے۔ کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ میں دس جماعتیں پڑھ چکا ہوں۔ کسی جگہ لکھنے پڑھنے کا کام نہیں ملتا۔ اگر نہ لکھتا پڑھتا تو لوگ گدھا کہتے۔
مقدر میں یہی روزی ہے۔ فیکٹریوں اور دکانوں سے مال اٹھاتا ہوں۔ یہ گدھا مال برداری کرتا ہے۔ مال دوسری دکانوں میں پہنچاتا رہتا ہے۔ ہم دو گدھے مل کر اپنا اپنا پیٹ پالتے ہیں۔“
”تم بولتے بہت ہو۔ مگر اچھا بولتے ہو۔ میں تم سے کہیں ملنا چاہتا ہوں۔“
”ہم مل تو رہے ہیں۔“
”یہاں نہیں۔ کسی دوسری جگہ تنہائی میں۔“
”اکیلے میں کیوں؟“
”میں نہیں چاہتا، کوئی ہم دونوں کو ایک جگہ دیکھے۔“
”کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہوگا؟“
”دو ہمشکل کا تماشا لگ جائے گا اور مجھے تماشا پسند نہیں ہے۔ کل اتوار ہے۔ میں فارغ رہتا ہوں۔ اگر کل صبح دس بجے کہیں ملوگے تو پھر باتیں ہوں گی۔“
”کہاں ملوں گا؟“
”تین تلوار کے پاس آکر کھڑے رہو۔ میں وہاں سے تمہیں کہیں لے جاؤں گا۔ تمہارے کام دھندے کا بھی بندوبست کردوں گا۔ اس گدھا گاڑی میں نہ آنا۔“
”سائیں! آپ کا نام کیا ہے؟“
”محبوب علی چانڈیو۔“
بارش تھم گئی تھی۔ گدھا گاڑی آگے بڑھی تو چانڈیو صاحب کو پارکنگ کی جگہ مل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نکلتے ہوئے بولا۔ ”یہاں بھی ہمیں کوئی ایک ساتھ نہ دیکھے۔ تم جاؤ۔ کل صبح ٹھیک دس بجے... تین تلوار کے پاس...“
وہ منہ پھیر کر فٹ پاتھ سے گزر کر روز بوتیک کے شو روم میں آگیا۔ وہ فیشن ڈیزائننگ اور اسٹچنگ کے حوالے سے محبوب فیشن انڈسٹریز کا مالک تھا اور اربوں ڈالرز میں کھیل رہا تھا۔
بوتیک کے مالک نے اسے دیکھتے ہی سلام کیا۔ پھر بڑی عقیدت مندی سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”چانڈیو صاحب! اتنی بارش میں آئے ہیں۔ خیریت تو ہے؟“
”ہاں۔ بارش کا مزہ آرہا ہے۔ بھیگتے ہوئے موسم سے انجوائے کرنے نکلا ہوں۔ کھلی فضا میں بھیگی بھیگی تازہ ہوائیں روح کو تازہ کردیتی ہیں۔“
”بے شک۔ کراچی میں کبھی بھولے بھٹکے بارش ہو جاتی ہے اور جب ہوتی ہے تو لطف اٹھانے والے خوب مزہ لیتے ہیں۔ آپ آفس میں تشریف رکھیں۔ میں گرما گرم کافی لاتا ہوں۔“
وہ آفس کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”مرزا صاحب! میں کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ آپ مائنڈ نہ کریں۔“
”او ناٹ ایٹ آل۔ ناٹ ایٹ آل۔“
محبوب علی چانڈیو دروازہ کھول کر چھوٹے سے آفس روم میں آیا۔ اس آفس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر میز کے پیچھے ایک ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر ذرا ادھر سے ادھر گھوم گیا۔ جیسے آرام دہ اونچی کرسی سے اچھل کر گدھا گاڑی میں آکر بیٹھ گیا ہو۔ یوں لگا آسمان سے زمین پر آگرا ہے۔ انسان کو گرتے اور تخت سے تختہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔
دل میں اچانک یہ بات آئی۔ ”اگر اللہ تعالیٰ کسی غلطی کی سزا دے اور اسے گدھا گاڑی والا بنا دے تو کیا وہ اپنے مرتبے، اپنی اونچی حیثیت سے گر کر جی سکے گا؟“
”نہیں۔“ اس نے گھبرا کر سوچا۔ ”میں محبوب علی چانڈیو فیشن انڈسٹریز میں بزنس ٹائیکون کہلاتا ہوں۔ ایسی ذلت اور پستی برداشت نہیں کرسکوں گا۔ منہ چھپا کر خودکشی کر لوں گا۔“



وہ بے اختیار اپنے کان پکڑ کر توبہ توبہ کرنے لگا۔ زیر لب کہنے لگا۔ ”میرے اللہ! میرے معبود... ! توبہ کرتا ہوں۔ میرے جانے انجانے گناہوں کو معاف فرما...“
اس کے دل میں خوف خدا تھا۔ جب بھی دل گھبراتا اپنے رب سے کردہ ناکردہ غلطیوں کی معافی مانگنے لگتا تھا۔ خوفِ خدا اسی عمل کو کہتے ہیں۔ اس وقت بھی دل میں گڑگڑا رہا تھا۔
”مجھے عزت دینے والے! مجھے معاف فرما... ! میں غلطیوں سے بچنے کی حتی الامکان کوششیں کرتا رہتا ہوں۔ آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ پتا نہیں کیوں، مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں وہ گدھا گاڑی والا بن گیا ہوں۔ کیا نام بتایا تھا اس نے...؟“
اس نے یاد کیا۔ ”ہاں۔ مراد علی منگی...“
اچانک اس کے اندر ایک منفی سوچ ابھری۔ ”یہ میرا ہمشکل ایک بیچارہ غریب ہی نہیں ہے۔ ایک مفرور قاتل بھی ہے۔ مگر تعجب ہے۔ بڑی آزادی سے گھوم رہا ہے۔“
یہ ایک چونکا دینے والی سوچ تھی۔ وہ ایک سیدھے سادے غریب آدمی کو مفرور قاتل کہہ رہا تھا۔ پھر ایک انگلی سے سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”کیا میں نے جو سنا تھا، وہ غلط ہے؟ کیا وہ وڈیرا حشمت جلالی یہ کہہ کر میرا مذاق اڑا رہا تھا کہ میرا ایک ہمشکل مفرور قاتل ہے؟ اس کے شبہ میں پولیس مجھے گرفتار کرسکتی ہے...
اونہہ! مجھے مفرور قاتل سمجھنا اور گرفتار کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ہاں مگر میں نے وڈیرے کی اس بات پر یقین نہیں کیا تھا کہ اس دنیا میں میرا کوئی ہمشکل بھی ہے۔ اور وہ بھی ایک قاتل...؟
تعجب ہے کیوں یقین نہیں کیا تھا؟ ایک دوسرے سے مشابہت رکھنے والے کئی ہوتے ہیں۔ مگر ہم نہیں مانتے کہ ہمارے جیسا کوئی دوسرا ہوگا۔
اس وقت میں نے وڈیرے کی بات کا یقین نہیں کیا تھا اور اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آرہا۔ جبکہ ہو بہو میری ہی صورت ہے۔ بالکل میں ہی میں ہوں۔
ویسے کیا وہ واقعی قاتل ہے...؟ صورت سے تو لگتا نہیں ہے۔“
وہ اپنے چہرے کو چھو کر بولا۔ ”ایسی صورت والے قاتل نہیں ہوتے۔ کل اس کے اندر سے سچ اگلواؤں گا۔“
مرزا نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے خیالات سے چونک کر ادھر دیکھا پھر کہا۔ ”آجائیں۔“

وہ کافی کی ٹرے اٹھائے اندر آتے ہوئے بولا۔ ”آپ تنہائی چاہتے ہیں اور میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو کافی پلانا، آپ کی خدمت کرنا ضروری ہے۔“
وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کبھی کبھی تو خدمت کا موقع ملتا ہے۔ بارش پھر ہونے لگی ہے۔ کھڑکی سے دیکھیں اور کافی کی چسکیاں لیں۔ ساون رت کا مزہ آئے گا۔“
وہ کافی کی ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ”بائی دا وے، آپ کچھ الجھے ہوئے سے لگ رہے ہیں۔“
اس نے ٹالنے کے لیے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ابھی کافی پیئوں گا تو دماغ صاف ہو جائے گا۔ اگر کوئی الجھن ہے تو نہیں رہے گی۔“
مرزا نے پوچھا۔ ”میں آپ کے کسی کام آسکتا ہوں؟“
وہ کافی کا ایک گھونٹ پینے کے بعد منہ کھول کر لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ ”ہا... پتا نہیں کیا الجھن تھی۔ ایک گھونٹ میں ہوا ہو گئی۔ آپ واقعی کام آئے ہیں۔ صحیح وقت پر کافی پلائی ہے۔“
اس نے بڑی خوبصورتی سے بات بنائی، مرزا کو ٹال دیا۔ مرزا نے دل ہی دل میں کہا۔ ”بڑے گہرے ہیں آپ چانڈیو صاحب، آخر ارب پتی بزنس مین یونہی تو نہیں بن گئے۔“

☆☆☆

وہ گدھا گاڑی پر بیٹھا گھر واپس جا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ ”میں اتنی دور اسپتال کیوں گیا تھا؟
بیمار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر سے بھی نہیں ملا۔ دوا نہیں لی اور بھلا چنگا ہو گیا۔ واہ... ! اللہ سائیں بھی کیا عجب تماشے کرتا ہے؟
قدرت کے تماشے ٹھہر ٹھہر کر سمجھ میں آتے ہیں۔ کمال ہے، اللہ سائیں نے کیا کھیل دکھایا ہے۔ وہ اوپر والا میرے سامنے میری ہی صورت دکھانے وہاں تک لے گیا تھا۔
میں تو جیسے اپنے سامنے اپنے آپ کو ہی دیکھ رہا تھا۔ دن رات سوچتا رہتا ہوں کہ بڑا آدمی بن جاؤں اور کیا بات ہے، دیکھتے ہی دیکھتے دولتمند بن گیا تھا۔ بہت مہنگی کار میں بیٹھا تھا۔ گلے میں ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ کیسا زبردست لگ رہا تھا میں۔ میرے اللہ سائیں نے جاگتی آنکھوں سے کیا خواب دکھایا ہے۔“
وہ گھر کے سامنے پہنچ کر گدھے کو گاڑی سے کھولنے لگا۔ باپ نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ ”تو نے تو کہا تھا آج مال اٹھانے نہیں جائے گا۔ پھر گاڑی کہاں لے گیا تھا؟“

"میں نہیں گیا تھا۔ اللہ سائیں لے گیا تھا۔ کیا بتاؤں ابا! آج میں نے کیا دیکھا ہے؟"

"ارے جا... ! کراچی شہر میں اور کیا دیکھے گا۔ بوری بند لاشیں دیکھی ہوں گی۔"

"نہیں ابا! بالکل اپنے جیسا مراد علی منگی دیکھا ہے۔ میرے جیسا منہ، ناک، آنکھیں، وہ سر سے پاؤں تک میرے جیسا تھا۔ کیا تو نے کبھی اپنے جیسا دوسرا دیکھا ہے؟"

"ذرا سوچ کے بول... میرے ہی جیسا ایک اور ہوتا تو تیرے دو باپ ہو جاتے۔"

اس نے باپ کو گھور کر دیکھا۔ وہ بولا۔ "تیری ماں بھی چکرا جاتی کہ دو خصم کیسے ہو گئے؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "ابا! معاف کر دے۔ چپ ہو جا..."

باپ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تو نے پوچھا ہے تو کہتا ہوں، میں نے کئی ملتی جلتی صورت والے دیکھے ہیں لیکن بالکل اپنے جیسے نہیں دیکھے۔ تو نے کہاں جا کر کسے دیکھ لیا ہے؟"

"جہاں بھی دیکھا ہے۔ اس کی کھال اور ہڈیاں بھی اپنے جیسی دیکھی ہیں۔ ابھی سوچ رہا ہوں تو یقین نہیں ہو رہا ہے۔ کل پھر ملنے جاؤں گا۔ میرے جیسا اس شہر میں ہے، تب ہی تو اس سے ملوں گا۔ وہ بھی مجھ سے ملنے کے لیے کچھ بے چین سا لگ رہا تھا۔"

باپ نے گدھے کے آگے چارا ڈالتے ہوئے کہا۔ "ایسا ہوتا ہے۔ لاکھوں کروڑوں میں دو چار ایسے ہوتے ہیں۔ جنہیں دور سے دیکھو تو ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔"

"وہ دور سے نہیں، نزدیک سے بھی بال بال میرے جیسا تھا۔ میں نے اسے بالکل آمنے سامنے دیکھا ہے۔"

باپ نے بے زار کر کہا۔ "ہوگا تیرے جیسا۔ ہونے دے۔ کیوں اسے سر پر سوار کر رہا ہے۔ جا منہ ہاتھ دھو کر روٹی کھالے میں نے ابھی گرم گرم پکائی ہے۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا مکان کے اندر آیا۔ "ایک اور مراد علی منگی پیدا ہو گیا ہے اور تو کہتا ہے اسے سر پر سوار نہ کروں۔ نہ کرنے سے بھی وہ سر میں گھس کے رہے گا۔"

اس نے ایک کمرے میں آکر دیکھا۔ مکان کے پچھلی طرف کا دروازہ کھلا تھا۔ جبکہ اسے بند رکھا جاتا تھا۔ گلی کے کتے گھس آتے تھے۔ وہ دروازے کو بند کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ "پتا نہیں یہ کیسے کھلا رہ گیا۔ ابا تو تو گھر کا بہت خیال رکھتا ہے۔"

وہ زیر لب بڑبڑاتا ہوا چھوٹے سے رسوئی گھر میں آیا۔ وہاں چولہے کے قریب ایک چھوٹی سی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ چٹائی پر روٹیوں کا چھابہ رکھا ہوا تھا۔ پھر یہ دیکھ کر چونک گیا کہ چھابے پر ایک سرخ گلاب کی کلی مسکرا رہی تھی۔ یکلخت کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ ہائے... ہوا، خوشبو اور گلاب...

اس نے ایک لمبی سانس کھینچی... "ماروی!"

وہ اداؤں والی اپنے وجود کا پتا ایسے ہی دیتی تھی کبھی پھول کھلاتی تھی۔ کبھی چوڑیاں کھنکناتی تھی اور کبھی پائل چھنکاتی تھی۔ اس نے کھلی ہوئی کھڑکی کو دیکھا پھر سمجھ گیا کہ پچھلا دروازہ اس کے آنے اور جانے سے کھلا رہ گیا تھا۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا پچھلے دروازے پر آیا۔ پھر اسے کھول کر باہر نکل کر جستجو سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس سے زیادہ وہ بیچارہ کیا کرے گا؟ وہ روٹی چھوڑ کر سرخ کلی کے پیچھے دوڑا آیا تھا۔

اس نے خلا میں تکتے ہوئے پوچھا۔ "میری جان... ! کیا تجھے ستانا اچھا لگتا ہے؟"

اس کی رس بھری آواز ہواؤں کے دوش پر گنگناتی ہوئی آئی۔

"اچھا لگتا ہے.... ! تو آتا ہے تو تیرے پیچھے دنیا کی ساری خوشیاں چلی آتی ہیں... ! تو جاتا ہے تو میں اور میری تنہائی رہ جاتی ہے۔"

وہ بولتی ہوئی اس کے پیچھے آگئی۔ وہ گھوم کر اسے بڑے پیار سے بڑے جذبے سے دیکھنے لگا۔ معشوق روبرو ہو تو دیکھنے کا انداز خود بخود بدل جاتا ہے

دیکھنے میں شوخی تھی۔ نگاہوں میں آرزوئیں مچل رہی تھیں اور وہ ایسی ہی تھی کہ اسے دیکھتے ہی نگاہیں خیرات مانگنے لگتی تھیں۔

ہائے جانی... ! تیرے آتے ہی آس پاس کی دنیا گم ہو جاتی ہے۔ پوری کائنات میں صرف تو ہی تو رہ جاتی ہے۔

وہ قریب آیا تو وہ پلٹ کر دروازے سے اندر آکر بولی۔ "روٹی سالن ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ باؤلا نہ بن تو مجھے کھاتے کھاتے بھی دیکھ سکتا ہے۔"

وہ اندر آکر بولا۔ "تیرے جانے کے بعد بھی تو روٹیاں رہیں گی۔ تو نہیں رہے گی۔"

"تیرے ابا نے مجھے آتے دیکھا ہے۔ وہ باہر ہے۔"

"وہ باہر ہی رہے گا۔ سمجھ دار ہے۔ تو میری بے چینی اور تڑپ کو کیوں نہیں سمجھتی؟ کبھی ہاتھ پکڑنے نہیں دیتی۔"





وہ ہنستے کھلکھلاتے ہوئے بولی۔ "کتنے جذبے سے پکڑ کر سوچتا ہوگا کہ چھولے گا تو جانے میں چھونے سے کیسی کمی کی؟"

"ہاں تو کیسی ہے، ایک بار تو معلوم ہو۔"

"اور جب تک معلوم نہ ہو، میری طلب شور مچاتی رہے گی۔"

یہی تو اچھا لگتا ہے کہ تجھ سے دور رہ کر بھی تیرے اندر ہنگامے کرتی رہوں۔"

وہ چپ چاپ سوچتا ہوا چٹائی پر بیٹھ گیا۔ روٹی اور سالن نکال کر کھانے لگا۔ ماروی نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہا ہے؟"

وہ لقمہ چباتے ہوئے بولا۔ "تو ٹھیک کہتی ہے۔ چھو لینے یا ہاتھ پکڑ لینے سے حسرت پوری ہوتی ہے۔ محبت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ تیرے چاچا اور چاچی شادی کے معاملے میں..."

اس کی بات ادھوری رہ گئی باہر سے چاچی کی آواز سنائی دی۔ وہ مراد علی منگی کے باپ سے کہہ رہی تھی۔ "میں جانتی ہوں، ماروی ادھر آئی ہے۔ ارے تو دروازہ روک کے کیوں کھڑا ہے۔ مجھ کو اندر جانے دے۔"

مراد کو باپ کی آواز سنائی دی۔ "اندر ماروی نہیں ہے ایک بار کہہ دیا۔ ہم باپ بیٹے رہتے ہیں۔ یہاں مردوں کا سامان بکھرا پڑا رہتا ہے تم اندر جانے کی ضد نہ کرو۔"

مراد اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ماروی پریشان ہو گئی۔ وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے پچھلے دروازے پر آئے بھاگنے کا وہی راستہ تھا لیکن اسے کھول کر باہر نکلنا چاہا تو وہاں چاچا تن کر کھڑا ہوا تھا۔

وہ دبلا پتلا مچھر کے جیسا سینہ تان کر بولا۔ "ہم جانتے تھے اسی لیے وہ آگے سے آئی ہے اور میں پیچھے سے۔"

پھر وہ ماروی سے بولا۔ "تجھے شرم نہیں آتی ہم نے تجھے ماں باپ بن کر پالا پوسا ہے اور ہمیں دھوکا دے کر ادھر آتی ہے۔"

ماروی کا سر جھکا ہوا تھا۔ مراد نے اگلے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا۔ "ابا! چاچی کو آنے دے۔ یہ ہمیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ ہم کو دشمن سمجھتے ہیں۔"

چاچی راستہ ملتے ہی دندناتی ہوئی آئی۔ پھر ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ "ہم دشمن ہوتے تو ابھی پنچایت بٹھاتے اور تم کو ماروی سے دور رہنے پر مجبور کر دیتے۔ ہم نے اب تک ایسا نہیں کیا۔ ہماری محبت کو اور شرافت کو سمجھو۔"

چاچا نے اندر آکر کہا۔ "کل ہی گاؤں سے خبر آئی ہے۔ وڈیرا سائیں بھی ماروی سے بیاں کرنا چاہ رہا ہے لیکن ہم تو ماروی کی خوشی دیکھ رہے ہیں۔ وہ تیرے گھر میں آنا چاہتی ہے۔"

چاچی نے کہا۔ "تیرا کیا فرض ہے؟ چل وڈیرے کی طرح دو لاکھ، ڈیڑھ لاکھ نہ سہی۔ ایک لاکھ تو جمع کر لے اور ہم نے تجھے ایک برس کا ٹائم بھی دیا ہے۔"

چاچا نے کہا۔ "اور تو ہے کہ رقم نہیں جوڑ رہا ہے۔ ننگی بھوکی محبت میں ماروی کو پھانس کر اسے ہم سے توڑ رہا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ میں دن رات محنت کر رہا ہوں۔ پیسے جوڑ رہا ہوں۔"

"دو مہینے ہو گئے۔ کتنے جمع کیے ہیں؟"

وہ اپنی ایک ایک انگلی گننے لگا پھر مایوس ہو کر بولا۔ "ابھی تک پورے تین ہزار دو سو..."

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "تین ہزار دو سو روپے گولک میں ہیں۔ واہ کیا خزانہ جمع کر لیا ہے۔"

"چاچی اپنی اوقات کے مطابق جمع کر رہا ہوں۔"

"اور دس مہینوں میں کیا ایک لاکھ ہو جائیں گے؟"

چاچا نے کہا۔ "تو تو بار بار پیدا ہو کر بھی ایک لاکھ روپے جمع نہیں کر سکے گا۔"

چاچی نے کہا۔ "کیوں ہماری معصوم بچی کو عشق محبت کا جھانسا دے رہا ہے۔ یہ بہت بھولی ہے۔ اس نادان کا پیچھا چھوڑ دے۔"

"چاچی! تم نے زبان دی ہے۔ ابھی دس مہینے تک کچھ نہ بولو۔ میں سمندر پار جا کر نوکری کروں گا۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ دیکھ لینا، لاکھ روپے ضرور لاؤں گا۔"

"تیرا نام مراد ہے۔ خدا کرے تیری مراد پوری ہو۔ مگر یہ اچھی طرح جان لے۔ ہم تیری خاطر اور اپنی ماروی کی خاطر وڈیرے کا رشتہ چھوڑ رہے ہیں۔ ایک لاکھ سے کم پر شادی نہیں کریں گے۔ ہم نے بچپن سے اسے پھول کی طرح رکھا ہے۔ ارے مجنوں کی اولاد...!"

وہ ماروی کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے لے جاتے ہوئے بولی۔ "دس مہینے کے بعد ہم اسے گاؤں لے جائیں گے۔ مرد کا بچہ ہے تو ٹائم سے پہلے آجانا۔"

ماروی نے جاتے جاتے مراد کو امید و حسرت سے دیکھا پھر چاچا چاچی کے ساتھ چلی گئی۔ باپ نے ٹین کے صندوق پر بیٹھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔ "تو کیسا گدھا ہے؟ خدا تجھے عقل دے۔ گھر میں بیٹھنے کے لیے کرسی نہیں ہے۔ کچی زمین پر سوتے ہیں اور ایک لاکھ روپے کا عشق کر

رہا ہے۔‘‘

وہ بولا۔ ’’ایجنٹ نے کہا ہے۔ پندرہ ہزار روپے دینے سے دبئی میں پکی نوکری ملے گی۔ میں دس مہینوں میں ایک لاکھ روپے سے زیادہ کما کر لاؤں گا۔‘‘

’’دبئی جانے کے لیے پندرہ ہزار کہاں سے آئیں گے؟‘‘

وہ جھاگ کی طرح فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کا اپنا مکان نہیں تھا۔ باپ بیٹے ماہانہ پانچ سو روپے کرایہ دیا کرتے تھے۔ کوئی جائداد نہیں تھی۔ گھر میں ایسا کوئی قیمتی سامان نہیں تھا جسے بیچ کر دبئی جانے کی صورت نکلتی۔

چاچا اور چاچی واقعی ماروی کو چاہتے تھے۔ اس کی پسند سے مراد کو داماد بنانے پر راضی تھے۔ لیکن خالی ہاتھ نہیں۔

☆☆☆

طلوع آفتاب سے پہلے شبنمی دھند چھائی ہوئی تھی۔ محبوب علی چانڈیو معمول کے مطابق کھلے میدان میں آ گیا تھا اور بھی کئی دولتمند حضرات اور خواتین تھیں۔ وہ منہ اندھیرے جاگنے اور جوگنگ کرنے کے عادی تھے۔

آرام سے بیٹھ کر کھانے والے رئیسوں کو ڈاکٹر مشورہ دیتے ہیں کہ دواؤں سے زیادہ صبح خیزی اور جوگنگ بہتر ہے۔ کسی علاج اور پرہیز کے بغیر صحت مندی حاصل ہوتی ہے۔

اس میدان میں محبوب علی صحت کے علاوہ بزنس کے گر بھی سیکھتا تھا۔ سوچتا تھا، جوگنگ کرتے وقت چھوٹے چھوٹے قدم کیوں اٹھائے جاتے ہیں۔ لمبی دوڑ کیوں نہیں لگائی جاتی؟

اس کا ذہن سمجھاتا تھا، کاروبار میں لمبی دوڑ لگانے والے منہ کے بل گرتے ہیں۔

دانش مندی یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر خود اعتمادی سے اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا چاہیے۔

پھر یہ کہ جوگنگ کرنے والا جلد ہی ہانپتا نہیں ہے اور جو ہانپتے نہیں ہیں وہ کاروبار میں کانپتے نہیں ہیں۔ ناکامی اور نقصانات کے سینے پر مستقل مزاجی سے پنجوں کے بل اچھلتے رہتے ہیں اور پنجوں کے بل اچھلنے والوں کی آہٹیں سنائی نہیں دیتیں وہ بڑی خاموشی سے کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہیں۔

وہ ہر صبح جوگنگ کے دوران ایسی ہی باتیں سوچتا تھا، سمجھتا تھا پھر اپنے کاروباری معاملات میں ان پر عمل کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ مرد کی کامیابی کی پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس روز صبح سویرے محبوب علی چانڈیو کے سامنے بھی عورت آ گئی۔

وہ جوگنگ کرتے کرتے رک گیا۔ وہ ایسی تھی کہ اس کے آگے منہ زور طوفان رک جایا کرتے تھے۔ پھر چانڈیو کیسے نہ رکتا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ’’سمیرا... تم؟‘‘

کمرشل اشتہارات کی دنیا میں سمیرا سپر ماڈل کہلاتی تھی۔ اس کے چہرے کا ناک نقشہ، اس کی ادائیں دوسری ماڈلز کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی پرکشش تھیں۔ اسے اسکرین پر دیکھنے والے سحر زدہ ہو جاتے تھے۔

ان دنوں محبوب علی کی فیشن انڈسٹریز سے نئے ڈیزائین کیے ہوئے ملبوسات مارکیٹ میں لائے جا رہے تھے۔ سمیرا وہ ملبوسات پہن کر فیشن شوز میں کیٹ واک کر رہی تھی اور بڑے ناز و ادا سے جادو جگا رہی تھی۔

محبوب علی نے حیرانی سے پوچھا۔ ’’تم تو سوسائٹی کے علاقے میں رہتی ہو پھر اتنی صبح یہاں کیسے آ گئیں؟‘‘

وہ زاویے بدل کر اپنا لباس دکھاتے ہوئے بولی۔ ’’اسے آپ کے ڈیزائنر اور اسٹچر نے تیار کیا ہے۔ ابھی اس کی کمرشل شوٹنگ تھی۔ میں نے سمندر کے کنارے طلوع ہوتے ہوئے سورج کے پس منظر میں کیٹ واک کیا ہے۔ آپ اسکرین پر دیکھیں گے۔ بہت ہی پرہٹ کمرشل ہوگی۔‘‘

محبوب نے کہا۔ ’’بے شک محنت ہم کرتے ہیں۔ صلہ اوپر والا دیتا ہے۔ بائی دا وے کوئی سا بھی لباس ہو تمہارے بدن پر خوب جچتا ہے۔ اسی لیے تو تمہیں جو بھی دیکھتا ہے، بے ساختہ کوئین آف دی کاسٹیومز کہتا ہے۔‘‘

وہ مسکرا کر بولی۔ ’’تھینکس گاڈ! پہلی بار آپ کے منہ سے تعریفیں سن رہی ہوں۔‘‘

’’تم میری پروڈکشنز کو مارکیٹ میں اچھال رہی ہو۔ میں بزنس مین ہوں۔ خوش ہو کر تعریفیں کر رہا ہوں۔‘‘

وہ ایک ادائے ناز سے بولی۔ ’’آج آپ نے میرے بدن کی تعریف کی ہے۔ آدمی چاہے کتنا ہی خشک مزاج ہو، اسے کوئی ایک عورت شاعر بنا دیتی ہے۔‘‘

اس نے بدن کی نہیں، لباس کی تعریف کی تھی۔ ویسے سچ تو یہی ہے کہ بدن صحت مند ہو تب ہی لباس جچتا ہے۔ گویا محبوب نے در پردہ اس کے بدن ہی کی تعریف کی تھی۔

وہ بولا۔ ’’ہمارے جیسے بزنس مین، شاعری کو دور سے سلام کرتے ہیں۔ ہماری فطرت میں رومانس نہیں ہوتا۔‘‘

’’اور جب ہو جاتا ہے تو پتا بھی نہیں چلتا۔ جب کسی کا جادو سر چڑھ کر بولے گا تو آپ حیران رہ جائیں گے۔‘‘





وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اپنی کاروں کے پاس آ گئے۔ سمیرا نے کہا۔ ’’آج سنڈے ہے۔ کیا میرے ساتھ وقت گزارنا چاہیں گے؟‘‘

محبوب علی کو یاد تھا، ابھی چار گھنٹے کے بعد اسے تین کوارٹر کے راؤنڈ اباؤٹ میں جانا ہے اور مراد علی منگی سے ملنا ہے۔ محبوب نے سمیرا کے سراپے پر ایک نظر ڈالی۔ حسن کے اس جیتے جاگتے شاہکار سے زیادہ ایک گدھا گاڑی والے کی اہمیت تھی۔

اس نے کہا۔ ’’سوری۔ کاروباری معاملات اتنے اہم ہوتے ہیں کہ ہمارا سنڈے بھی آف نہیں ہوتا۔ آج بھی اچانک کام نکل آیا ہے۔ میں آج بھی مصروف رہوں گا۔‘‘

وہ اپنی کار کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ’’میں بھی آپ کے کاروبار کی ایک اہم ضرورت ہوں اور آپ مجھے نظر انداز کر رہے ہیں۔ اگر آپ کا یہی رویہ رہا تو سوسوری آپ کے ادارے میں میرا یہ آخری کمرشل ہوگا۔‘‘

وہ کار اسٹارٹ کر کے اسے ایک ٹرن دے کر وہاں سے چلی گئی۔ کار کے ساتھ محبوب علی کو بھی سوچنے کے لیے ایک ٹرن دیا تھا۔ اپنی اہمیت جتا گئی تھی۔

اور وہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ محبوب نے مختصری دو چار ملاقاتوں میں اس کے متعلق اندازہ لگایا تھا اور کچھ معلومات بھی حاصل کی تھیں کہ وہ عام ماڈلز کی طرح اپنے حسن کی نمائش کرنے ماڈلنگ کی دنیا میں نہیں آئی ہے۔

وہ ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ حالات سے مجبور ہو کر خود کو نمائش کے لیے پیش کر رہی تھی۔ وہ بی کام کر چکی تھی۔ کاروباری معاملات میں خاصی سمجھ بوجھ رکھتی ہے اور ایک اچھی لائف پارٹنر بھی بن سکتی تھی۔

اپنے والد کے زمانے سے محبوب علی کے ایک بزرگ ہمدرد معروف تجلی صاحب تھے۔ اس کے کاروباری اور ذاتی معاملات میں مفید مشورے دیا کرتے تھے اور وہ پورے احترام سے ان پر عمل کرتا رہتا تھا۔

معروف تجلی نے کئی بار سمجھایا تھا۔ ’’ذرا اپنی عمر کا حساب کرو۔ اب تک تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔ مرد کو کچی عمر میں شادی کرنی چاہیے کہ بڑھاپے سے پہلے اپنے بچے جوان ہو جائیں اور اس کے مضبوط بازو بن جائیں۔‘‘

وہ جواب دیتا تھا۔ ’’معروف صاحب! میں بہت سوچ سمجھ کر شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی گھر کا سکون برباد کرنے والی آئے گی تو ذہنی انتشار کے باعث کاروبار پر برا

## مہکتی کلیاں

☆ جو شخص زیادہ سوچنے والا ہوتا ہے، وہ سب سے صحیح کام کرتا ہے۔

☆ دوسروں کے ساتھ زیادہ نیک سلوک وہی شخص کر سکتا ہے، جو خود مصیبتوں میں مبتلا رہ چکا ہو۔

☆ ہر شخص ایک ضخیم کتاب ہے، بشرطیکہ آپ کو پڑھنا آتا ہو۔

☆ عقل مند دوسروں کی اور بے وقوف اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں۔

☆ پرامید ہو کر سفر کرنا منزل پر پہنچنے سے بہتر ہے۔

مرسلہ: صدف ثاقب راجہ، پنڈ دادن خان

## نہلے پہ دہلا

(1) دل کے داغ کیسے دھوئے جا سکتے ہیں؟

☆ سرف ایکسل کا پیکٹ پھانک کر واشنگ مشین میں چھلانگ لگا دیں۔ لیکن اتنا خیال رہے کہ یہ لوڈشیڈنگ کے دوران ہو۔

(2) آج کل وفا اور محبت کہاں مل سکتی ہے؟

☆ صرف رومانوی ناولوں میں۔

(3) امن کی فاختہ کون لوگ اڑاتے ہیں؟

☆ جن کے ہاتھوں سے بارود کی بو آتی ہے۔

(4) جب کسی فلم میں غریب ہیروئن قیمتی کپڑے پہن کر رقص کرتی ہے، تو آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

☆ خود کو احمق۔

(5) یہ زندگی اسی کی ہے......

☆ جو کسٹم آفیسر ہے۔

(6) زندگی کب حسین معلوم ہوتی ہے؟

☆ جب بیوی میکے چلی جاتی ہے۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

اثر پڑے گا۔ ابھی میری زندگی میں کوئی عورت نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے ابھی میں آرام سے جی رہا ہوں۔“

”عورت آرام بھی دے سکتی ہے اور زندگی حرام بھی کرسکتی ہے۔ انتخاب درست ہوگا تو وہ آرام پہنچائے گی۔“

”عورت کو پرکھنے کی کوئی کسوٹی نہیں ہے۔ کیسے معلوم ہو کہ وہ آرام پہنچائے گی؟“

معروف تجلی نے بزرگانہ سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تمہارے لیے فکرمند رہتا ہوں۔ تمہاری خاطر میں نے سمیرا کے متعلق معلومات حاصل کی ہیں۔ وہ واقعی شریف گھرانے سے آئی ہے اور ماڈلنگ کے پیشے سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے پھر یہ کہ تعلیم یافتہ ہے۔ اگر تم چاہو گے تو وہ تمہارے کاروباری معاملات میں اچھی معاون ثابت ہوگی۔“

”آپ جانتے ہیں میں عورتوں سے دور بھاگتا ہوں۔ سمیرا پر دل کیسے آئے گا؟ نہیں آئے گا تو شادی کیسے کروں گا؟“

”خود کو آمادہ کرو۔ دل لگاؤ گے تو لگے گا۔ دنیا کے نوے فیصد مرد عاشق نہیں ہوتے۔ صرف شوہر ہوتے ہیں اور عشق کے بغیر اچھی ازدواجی زندگی گزارتے ہیں۔“

”آپ درست فرماتے ہیں۔ میرے لیے کوئی محبوبہ نہیں صرف ایک اچھی بیوی ضروری ہے۔“

اور اس وقت صبح سویرے جوگنگ کے دوران میں وہ آگئی تھی۔ محبوب اسے اچانک وہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ پھر سمیرا نے جاتے جاتے دھمکی دے کر جیسے معروف تجلی کے مشوروں کو اس کے ذہن میں تازہ کردیا تھا۔

اس نے اسے نظرانداز کرکے اس کی توہین کی تھی۔ وہ اس سے ناراض اور مایوس ہوکر کہہ گئی تھی۔ ”آپ مجھے نظرانداز کریں گے تو آپ کے ادارے میں میرا یہ آخری کمرشل ہوگا۔“

محبوب ذرا سنجیدہ ہوگیا۔ اسے اچھی طرح دیکھنا پرکھنا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ یہ تو سب ہی کہتے ہیں کہ دو پیسے کی ہانڈی بھی ٹھونک بجا کر خریدی جاتی ہے اور وہ ایسی ہانڈی تھی جو تمام عمر ازدواجی چولہے پر چڑھی رہنے والی تھی۔

لہٰذا وہ بڑے اطمینان سے سال یا چھ ماہ تک اس کا مشاہدہ کرنے کا فیصلہ کرنے لگا۔

تعجب ہے صرف پرکھنے کے لیے اتنی لمبی مدت...؟ کیا کرے گا وہ اپنے مزاج سے مجبور تھا۔ اسے واقعی عورتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔

وہ دس بجے تین تلوار کے پاس آیا۔ مراد علی اس کے انتظار میں وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کار سے نکل کر اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ راؤنڈاباؤٹ سے اتر کر سڑک پار کرتا ہوا اس کے پاس آیا۔ پھر اپنا ہاتھ پیشانی تک لے جا کر بولا۔ ”سلام صاحب۔“

”وعلیکم السلام۔ آؤ گاڑی میں بیٹھو۔“

اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ مراد علی نے اپنی جوتیاں اتاریں۔ پھر انہیں ہاتھوں میں لے کر اندر بیٹھ گیا۔ محبوب نے پوچھا۔ ”انہیں ہاتھوں میں کیوں لیا ہے۔ پہنے رہو۔“

”سائیں! گاڑی میرے سے بھی زیادہ صاف اور اجلی ہے اور میرے جوتوں میں مٹی لگی ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ جو چیز جہاں کے لیے ہوتی ہے وہیں اچھی لگتی ہے۔ انہیں پہن لو۔“

اس نے پہن لی۔ محبوب دروازہ بند کرکے اپنی اسٹیئرنگ سیٹ پر آگیا۔ اس نے نظامِ قدرت کے مطابق ابھی کہا تھا کہ جو چیز جہاں رہنے کے لیے ہوتی ہے وہیں اچھی لگتی ہے۔

وہ آگے رہنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ لہٰذا اس نے مراد کو پیچھے بٹھایا تھا۔ اس نے کار آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”میں نے کل بتایا تھا میمن گوٹھ میں رہتا ہوں۔“

”میمن گوٹھ سے پہلے کہاں رہتے تھے؟“

”گھوٹکی سے آگے وڈیرا حشمت جلالی کی زمینیں ہیں۔ میں وہاں وڈیرے کا منشی تھا۔“

محبوب علی ڈرائیو کرتے کرتے ذرا سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ اسی وڈیرے حشمت جلالی نے اسے دیکھ کر پوچھا تھا۔ ”چانڈیو صاحب! کیا آپ کا کوئی ہم شکل جڑواں بھائی ہے؟“

اس نے جواب دیا تھا۔ ”میرا کوئی بھائی ہے نہ بہن ہے۔ کیا آپ نے میرا کوئی ہم شکل دیکھا ہے؟“

”ہاں۔ وہ یہاں میرا منشی تھا۔ میری بیٹی کو قتل کرکے فرار ہوگیا ہے۔ کسی نہ کسی دن پکڑا جائے گا۔“

پھر حشمت جلالی نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ”یہاں کے تھانے والے آپ کو دیکھیں گے تو قاتل سمجھ کر گرفتار کرلیں گے۔“

محبوب علی چانڈیو کار کو سی ویو کی طرف موڑتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”یہ میرا ہم شکل وہی جلالی گوٹھ کا رہنے والا مفرور قاتل ہے۔ تعجب ہے یہاں آزادی سے گھوم رہا ہے اور اب تک پولیس والوں کی نظروں میں نہیں آیا۔“

اس نے مراد علی سے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ تم جلالی گوٹھ سے کب یہاں کراچی شہر میں آئے تھے؟“

”کوئی دو برس ہوگئے۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”دو برس گزر گئے اور پولیس والوں نے تمہیں گرفتار نہیں کیا؟“

اس نے حیرانی سے محبوب کو دیکھا پھر معصومیت سے پوچھا۔ ”وہ مجھے کیوں گرفتار کریں گے؟“

”تم جلالی گوٹھ سے بھاگے ہوئے قاتل ہو؟“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”تم نے وڈیرے کی بیٹی کو قتل کیا ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔ جب میں ادھر سے آیا تو زلیخا زندہ تھی۔ میں نے اسے دور سے حویلی کی چھت پر دیکھا تھا۔“

”کیا وہ حشمت جلالی جھوٹ بولتا ہے؟“

”پکا جھوٹا ہے۔ میرا دشمن ہے۔ آپ کا ارادہ کیا ہے؟ کیا مجھ کو تھانے لے جارہے ہیں؟“

وہ ایک عمارت کے سامنے کار روکتے ہوئے بولا۔ ”یہ تھانہ نہیں ہے اور میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔“

وہ کار سے نکل کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”یہاں میرا ایک فلیٹ ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ کوئی اندیشہ نہ کرو۔ ہم یہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

وہ فرسٹ فلور کے ایک فلیٹ میں آگئے۔ وہ ڈرائنگ روم بڑی عالی شان کوٹھیوں کی طرح تھا۔ مہنگے آرائشی سامان سے سجا ہوا تھا۔ ایک کھڑکی سنیما اسکوپ اسکرین کی طرح وسیع و عریض تھی۔ وہاں سے دور تک سمندر اور ساحل دکھائی دے رہا تھا۔

محبوب نے کھڑکی کے پاس آکر صوفہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”بیٹھو۔ تم نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے اور نہ ہی تم سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔“

وہ صوفے کے ایک سرے پر بیٹھ گیا۔ محبوب نے کہا۔ ”ایسے نہ بیٹھو جیسے بھاگنے والے ہو۔ آرام سے بیٹھو۔“

وہ ذرا پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”وڈیرا سائیں میرا دشمن ہوگیا تھا۔ اسی لیے میں جلالی گوٹھ سے یہاں آگیا۔ یہ تو خدا جانتا ہے کہ وہ کیوں میرے پیچھے مجھ کو قاتل اور بھگوڑا کہہ رہا ہے۔“

”اگر وہ جھوٹ بول رہا ہے تو جھوٹ بولنے کی بھی کوئی وجہ ہوگی۔ ذرا اطمینان سے اچھی طرح سوچو اور مجھے بتاؤ کہ وہ تمہارے خلاف کیوں بول رہا ہے؟“

اس نے دور سمندر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے دس جماعتیں پاس کی ہیں۔ وڈیرے نے اپنی زمینوں کا حساب کتاب رکھنے کی ذمے داری مجھے دی تھی۔ مجھے مہینے بھر کا اناج اور دس روپے دیتا تھا۔ وہاں ہم باپ بیٹے کا گزارا ہوجاتا تھا۔

وڈیرے کی ایک جوان بیٹی اور دو جوان بیٹے ہیں۔ بیٹی کا نام زلیخا ہے۔ وہ مجھ سے عمر میں سات برس بڑی ہے اور بن بیاہی ہے۔ اس کے باپ اور بھائی نہیں چاہتے تھے کہ وہ زمین جائداد کا ایک حصہ لے کر پرائے گھر جائے۔ اس لیے اس کی شادی قرآن سے کرکے اسے گھر میں بٹھا رکھا تھا۔“

محبوب نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ”یہ ہمارے لوگوں میں بڑی لعنتی رسم ہوگئی ہے۔ خدا کا ذرا خوف نہیں ہے۔ قرآن مجید آخری مقدس کتابِ ہدایت ہے۔ اسے بھی لوگ اپنی بے جا ضرورتوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”میں ستائیس برس کا تھا۔ وہ چونتیس برس کی تھی۔ حویلی کی چار دیواری میں روتے روتے اس کے آنسو ختم ہوگئے تھے۔ کوئی اس کے دکھ کی دوا کرنے والا نہیں تھا۔ نوکروں میں ایک میں ہی تھا جو حویلی کے اندر جاتا آتا تھا۔

جب فصل پکتی اور کاٹی جاتی اور منڈی سے بڑے بڑے بیوپاری آتے تو مجھے راتوں کو بھی کھاتے لکھنے کے لیے وہاں رہنا پڑتا تھا۔ ایک رات ایسا ہوا جیسا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس رات جہاں میں کام کرتا تھا وہاں زلیخا آگئی۔ میں حیرانی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے دونوں ہاتھ باندھ کر سر کو ادب سے جھکا لیا۔

وہ ادب آداب کے لیے نہیں آئی تھی۔ اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے حکم دیا۔ ”یہاں آؤ...!“

میں آگے بڑھ کر اس کے ذرا قریب ہوا۔ لیکن پریشان ہوگیا۔ پہلے کبھی حویلی کے مالکان کے اتنے قریب نہیں ہوا تھا۔ اس نے پھر حکم دیا۔ ”اور قریب آؤ۔“

تب مجھے اس کی نیت کا اندازہ ہوا۔ میں بری طرح گھبرا گیا۔ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس نے ڈانٹ کر پوچھا۔ ”کیا بہرے ہو...؟ سنا نہیں تم نے...؟ پاس آؤ...“

میں پاس آکر خوف سے لرزنے لگا۔ وڈیرا یا اس کے جوان بھائی دیکھ لیتے تو میری گردن اڑا دیتے۔ وہ تو حکم دینے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ اپنے مزاج کے مطابق ایک ملکہ عالیہ

کے انداز میں بولی۔ ”مجھے دونوں ہاتھوں سے پکڑو۔“

میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”بی بی جی! ہم۔ میں غریب آدمی ہوں مارا جاؤں گا۔“

میری قربت کے باعث اس کی بھی آواز لرزنے لگی۔ وہ جذبات کی ہلچل میں بولی۔ ”جو کہہ رہی ہوں‘ وہ کرو۔ ورنہ...“

لفظ ”ورنہ“ کے بعد کچھ کہنا نہیں پڑتا۔ اس کی دھمکی سمجھ میں آگئی۔ میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام لیا۔ میری قربت اور میری گرفت ایسی تھی کہ دریا ساحل سے چھلک گیا۔

وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ مجبور تھی جذبات کے کوڑے کھاتی ہوئی آئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میرے پاس لاکھوں روپے کے زیورات ہیں۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں تمہارے ساتھ بہت خوش رہوں گی۔“

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو لاکھوں روپے کے لالچ میں اسے بھگا کر لے جاتا لیکن میں ماروی کا دیوانہ ہوں۔“

محبوب بڑے انہماک سے یہ روداد سن رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ ماروی کون ہے؟“

وہ بڑے جذبے سے بولا۔ ”میرا دل ہے۔ میری جان ہے۔ میرا پیار ہے۔ میرا سنسار ہے۔ اس وقت بھی میری آنکھوں میں روشن ہے۔ میرے اندر یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ نہ ملی تو کیا ہوگا؟ سیدھی سی بات ہے‘ اس کے بغیر جی نہیں سکوں گا۔“

محبوب نے سر ہلا کر کہا۔ ”اسی لیے تم زلیخا کی طرف مائل نہ ہوئے۔ آگے بولو پھر کیا ہوا؟“

”میں زلیخا کی بات کیا بتاؤں‘ وہ برسوں سے سلگتی آرہی تھی۔ ان لمحات میں آگ ہو رہی تھی۔ میں خود کو اس سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی طاقت دکھاتا‘ اسے دھکا دیتا تو اس کی توہین ہوتی۔ اسے چوٹ لگتی تو میری شامت آجاتی۔

میں اسے سمجھا رہا تھا کہ اس کے قابل نہیں ہوں۔ حویلی کا نوکر ہوں۔ ہمیں تو نظریں اٹھا کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ میں اسے چھونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا اور وہ شعلوں کی طرح لپٹ گئی تھی۔

میں نے ایک بار خود کو چھڑایا تو وہ پھر تڑپ کر لپٹ کر ہانپتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بھگا کر نہ لے جاؤ۔ مگر پیار کرو۔ جو کہتی ہوں وہ کرو۔ نہیں تو شور مچاؤں گی۔ بابا سائیں سے بولوں گی کہ تم مجھے برباد کرنا چاہتے تھے۔“

یہ سن کر میرا سر گھوم گیا۔ میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ اس کی بات نہ مانتا تو جو گناہ نہیں کیا ہے‘ اس کے الزام میں مارا جاتا اور اس کی بات مان لیتا تو نہ چاہتے ہوئے بھی گناہگار بن جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا‘ کیا کروں؟“

اس نے محبوب علی کو دیکھا۔ پھر سر جھکا کر کہا۔ ”میں مجبور ہوگیا تھا۔ جو نہیں کرنا چاہیے تھا‘ وہ کرنا پڑا۔ وہ مطمئن ہوکر رونے لگی۔ اس کے آنسوؤں نے سمجھایا کہ وہ اپنے حالات سے مجبور ہے۔ اس نے جاتے وقت اپنے گلے سے سونے کا ہار اتار کر دیتے ہوئے کہا۔ ”اسے رکھو۔ خبردار! انکار نہ کرنا۔ کل پھر آؤں گی۔“

وہ چلی گئی۔ میں نے سونے کی چمک دور سے دیکھی تھی۔ پہلی بار وہ میرے ہاتھوں میں آیا تھا۔ میں نے گھر آکر اس ہار کو ٹین کے صندوق میں چھپا دیا۔ وہ میرے دماغ میں چھپی ہوئی تھی۔ پریشان ہوکر سوچنے لگا‘ کل رات کیا ہوگا؟

وہ پھر آئے گی اور میں پھر مجبور ہو جاؤں گا۔ انکار نہیں کرسکوں گا۔ یوں کسی رات پکڑا جاؤں گا۔

میں لرز گیا۔ بے اختیار انکار میں سر ہلانے لگا پھر میں نے قسم کھالی کہ اب گناہگار نہیں بنوں گا۔

میں نے بہت مجبور ہوکر ماروی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اب مجبور ہوکر بھی ایسی غلطی نہ کرنے کی قسم کھا لی۔ چھ ماہ پہلے وہ اپنے چچا اور چچی کے ساتھ کراچی چلی گئی تھی۔ اس پر وڈیرے کی نیت خراب ہوگئی تھی۔

اس نے ماروی کو داشتہ بنانے کے لیے اس کی قیمت لگائی تھی۔ صرف دس ہزار دینا چاہتا تھا۔ اگر اسے فروخت نہ کیا جاتا تو وہ اسے اٹھوا لیتا۔ غریبوں کے ساتھ کیا زبردستی ہوتی ہے۔

چاچی نے ماروی کو کلیجے سے لگا کر پالا تھا۔ اس کی بربادی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وڈیرا اپنی کمینگی دکھاتا‘ چاچی اور چاچا اسے راتوں رات وہاں سے کراچی لے آئے۔

بابا فصل کی کٹائی کے بعد صبح گھر آیا تو میں نے کہا۔ ”چاچا کی طرح ہمیں بھی بھاگنا ہوگا۔ میں یہاں رہ گیا تو کسی دن جان سے جاؤں گا۔ تو ابھی سامان کی گٹھڑی باندھ کر یہاں سے نکل جا۔ میں رات ہونے سے پہلے تیرے پیچھے آجاؤں گا۔“

میں نے بابا کو بتایا کہ حویلی میں میرے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ وہ سونے کا ہار دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ حویلی کا سونا بھی





ہماری کٹیا سے برآمد ہوتا تو دونوں باپ بیٹے کی شامت آجاتی۔ وہ اسی وقت سامان کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی باندھ کر وہاں سے چلا گیا۔ ہماری کٹیا میں سامان ہی کیا تھا۔ میں نے بھی دن ڈھلنے کا انتظار کیا۔ پھر رات ہوتے ہی دوسری گٹھڑی باندھ کر تاریکی میں چھپتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔“

محبوب علی بڑی توجہ سے اس کی روداد سن رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”سچ بولو۔ کیا تم نے وڈیرے کی بیٹی کو قتل نہیں کیا ہے؟“

”خدا گواہ ہے۔ جب میں گوٹھ چھوڑ کر آرہا تھا تو چاندنی رات میں حویلی کی چھت پر اس کا سایہ دیکھا تھا۔ وہ زندہ تھی۔ مجھ سے جیسی بھی قسم لے لو۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا ہے۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہارے وہاں سے آنے کے بعد اسے قتل کیا گیا ہے۔“

”کس کی مجال ہے کہ کوئی حویلی میں گھس کر اسے قتل کرے۔ یہ کام اس کے باپ اور بھائیوں نے کیا ہوگا۔“

محبوب نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے قتل کرنے کا کوئی سبب پیدا کیا ہوگا۔ کاروکاری کے دستور کے مطابق پہلے اپنی ہی بیٹی زلیخا پر بدکاری کا الزام عائد کیا ہوگا۔ تب ہی حشمت جلالی نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اسے قتل کر کے فرار ہوگئے ہو۔“

”میں سوچتا ہوں‘ انہیں کسی طرح پتا چل گیا ہوگا کہ زلیخا رات کو میرے پاس آئی تھی۔“

”پتا نہ چلا ہو‘ تب بھی بیٹیوں اور بہنوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایسی وارداتیں کی جاتی ہیں اور اس کے قتل کا الزام کسی نامعلوم عاشق پر لگایا جاتا ہے۔“

محبوب علی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا۔ پھر سمندر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وڈیرا حشمت جلالی بہت گہرا ہے۔ وہ زبان سے کہتا ہے کہ تم قاتل ہو۔ لیکن اس نے شاید تمہارے خلاف رپورٹ درج نہیں کرائی ہے۔ جانتے ہو کیوں؟“

اس نے پلٹ کر مراد کو دیکھا پھر کہا۔ ”رپورٹ درج کرانے سے یہ بات سب کو معلوم ہوتی کہ وڈیرے کی بیٹی نے حویلی کے نوکر کے ساتھ منہ کالا کیا ہے۔ وہ باپ بیٹے یہ بے عزتی برداشت نہ کرتے۔ انہوں نے اپنی عزت رکھنے کے لیے پولیس کو کسی نامعلوم قاتل کے پیچھے لگا دیا ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں دعا مانگتا ہوں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

محبوب علی نے کہا۔ ”یہ تم نے اچھا کیا جو اس شہر میں آگئے۔ تم میرے ہم شکل ہو۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تمہیں بہت اچھا روزگار دوں گا۔“

وہ اپنے ہم شکل کو دیکھ رہا تھا اور بول رہا تھا پھر اس نے چونک کر پوچھا۔ ”وہ سونے کا ہار کہاں ہے؟“

”وہ تو ہمارے گلے میں ہڈی کی طرح اٹکا ہوا ہے۔ ہم اسے اپنی کٹیا میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ ڈر لگتا ہے کسی نے اس ہار کی جھلک بھی دیکھ لی تو وڈیرے تک خبر پہنچ جائے گی۔ یا ہم پر چوری کا الزام آئے گا کہ روکھی سوکھی کھانے والوں کے پاس اتنا قیمتی ہار کہاں سے آیا؟ ہم کیا جواب دیں گے کہ اتنا سونا کہاں سے لائے ہیں؟“

وہ صوفے کے پاس آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”وہ ہار تمہارے گلے کا پھندا بن سکتا ہے۔“

”ابا بھی یہی کہتا ہے۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ آج رات اسے کہیں لے جا کر پھینک دوں گا۔“

”پاگل ہوگئے ہو؟ سونا پھینک دو گے۔ مجھے لا کر دو۔ میں تمہیں اس کی قیمت دوں گا۔“

”میں اس ہار کا ایک پیسا بھی نہیں لوں گا۔ کبھی نہیں لوں گا۔ وہ گناہ کی کمائی ہے۔“

محبوب نے پہلی بار اسے تعریفی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔ ”تم غریب ہو۔ تمہاری بہت سی ضرورتیں پوری نہیں ہوتی ہوں گی۔ وہ ہار تمہاری کوئی ایک ضرورت پوری کرسکتا ہے۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”میری اوقات سے زیادہ مجھے ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔“

محبوب نے حیرانی سے پوچھا۔ ”ایک لاکھ...؟“

”اس کے بغیر میں اپنی ماروی کو حاصل نہیں کرسکوں گا۔ ابا کہتا ہے اس ہار کی صحیح قیمت لگے گی تو پچاس ہزار روپے مل جائیں گے۔ میں ماروی کی آدھی قیمت ادا کرسکوں گا۔“

”میں تمہیں اس ہار کے ایک لاکھ دوں گا۔ تم بڑی آسانی سے اپنی ماروی کو حاصل کرسکو گے۔“

مراد اندر سے تڑپ گیا۔ بیٹھے بیٹھے ماروی مل رہی تھی۔ وہ صوفے پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ محبوب علی اسے ٹٹولتی ہوئی‘ پرکھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ بولا۔ ”میرا ایمان ڈگمگا رہا ہے۔ ایسے ہی وقت انسان کو سنبھلنا چاہیے۔ ماروی میری زندگی ہے۔ میں اسے

حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ لیکن وہ ہار۔۔۔"

وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔ "نہیں۔ وہ گناہ کی کمائی ہے اور میری ماروی بہت پاک ہے۔ ہم بچپن سے ساتھ کھیلتے آئے ہیں۔ جب وہ جوان ہوئی تو اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اب میں کبھی اس کا ہاتھ نہیں پکڑوں گا۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں سائیں! میں آپ سے لاکھ روپے نہیں لوں گا۔ گناہ کے راستے سے ملنے والا ایک پیسا بھی میری ماروی کے لیے حرام ہے۔"

"کیا اس ہار کو گلے کا پھندا بنا کر رکھو گے؟"

"میں ہار لا کر آپ کو دیدوں گا۔ آپ ایسا کریں' اس کی رقم غریبوں اور محتاجوں کو دیدیں۔"

وہ اس کی ایمانداری اور شرافت سے متاثر ہو کر بے اختیار بولا۔ "واہ شاباش۔۔۔! تم بہت ایمانداری سے محبت کررہے ہو۔ ماروی بہت خوش نصیب ہے۔"

"آپ سے ایک التجا ہے۔"

"ہاں بولو۔"

"آپ بڑے آدمی ہیں۔ مجھے دبئی میں کہیں کام پر لگا سکتے ہیں۔ سنا ہے وہاں کام کرنے والوں کو بہت زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ میں دس مہینوں میں لاکھ روپے کما لوں گا۔"

"میں چاہوں تو ابھی ایک لاکھ دے سکتا ہوں لیکن پیار کرنے والوں کو پتھروں کا سینہ چاک کرکے دودھ کی نہر نکالنا چاہیے۔ میں تمہیں یہاں ملازمت دوں گا۔ تم اسلام آباد جاؤ گے وہاں میرے ایک ڈیزائننگ اور اسٹیچنگ سینٹر میں کام کرو گے۔"

"آپ کا کام کیا ہوتا ہے' میں بالکل نہیں جانتا۔"

"میرے آدمی تمہیں ٹریننگ دیں گے۔ تم جلد ہی میرے کاروبار کو سمجھنے لگو گے۔"

"کیا میں دس مہینوں میں ماروی کو اپنے گھر لا سکوں گا۔"

"ضرور لاؤ گے' یہ میرا وعدہ ہے۔ تم وعدہ کرو کہ میرے کاروبار کو اچھی طرح سمجھنے کی کوششیں کرتے رہو گے۔"

"اللہ سائیں نے چاہا تو جو آپ چاہتے ہیں' وہی کروں گا لیکن آپ مجھ پر اتنی مہربانی کیوں کررہے ہیں؟"

"جب دولت ہو تو بڑے بڑے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ میں بھی ایک کھیل کھیلنا چاہتا ہوں۔ تم میرے کاروبار کو اور میری انتظامیہ کو اس حد تک سمجھ لو کہ جب کبھی میں ملک سے باہر جاؤں تو یہاں محبوب علی چانڈیو بن کر رہو۔"

اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "میں۔۔۔؟"

"ہاں تم۔۔۔!"

"میرا باپ بھی آپ کے جیسا کبھی نہیں بن سکے گا۔"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ سال چھ ماہ کی ٹریننگ کے بعد تم حیران ہو کر خود کو میری جگہ دیکھو گے۔ پھر مان لو گے کہ پتھر کو تراش کر ہی تاج محل بنایا جاتا ہے۔

دیکھ لینا' تمہیں بھی بڑا مزہ آئے گا۔ میری غیر موجودگی میں تمہیں یہاں دیکھ کر کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ میں موجود نہیں ہوں۔ سب ہی تمہیں محبوب علی چانڈیو سمجھیں گے۔"

"کیا میں آپ کے جیسا بول سکوں گا؟"

"بالکل میرے لب و لہجے میں بولنا سیکھ لو گے۔ دس جماعتیں پاس ہو۔ ماہرین تمہیں فر فر انگریزی بولنا بھی سکھا دیں گے۔ بس تمہارے اندر لگن ہونی چاہیے۔

جب تک ہر پہلو سے تمہاری ٹریننگ مکمل نہیں ہوگی تم اسلام آباد میں رہو گے۔ اور میرے کسی آدمی کے سامنے نہیں آؤ گے۔ صرف دو چار خاص آدمی تمہیں ٹریننگ دیں گے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "یہ تو کچھ عجیب سی بات ہو گی۔ بلکہ عجیب سا دلچسپ تماشا ہوگا۔ میں سوچتا رہتا ہوں کہ کبھی بہت بڑا آدمی بن جاؤں۔ جب آپ یہاں نہیں رہیں گے تو دو چار دنوں کے لیے ہی سہی' میں بڑا آدمی بن جاؤں گا۔ یا خدا! مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔"

"اگر محنت کرو گے۔ ٹریننگ حاصل کرو گے تو تمہارا خواب کبھی کبھی پورا ہوتا رہے گا۔ میں اپنی دلچسپی کی خاطر لائف انجوائے کرنے کے لیے یہ تماشا کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولا۔ "بڑے لوگ بڑے بڑے تماشے کرتے ہیں۔ آپ تماشا کریں گے میرا بھلا ہوگا۔ اللہ سائیں آپ کا بھلا کرے۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "تم سے مل کر مزہ آگیا۔ چلو میں تمہیں میمن گوٹھ پہنچا دوں۔"

وہ دونوں باہر کار میں آکر بیٹھ گئے۔ محبوب نے اس بار اسے اپنے برابر بٹھایا۔ ڈیش بورڈ میں سے تیس ہزار نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ "یہ ایڈوانس پیمنٹ ہے۔ کل ہی ٹرین سے اسلام آباد جاؤ۔ وہاں میرے آدمی تمہیں ریسیو کریں گے۔"

اس نے ایک کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ "کوئی پرابلم ہو تو اس میں میرا فون نمبر ہے۔"

اس نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی پھر اس سے پوچھا۔ "تمہارے پاس موبائل فون ہے؟"

"نہیں۔ جی چاہتا ہے۔ ایک فون میرے پاس ہو۔"

اور ایک ماروی کے پاس۔ پھر چاچا چاچی کو پتا نہیں چلے گا۔ ہم چھپ کر باتیں کیا کریں گے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اب تمہاری نوکری ایسی ہے کہ تمہیں اپنے پاس فون رکھنا ہوگا۔ ماروی کے پاس ہوگا تو وہ اپنے بزرگوں سے چھپا کر نہیں رکھ سکے گی۔ آج سنڈے ہے۔ کل دکانیں کھلیں گی تو اپنے لیے ایک فون خرید لینا۔"

اس نے میمن گوٹھ پہنچتے ہی کار کے کلرڈ شیشے چڑھا لیے پھر کہا۔ "میں نہیں چاہتا' کوئی ہمیں ایک ساتھ دیکھے اور حیران ہوتا رہے۔ تم بھی کسی سے نہ بولو کہ تمہارا کوئی ہمشکل ہے۔"

پھر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ماروی سے کوئی بات چھپاتے ہو یا نہیں؟ فی الحال اس سے بھی نہیں بولو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ ابھی اس سے بھی بات چھپاؤں گا۔"

ایک جگہ پانی کا بڑا سا ٹینکر کھڑا تھا۔ وہاں پانی بھرنے کے لیے مردوں اور عورتوں کی بھیڑ لگی تھی۔ مراد نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "گاڑی روک دیں۔"

اس نے گاڑی روک کر پوچھا۔ "کیا یہیں تمہارا گھر ہے؟"

"نہیں ذرا آگے ہے۔ یہاں ماروی' چاچا' چاچی اور میرے ابا پانی بھرنے آئے ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ پانی کے بھاری کین اٹھا کر لے جانے ہوں گے۔"

وہ گاڑی سے اتر گیا۔ محبوب نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے لگ کر بولا۔ "آپ نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

محبوب نے کہا۔ "تم نظر آ رہے ہو۔ یہ شیشے ایسے ہیں کہ باہر سے کوئی اندر نہیں دیکھ سکتا۔ آج شام کسی پی سی او سے فون کر کے بتاؤ' کس ٹرین سے جانے والے ہو۔"

"میں دو چار گھنٹے بعد ہی بتاؤں گا۔ پھر فون خریدنے کے بعد برابر باتیں کرتا رہوں گا۔"

وہ محبوب کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس سے بول رہا تھا اور رہ رہ کر اپنی ماروی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اسے سلام کر کے ٹینکر کی طرف جانے لگا۔ جب پانی کی قلت ہوتی تھی تو وہاں کے لوگ آپس میں چندہ کر کے بڑا ٹینکر منگواتے تھے۔ اس وقت پانی بھرنے والوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔

ماروی کی نظریں اسے بڑے پیار سے دیکھ رہی تھیں۔ دوسرے لوگ بھی مراد کو ایک بہت ہی خوبصورت اور مہنگی کار سے اتر کر آتے دیکھ رہے تھے۔ محبوب علی واپسی کے لیے گاڑی کو موڑ رہا تھا۔ پھر ماروی پر نظر پڑی تو رک گیا۔

مراد نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس بھیڑ میں ماروی کون ہے۔ ٹریفک کے ہجوم میں بولنا نہیں پڑتا کہ سرخ سگنل کہاں ہے؟ وہ خود ہی راستہ روک دیتا ہے۔

پتا نہیں اس میں کیا بات تھی؟ وہ اچانک ہی ایسے رک گیا تھا جیسے کار کو خود بخود بریک لگا ہو۔ ایسی ہستیاں کم ہوتی ہیں جو پہلی ہی نظر میں زنجیر ڈال دیتی ہیں۔

اگر اس سے پوچھا جاتا تو وہ ماروی کو دیکھنے اور رک جانے کی وجہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ایک سے بڑھ کر ایک حسینہ کو دیکھ کر بھی کار نہیں روکی تھی۔

حقیقتاً دنیا جہاں کی حسیناؤں میں حسین صرف وہی ہوتی ہے جو کچھ کہے سنے بغیر اچانک ہی نگاہوں میں سما جاتی ہے اور کچھ کہے سنے بغیر دل میں بیٹھ جاتی ہے اور نگاہوں میں سما جانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بزنس مین پہلی نگاہ میں ہی عاشق ہو گیا تھا۔ وہ عشق کو دماغی فتور کہتا تھا اور حسن پرست عیاش بھی نہیں تھا۔

اس بیوپاری کے ذہن میں جو سب سے پہلی بات آئی وہ یہ تھی کہ نئے ڈیزائن کیے ہوئے ملبوسات کے لیے ماروی کا چہرہ اور اس کا سراپا غضب ناک ہے۔

وہ نیا ڈیزائن اس کے بدن پر دھوم مچا دے گا۔ اگرچہ ماروی ماڈل نہیں تھی۔ تاہم وہ ماڈلنگ کے لیے راضی ہو جاتی تو وہ نئے ملبوسات کی پبلسٹی کا بجٹ بڑھا دیتا۔

اس نے فوراً ہی موبائل فون نکال کر کھڑکی کے کلرڈ شیشے کو ذرا نیچے کیا پھر اس کی متحرک تصویریں اتارنے لگا۔ وہ دور تھی پانی سے بھرا ہوا ایک کین اٹھا رہی تھی۔ مراد علی نے اس کین کو اٹھا لیا۔ پھر دوسرے کین کو بھی اٹھا کر اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

ماروی نے اپنی چاچی کے لیے آسانی کی۔ اس نے کین اٹھا کر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ جیسے پنگھٹ پر جواں سال پنہارن نے بل کھا کر شانے پر پیتل کی گاگر رکھی ہو۔

کین اٹھاتے وقت بل کھانے کا کیا انداز تھا۔ کوئی شاعر دیکھتا تو اس کے کلیجے سے ہائے نکل جاتی۔ وہ ان سب کے ساتھ چلتی ہوئی کار کی طرف آنے لگی۔ اس کی چال میں ماڈلنگ نہیں تھی۔ عجب قدرتی چال تھی۔ پانی کا کین اٹھا کر چلتے وقت کمر بہت دھیرے دھیرے ہلکے ہلکے اشارے کی طرح لچک رہی تھی۔

پورا سراپا لہر لہر بہتا ہوا سا لگ رہا تھا۔ فیشن شوز میں ماڈلز کیا کیٹ واک کرتی ہوں گی؟ اس وقت ماروی کی چال دیکھ لیتیں تو اپنی نمائشی چوکڑیاں بھول جاتیں۔

وہ مراد اور چاچا چاچی کے آگے آگے چلتی ہوئی کار کے قریب سے گزر رہی تھی۔ چہرے کے نقوش جو





[بہت] سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا غضب کا ناک [نقشہ] تھا جیسے مصور اعظم نے خاص طور پر نیندیں اڑانے کے [لیے اس] کی تصویر بنائی ہو۔

مراد نے کھڑکی کے پاس آ کر پوچھا۔ "سائیں! کیا [مجھ سے] کچھ کہنے کے لیے رک گئے ہیں؟"

وہ فون کے قریب سے گزرتی ہوئی ماروی کو موبائل [کے کیمرے] میں فریم کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "نہیں۔ میں [ایک ضروری] کال اٹینڈ کر رہا ہوں۔ تم جاؤ۔"

وہ چلا گیا۔ اس کے ساتھ ماروی بھی چلی گئی۔ اس کا [موبائل] کیمرا بھرپور نظاروں سے خالی ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے [سب] کچھ خالی ہو گیا ہو۔ وہ تھوڑی دیر تک اسے دور جاتے [ہوئے] دیکھتا رہا۔ اس کی پشت نظر آ رہی تھی۔

وہ تو بچپن سے اب تک اسی طرح چلتی آ رہی تھی اور [آگے بھی] تو وہ چلتی ہی رہے گی مگر وہ کب تک بیٹھا رہے گا؟ اس [نے] سر کو جھٹک کر فون کو آف کر کے ڈیش بورڈ پر رکھتے [ہوئے] ایک گہری سانس لی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کچھ [ادھورا] ادھورا سا کیوں لگ رہا ہے؟ اس نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے؟

اس نے کار اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھانے سے پہلے ادھر دیکھا' جدھر وہ گئی تھی۔ ادھر صرف خیالی کیٹ [واک] رہ گئی تھی۔ کوئی ایسی سوچ رہ گئی تھی' جو ابھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اس نے کار آگے بڑھا دی۔ مراد علی منگی کے پسماندہ [علا]قے سے نکل کر اپنے ترقی یافتہ علاقے کی طرف جانے لگا۔

مراد علی منگی اور محبوب علی چانڈیو کی... الگ الگ دنیا [تھی]۔ تقدیر انہیں یکجا کر کے سمجھا رہی تھی کہ سب ہی انسان [ایک] جیسے ہوتے ہیں۔ وہی ہاتھ پاؤں' وہی دل اور وہی [دماغ] ہوتے ہیں لیکن تقدیر کسی کو زمین پر بٹھاتی ہے کسی کو [آسم]ان پر چڑھا دیتی ہے۔

آگے نہ جانے ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

وہ گھر آ کر چھٹی کا باقی دن کسی مصروفیت کے بغیر آرام [سے] کھاتے پیتے اور سوتے ہوئے گزارنا چاہتا تھا لیکن بیڈ [روم] میں آ کر لیٹتے ہی وہ نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ اس نے [موبائل میں] تکتے ہوئے اسے دیکھا۔ پتا ہی نہ چلا کہ وہ اندر چھپی [ہوئی] تنہائی ملتے ہی باہر آ جائے گی۔

اس نے سوچا۔ "بزنس میری گھٹی میں پڑا ہے۔ یہ [ماڈ]ل نئے ملبوسات کی مارکیٹنگ کے لیے میرے ذہن میں [اٹریکٹ] کر رہی ہے۔ وہ ہے ہی ایسی' پانی کا کین اٹھائے کیسے انوکھے اور پرکشش انداز میں چل رہی تھی۔"

وہ بے اختیار اسے تصور میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں ابھی گرافک کے ذریعہ اسے ماڈل بنا کر صحیح اندازہ کر سکوں گا۔"

وہ بیڈ سے اتر کر کمپیوٹر کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اسے آپریٹ کرنے لگا۔ موبائل فون کے ذریعہ جو متحرک تصویریں اتاری تھیں۔ انہیں کمپیوٹر میں ٹرانسفر کر کے ٹی وی کے بڑے اسکرین پر دیکھنے لگا۔ وہ اتنی صاف اور واضح دکھائی دے رہی تھی کہ بالکل اپنے قریب لگ رہی تھی۔

پہلی بار اس کے سینے سے ایک گہری سانس نکلی۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ "میں اسے ماڈلنگ کے لیے پرکھ رہا ہوں۔"

بڑی اسکرین میں ماروی کے آس پاس مراد' چاچی اور چاچا تھے۔ وہ ان سب کو ایک ایک کر کے واش آؤٹ کرنے لگا۔ ذرا سی محنت کے بعد وہ سب مٹ گئے۔ ماروی تنہا رہ گئی۔

وہ تھوڑی دیر تک اس کی مست خرامی دیکھتا رہا پھر اس نے تھر کے ایک ریگستانی بیک گراؤنڈ میں اسے ٹرانسفر کر دیا۔ وہاں دور ایک کنویں کے پاس چند عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ موجودہ فریمنگ کے مطابق ماروی بھی وہاں سے پانی بھر کر آنے لگی۔

پھر وہ کین کی جگہ پیتل کی گاگر لے آیا۔ اب وہ تھر کی عورتوں کی طرح پانی کی گاگر اٹھائے خم کھاتی' بل کھاتی ہوئی بدن کے زاویے دکھاتی چلی آ رہی تھی۔

محبوب پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔

وہ کیا تھی اور کیا سے کیا ہو گئی تھی...؟ کسی میک اپ' ہیئر اسٹائل اور مہنگے پہناوے کے بغیر دل میں گھسی جا رہی تھی۔

پھر وہ آپریٹ کرتے ہوئے اس کے چہرے کو بگ کلوز میں لے آیا۔ بڑی اسکرین تھی۔ بالکل قریب آ جانے سے یوں لگا جیسے چہرے کے سامنے چہرہ آ گیا ہو۔ اس نے پھر ایک لمبی گہری سانس لی۔ کیا صورت تھی۔ صورت حال بدل رہی تھی۔

وہ تبدیلی کو اب بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ خود سے کہہ رہا تھا۔ "میرا انتخاب درست ہے۔ آئی ایم سیور۔ یہ ہمارے نئے آئٹم کے لیے بہترین ماڈل ثابت ہوگی۔"

اسے اسکرین پر ماڈل بنانے میں کئی گھنٹے گزر گئے۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اسے رنگ ٹون نے متوجہ کیا۔ اس نے اسکرین پر انجانے نمبر پڑھے پھر بٹن دبا کر اسے

کان سے لگایا۔ ”ہیلو...!“
”سائیں میں مراد بول رہا ہوں۔ آج رات دس بجے کی ٹرین سے جا رہا ہوں۔ کل اسلام آباد پہنچتے ہی آپ کو فون کروں گا۔ آپ کی مہربانیوں سے یہ فون میں نے ابھی خریدا ہے۔ آپ کے پاس میرا نمبر آ گیا ہوگا۔“
”ہاں۔ میں اسے save کرلوں گا۔ وہاں اسٹیشن پر میرے آدمی تمہیں لینے آئیں گے۔ انہیں اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ گے۔ یاد رکھو! وہاں تمہیں بہت محنت کرنی ہے۔ بہت کچھ سیکھنا ہے۔ میری یہ بات یاد رکھو! خواہ مہینے اور سال لگ جائیں۔ واپس آنے کی جلدی مت کرنا...“
اچانک اس کے سامنے پہلے ماروی آئی پھر اندر سے سوال پیدا ہوا کہ وہ مراد کو جلدی واپس آنے سے کیوں منع کر رہا ہے؟
اس نے جھجکتے ہوئے سوچا۔ ”اور کیوں منع کروں گا؟ میں تو اسے آدمی بنا رہا ہوں۔ اس کا معیار زندگی بلند کر رہا ہوں۔“
سامنے اسکرین پر ماروی کا بگ کلوز گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ کیا وہ لاشعوری طور پر گلاب سے کانٹے ہٹا رہا تھا؟
اس نے انکار میں سر ہلا کر سوچا۔ ”نہیں۔ یہ فضول سا خیال کیوں پیدا ہو رہا ہے؟“
اس نے فوراً ہی اسکرین سے چہرے کو بجھا دیا۔ کمپیوٹر کو شٹ ڈاؤن کر دیا۔ مراد سے بھی رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہاں کچھ نہ تھا۔
پھر بھی وہ خاموش اور سادے اسکرین کو تک رہا تھا۔
ایسے تو منتظر آنکھیں دروازے کو تکتی ہیں یا ایسی آنکھیں تو دعا بن کر آسمان کو پکارتی ہیں اور دعا مانگنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ کیا مانگ رہا ہے؟ اور لاشعوری طور پر جو چور دروازہ کھلا رکھا ہے۔
ایک ملازم نے آ کر کہا۔ ”تجلی صاحب آئے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔“
اسے یوں لگا جیسے نامعلوم شکنجے سے نکل کر اپنی دنیا میں واپس آ گیا ہے۔ وہ فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ معروف تجلی نے کہا۔ ”میرا خیال تھا تم سنڈے منانے کے لیے کہیں آؤٹنگ کے لیے گئے ہو گے۔ پھر بھی یہاں آ گیا۔“
وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اچھا ہوا آ گئے۔ میں آپ کو کال کرنے والا تھا۔“

”خیریت؟ سنڈے کے دن مجھے کال کرنے والے تھے؟“
”ہاں۔ وہ میں نے مراد علی منگی کے بارے میں بتایا ہے نا۔ میں اپنے اس ہم شکل سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔“
معروف تجلی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”آپ سے مشورہ چاہتا ہوں۔ اگرچہ میں بچکانہ سی بات کہہ رہا ہوں مگر ابھی جو کہہ رہا ہوں وہ ضرور کروں گا۔
آپ بولیں، اگر مراد علی عارضی طور پر میری جگہ آ جائے اور آپ کی رہنمائی میں میرا کاروبار چلائے تو کیسا رہے گا؟“
معروف تجلی نے حیرانی اور پریشانی سے پوچھا۔ ”تم اپنے حواس میں رہ کر بول رہے ہو؟“
”میں پورے ہوش و حواس میں ہوں۔ آپ سے گزارش ہے، مجھے پاگل نہ سمجھیں۔“
بزرگ مشیر نے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”پاگل اور کیسے ہوتے ہیں؟ اپنے پچیس سو کروڑ کے بزنس کا مالک اپنے ہم شکل کو بناؤ گے۔ جبکہ کوئی اپنا ایک روپیہ خوامخواہ کسی کو نہیں دیتا۔ ایسی بچوں جیسی باتیں تمہارے ذہن میں کیوں آ رہی ہیں؟“
”میں ذرا انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سوچیں کیا لگے گا؟ میں اپنے ہم شکل کو اپنی جگہ پہنچا کر چھپ کر دیکھتا رہوں گا کہ میری غیر موجودگی میں کیا ہو رہا ہے۔ مجھ سے لاکھوں روپے تنخواہ پانے والے اپر گریڈ کے ملازم کیا کرتے ہیں۔ کتنے ایماندار ہیں اور کتنے آستین کے سانپ ہیں؟“
”اس سے پہلے وہ ہم شکل آستین کا سانپ بن کر ڈس لے گا۔ ایسا چکر چلائے گا کہ تمہیں کنگال بنا کر خود مالا مال ہو جائے گا۔“
”مراد علی انتہائی شریف اور نیک انسان ہے۔“
”تم نے ایک دن میں اس کے اندر جھانک کر دیکھ لیا۔ برخوردار...! یاد رکھو، جس میں اچھائی ہوتی ہے اس میں کچھ برائی بھی ہوتی ہے۔ دراصل فرشتوں کی خوبیاں اور شیطان کی خرابیوں کو ملا کر انسان بنایا گیا ہے۔ وہ خیر بھی ہے۔ شر بھی ہے۔ انسان قابل عزت ہے لیکن قابل اعتماد نہیں ہے۔“
”آپ درست فرماتے ہیں۔ مراد کے پاس ایک قیمتی سونے کا ہار ہے۔ میں اس زیور کے ایک لاکھ روپے سے زیادہ دینا چاہتا تھا۔ آپ یقین کریں کہ اس نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ گناہ کی کمائی کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔“





بزرگ نے پوچھا۔ ”گناہ کی کمائی؟“
محبوب نے مراد اور وڈیرے کی بیٹی کا قصہ سنایا پھر کہا۔ ”مراد چاہتا ہے کہ میں وہ زیور لے کر اس کی رقم ضرورت مندوں کو یا کسی فلاحی ادارے کو دے دوں۔“
معروف تجلی نے سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ روپے پیسے کا لالچی نہیں ہے۔“
”اور سنیں۔ اسے ایک لاکھ روپے کی شدید ضرورت ہے۔ اگر اس نے دس ماہ میں ایک لاکھ روپے ادا نہ کیے تو ماروی اس کی دلہن نہیں بن سکے گی۔ پرائی ہو جائے گی۔ جبکہ وہ ماروی کا دیوانہ ہے۔ اس کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتا ہے۔“
ایسا کہتے وقت محبوب کے سامنے ماروی آ گئی۔ اس کے شانے پر گاگر رکھی ہوئی تھی۔ وہ مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔ ”میری گاگر کا پانی نہیں پیئو گے؟“
اس نے سر کو جھٹکا تو وہ غائب ہو گئی۔ معروف تجلی نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“
وہ جلدی سے سنبھل کر بولا۔ ”کچھ نہیں، آپ بتائیں، کیا مراد قابل اعتماد نہیں ہے؟“
”یہ باتیں سن کر تو یہی لگتا ہے کہ وہ پیار کا دیوانہ ہے۔ دولت کا دیوانہ نہیں ہے۔ لیکن...“
”جب قابل اعتماد ہے تو پھر یہ لیکن کیا؟“
”وہ انتہائی نچلے طبقے کا جاہل گنوار ہے۔ تمہاری تعلیم، ذہانت اور شخصیت میں کبھی ڈھل نہیں سکے گا۔“
”اس نے دس جماعتیں پاس کی ہیں۔ وہ انگریزی بول نہیں سکتا لیکن کسی حد تک سمجھ لیتا ہے۔ اسے ٹریننگ دی جائے گی تو وہ چند مہینوں میں میری طرح بولنے لگے گا۔ وہ بہت سمجھدار ہے۔ میرے کاروبار کو بھی کسی حد تک سمجھنے لگے گا۔ باقی آپ اس کے ساتھ رہ کر سمجھاتے رہیں گے۔“
معروف تجلی گہری سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ محبوب نے کہا۔ ”یہ بچگانا حرکتیں ہوں گی لیکن میں نے کہا نا... اپنی جگہ ہم شکل کو لا کر دور سے تماشے دیکھ کر تفریح کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس پر اعتماد ہے۔ وہ مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ ہمیشہ میرا احسان مند رہے گا۔ آپ بھی اس کے قریب رہیں گے تو اس پر اعتماد کرنے لگیں گے۔“
”برخوردار! تمہاری زندگی میں ایک شریک حیات آ جائے گی تو ایسی کسی تفریح کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“
”شریک حیات بھی آ جائے گی۔ میں آپ کے مشوروں کے مطابق سمیرا کو اچھی طرح پرکھنے اور سمجھنے والا ہوں۔ تب تک ایک ہم شکل سے فائدہ اٹھا کر فرمانبردار کہلانے والے اہم ملازموں کے اصلی چہرے دیکھ لوں تو یہ دانائی ہوگی اور تفریح بھی۔“
معروف نے سر ہلا کر کہا۔ ”چلو اس طرح بھی تفریح ہوتی ہے تو کرو۔ یہ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے؟“
”آپ کسی بھی پہلی فلائٹ سے اسلام آباد جائیں مراد کل شام تک وہاں پہنچے گا۔ آپ اسے مرگلہ والے بنگلے میں لے جائیں۔ دن رات اس کے ساتھ رہیں گے اور اسے گائیڈ کرتے رہیں گے تو وہ جلد ہی میرے پلان کے مطابق مطلوبہ تعلیم و تربیت اور کاروباری سوجھ بوجھ حاصل کر سکے گا۔“
”تم سیٹ بک کراؤ میں چلا جاؤں گا۔“
محبوب خوش ہو گیا۔ وہ فون اٹھا کر اپنے ٹریولنگ ایجنٹ سے رابطہ کرنے لگا۔

☆☆☆

وہ دوسرے دن معمول کے مطابق آفس میں بیٹھا کاروباری معاملات سے نمٹتا رہا۔ اس نے کئی بار محسوس کیا کہ ذہن کچھ بوجھل سا ہے۔ پچھلی رات تو پتا ہی نہ چلا کہ وہ سوتا رہا تھا یا سوچتا رہا تھا۔
وہ عجیب نہ معلوم سے خیالات میں جکڑا رہا تھا۔ آفس میں بھی یہی ہو رہا تھا۔ وہ اہم کاروباری معاملات میں پوری طرح دماغی طور پر حاضر نہیں تھا۔ زندگی میں پہلی بار اپنے اندر کی بے چینی کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔
اس کا اپنا خیال تھا کہ وہ کمپیوٹر کو شٹ ڈاؤن کرنے کے بعد ماروی کی موی فلم کو بھلا چکا ہے۔ اس کے باوجود وہ یو ایس بی ساتھ لایا تھا۔ اس نے ایڈورٹائز کے شعبہ کے اہم افراد کو کمپیوٹر کی اسکرین پر اسے دکھایا تھا اور خود بڑی لگن سے دیکھتا رہا تھا۔ اور ان سے کہا تھا کہ نئے ملبوسات کو ڈسپلے کرنے کے سلسلے میں ماروی کے مطابق جلد سے جلد متفقہ رائے پیش کریں۔
وہ کاروبار کے حوالے سے اس کے ذہن میں تھی۔ اسے معروف تجلی کا مشورہ یاد آیا۔ اس نے اس کی بہتری کے لیے کہا تھا۔ ”تم شادی کی عمر سے آگے نکل گئے ہو۔ سمیرا کے لیے سوچو۔ وہ ایک بہترین لائف پارٹنر ثابت ہوگی۔“
اس نے ریسیور اٹھا کر ذرا سوچا کہ اس سے کیا کہنا چاہیے پھر اس نے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر اس کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو۔ یہ آپ کے آفس کا نمبر ہے۔ آپ ہی ہیں نا؟“
”ہاں۔ میں بول رہا ہوں۔ کیا اپنا نام بتاؤں؟“

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ”آپ کا نام محبوب علی چانڈیو ہے۔“

اس نے کہا۔ ”لنچ کا وقت ہو چکا ہے۔ کیا میرا ساتھ دوگی؟“

”میں ابھی لنچ کرنے کچن میں جا رہی تھی۔ کیا آپ یہاں آنا پسند کریں گے؟“

”گھر میں نہیں۔ کسی ریسٹورنٹ میں۔ یہاں آفس کے قریب ایک معیاری ریسٹورنٹ ہے وہاں انتظار کروں گا۔ کب تک آسکوگی؟“

”سادگی سے تیار ہونے میں اور وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹا لگے گا۔“

”نو پرابلم۔ میں منتظر رہوں گا۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ بے چینی کچھ کم ہو رہی ہے۔ ذہن بوجھل نہیں ہے۔ یہ اچھا ہوا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر سمیرا کی طرف ٹرانسفر ہوگیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ اس کے ساتھ ریسٹورنٹ کے ایک کیبن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سادگی سے تیار ہو کر آئی تھی۔ پھر بھی دیکھنے والوں کی نگاہوں کو پکار رہی تھی۔

دیکھنے والوں میں محبوب سب سے قریب تھا لیکن حسن پرست اور رومانٹک نہیں تھا۔ سمیرا کی قربت سے فی الحال یہ فائدہ ہو رہا تھا کہ ذہن سے انجانا بوجھ کم ہوگیا تھا۔

سمیرا خوش تھی۔ وہ میز کے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟“

اس نے پوچھا۔ ”کس بات کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہو؟“

”کل آپ نے نظر انداز کیا تھا۔ آج لنچ پہ بلایا ہے۔“

”یہ بات ذہن سے نکال دو کہ تم نے ہمارے ملبوسات کی ماڈلنگ کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس لیے میں نے تمہیں سمجھانے منانے کے لیے بلایا ہے۔“

اس کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ یہی سوچ کر آئی تھی۔ محبوب نے کہا۔ ”میں کسی کی دھمکیوں میں نہیں آتا۔ ماڈلنگ کرنا یا نہ کرنا، تمہارا ذاتی مسئلہ ہے۔“

اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ”اس کا مطلب ہے، نئے ملبوسات کی ماڈلنگ کے لیے کسی دوسری کا انتخاب ہو چکا ہے؟“

”ہو جائے گا۔ ماڈلز کی کمی نہیں ہے۔“

”یعنی میری ضرورت نہیں رہی۔“

”تم انکار نہیں کروگی تو پھر ہمارے لیے ضروری ہو۔“

وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ”میں ماڈلنگ نہیں کروں گی۔“

”کوئی بات نہیں۔“

”پھر مجھے کیوں بلایا ہے؟“

”میں دوسری آفر دے رہا ہوں۔“

سمیرا نے پھر نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ بولا۔ ”میں نے سنا ہے کہ تم نے بی کام کیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”مجھے ایک آئٹم کی ماڈلنگ کے تیس لاکھ سے پچاس لاکھ تک ملتے ہیں۔ کہیں ملازمت کرتی تو ماہانہ تنخواہ پچیس ہزار سے زیادہ نہ ملتی۔ کہاں پچیس ہزار اور کہاں تیس لاکھ۔“

”جب ماڈل بننا ہی تھا تو اتنی زیادہ تعلیم کیوں حاصل کی؟“

”مجھے میتھ اور اکاؤنٹنگ سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔ تعلیم کے دوران کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ماڈل گرلز کو لاکھوں روپے ملتے ہیں۔ جب معلوم ہوا تو میں نے آج تک حاصل کیے ہوئے تمام تعلیمی سرٹیفکیٹس لاک اپ میں رکھ دیے۔“

”علم کو تالے چابی میں نہیں رہنا چاہیے۔ انہیں باہر نکالو اور میرے پورے اکاؤنٹ سیکشن کی ذمے داریاں سنبھالو۔“

وہ کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ”تمہاری ماہانہ تنخواہ دو لاکھ سے شروع ہوگی۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیا...؟ مجھے سن کر بھی یقین نہیں ہو رہا ہے۔ ایک بی کام پاس کرنے والی کو دو لاکھ روپے...“

”تم میری پرسنل اسسٹنٹ بھی رہوگی اور [illegible] صاحب کی گائیڈنس میں میرے پورے کاروبار کی نگرانی کروگی۔“

”آپ مجھے بہت بڑی ذمے داریاں دے رہے ہیں۔ مجھے بہت بڑے چیلنج سے دوچار کر رہے ہیں۔ میں آپ کی توقعات پر پوری اترنے کی کوشش کروں گی۔“

”میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم ایک بہت ہی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔“

”میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ نے میری تعلیم، میرے گھرانے کے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل کی ہیں۔“

”جو بھی معلومات حاصل کی ہیں۔ کیا غلط ہیں؟“

”نہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ آپ میری ذات میں دلچسپی لے رہے ہیں اور میرے متعلق معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ انڈر مائی پلیزر۔ میں...“

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ پھر اس سے آنکھیں چرا



کرتے ہوئے بولی۔ ”میں لاکھوں روپے کی ماڈلنگ کو ٹھکراتی جا رہی تھی۔ یہ پیشہ مجھے بوجھ لگتا تھا۔ کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟ آپ کی آفر نے بہت بڑا سہارا دیا ہے۔“

”ماڈلنگ میں اپنے حسن کی، اپنی ذات کی نمائش کا بھرپور موقع ملتا ہے اور نمائش عورت کی کمزوری ہے۔ اس پیشے کو ٹھکرانے کا فیصلہ جذباتی نہ ہو۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔“

”سوچ لیا ہے۔ ایک ماڈل کا حسن اور اس کی کشش دو برس یا زیادہ سے زیادہ چار برس رہتی ہے۔ پھر اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ لاکھوں کی آمدنی خاک ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کی ملازمت میں میری کارکردگی اچھی رہے گی تو ماہانہ لاکھوں روپے بڑھاپے تک ملتے رہیں گے۔“

”جہاں تک کارکردگی کا تعلق ہے، تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم محض میرے ایک ہی شعبے کو نہیں بلکہ پورے کاروبار کو بھی سنبھال سکتی ہو۔“

”خدا مجھے توفیق دے۔ میں اپنی بھرپور تعلیمی صلاحیتوں سے اور ذہانت سے کام کروں گی۔ میرے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔“

اس نے چور نظروں سے محبوب کو دیکھا پھر کہا۔ ”آپ مجھے ماڈلنگ سے ہٹا کر صحیح راستے پر لا رہے ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ مجھ سے زیادہ کوئی اور خوش نصیب ہوگی۔“

محبوب کو ایکدم سے یوں لگا جیسے ماروی سامنے بیٹھی ہو۔ وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی طرف میز پر جھک کر پوچھ رہی تھی۔ ”کہیں یہ پیار کی ابتدا تو نہیں ہے؟“

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ ”آں؟ یہ؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

سمیرا نے حیرانی سے کہا۔ ”میں نے تو کچھ نہیں کہا ہے؟“

اے دل... وہ نہیں تھی۔

وہ سنبھل کر بولا۔ ”آ... اچھا۔ تم نے کچھ نہیں کہا... وہ مجھے یوں لگا جیسے تم نے کچھ کہا ہو۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”کان بج رہے ہیں۔ بھوک زیادہ لگے تو ایسا ہی ہوتا ہے اور ہم نے اب تک کھانے کا آرڈر نہیں دیا ہے۔“

محبوب نے ویٹر کو بلا کر سمیرا کی پسند کے مطابق کھانے کا آرڈر دیا۔ وہ حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ سمیرا نے پوچھا۔ ”آپ کو شاعری سے دلچسپی ہے؟“

”کالج لائف میں شاعروں کو خوب پڑھا ہے اور شاعری بھی کی ہے۔ ڈیڈی مرحوم نے کاروبار میں الجھایا تو شاعری بھول گیا۔ وہ کہا کرتے شعروشاعری، عشق ومحبت غریبوں کا اور بیروزگار لوگوں کا مشغلہ ہے۔“

”ڈیڈی کہا کرتے تھے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟“

”اب تو میں بھی یہی کہتا ہوں۔ شاعری خیالوں کی رنگین دنیا میں لے جاتی ہے۔ جبکہ بزنس سنگین معاملات میں الجھا دیتا ہے۔ مجھے تو اب کوئی فلمی گانا سننے کی بھی فرصت نہیں ملتی ہے۔ نہ دل ادھر مائل ہوتا ہے۔“

”انسان کو بالکل ہی پتھر نہیں ہو جانا چاہیے۔ دل میں نرم گوشہ بھی رکھنا چاہیے۔“

”میں نے تم سے کہا ہے کہ آگے چل کر میری معاون کی حیثیت سے کاروبار سنبھالوگی۔ لہٰذا مجھ سے عشق ومحبت اور شعروشاعری کی نہیں، صرف بزنس کی باتیں کیا کرو۔“

وہ ذرا بجھ سی گئی۔ پھر یہ سوچ کر مسکرانے لگی کہ ابھی ابتدا ہے۔ یہ ابھی میری ذات میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ آگے چل کر کوئی شعر کہیں گے پھر جان غزل بھی کہیں گے۔

وہ سوچ رہا تھا۔ ”ابھی مجھے کیا ہوگیا تھا۔ میں نے صاف طور سے ماروی کی جھلک دیکھی تھی اس نے کچھ پوچھا تھا۔ میرے اندر ایک چٹکی لی تھی... نہیں، ایسا کچھ نہیں تھا۔ فریب نظر تھا۔ فریب سماعت تھا۔

وہ تھی۔ مگر نہیں تھی۔

”یہ کیا ہوگیا تھا؟“

دو ویٹر وہاں آ کر میز پر ڈشیں رکھ کر چلے گئے۔ سمیرا نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”بے شک ہمیں صرف بزنس کی باتیں کرنی چاہیے۔ آپ کے کاریگروں نے نئے ملبوسات کی بہت ہی خوبصورت اور دیدہ زیب ڈیزائننگ کی ہے۔ اپر کلاس کی خواتین انہیں منہ مانگی قیمت پر پہننے کے لیے مچل جائیں گی۔“

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ”میں یہی چاہتا ہوں۔ اور ہوتا یہی ہے۔ اپر کلاس کی خواتین پاگل ہوتی ہیں تو ہمارے منافع کا گراف اوپر اور اوپر جاتا ہے۔“

”اب آپ کو جلد سے جلد نئے آئٹم کی پبلسٹی کے لیے کسی نئی ماڈل کے متعلق سوچنا ہے۔“

”نئی ماڈل...؟“

بزنس کی باتیں ہو رہی تھیں اور ماروی چھم سے سامنے آگئی۔ وہ نیا لباس پہن کر پائل چھنکاتی عجیب سے دیہاتی انداز میں جادو جگاتی چل رہی تھی۔ کیا مشکل ہے، ابھی اس نے کہا تھا کہ ان کے درمیان صرف بزنس کی باتیں ہونی چاہئیں۔

وہ بے اختیار بولا۔ ”اسے دیکھ کر تو لوگ کیٹ واک

کی جادوگری بھول جائیں گے۔"

سمیرا نے حیرانی سے پوچھا۔"کسے دیکھ کر...؟"

وہ خیالات سے چونک گیا۔ پھر بولا۔"وہ ایک گوٹھ میں رہنے والی لڑکی ہے۔ کیا بتاؤں وہ جتنی حسین اور پرکشش ہے۔ اتنی ہی اس کی مست خرامی لوٹ لیتی ہے۔ ہوش اڑا دیتی ہے۔ پر کاٹ دیتی ہے پھر اڑنے نہیں دیتی۔"

سمیرا نے حیرانی سے کہا۔"او گاڈ...! آپ شاعرانہ انداز میں بول رہے ہیں۔"

وہ پھر چونک گیا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا' کالج لائف کا شاعر بول پڑا تھا۔ وہ بولا۔"کھانے کے بعد آفس چلو۔ تمہیں کمپیوٹر میں اس کی شارٹ موومنٹس دکھاؤں گا۔"

وہ کھانے کے بعد آفس میں آ گئے۔ محبوب نے مختلف شعبوں کے اہم عہدیداروں کو بلا کر کہا۔"آپ حضرات سمیرا کو ایک ماڈل کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ یہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔"

پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے عہدیدار نے کہا۔"ابھی ہم سمیرا کی ہی باتیں کر رہے تھے۔ ہم سب کی متفقہ رائے ہے کہ نئے آئٹم کی پبلسٹی کے لیے ان کا ہی انتخاب کیا جائے۔"

محبوب نے کہا۔"یہ ماڈلنگ چھوڑ چکی ہیں۔"

"کیا...؟" سب نے حیرانی سے سمیرا کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ محبوب نے کہا۔"آج سے یہ میری بزنس اسسٹنٹ ہیں۔ میرے تمام بزنس سیٹ اپ کی نگرانی کریں گی۔"

وہ سب خاموش رہے۔ اپنے آقا اپنے بگ باس کے منہ پر یہ بولنے کی جرأت نہیں تھی کہ وہ سمیرا کا دیوانہ ہو گیا ہے۔ ایک ماڈل گرل کو بزنس کے سنگین معاملات میں مداخلت کرنے کے لیے ان کے سروں پر اسے مسلط کر رہا ہے۔

محبوب نے جنرل منیجر سے کہا۔"آپ سمیرا کا اپائنٹمنٹ لیٹر تیار کریں۔ ان کی اسٹارٹنگ تنخواہ پے آپ مجھ سے پوچھ کر لکھیے گا۔"

سب ہی کے ذہنوں کو دوسرا جھٹکا لگا۔ وہ بولا۔"سمیرا نے بی کام کیا ہے۔ یہ یہاں اپنی تعلیمی صلاحیتوں کا عملی مظاہرہ کریں گی۔ چونکہ نئی ہیں اس لیے آپ حضرات انہیں گائیڈ کرتے رہیں گے۔ یہ جلد ہی یہاں کے معاملات کو سمجھ لیں گی۔"

جنرل منیجر نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے سمیرا کو باس کی بزنس اسسٹنٹ بننے کی مبارکباد دی۔ پھر سب ہی باری باری اسے وش کرنے لگے۔ محبوب نے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر سے کہا۔"آپ سمیرا کو میری لائی ہوئی ماڈل دکھائیں۔"

حکم کی تعمیل کی گئی۔ بڑے سے ٹی وی اسکرین پر ماروی کو پیش کیا گیا۔ وہ نظر آئی تو محبوب کے دماغ پر دھندی چھانے لگی۔ یکلخت آس پاس کی دنیا گم ہو گئی۔ اس دھند میں صرف وہی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے ذہن کو جھٹک کر سوچا۔"یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ وہ دکھائی دیتی ہے تو اس کے آگے ساری دنیا کیوں مٹ جاتی ہے؟ میرے ذہن پر دھندی کیوں چھا جاتی ہے؟ میں یقین سے کہتا ہوں کہ نہ میں نے کبھی عشق کیا ہے اور نہ ماروی سے ایسا کوئی لگاؤ ہے۔ وہ مراد علی کی محبت ہے۔ وہ یہاں نہیں ہے اسلام آباد میں ہے۔ ماروی اس کی امانت ہے اور خدا مجھے امانت میں خیانت کرنے والی نیت سے بچائے..."

سمیرا نے کہا۔"مارویلس... اس لڑکی میں ایک عجیب سی دلکشی ہے۔ اس نے معمولی سا سوتی لباس پہنا ہے لیکن اس کی باڈی لینگویج نے معمولی لباس کو بھی اہم بنا دیا ہے۔"

پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر نے کہا۔"نو ڈاؤٹ یہ حسین بھی ہے اور پرکشش بھی لیکن تربیت یافتہ ماڈل نہیں ہے۔"

دوسرے عہدیدار نے کہا۔"یہ ایک لوئر کلاس کی لڑکی ہے Untalented and Untame able ہے۔ اسے سکھانے پڑھانے اور سمجھانے میں برسوں لگ جائیں گے۔"

تیسرے عہدیدار نے کہا۔"اور ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اگلے ماہ کی دس تاریخ سے چھ ٹی وی چینلز میں اشتہارات کی بکنگ ہو چکی ہے۔ دو دنوں کے بعد فیشن شو کی شوٹنگ ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔ اتنے کم عرصہ میں کوئی تربیت یافتہ ماڈل ہی ہمارے نئے ملبوسات کو ڈسپلے کر سکے گی۔"

محبوب نے کہا۔"بے شک یہ نہیں جانتی کہ ماڈلنگ کیا ہوتی ہے اور نہ ہی میں نے ماڈلنگ کے سلسلے میں اس کے بزرگوں سے بات کی ہے اور نہ ہی ہمارے پاس وقت ہے۔ پھر بھی اس سلسلے میں میری پلاننگ کچھ اور ہے۔"

وہ ریوالونگ چیئر پر ادھر سے ادھر گھوم کر بولا۔"اس لڑکی کو کسی طرح کی ٹریننگ نہیں دی جائے گی۔ یہ جیسی دکھائی دیتی ہے ویسی ہی میک اپ اور ہیئر اسٹائل کے بغیر اسے شوٹ کیا جائے گا۔"

سب نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں





کہا۔"ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اور نہ ہو سکتا ہے۔"

محبوب اسکرین پر ماروی کو دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔"اور یہ دستور کے مطابق کیٹ واک نہیں کرے گی۔ اپنی ہی چال چلے گی اور فتنے جگائے گی۔"

ایک نے حیرانی سے پوچھا۔"یہ میک اپ اور ہیئر اسٹائل کے بغیر کیسی عجیب سی مضحکہ خیز لگے گی۔"

سمیرا نے کہا۔"ابھی ہم سب اسے اسکرین پر دیکھ رہے ہیں۔ آپ اسے پھر دیکھیں' کیا یہ مضحکہ خیز لگ رہی ہے؟"

محبوب نے کہا۔"آپ سب ہی اس کے حسن کی اور دلکشی کی تعریف کر رہے ہیں۔ جبکہ اس نے میک اپ نہیں کیا ہے۔"

ایک عہدیدار نے بے یقینی سے پوچھا۔"کیا واقعی اس نے میک اپ نہیں کیا ہے؟"

دوسرے نے کہا۔"اس کے ہونٹ گلابی ہیں۔ آنکھیں کاجل جیسی کالی اور پلکیں گھنی ہیں اور رخساروں پر ہلکی سی لالی ہے۔"

محبوب نے کہا۔"اس نے مصنوعی پلکیں نہیں لگائی ہیں۔ آنکھیں کاجل بنا کالی ہیں۔ اس کے لبوں پر قدرتی گلاب کھلتے ہیں اور رخساروں پر حیا کی لالی ہے۔"

جنرل منیجر نے کہا۔"ہم تو سمجھ رہے تھے' آپ نے کسی پارلر سے لائٹ میک اپ کرایا ہے۔"

"یہ تو مجھے جانتی بھی نہیں ہے۔ کبھی ایک دوسرے سے ہمارا سامنا نہیں ہوا ہے۔"

یہ یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔ محبوب نے کہا۔"میں نے چھپ کر اس کی متحرک تصویریں اتاری ہیں۔ آئندہ بھی میری یہی پلاننگ ہے۔ ایک نئے انداز سے ماروی کو شوٹ کیا جائے گا۔ اسے معلوم نہیں ہوگا اور ہم چھپ کر اسے شوٹ کرتے رہیں گے۔"

ڈائریکٹر نے کہا۔"یہ ممکن نہیں ہے۔ ہم اسے جتنے اینگلز سے شوٹ کر کے اسکرین پر لانا چاہتے ہیں۔ وہ تمام کیمرا اینگلز اسے سمجھانے ہوں گے۔"

"نہیں۔ ہمارے کیمرے اور کیمرا مین اسے نظر نہیں آئیں گے۔ وہ آپ ہی چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے جن زاویوں سے نظر آتی رہے گی' انہی زاویوں سے اسے شوٹ کیا جائے گا۔ اسے معلوم نہیں ہوگا کہ اس کی متحرک تصویریں اتاری جا رہی ہیں۔"

ایک نے شدید حیرانی سے کہا۔"یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اس کی ویڈیو فلمیں بنائیں اور اسے خبر نہ ہو؟"

سمیرا نے کہا۔"یہ کام ذرا مشکل ہے۔ ناممکن نہیں ہے۔ ہمارے کئی کیمرا مین وہاں مختلف مقامات میں چھپے رہیں گے۔ جہاں ماروی اٹھتی بیٹھتی اور چلتی پھرتی وقت گزار رہی ہوگی۔"

"کیا ہمیں پہلے سے معلوم ہوگا کہ وہ کب اور کہاں وقت گزارنے جا رہی ہے؟"

محبوب نے کہا۔"آپ کیمرا یونٹ کے ساتھ تیار رہیں۔ کل صبح سے یہ انفارمیشن ملتی رہے گی کہ وہ آئندہ کہاں کہاں وقت گزارتی ہے۔ وہ جہاں جائے گی اس سے دو چار گھنٹے پہلے آپ اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ وہاں پہنچ کر خفیہ طور پر اسے پکچرائز کرنے کے انتظامات کریں گے۔"

سمیرا نے پوچھا۔"پہلی بار ایسا ہو رہا ہے۔ کیا مجھے اس کیمرا یونٹ کے ساتھ رہنا چاہیے؟"

وہ بولا۔"میں چاہتا ہوں' تم آخری بار ہمارے اس نئے آئٹم کے لیے ماڈلنگ کرو۔ ہم نہیں جانتے ماروی کے سلسلے میں کامیابی ہوگی یا ناکامی...؟ دونوں صورتوں میں تمہارے ذریعہ بھی نئے ملبوسات کو ڈسپلے کیا جائے گا۔"

"میں خوشی سے آخری بار یہ کام کروں گی۔"

محبوب نے کہا۔"آپ حضرات جائیں اور شوٹنگ کی تیاری کریں۔ ایسے لینس ضرور رکھیں جو سو دو سو فٹ کی دوری سے چہرے کا کلوز اپ لیتے ہیں اور یہ کہ سمیرا کی شوٹنگ کے لیے ایک علیحدہ یونٹ کام کرے گا۔"

وہ سب احکامات سن کر چلے گئے۔ اس نے سمیرا سے کہا۔"چلو۔ میں تمہیں گھر چھوڑ کر دوسرے کام سے جاؤں گا۔"

وہ دونوں آفس سے باہر آ کر کار میں بیٹھ گئے۔ سمیرا نے گھر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔"کیا آپ نے محسوس کیا ہے کہ ماروی میں ایک عجیب طرح کی کشش ہے؟"

وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسٹیئرنگ بہکتے بہکتے رہ گیا لیکن وہ بہک گیا۔ بقول سمیرا عجیب سی کشش نے کھینچ لیا۔ وہ کیا بولتا کہ نامعلوم کشش نے اسے کہیں کا نہیں رکھا ہے۔ نہ جانے اسے بے اختیار کہاں لے جا رہی ہے؟

وہ ونڈ اسکرین کے پار اسے دیکھتے ہوئے بولا۔"ہاں۔ اسے اور کچھ نہیں' قدرتی کشش ہی کہا جا سکتا ہے۔"

"یقیناً آپ نے بھی یہ کشش محسوس کی ہوگی؟"

اس سوال نے اسے الجھا دیا۔ وہ اقرار نہیں کر سکتا تھا اور انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دل کی واردات پہلی بار ہوئی تھی۔ نہ وہ ادھر کا رہا تھا نہ ادھر کا رہا تھا۔

سمیرا نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ ''میں نے نئے ملبوسات کی پبلسٹی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اندازہ کیا ہے کہ اس کی قدرتی کشش ہمارے کام آئے گی۔''

وہ گاڑی کو ایک راستے سے دوسرے راستے پر موڑتے ہوئے بولا۔ ''ماروی کو چھوڑو۔ اپنی ڈیوٹی پر دھیان دو۔ ڈیوٹی کے علاوہ تمہیں کل ہی سے اپنی ماڈلنگ اور شوٹنگ کے لیے ایسے انتظامات کرنے ہیں کہ مقررہ وقت سے پہلے ہی ہماری اشتہاری فلمیں تمام ٹی وی چینلز میں پہنچ جائیں۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی پرسنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے تمام شوٹنگ کے انتظامات کی نگرانی کروں گی۔''

اس نے سمیرا کا دھیان ماروی کی طرف سے ہٹا دیا۔ دوسرے الفاظ میں اپنا دھیان بٹا دیا۔ اسے گھر پہنچا کر اپنی کوٹھی کی طرف جانے لگا۔

کوئی سیلاب محبت کو کہاں تک روکے
دل میں جو بات ہو آنکھوں سے عیاں ہوتی ہے

سمیرا دیکھتی رہی تھی۔ اسے کچھ اندازہ ہو رہا تھا لیکن وہ اپنے باس کے ذاتی معاملے میں ابھی کچھ بول نہیں سکتی تھی۔

وہ ڈرائیو کرتا ہوا سوچ رہا تھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں اچھی طرح جانتا ہوں' چھپ چھپ کر اس کی چلتی پھرتی تصویریں اتاری جائیں گی۔ تب بھی اشتہاری فلم کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ میں اسے کسی ٹی وی چینل کے ذریعے پیش نہیں کر سکوں گا پھر بھی لاکھوں روپے کے بجٹ سے اس کی فلم تیار کروں گا... کیوں کروں گا؟ یہ تو سراسر نادانی ہے۔''

اس نے مسکراتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ ''نادانی نہیں' تفریح ہے۔ لاکھوں روپے کیا ہوتے ہیں...؟ کچھ نہیں... وہ جب تک شوٹنگ ہوتی رہے گی۔ میں اسے کبھی قریب سے کبھی دور سے دیکھتا رہوں گا۔ پھر اس فلم کو اپنے بیڈ روم میں رکھوں گا۔ دولت ہو تو مہنگی تفریح ہوتی ہے۔ جب دل چاہے گا' اسے ٹی وی اسکرین پر دیکھتا رہوں گا۔''

وہ اپنی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ کوٹھی کو اندر سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ''میرے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں دنیا جہان کا آرائشی سامان ہے۔ دل بہلانے کے لیے انڈور گیمز' ٹی وی اور کمپیوٹر ہیں۔ اسی طرح اس کی تصویروں سے بھری ہوئی فلم بھی میرے پاس رہا کرے گی۔ وہ تصور میں آتی ہے تو بیڈ روم کے ٹی وی پر بھی آتی رہے گی۔ یہ انسانی فطرت ہے' وہ دیکھنے کی چیز کو دیکھتا ہی رہتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم اپنے اندر چھپ کر بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔''

اس نے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھ کر سب سے پہلے مراد علی منگی کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ سلام کرتے ہوئے بولا۔ ''سائیں! آپ نے تو مجھے بادشاہوں والی نوکری دی ہے۔ یہاں آپ کے ایک بزرگ معروف تجلی صاحب میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ایک انگریزی کا بچہ ہے' وہ مجھ کو آپ کی طرح انگریزی بولنا سکھا رہا ہے۔''

محبوب نے کہا۔ ''تم دل لگا کر سیکھتے رہو۔''

''دن رات سیکھتا رہوں گا۔ تجلی صاحب اور ایک صاحب آ کر مجھ کو کاروباری باتیں سمجھاتے رہیں گے۔ ایک درزی میرا ناپ لے کر گیا ہے۔ یہاں مجھ کو آپ کے جیسے کپڑے پہنائے جائیں گے۔''

محبوب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اچھا اب چپ ہو جاؤ۔ مجھے بھی بولنے دو۔ وہاں تمہارے ساتھ جو ہو رہا ہے' مجھے سب معلوم ہے۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''حکم کریں سائیں!''

''کل جہاں پانی کا ٹینکر آیا تھا' وہاں میں نے تمہاری ماروی کو دیکھا تھا۔ تم بہت خوش نصیب ہو۔ میں چاہتا ہوں تمہاری ماروی ہمارے نئے ملبوسات پہن کر تصویریں اتارے' ماڈلنگ کرے' ان ملبوسات کی پبلسٹی کرے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''وہ جاہل گوار کیا پبلسٹی کرے گی؟ وہ تو کیمرے کے سامنے کچھ بول نہیں سکے گی۔ بہت شرمیلی ہے۔ سب کے سامنے شرمائے گی۔''

''میں جانتا ہوں' وہ نہ بول سکے گی نہ ایکٹنگ کر سکے گی لیکن ہم اس طرح چھپ چھپ کر اس کی تصویریں اتاریں گے کہ اسے خبر نہیں ہوگی۔ ہم جہاں کہیں گے' تم وہاں اس کے ساتھ گھومتے پھرتے رہو گے تو صرف دو چار دنوں میں ہمارا کام ہو جائے گا۔ ہم اتنے سے کام کے لیے ماروی کو پانچ لاکھ روپے دیں گے۔ اسے بعد میں بتائیں گے کہ ہم نے اس سے کیا کام لیا ہے۔''

مراد علی پانچ لاکھ روپے کی آفر سن کر حیران رہ گیا۔ چند لمحوں تک بول نہ سکا۔ وہ اسے حاصل کرنے اس سے شادی کرنے کے لیے ایک لاکھ روپے حاصل نہیں کر سکا تھا۔ کجا یہ کہ ایک مشت پانچ لاکھ مل رہے تھے۔ نگاہوں کے سامنے دلہن سولہ سنگار کر رہی تھی اور دولہا کے کانوں میں شہنائیاں بج رہی تھیں۔





محبوب نے پوچھا۔ ''چپ کیوں ہو؟ کیا اس کام کے لیے کسی طرح ماروی کے بزرگوں کو راضی کر سکو گے؟ میرا خیال ہے' لاکھوں روپے کے سامنے وہ انکار نہیں کریں گے۔''

''آپ کا خیال درست ہے۔ میں چاچا چاچی کو راضی کروں گا لیکن مجھے ماروی کے ساتھ رہنا ہوگا۔''

''ہاں تمہاری موجودگی لازمی ہے۔ تم آج ہی رات کی فلائٹ سے یہاں آؤ گے۔ کیا وہاں تجلی صاحب موجود ہیں؟''

''جی ہاں۔ میرے ساتھ چائے پی رہے ہیں۔''

''انہیں اپنا فون دو۔''

تھوڑی دیر بعد معروف تجلی کی آواز سنائی دی۔ ''تفریح کرنے والے برخوردار بولو۔ اور کوئی نئی بات ہے؟''

وہ بولا۔ ''ہاں۔ آپ کو یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں آنے کی زحمت دے رہا ہوں۔''

''تمہید نہ باندھو۔ اصل بات بولو؟''

''آپ کو پھر یہاں آنا ہوگا۔ میں ابھی ٹریول ایجنٹ سے کہتا ہوں۔ وہ آج رات یا کل صبح کی کسی فلائٹ میں دو سیٹیں او کے کرا دے گا۔ آپ مراد علی کو لے کر یہاں آئیں۔''

''خیریت تو ہے؟ کل یہاں بھیجا اور آج واپس بلا رہے ہو؟ بڑی افراتفری میں پلاننگ چینج کر رہے ہو؟''

''پلاننگ چینج نہیں کر رہا ہوں۔ صرف دو چار دنوں کے لیے مراد علی کی یہاں ضرورت ہے۔ آپ اسے لے کر آئیں پھر بتاؤں گا کہ معاملہ کیا ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ سیٹیں او کے کراؤ۔''

محبوب علی نے ٹریول ایجنٹ سے کسی فلائٹ کی بات کی۔ اس نے کہا۔ ''اسلام آباد سے کل تک کراچی کی ڈائریکٹ فلائٹ نہیں ہے۔ آج رات ایک بجے اسلام آباد سے لاہور پھر لاہور سے رات تین بجے کی فلائٹ سے کراچی جا سکتے ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''دونوں فلائٹس میں دو سیٹیں کنفرم کراؤ اور معروف تجلی صاحب کو فون پر انفارم کرو۔ وہ آپ کے پاس آ کر ٹکٹس کلیکٹ کر لیں گے۔''

محبوب تماشے کر رہا تھا۔ معروف تجلی کو یہ سمجھانے والا تھا کہ ماروی کے ذریعے نئے ملبوسات کی تشہیر سے منافع کا گراف ضرور اوپر جائے گا۔ وہ تفریح بھی کر رہا ہے اور تجربہ بھی' وہ اپنے منصوبے کے مطابق اسے ایک نئے انداز میں اسکرین پر لا کر جلد ہی سب کو چونکا دے گا۔

اس نے رات کے کھانے کے بعد ڈرائیور کو بلا کر کہا۔ ''صبح چار بجے کی فلائٹ سے تجلی صاحب آ رہے ہیں۔ انہیں ائر پورٹ سے یہاں لے آؤ اور وہاں جانے سے پہلے مجھے جگا دینا۔''

وہ بولا۔ ''جی جناب! میں صبح اٹھ جاؤں گا پھر آپ کو جگانے کے بعد یہاں سے جاؤں گا۔''

ملازم چلا گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔ جو تماشے کر رہا تھا' وہ عمل میں آنے سے پہلے اس

## باتوں سے خوشبو آئے

☆ اپنے نفس کو قابو میں رکھو تاکہ اللہ تعالیٰ تم پر نازل ہونے والے قہر کو قابو میں رکھے۔

☆ خواہشات کے دھارے میں اس طرح نہ بہہ جاؤ کہ جب ڈوبنے لگو تو تیرنا بھی بھول جاؤ۔

☆ فکر کے درخت کو صبر کا پانی دیتے رہنا چاہیے تاکہ آنے والی نسلیں خوشحال زندگی بسر کر سکیں۔

☆ ہم زندگی کے بارے میں مختلف تجربے کرتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ درحقیقت زندگی ہمارا تجربہ کر رہی ہوتی ہے۔

☆ آنسوؤں کو مسکراہٹ میں بدل دو تو زندگی میں خوشیاں تلاش کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

☆ اونچی اڑان کی خواہش رکھو مگر پہلے اچھی طرح دیکھ لو کہ تمہارے پر اس قابل ہیں یا نہیں۔

☆ کسی کو کبھی یہ مت کہو کہ وہ دل کا برا ہے یہ سب ہمارے دماغ کی خرافات ہوتی ہیں ہر شخص کا دماغ اچھا یا برا ہوتا ہے۔

☆ اکٹھے رہو مگر فاصلہ رکھو کیونکہ قلعے کے ستونوں کے درمیان یہ فاصلہ ہی تو ہے جو اسے مضبوطی سے کھڑا رکھتا ہے۔

☆ کسی دوسرے سے کیا ہوا وعدہ ٹوٹ جاتا ہے مگر اپنے دل سے کیا ہوا وعدہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔

☆ مشکل حالات میں جبر سے نہیں، صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیوسینٹرل جیل ملتان

کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ پھر وہ خواب گاہ میں آ کر لائٹس آف کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

اسے ہمیشہ اپنے روٹین کے مطابق نیند آجاتی تھی۔ وہ اس رات بھی بہ ظاہر سو گیا۔ سوتے وقت کوئی بے چینی نہیں تھی لیکن وہ اچانک ہی نیند میں کسمسانے لگا۔

لاشعوری طور پر کسی مسئلہ میں گرفتار رہنے والے بہ ظاہر سنجیدہ اور نارمل رہتے ہیں لیکن نیند کی حالت میں وہ مسئلہ بیدار ہو جاتا ہے۔ انہیں کچھ ابنارمل کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

وہ دھندلی دھندلی سی نظر آ رہی تھی۔

ایسا ہوتا ہے، جسے جاگتا ہوا ذہن یاد نہیں کرتا۔ اسے سوتا ہوا ذہن جگا دیتا ہے۔

اس کے شانے پر پانی سے بھرا ہوا کین نہیں تھا۔ پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری تھی۔ وہ خراماں خراماں جادو جگاتی آ رہی تھی۔ وہ ہستی جیسے ملکوتی نور میں ڈھل کر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ایسا نور پھوٹ رہا تھا کہ اس پر آنکھیں نہیں ٹھہر رہی تھیں۔

وہ ماروی ہی تھی لیکن اس کا حسن اس کی کشش زمینی نہیں تھی۔ وہ پریوں کے دیس سے اس کے لیے پھولوں اور خوشبوؤں کا تحفہ لے کر زمین پر اتر آئی تھی۔

وہ ایک تابوت کے پاس آ کر رک گئی۔ محبوب نے خود کے اس تابوت میں دیکھا۔ یہ کیا؟ کیا وہ زندگی سے خالی ہو چکا تھا... ہاں۔ تب ہی وہاں پڑا تھا۔

ماروی نے ٹوکری سے گلاب کی ایک کلی نکال کر اس پر جھک کر اس کے سینے میں رکھ دی۔

اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ ایک سرخ کلی نے اس کے سینے پر آ کر دھڑکنوں کو زندہ کر دیا تھا۔

ماروی نے ٹوکری کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اچھالا تو پھول فضا میں بکھرتے ہوئے بلندی تک گئے پھر ان کی مہکتی ہوئی پتیاں نیچے آ کر بارش کے قطروں کی طرح اس پر برسنے لگیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنے آپ کو چھو کر زندگی کا یقین کرنے لگا۔ پھر تابوت سے باہر آ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے ڈھونڈنے لگا۔

وہ نہیں تھی۔

خواب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کبھی وقت کا کوئی شریر لمحہ گزرتے گزرتے چھیڑ جاتا ہے۔ وہ لمحہ اسے میمن گوٹھ سے اپنے پیچھے آنے کی تحریک پیدا کرتا آ رہا تھا اور وہ جو ایک لمحے کی طرح آئی تھی۔ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

سینے میں سرخ کلی انگارے کی طرح سلگ رہی تھی۔ بڑی میٹھی جلن تھی۔ اب وہ ساری عمر اس جلن کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جو گم ہو گئی تھی اس کی تلاش کا سفر شروع کرنا چاہتا تھا۔

ایسے ہی وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ پہلی بار اسے جاگنے سے تکلیف ہوئی۔ یوں لگا جیسے جنت سے نکالا گیا ہے۔ اس نے دروازے کی طرف سر گھما کر بےزاری سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ ”میں عبدل ہوں جناب۔ آپ نے جگانے کو کہا تھا۔ میں ائرپورٹ جا رہا ہوں۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”ٹھیک ہے جاؤ۔“

وہ چلا گیا۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ اس نے حیرانی سے سوچا۔ ”میں نے اسے خواب میں کیوں دیکھا ہے؟“

وہ خود کو دھوکا دے رہا تھا کہ وہ بیوپاری ہے۔ عشق و محبت کے معاملات میں خشک مزاج کا حامل ہے لیکن اس بیوپاری نے کبھی کسی حسینہ کو خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو گہری نیند میں بھی منافع کا گراف دیکھتا رہتا تھا اور اگر پتھر دل والوں کے لیے بھی عورت ضروری ہوتی ہے تو وہ ضرورت پوری کرنے کے لیے سمیرا کو رفتہ رفتہ اپنی زندگی میں لانے والا تھا۔ اس حساب سے سمیرا کو خواب میں آنا چاہیے تھا۔

ماروی کیوں آئی تھی؟

اس نے بستر سے اتر کر الماری سے ایک لباس نکالا پھر باتھ روم میں آ کر غسل کرنے لگا۔ شاور کا ٹھنڈا پانی سر کو ٹھنڈا کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ”مجھے اس بات میں نہیں الجھنا چاہیے کہ وہ خواب میں کیوں آئی تھی؟ اس لیے آئی تھی کہ میں پچھلے چوبیس گھنٹوں سے اسے ماڈل بنا کر پیش کرنے کے متعلق کچھ زیادہ ہی شدت سے سوچ رہا ہوں۔“

ایک دوسری سوچ نے کہا۔ ”ٹھیک ہے کہ میں صرف کاروباری حوالے سے سوچتا ہوں لیکن کاروبار کے خشک صحرا میں گلاب کی کلی سینے پر نہیں کھلتی۔ ایک بیوپاری کے مردہ دل کی دھڑکنوں کو زندہ نہیں کرتی۔“

وہ تفریح اور تماشے کرنے والا پریشان ہو گیا۔ غسل سے فارغ ہو کر کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا۔ ”میں خواب میں اسے کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟ کیا میں اپنے اندر خود کو چھپا رہا ہوں؟ کیا میں حقیقت سے کترا رہا ہوں؟“

اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچا۔ ”ہاں۔ شاید میں نے بزنس کے بہانے اسے اپنے اندر چھپا رکھا ہے۔





میرے دل میں چور ہے اور میں چور تماشے کر رہا ہوں۔“

وہ اور پریشان ہو گیا۔ ”یہ۔ یہ اچھی بات نہیں ہے وہ مراد علی کی محبت ہے۔ یہ میرا فرض ہے، مراد کی غیر موجودگی میں مجھے ماروی کو اس کی امانت سمجھنا چاہیے۔

توبہ توبہ۔ جو پیار کرنے والا مجھ پر اعتماد کر کے پردیس گیا ہے، میں اس کے اعتماد کو دھوکا دے رہا ہوں۔ اس کی محبوبہ کو پھول اور خوشبوؤں کے حوالے سے سوچ رہا ہوں۔ میں کیا کر رہا ہوں...؟ یا خدا میں غلطی کر رہا ہوں۔ نہیں۔ مجھے اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔“

اسی وقت اذان ہونے لگی۔ وہ پانچوں وقت کا نمازی نہیں تھا۔ چونکہ منہ اندھیرے اٹھنے کا عادی تھا۔ اس لیے نماز پڑھنے کے بعد جوگنگ کے لیے کھلے میدان میں جاتا تھا۔ یوں فجر کی نماز کو ٹالتا نہیں تھا۔ جمعہ کی نماز مسجد میں ضرور پڑھتا تھا۔

معروف تجلی نے فون پر اطلاع دی کہ جہاز لیٹ ہے۔ وہ شاید صبح چھ بجے تک کراچی پہنچیں گے۔ وہ اطمینان سے مصلیٰ بچھا کر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ اور عبادت کی دھن ہو تو دھیان سے عبادت ہوتی ہے مگر محبوب نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ بے دھیانی میں ایسی جگہ پہنچ گیا ہے جہاں اس پر پھولوں کی پتیاں برس رہی ہیں۔

وہ پہلی بار ایسے حالات سے گزر رہا تھا۔ کچھ بے ایمان تھا اور اسے مراد کی امانت سمجھتے ہوئے کچھ ایمان دار بھی تھا۔ بہر حال مراد اور معروف تجلی آ گئے۔ اس نے ڈرائنگ روم میں ان سے ملاقات کی۔ پہلے معروف تجلی کو تفصیل سے بتایا کہ وہ ماروی کو کس طرح ایک ماڈل کے طور پر شوٹ کرنا چاہتا ہے۔ معروف نے اسے ماڈل بنانے پر اعتراض نہیں کیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ایک رئیس اعظم بڑی مہنگی تفریح کر رہا ہے۔

محبوب نے مراد سے کہا۔ ”صرف چار یا چھ دنوں کی محنت سے ایک اشتہاری فلم تیار ہو جائے گی۔ ماروی کے بزرگوں کو راضی کرو۔ یہ فلم شوٹنگ موہنجوڈرو اور عمر کوٹ کے قلعہ میں ہو گی۔ ان کے لیے وہاں آنے جانے اور رہنے سہنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ تم ابھی دو لاکھ روپے انہیں پیشگی کے طور پر دو گے۔ واپسی پر مزید تین لاکھ روپے ادا کیے جائیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں ابھی جا کر انہیں راضی کر لوں گا۔“

”انہیں راضی کرنے کے بعد کئی معاملات میں محتاط رہنا ہو گا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے لوگ شوٹنگ کے دوران وہاں تمہیں اپنا باس محبوب علی چانڈیو سمجھیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”ہاں۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ آپ کے وہ تمام ملازم ہمارے ہم شکل ہونے سے دھوکا کھائیں گے۔“

محبوب نے کہا۔ ”اور انہیں دھوکے میں رکھنا ہو گا۔ ان ملازموں کو یہی سمجھنے دو گے کہ تم، تم نہیں ہو۔ میں ہوں۔“

”سائیں! جب میں ان سے بولوں گا تو وہ سمجھ لیں گے کہ میں ان کا باس نہیں ہوں۔“

”تم ان سے بالکل بات نہیں کرو گے۔ میں ان ملازمین کو یہاں سمجھا دوں گا کہ وہ ماروی اور اس کے چاچا اور چاچی کے سامنے نہ مجھ سے بات کریں اور نہ ہی کسی بات پر بھول سے بھی ”یس سر۔ یا سوری سر...“ کہیں گے۔“

معروف تجلی نے مسکرا کر کہا۔ ”واہ کیا بات ہے محبوب...! خوب تماشا کرنے جا رہے ہو۔ میں بڑی دلچسپی سے انتظار کروں گا کہ اس تماشے کا انجام کیا ہوتا ہے؟“

”میں جو چاہتا ہوں، وہی انجام ہو گا۔“

”تمہارے تمام ملازم مراد کو اپنا باس محبوب علی سمجھتے رہیں گے۔ تمہارے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ کیا سوچیں گے کہ تم ایک غریب مراد علی منگی بن کر ماروی کو اور اس کے بزرگوں کو دھوکا دے رہے ہو۔ ماروی کے دیوانے ہو گئے ہو؟“

وہ آخری فقرہ سن کر مراد کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے چونک کر محبوب کو دیکھا۔ پھر معروف تجلی سے بولا۔ ”سائیں ایسے نہیں ہیں۔ آپ ان کے بارے میں ایسی بات نہ بولیں۔“

مراد کے اندھے اعتماد سے محبوب کو ایک ذرا سی شرم آئی۔ اس نے معروف سے کہا۔ ”ملازمین اپنے مالک کے

## شوق

استاد (شاگرد کے والد سے)۔ ”آپ کے بیٹے کو پڑھنے کا بالکل بھی شوق نہیں ہے۔“

باپ۔ ”ماسٹر صاحب! یہ بات بالکل غلط ہے، اگر میرے بچے کو پڑھنے کا شوق نہ ہوتا تو ہر جماعت میں تین تین سال کیوں لگاتا۔“

مرسلہ: توصیف احمد، پٹھان کالونی، کراچی

پیٹھ پیچھے جو رائے قائم کرتے ہیں' کرنے دیں۔ ان میں سے کسی کی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ میرے اور ماروی کے متعلق کوئی سوال کرے۔"

تجلی نے کہا۔ "تمہاری پلاننگ یہ ہے کہ تم اور مراد کہیں بھی ایک ساتھ دیکھے نہ جاؤ۔ کسی کو معلوم نہ ہو کہ تم دونوں ہم شکل ہو۔ ایسا کب تک ہوگا؟ کبھی تو بھید کھلے گا؟"

"جب بھید کھلے گا' تب دیکھا جائے گا اور تب تک میں ایک لمبی اننگ کھیلتا رہوں گا۔"

مراد نے کچھ سوچ کر کہا۔ "میں شوٹنگ کے لیے ماروی کے ساتھ جہاں بھی جاؤں گا' وہاں آپ نہیں رہیں گے۔ اگر آپ سے کچھ پوچھنا ہوگا۔ آپ کی بہت ضرورت ہوگی تو کیا تجلی صاحب میرے ساتھ رہا کریں گے؟"

"ہاں یہ میرے بزرگ تمہیں گائڈ کرتے رہیں گے اور میں تم سے فون پر برابر رابطہ رکھوں گا۔"

معروف تجلی نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ' یہ جو نئے ڈیزائن کیے ہوئے ملبوسات ہیں' یہ ماروی کو کیسے پہنائے جائیں گے۔ وہ سوال کرے گی کہ قیمتی ملبوسات کہاں سے آئے ہیں؟ اور وہ سب اسے کیوں پہنائے جارہے ہیں؟"

مراد نے کہا۔ "یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں ایسی باتیں بناؤں گا کہ وہ خوش ہو کر پہنے گی۔ آپ جہاں کہیں گے وہ میرے ساتھ رہے گی۔ اسے آخر تک معلوم نہیں ہوگا کہ اس کی فلم تیار کی جارہی ہے۔"

وہ دو گھنٹے بعد میمن گوٹھ پہنچا تو محلے کی عورتیں اور مرد گھروں سے نکل کر اسے دیکھنے لگے۔ اور کیوں نہ دیکھتے؟ محبوب کا ڈرائیور ایک مہنگی کار میں اسے پہنچانے آیا تھا۔ وہ گدھا گاڑی چلانے والا بہت ہی مہنگے کپڑے کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ پیروں میں پالش کیے ہوئے جوتے اس کے مقدر کی طرح چمک رہے تھے۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ ڈرائیور دو بڑے بڑے سوٹ کیس اٹھا کر جھگی کے اندر پہنچا رہا تھا صرف اتنا ہی نہیں' بڑے بڑے شاپرز میں بھرا ہوا سامان بھی گاڑی سے نکالا جارہا تھا۔

اس کا باپ حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ محلے کی ایک خاتون نے کہا۔ "اے مراد! تو پرسوں ادھر سے گیا تھا۔ آج واپس آگیا۔ کیا اتنی جلدی دبئی سے دولت کما کر لے آیا ہے؟"

اس نے کہا۔ "دولت ہمارے پاکستان میں بھی ہے۔ کمانے والے یہاں بھی خوب کماتے ہیں۔ میں جلد ہی یہاں بہت بڑی کوٹھی بنوانے والا ہوں۔"

محلے والے حیرانی سے اور رشک بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے گھر کے اندر آکر باپ سے کہا۔ "ابا! مجھے بہت سے ضروری کام نمٹانے ہیں۔ تو ابھی ماروی کے گھر چل' یا چاچا چاچی کو یہاں بلا کر لے آ۔ ان سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"بڑی کمائی کر کے آیا ہے۔ اب تو بس شادی کی ہی باتیں کرے گا۔ ان بڑے بڑے صندوقوں میں کیا ہے۔"

"انہیں صندوق نہیں سوٹ کیس کہتے ہیں۔ تو زیادہ نہ بول انہیں بلا کر لا۔ ابھی ان سے باتیں کرنی ہیں۔"

اس کا باپ ماروی کے دروازے پر پہنچا تو اس سے پہلے مراد کے مالدار ہونے کی خبر وہاں پہنچ گئی تھی۔ ماروی کے چاچا نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "اللہ سائیں جب دیتا ہے تو نامراد کو بامراد بنا دیتا ہے۔ سنا ہے تیرا بیٹا خوب کما کر لایا ہے۔"

"پتا نہیں کیا کما کر لایا ہے۔ آتے ہی کوئی اور بات نہیں کی۔ باؤلا ہو گیا ہے۔ سیدھا مجھ کو تیرے دروازے پر بھیج دیا کہ میں چاچا اور چاچی کو ابھی بلا کر لاؤں۔"

چاچی نے مسکرا کر کہا۔ "میں سمجھ گئی' ماروی کی بات کرے گا۔ سنا ہے' بڑے بڑے صندوق لے کر آیا ہے۔"

مراد کے باپ نے کہا۔ "انہیں صندوق نہیں" "سوٹ کیس" کہتے ہیں۔ جلدی چلو' میں بھی تو دیکھوں۔ مجھے تو کچھ دیکھنے ہی نہیں دیا۔ باپ ہو کر نہیں جانتا کہ کیا لایا ہے۔"

ماروی دوسرے کمرے میں سلائی مشین کے پاس بیٹھی محلے کی ایک عورت کے کپڑے سی رہی تھی۔ وہ اور چاچی سلائی کڑھائی کر کے گھر کا چولہا جلائے رکھتی تھیں۔

اس نے مشین کی گھڑ گھڑ بند کر دی تھی۔ دوسرے کمرے میں مراد کے متعلق ہونے والی باتیں سن رہی تھی۔ اسے تصور میں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

اسے چاچی کی آواز سنائی دی۔ "ماروی! ہم جارہے ہیں۔ ابھی آجائیں گے۔ دروازہ اندر سے بند کر لے۔"

ماروی نے آنکھیں بند کر لیں۔ چاچا چاچی پیا کے دیس گئے تھے۔ برات لے کر آنے والے تھے۔ بہت دور سے شہنائیوں کی دل کھینچ لینے والی سریلی دھن سنائی دے رہی تھی۔

اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں کھول دیں۔ شہنائی نہیں تھی۔ ابھی تنہائی تھی۔ اس نے کمرے سے باہر آکر دیکھا۔ چاچا چاچی جا چکے تھے۔ باہر کا دروازہ ساجن کی





بانہوں کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بند کر دیا۔ بانہوں میں جیسے قید ہو گئی۔

مراد علی مشکل میں تھا۔ محلے کی عورتیں اور مرد یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو گئے تھے۔ سب ہی تجسس میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔

"ارے منگتی! تو گدھا گاڑی چلاتے چلاتے اچانک پیسے والا کیسے بن گیا ہے؟"

"یہ تو بتا کہاں کام کرتا ہے؟ دبئی کل گیا اور آج آگیا۔ کیا تجھے جادو کی چھڑی مل گئی ہے؟"

"اللہ...! کتنی بڑی قیمتی کار تجھے دروازے تک پہنچانے آئی تھی۔ تیرا تو لباس اور حلیہ ہی بدل گیا ہے۔"

ایک خاتون نے کہا۔ "اے مراد! دروازے پہ کیوں کھڑا ہے۔ ہمیں اندر آنے دے۔ آخر ہم برسوں سے تیرے دکھ درد میں شریک رہتے آئے ہیں۔"

مراد نے کہا۔ "ماں جی! آپ سب کو اپنی خوشیوں میں ضرور شریک کروں گا۔ ذرا صبر کریں۔ ماروی کے چاچا چاچی آرہے ہیں۔ ان سے تاریخ پکی کر لوں پھر سب کو گھر میں بلاؤں گا۔"

ایک بوڑھے نے کہا۔ "تاریخ پکی کرنے کے لیے محلے کے بڑے بوڑھوں کو پہلے بلانا چاہیے۔ بولو ہم آجائیں۔"

چاچا چاچی اس کے باپ کے ساتھ آگئے۔ اس نے اندر آنے کا راستہ دیا۔ پھر دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "میں آپ سب کو پھر کسی وقت بلاؤں گا۔ ابھی ہمیں اپنی باتیں کرنے دیں۔"

اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ چاچا چاچی آکر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وہ ایک موڑھے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "چاچی یہ جو تم اور ماروی سلائی کڑھائی کا کام کرتی ہو نا! اب اسے چھوڑ دو۔ میں ماروی کے لیے بہت بڑا کام لے کر آیا ہوں۔"

چاچا نے پوچھا۔ "کیا کام لائے ہو؟"

وہ بولا۔ "کام چھوٹا ہے اور پیسے بڑے ہیں۔ تم اور چاچی نوٹ گنتے گنتے تھک جاؤ گے۔"

چاچی نے حیرانی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "کیا کہہ رہا ہے؟ کتنے نوٹ ملیں گے؟"

"پانچ لاکھ۔" اس نے پانچ انگلیاں دکھاتے ہوئے کہا۔ "پانچ لاکھ روپے ملیں گے۔"

"ہائیں...!" چاچا چاچی نے دیدے پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ مراد کے باپ نے بے یقینی سے کہا۔ "اتنے روپے کون دے گا۔ جانتا ہے پانچ لاکھ کتنے ہوتے ہیں؟ کبھی دیکھے ہیں تو نے؟ نوٹوں سے یہ جھگی بھر جائے گی۔"

مراد نے اپنے بیگ میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر ان کے سامنے رکھیں اور کہا۔ "یہ گڈیاں کھولو گے تو یہاں نوٹ ہی نوٹ اڑتے ہوئے دکھائی دیں گے۔"

ان تین بوڑھوں کی اوپر کی سانسیں اوپر ہی رہ گئیں۔ چاچی نے پوچھا۔ "یہ پانچ لاکھ ہیں؟"

"یہ صرف دو لاکھ ہیں۔ ماروی ہفتہ دس دن تک ایک کام کرے گی تو باقی تین لاکھ روپے ملیں گے۔"

چاچی نے انگلیوں پر حساب کیا۔ "دو لاکھ یہ اور تین لاکھ... دس دنوں میں پورے پانچ لاکھ...؟"

وہ دونوں بوڑھے حیرانی سے منہ کھولے گڈیوں کو اٹھا اٹھا کر اچھی طرح انہیں چھو کر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے تو کبھی خواب میں بھی اتنے روپے نہیں دیکھے تھے۔

چاچا نے نوٹوں کو سونگھ کر پوچھا۔ "یہ اصلی ہیں نا؟"

"مجھ پر شبہ نہ کرو۔ کیا میں نقلی نوٹ دے کر ماروی کو حاصل کر سکوں گا؟ میں جھوٹ بول کر دھوکا دے کر اپنا نقصان نہیں کروں گا۔ اب نوٹوں سے کھیلنے کے دن آگئے ہیں۔ تمہیں اصلی نقلی کی پہچان ہوتی رہے گی۔"

چاچی نے ان بوڑھوں سے گڈیاں چھین کر اپنے دوپٹے میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں بیٹا! تم جھوٹ نہیں بولو گے۔ یہ اصلی ہی ہیں۔ کیا کہوں' ہاتھوں میں لے کر بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ تم نے دو دنوں میں اتنی دولت کمالی ہے۔"

"یہ میں نے نہیں کمائی ہے۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ یہ آپ کی ماروی کی کمائی ہے۔"

چاچی نے پوچھا۔ "اسے کیا کرنا ہوگا؟"

وہ چاچا سے بولا۔ "آپ ملنگا کے ہوٹل میں جاتے رہتے ہیں۔ وہاں ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں؟"

چاچا نے کہا۔ "میں تو روز ٹی وی دیکھنے کے لیے ہی وہاں چائے پینے جاتا ہوں۔"

"چاچا! جب ٹی وی پر اشتہار آتا ہے تو خوبصورت عورتیں کبھی اپنے لمبے اور ریشمی بالوں کی نمائش کرتی ہیں۔ کبھی نئے اور مہنگے لباس پہن کر اتراتی ہوئی چلتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا۔"

"ہاں دیکھا ہے۔ ان کی کیا بات ہے۔ وہ تو بہت اونچے گھرانے کی لڑکیاں ہوتی ہوں گی۔"

"کوئی نہیں چاچا! وہ ہمارے ہی جیسی غریب ہوتی ہیں مگر لاکھوں کماتی ہیں۔ ماروی بھی نئے اور قیمتی لباس پہن کر ہمارے ساتھ گھومتی پھرتی رہے گی تو اسے پانچ لاکھ ملیں گے۔ ابھی یہ دو لاکھ کی پیشگی ادائیگی ہے۔"

چاچی نے کہا۔ "ارے بیٹا! تم کہو گے تو وہ روز نئے لباس پہن کر گھومتی رہے گی۔ لیکن ہم اس کے ساتھ رہیں گے۔"

"ضرور اس کے ساتھ رہیں گے۔ لیکن کیمرے سے دور رہیں گے اور ماروی کو یہ نہیں بتائیں گے کہ اس کی فلم اتاری جا رہی ہے۔ وہ انجان رہے گی۔ اسے کیمرے نظر نہیں آئیں گے۔"

مراد نے انہیں سمجھایا کہ ماروی کو معلوم ہوگا تو وہ کیمرے کے سامنے پیشہ ور ماڈلز کی طرح ایکٹنگ نہیں کر سکے گی۔ شرماتی رہے گی اور اسے پیشہ ور ماڈلز کی طرح پیش بھی نہیں کیا جائے گا۔ اسے معلوم نہیں ہوگا اور وہ نئے ملبوسات میں اس کے ساتھ چلتی پھرتی رہے گی۔ اور وہ خود اس کے ساتھ رہنے کے باوجود کیمرے کے فریم سے باہر رہا کرے گا۔

اس نے بڑی مشکلوں سے چاچا چاچی کو سمجھایا تو وہ سمجھ گئے کہ ماروی کو کمرشل انداز میں نہیں، قدرتی طور پر چلتے پھرتے دکھایا جائے گا اور وہ ایک سیدھا سادا سا کام ہے۔

وہ سوٹ کیس کھول کر نئے تیار کیے ہوئے ملبوسات نکال کر دکھانے لگا۔ چاچی نے کہا۔ "اللہ! کتنے خوبصورت ہیں۔ اتنے مہنگے لباس تو ہم خواب میں بھی نہیں پہن سکتے۔"

اس نے مراد کو دیکھ کر پوچھا۔ "ماروی سے کیا کہیں گے؟ وہ پوچھے گی، ایسے کپڑے اسے کیوں پہنائے جا رہے ہیں؟"

مراد نے کہا۔ "تم ماروی سے کہو گی کہ یہ سب شادی کے جوڑے ہیں۔ میں اس کے لیے لایا ہوں۔ وہ یہ لباس پہن کر ہونے والے دولہے کے ساتھ موہنجو دڑو کے کھنڈرات میں اور عمر کوٹ میں گھومنے پھرنے جائے گی۔"

چاچی نے سر ہلا کر کہا۔ "واہ...! تیرے دماغ میں کیا بات آئی ہے۔ وہ شادی کے جوڑے سمجھ کر انہیں خوشی سے پہنے گی۔ اگر یہ سارے لباس ڈھیلے ڈھالے ہوں گے تو میں آج ہی ماروی کو پہنا کر انہیں ٹھیک کر لوں گی۔"

مراد کے باپ نے کہا۔ "میرا بیٹا تم لوگوں کو اتنی دولت دے رہا ہے۔ اس کا نکاح آج ہی ماروی سے پڑھا دو۔ میں بہو کو آج ہی گھر لانا چاہتا ہوں۔"

مراد نے کہا۔ "ابا...! تو نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ چاچا...! بس ہاں بول دو۔"

چاچی اپنے دوپٹے میں جھانک کر نوٹوں کی گڈیوں کو دیکھ رہی تھی۔ مراد نے کہا۔ "ادھر کیا دیکھ رہی ہو؟ ادھر دیکھو اور ابھی ہاں کہو۔ یہ دونوں سوٹ کیس تمہارے ہیں۔ انہیں گھر لے جاؤ اور یہ روپے ان میں رکھ کر لے جاؤ۔"

مراد کے باپ نے کہا۔ "ہاں۔ نوٹ رکھتے رہو۔ پہلے ہاں بول دو۔ میں ابھی قاضی صاحب کے پاس جا کر بات کروں گا۔"

چاچا نوٹوں کی گڈیوں کو سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے بولا۔ "ماروی تو اب تمہاری ہے۔ جب چاہے لے جاؤ۔ مگر ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ شادی کی دھوم دھام کے لیے کچھ تو وقت دو۔"

مراد نے کہا۔ "شاید ہمیں فلم شوٹنگ کے لیے کل ہی جانا ہوگا۔ نکاح آج ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔"

چاچی گہری سوچ میں تھی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولی۔ "پہلے میں تمہارے چاچا سے کمرے میں جا کر کچھ ضروری باتیں کر لوں پھر واپس آ کر جواب دوں گی۔"

وہ اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں آئی پھر دروازے کو بند کرتے ہوئے بولی۔ "یہ کیوں کہہ دیا کہ ماروی کو جب چاہو لے جاؤ۔ تجھے کچھ عقل ہے یا نہیں؟"

وہ ناگواری سے بولا۔ "میں نے کیا بے عقلی کی ہے؟"

وہ بولی۔ "ابھی دو لاکھ ملے ہیں۔ ہفتہ دس دن میں اور تین لاکھ ملیں گے۔ تب تک ماروی ہمارے پاس رہے گی تو یہ ساری رقم ہماری ہوگی۔ اگر آج دلہن بن کر یہاں آئے گی تو اس کی کمائی پر مراد کا حق ہوگا۔ کچھ عقل ہے تیرے پاس...؟"

چاچا نے سر ہلا کر کہا۔ "یہ بات میرے بھیجے میں نہیں آئی تھی۔ تو نے کتنی دور کی بات سوچی ہے۔ ماروی کو آج رخصت کریں گے تو خالی ہاتھ منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

وہ اپنی ایک ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ کی پانچ انگلیاں رکھتے ہوئے بولی۔ "پہلے پانچ لاکھ ہمارے ہاتھ میں آئیں گے پھر ہم ماروی کا نکاح پڑھا کر اپنے گھر سے رخصت کریں گے۔"

وہ شوہر کے ساتھ کمرے میں واپس آئی۔ مراد کے باپ نے کہا۔ "یہ عورتوں کی کھسر پھسر مردوں کے مزاج کو اور فیصلوں کو بدل دیتی ہے۔ ہاں تو کیا فیصلہ کیا؟"

چاچی نے کہا۔ "فیصلہ کیا کرنا ہے۔ ماروی تمہاری





ہے آج نہیں آئے گی تو کل آئے گی۔ آج کا سارا دن اور ساری رات ان لباسوں کو ٹھیک کرتے گزرے گا۔ وقت کہاں ملے گا؟"

اس نے مراد سے کہا۔ "ماروی جو کام کرے گی اس کے لیے لباس کا ٹھیک ہونا ضروری ہے یا نہیں؟"

مراد نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ "اور شادی ایسے تو نہیں ہوگی کہ بیٹی کا ہاتھ پکڑایا اور گھر سے نکال دیا۔ رشتے داروں کو اور محلے والوں کو ضرور بلانا اور کھلانا پلانا ہوگا۔ یہ سب کچھ آج ہی نہیں ہو سکے گا۔"

چاچا نے کہا۔ "دو چار دنوں کی بات ہے۔ جب فلم کا کام ختم کر کے واپس آئیں گے تو دن تاریخ مقرر کر دیں گے اسی دن ماروی کو گھر لے آنا ہم انکار نہیں کریں گے۔"

مراد نے سوچا۔ "بے شک محلے والوں کو شادی کی دعوت نہ دی تو بڑی شکایتیں ہوں گی۔ پھر نئے ملبوسات کی فٹنگ بہت ضروری ہے۔ اس میں وقت لگے گا۔"

کمرشل ایڈ کی شوٹنگ کی اہمیت پہلے تھی۔ اس نے سوچا۔ "سائیں کا کام پہلے کرنا چاہیے۔ مجھے جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ میں ماروی کی قربت چاہتا ہوں۔ وہ تو ہفتہ دس دنوں تک میرے ساتھ ہی رہے گی۔ شادی واقعی دھوم دھام سے ہونی چاہیے۔ پھر یہ چاچی چاچا کا بڑا پن ہے کہ مجھ سے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں۔"

اس نے دل میں سوچا۔ "ٹھیک ہے۔ پہلے چانڈیو صاحب کا کام ہونا چاہیے۔ ہم فلم کی شوٹنگ سے واپس آنے کے بعد شادی کی دھوم دھام کریں گے۔"

☆☆☆

پورے میمن گوٹھ میں یہ بات حیرانی سے گردش کر رہی تھی کہ گدھا گاڑی چلانے والا اسلام آباد سے ہوائی جہاز میں کراچی آیا تھا اور اب ماروی کو اور اس کے چاچا اور چاچی کو ہوائی جہاز میں لاڑکانہ لے جا رہا ہے۔

غربت کی سطح سے بھی نیچے زندگی گزارنے والے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ "کیا ہم سوچ بھی سکتے ہیں کہ مراد علی کے پاس اتنی دولت ہوگی؟"

"اللہ سائیں مہربان ہوتا ہے تو اسی طرح گدھے کی پیٹھ سے اچھال کر آسمانوں کی سیر کراتا ہے۔"

کسی غریب کو اس کی اوقات کے مطابق ملے تو اچھا ہے۔ دولت زیادہ ملے تو مصیبت بن جاتی ہے۔ وہاں ایسے بھی غریب محتاج تھے جو چھوٹی بڑی چوریاں اور ہیرا پھیریاں کر کے زندگی گزار رہے تھے۔ ان للچائی ہوئی آنکھوں کو مراد کی جگمگی بینک کالا کر دکھائی دے رہی تھی۔

وہاں کے دو چار لوگ یقین کرنے کے لیے ائرپورٹ آئے تھے۔ انہیں آنکھوں سے ہوائی جہاز میں جاتے دیکھنا چاہتے تھے۔ ایسے وقت ان کی سرپرستی اور راہنمائی کے لیے معروف جگی موجود تھا۔ وہ اس کے ساتھ بورڈنگ کارڈ لینے کے لیے اندر گئے۔ پھر نظر نہیں آئے تھے۔

محلے کے کچھ آدمی عمارت کے باہر بھٹک رہے تھے اور وقفہ وقفہ سے اڑنے والے جہازوں کو دیکھ رہے تھے۔ ایسے خوش ہو رہے تھے۔ جیسے خود جہاز میں بیٹھنے جا رہے ہوں۔ وہ وہاں سے اڑ کر جانے والے جہازوں کی طرف اشارہ کرتے اور کہتے تھے۔ "وہ دیکھو۔ مراد ماروی کے ساتھ اسی جہاز میں اڑتا جا رہا ہے۔ انہیں کتنا مزہ آ رہا ہوگا؟"

ماروی اور چاچا چاچی کی سیٹ بیلٹس باندھ دی گئی تھیں۔ وہ آسمان پر اڑنا بھی چاہتے تھے اور گھبرا بھی رہے تھے۔ مراد ان کے پیچھے والی سیٹ پر معروف جگی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دولت مل جائے تو لوگ آسمان پر اڑنے لگتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ اب اڑنے کا وقت آیا تو گھبرا رہے تھے۔

مراد نے آگے ماروی کی طرف جھک کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں پوچھا۔ "تم گھبرا رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "میں نے منع کیا تھا، شادی سے پہلے نہ چھونا۔ اب کہہ رہی ہوں، ہاتھ اسی طرح رکھو۔ مجھے حوصلہ رہے گا۔"

"یاد ہے، تم نے کہا تھا، ہم جئیں گے ایک ساتھ مریں گے ایک ساتھ۔ پھر ڈرنا کیسا؟"

وہ بولی۔ "ہاں مراد...! یہی سوچ کر ڈر نہیں لگ رہا ہے کہ تم میرے بالکل قریب ہو۔"

جب جہاز فضا میں بلند ہوا تو ماروی نے کھڑکی سے دیکھا، جس زمین پر پیدا ہوئی تھی، وہ دور ہوتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی، صرف آسمان کی دھندلی سی نیلاہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ جہاز جب اور بلندی پر پہنچا تو وہ صاف و شفاف سفید بادلوں کے درمیان سے گزرنے لگی۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یوں جیتے جی اپنے محبوب کے ساتھ بادلوں میں پہنچ جائے گی۔

اسے اپنے پیچھے مراد کی سرگوشی سنائی دی۔ "ہم نے سنا تھا کہ پیار ہو جائے تو پاؤں زمین پر نہیں پڑتے۔ محبت کرنے والے آسمانوں پر اڑتے رہتے ہیں۔ آج یہ سچ ہو رہا ہے۔"

محبت وہی ہوتی ہے جو اپنے پاؤں مضبوطی سے زمین پر جمائے رکھتی ہے۔ کسی بھی حال میں اس کے قدم نہیں اکھڑتے۔ محبوب علی زمین پر تھا۔ اسی لاکھ کی ائر کنڈیشنڈ جیپ ڈرائیو کرتا ہوا لاڑکانہ پہنچ رہا تھا۔ اس نے معروف تجلی سے کہا تھا۔ ”میں لاڑکانہ کے ایک ہوٹل میں رہوں گا۔ آپ مراد کی فیملی کے ساتھ موہنجو ڈرو کے قریب کسی ہوٹل میں رہیں گے۔ فلم شوٹنگ کا عملہ بھی وہیں کے ہوٹلوں میں قیام کرے گا۔“

موہنجو ڈرو لاڑکانہ سے بیس میل دور دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر ہے۔ شوٹنگ کرنے والے دو دنوں تک وہاں مصروف رہنے والے تھے۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ کام کے دوران لاڑکانہ نہ آئیں۔ کیونکہ محبوب علی کلرڈ شیشوں کی جیپ میں چھپ کر وہاں پہنچنے والا تھا۔

دوسرے دن سورج نکلتے ہی شوٹنگ کا آغاز ہوا۔ چار کیمرے مختلف مقامات میں چھپائے گئے۔ ان کھنڈرات میں چھپنے چھپانے کے لیے کہیں ٹوٹی ہوئی دیواریں تھیں اور کہیں شکستہ چھتیں اور زمین دوز راستے تھے۔ کیمرے میں ایسے لینس موجود تھے جن کے ذریعہ ماروی کو بہ آسانی کبھی لانگ شاٹس اور کبھی بگ کلوز میں پکچرائز کیا جاسکتا تھا۔

جب وہ نئے لباس میں کھنڈر کے ایک حصے سے نمودار ہوئی تو محبوب کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ دیوانہ بہت پہلے سے وہاں پہنچ کر اپنے چھپنے کی جگہ بنا چکا تھا۔

وہ بہت دور اپنی جیپ میں بیٹھا ایک دوربین سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دوربین کے لینس اتنے پاور فل تھے کہ وہ بالکل قریب آگئی تھی۔ وہ لینس کی چکری کو گھماتا تو وہ اور قریب آکر جیسے اس کی سانسوں سے ٹکرانے لگتی۔

وہ بے خیالی میں سانسیں روک روک کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک زمین دوز حصے سے ابھرتی ہوئی آہستہ آہستہ آفتاب کی طرح طلوع ہوئی تھی۔ صدیوں کا مردہ کھنڈر جیسے زندہ ہو گیا تھا۔ اس کی شکستہ دیواریں اور خاموش پتھر گویا بول اٹھے تھے۔

وہ دوربین کے دائرے میں سراپا دکھائی دے رہی تھی۔ مراد اس سے دور کھڑا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر نئے لباس میں شرما رہی تھی، مسکرا رہی تھی۔ ایک ایک قدم اٹھاتی مراد کی طرف یوں آرہی تھی جیسے پیار کی شراب پی رکھی ہو۔ قدم بہک رہے تھے اور چال مستانی ہو رہی تھی اور محبوب کی دوربین کہہ رہی تھی کہ بہکنے والی اس کی سمت چلی آرہی ہے۔ ہاں اسی کے پیار میں، اسی کی سمت آنے کے لیے اس کی چال میں نشہ گھل رہا ہے۔

”دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔“

مراد اس کی دوربین کے دائرے سے اور کیمرے کے فریم سے باہر تھا۔ ایسا ہوتا ہے، جو دل میں ہوتے ہیں وہ حالات کے ہاتھوں باہر نکالے جاتے ہیں جیسے مراد اس وقت باہر ہو گیا تھا اور جو باہر ہوتے ہیں، وہ اندر جانے کی خوش فہمی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ جیسے محبوب بھٹک رہا تھا۔

محبوب دیکھ رہا تھا اور پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ اس بزنس مین کے اندر پہلی بار کالج لائف کا شاعر بیدار ہو رہا تھا۔ اس کا دل بے اختیار کہہ رہا تھا۔

پھر اس نے آنکھوں سے دوربین ہٹالی۔ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ ”یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟

میں یہاں چھپ کر دیکھنے آیا ہوں کہ اشتہاری فلم میری پلاننگ کے مطابق تیار ہو رہی ہے یا نہیں؟ لیکن میرا دل میرا دماغ صرف ماروی کو سوچ رہا ہے اور میں اپنے ضمیر سے کہتا جا رہا ہوں کہ یہ ایک غریب عاشق کی امانت ہے میں امانت میں خیانت نہیں کروں گا۔

میں ہوں کہ کل بھی اسے سوچ رہا تھا۔ آج بھی اسے سوچتا ہوا سیکڑوں میل دور آیا ہوں۔

یہ خواب میں بھی آئی تھی اور میں یہاں اشتہاری فلم کی شوٹنگ کی نگرانی کرنے نہیں آیا ہوں۔ دوربین اس لیے لایا ہوں کہ اسے قریب سے ہر لباس میں، ہر رنگ میں ہر زاویے سے دیکھوں۔ میں اپنے اندر کے چور کو پکڑ رہا ہوں اور ڈھیل دے رہا ہوں جیسے کوئی بات نہ ہو۔ مراد دو ٹکے کا آدمی ہے۔ میرا ملازم ہے۔ اور میں آقا ہوں۔ اس کی ہر چیز لے سکتا ہوں۔ خرید سکتا ہوں یا چھین سکتا ہوں۔“

اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ وہ نظر نہیں آئی کھنڈر کے اس حصے کے شاٹس لیے جاچکے تھے۔ مراد کو جس طرح سمجھایا گیا تھا، اس کے مطابق وہ ماروی کو کسی دوسرے مقام پر لے گیا تھا اور ماروی اسی کے ساتھ جانے کے لیے پیدا ہوئی تھی خواہ کھنڈر میں جاتی یا کسی گلزار میں جاتی، اس بھری بہار کا ہاتھ مراد کے ہی ہاتھ میں ہوتا۔

وہ بے خیالی میں سوچ رہا تھا۔ مراد کو آزما یا چکا ہے۔ یہ طے ہے کہ وہ دولت کے پیچھے بھاگنے والا اور کسی بھی حال میں بک جانے والا عاشق نہیں ہے۔ البتہ ماروی کو آزمایا جاسکتا تھا۔ اس کے چاچا اور چاچی لالچی تھے۔ انہیں شیشے میں اتارا جاسکتا تھا۔

پھر اس کے ضمیر نے کہا۔ اسے ماروی کو خریدنے کی







بات نہیں سوچنی چاہیے۔ لیکن وہ بے دھیانی میں سوچ رہا تھا۔ اب سے پہلے دماغ نے سمجھایا تھا کہ وہ ماروی کی طرف مائل ہو کر غلطی کر رہا ہے۔ وہ مراد علی کی محبت ہے۔ اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر اسلام آباد گیا ہے۔ اپنے باس پر اعتماد کرتا ہے۔ اسے ایک دیانت دار ملازم کے اعتماد کا بھرم رکھنا چاہیے اور اب اسے نئے لباس میں، نئے ناز و انداز میں دوربین کے ذریعہ بالکل قریب دیکھ کر تڑپ گیا تھا۔ کیا کیا جائے، ضمیر اپنی جگہ ہے۔ طلب اپنی جگہ۔ انسانیت اور شرافت اپنی جگہ ہے اور ضرورت اپنی جگہ اہم ہے۔

ایسے وقت عقل میں یہ بات آئی کہ ماروی کی غربت اور محتاجی دور کرنا اسے جھگی سے نکال کر عالیشان کوٹھی میں لانا انسانیت بھی ہے اور شرافت بھی اور نیکی بھی...

مراد علی کی کیا اہمیت ہے؟ ماروی اس سے بے وفائی کرے گی تو وہ کسی دوسری ماروی سے شادی کر لے گا۔ یا دیوانہ عاشق ہو گا تو جان پر کھیل جائے گا۔ دنیا میں کتنے ہی لوگ کیڑوں مکوڑوں کی طرح مرتے رہتے ہیں۔ ایک غریب عاشق کے مرنے سے کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ کوئی ماتم نہیں کرے گا۔

وہ جیپ ڈرائیو کرتا ہوا کھنڈر کے ایک حصے میں پہنچا۔ آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے کچھ اور لوگ بھی کہیں کہیں نظر آرہے تھے۔ کئی گاڑیاں احاطے سے باہر کھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے بھی اپنی جیپ ان سے ذرا دور لا کر روک دی۔ پھر وہی دوربین، وہی طلب، وہی خواہشیں۔ وہ اسے آنکھوں سے لگا کر دیکھنے لگا۔

وہ نظر نہیں آئی محبوب نے فون کے ذریعہ معروف تجلی سے پوچھا۔ ”ماروی کہاں ہے؟“

ماروی ایک پجیرو کے اندر تھی۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے وہ اندر لباس تبدیل کر رہی تھی۔ مراد پہریدار کی طرح باہر کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ پجیرو سے باہر آئی تو دوسرے رنگ اور مختلف ڈیزائن کے لباس میں تھی۔ مراد کے ساتھ چلتی ہوئی، باتیں کرتی ہوئی ایک حوض کے کنارے آکر بیٹھ گئی تھی۔ اس حوض میں برسات کا پانی جمع تھا۔ وہ ایک ادا سے سر جھکائے پانی میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ کئی کیمروں کی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں۔ اس نے مراد سے پوچھا۔ ”کیا اس کے بعد بھی مجھے لباس بدلنے کو کہو گے؟“

وہ بولا۔ ”ہاں۔ اس کے بعد ایک اور لباس پہنو گی۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”تم دیوانے ہو۔ پتا نہیں کہاں سے اتنی دولت مل گئی ہے۔ چاچی کو دو لاکھ دیے ہیں اور مجھے نئے نئے کپڑے پہنا کر اس کھنڈر میں گھما رہے ہو۔ کیا گھومنے پھرنے کی اور کوئی جگہ نہیں ملی؟“

”دوسری جگہ بھی ہے۔ ابھی ہم یہاں سے ہوٹل جائیں گے، چاچا چاچی کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ پھر عمر کوٹ جائیں گے۔“

”عمر کوٹ...؟“

”ہاں۔ عمر ماروی کی داستان وہاں آج بھی زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گی۔ آج ایک مراد اپنی ماروی کو عمر کوٹ کے تاریخی قلعہ میں لے جائے گا۔“

وہ بولی۔ ”تمہیں داستان معلوم ہے نا؟ ماروی اپنے محبوب کی دیوانی تھی اور عمر نے اپنی دولت اور طاقت کے بل پر ماروی کو اس کے محبوب سے جدا کر دیا تھا۔“

مراد نے مسکرا کر کہا۔ ”ہاں جانتا ہوں۔ عمر نے ماروی کو ہر قیمت پر خریدنا چاہا تھا۔“

ماروی نے بڑے فخر سے کہا۔ ”لیکن نہ خرید سکا۔“

”تب عمر نے اسے اپنے قلعہ میں قید کر دیا۔“

اس نے بڑی شوخی سے سوال کیا۔ ”ہم عمر کوٹ جا تو رہے ہیں۔ اگر کسی عمر نے مجھے وہاں قیدی بنا لیا تو کیا کرو گے؟“

”خدا نہ کرے ایسا ہو۔“

اس نے پھر شوخی سے پوچھا۔ ”اگر ایسا ہوا تو...؟“

”میں غریب ہوں۔ چھیننے والے کا ہاتھ نہ روک سکا تو اپنی جان پر کھیل جاؤں گا۔“

”محبت کی داستانوں میں یہی ہوتا ہے۔ اگر کسی نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو اپنی جان دیدوں گی۔“

وہ دوربین کے ذریعے بالکل قریب آگئی تھی۔ اتنے قریب کہ محبوب اسے چھو سکتا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر اسے پکڑ سکتا تھا۔

اس نے بڑے جذب کے عالم میں ہاتھ بڑھایا تو چھو نہ سکا۔ پھر حواس میں آتے ہی آنکھوں سے دوربین ہٹائی تو وہ نہیں تھی۔ اس سے تقریباً سو گز کی دوری پر مراد کے ساتھ حوض کے کنارے بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے دوربین لگائی۔ جیسے خواب آتے ہیں، ویسے ہی وہ سانسوں کے قریب آگئی۔ مگر اس وقت قریب آنے والی ماروی کو معلوم نہ تھا کہ کوئی اس کی چاہت میں کیسا باؤلا ہو رہا ہے۔

شام کو پجیرو ڈرائیو کرنے والا ملازم ماروی اور مراد کو

عمر کوٹ کی طرف لے گیا۔ چاچا اور چاچی ان کے ساتھ تھے۔ اشتہاری فلم شوٹ کرنے والا عملہ ان سے پہلے اپنی گاڑیوں میں ادھر جا چکا تھا اور ان سب سے پہلے محبوب اپنی کلرڈ شیشوں والی جیپ میں اس منزل کی طرف رواں دواں تھا۔

اس نے معروف تجلی سے کہا تھا۔ ”آپ میرے ساتھ عمر کوٹ چلیں، کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

اور تجلی نے مراد سے کہا تھا۔ ”تم ماروی کی فیملی کے ساتھ آؤ۔ میں دوسری کسی گاڑی میں وہاں پہنچوں گا۔“

اب وہ محبوب کے ساتھ جیپ کی پچھلی سیٹ پر تھا۔ ایک ملازم ڈرائیو کر رہا تھا۔ محبوب نے ڈرائیور کی موجودگی میں رازداری کی خاطر انگریزی میں کہا۔ ”میں اپنی ایک پرسنل بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے یہ زبان بول رہا ہوں۔“

”میں مجبوری سمجھ رہا ہوں، تم کیا کہنے والے ہو، یہ بھی کسی حد تک سمجھ رہا ہوں“

”بے شک آپ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔ مجھے تو دیکھتے اور سمجھتے رہے ہیں۔“

”اور میں سمجھ رہا ہوں کہ ماروی تمہیں متاثر کر رہی ہے۔“

”پلیز ڈرائیور کی موجودگی میں اس کا نام نہ لیں۔“

”بے شک اسے نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کسی لڑکی کی باتیں کر رہے ہیں۔“

”معروف صاحب! میں کیا کروں؟ بہت پریشان ہوں۔ وہ میرے حواس پر چھا رہی ہے۔“

”عورت دو طرح سے کھینچتی ہے۔ ایک تو ہوس کے لیے یا پھر سچے پیار کے لیے۔ تمہارا معاملہ کیا ہے؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ سوچتے وقت وہ نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ بہت ہی خاموش اور سیدھی سادی سی تھی۔ اس کی خاموشی کہہ رہی تھی۔ ”لو مجھے دیکھو اور بولو، میں ہوس جگا رہی ہوں یا پیار...؟“

وہ معروف کی طرف منہ کر کے بولا۔ ”پیار...“

”پیار کوئی بھی کسی سے کر لیتا ہے۔ جب وہ مل جائے اور ضرورت پوری ہو جائے تو وہی پیار بیزار کر دیتا ہے۔“

”وہ ایسے دل میں سمائی ہے کہ کبھی بیزاری نہیں ہو گی۔“

”تم اعلیٰ طبقہ سے ہو، وہ ادنیٰ سے۔ تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، وہ سراسر ان پڑھ ہے۔ رہن سہن اور طور طریقوں میں اتنا واضح فرق ہے کہ وہ تمہارے شانہ بشانہ چلے گی تو معلوم ہو گا، تھری پیس سوٹ میں پیوند لگا کر چل رہے ہو۔ اپنی سوسائٹی میں مذاق بن جاؤ گے۔“

”میں اسے سکھاؤں گا، پڑھاؤں گا۔ اپنے قابل بناؤں گا۔“

اس نے سمجھایا۔ ”جب وہ حاصل ہو گی تو پہلے مرحلے میں اس کے ساتھ دن رات دیوانگی میں گزریں گے۔ اسے پڑھانے اور کچھ سکھانے کی فرصت نہیں ملے گی۔

جب ذرا نشہ اترے گا تو اسے تربیت دینے والوں کی رپورٹ کھلے گی۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

کبوتر کبھی باز کے ساتھ پرواز نہیں کر سکتا۔ قدرت کی طرف سے جس ماحول میں جس کے ساتھ رہنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، ہم اسی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔

میری مانو۔ میرا تمہارے ساتھ ہر فضا میں سانسیں لے سکتی ہے۔ ہر آسمان پر پرواز کر سکتی ہے۔ اور یہ بیچاری تو پر تولتے ہی اپنی پستی میں چلی جائے گی۔“

”آپ کا مشورہ مجھے مایوس کر رہا ہے اور میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ وہ میری ضرورت بن گئی ہے۔“

معروف تجلی کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے محبوب کو دیکھے بغیر کہا۔ ”ضرورت... اب تمہارے منہ سے سچ نکل رہا ہے۔ پہلے تم نے کہا تھا کہ اس سے پیار ہو گیا ہے۔“

”ہاں میں کیسے سمجھاؤں کہ اس سے پیار ہو گیا ہے۔ کیا ہمیں اپنی زندگی میں پیار کی ضرورت نہیں ہوتی؟“

”عورت سے پیار کرنا، شادی کرنا اور بچے پیدا کرنا ضروری ہے لیکن ازدواجی زندگی کے دوسرے مرحلے میں بچے اور سلسلۂ روزگار عورت سے زیادہ ضروری ہو جاتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ عورت صرف فرائض ادا کرنے کے لیے رہ جاتی ہے۔ پیار ماضی کا بھولا ہوا قصہ بن جاتا ہے۔“

”میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ وہ میری زندگی میں آ کر ماضی کا بھولا ہوا قصہ نہیں بنے گی۔“

”میرا کام مشورہ دینا ہے اور مشورہ یہ ہے کہ اسے اپنی سوسائٹی کا حصہ نہ بناؤ۔ اسے خرید لو اس کے ساتھ کہیں رازداری سے جب تک رہنا چاہو رہو۔ جب دل بھر جائے تو چھوڑ دو۔ یہی دانش مندی ہو گی۔

میری یہ بات گرہ میں باندھ لو کہ زندگی کی ہر ضرورت کی طرح عورت کی ضرورت بھی پوری ہوتے ہی کم ہو جاتی ہے۔“

”آپ کی باتیں سچی ہیں مگر کڑوی ہیں لیکن ہماری دنیا میں کیا لوگ سچی محبت نہیں کرتے۔ عشق و محبت کی جو لازوال کہانیاں ہیں، وہ جھوٹی ہیں؟“

”جھوٹی نہیں ہیں۔ ان لازوال کہانیوں کے علاوہ آج بھی سچا عشق کرنے والوں کی مثالیں ملتی ہیں۔ پہلے تم اپنے آپ کو سمجھو کہ انسانی ضرورت کے مطابق اس سے پیار کر رہے ہو یا کسی بھی ضرورت سے بالاتر ہو کر اس کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہو۔

ایسا عشق کہ محبوب کو حاصل کرنا ضروری نہ ہو۔ اس کے حصول کی تمنا میں جلتے رہو۔ لیکن اسے پانے کے لیے جبر کی راہ اختیار نہ کرو۔ اسے خرید کر اس کی توہین نہ کرو۔“

محبوب نے سر جھکا کر سوچا۔ ”میں ابھی اس کو اور اس کے چاچا چاچی کو خریدنے کی بات سوچ رہا تھا۔ مجھے کیا ہو گیا ہے؟“

معروف تجلی نے کہا۔ ”تم اس کی طرف جاتے ہو، وہ اپنے عاشق کی طرف جاتی ہے۔ عمر ماروی کا قصہ نہ دہراؤ اس کی محبت کو جنگل میں رہنے دو۔ اسے اپنے محل میں قید کرنے کی کبھی نہ سوچو۔

سچا عشق یہ ہے کہ مراد کو رقیب نہ سمجھو۔ اپنی محبوبہ کی چاہت کو اپنی چاہت، اس کی منزل مراد کو اپنی منزل سمجھو۔ اس کی منزل پر اسے پہنچاؤ گے تو تمہیں عجیب طرح کی سچی مسرتیں حاصل ہوں گی۔ تم تمام ہوس اور ضرورتوں کو مار کر اس محبوبہ سے عشق کرو گے تو تمہاری آنکھوں سے دوربین ہٹ جائے گی۔“

محبوب علی نے ایک ہاتھ سے اپنے سر کو تھام کر کہا۔ ”اس موضوع کو ڈراپ کریں۔ میرا سر دکھ رہا ہے۔“

کار کی محدود فضا میں خاموشی چھا گئی۔ محبوب نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اسے دیکھنے لگا۔ کیا کرے، وہ خود آ جاتی تھی۔

اسے دیکھنے سے ایک عجیب طرح کی آسودگی ملتی تھی۔ گویا آسودگی اور مسرتیں حاصل کرنے کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ اور اگر ضرورت تھی تو اس کے چاچا اور چاچی لالچی تھے۔ لاکھوں روپے ان کی جھولی میں آتے ہی وہ اپنی بھتیجی کو اس کی جھولی میں ڈال سکتے تھے۔

اس نے آنکھیں کھول کر معروف تجلی کو دیکھا۔ وہ کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”میرا یہ کام کر دیں۔ آپ کسی تھرڈ مین سے کام لیں۔“

”کام کیا ہے؟“

”وہ چاچا اور چاچی سے کہے گا کہ ایک رئیس اعظم ان کی بیٹی کا دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ شادی سے پہلے انہیں دس لاکھ روپے دے گا۔“

معروف نے کہا۔ ”وہ راضی نہیں ہوں گے۔“

## اف یہ مہنگائی

## پانچ سو کا کھلا

ایک دفعہ میں بازار سے گزر رہا تھا، ایک صاحب نے آواز دی۔ ”بابو 500 کا کھلا دے دو۔“ پہلے میں سمجھا کسی اور کو آواز دی ہو گی۔ غور کرنے پر پتا چلا کہ وہ صاحب مجھ سے ہی مخاطب ہیں۔ میں نے انتہائی شرمندگی سے جواب دیا۔

”محترم۔ اس مہنگائی کے دور میں پانچ سو تو کیا میرے پاس ایک سو کا کھلا بھی نہیں۔ البتہ آپ نے 500 کا کھلا مانگ کر میری جو عزت افزائی کی ہے۔ اس پر آپ کا شکر گزار ہوں۔“

☆☆☆

## اف یہ لوڈشیڈنگ

ایک دفعہ میں پاکستان کے ایک شہر میں گیا وہاں جاننے والے کے پاس کچھ دیر ٹھہرا۔ جاتے ہوئے میں نے سوچا کہ کپڑے تبدیل کر لوں اور بیگ سے ایک نیا جوڑا نکالا۔ اس پر کچھ شکنیں، سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ استری اسٹینڈ، کہاں ہو گا۔ استری اسٹینڈ تو کیا، مجھے کمرے میں، بلب، پنکھا، ٹیوب لائٹ کچھ بھی نظر نہ آیا۔ حتیٰ کہ الیکٹرک بورڈ، سوئچ وغیرہ کچھ بھی نہیں۔

پوچھنے پر ان صاحب نے بتایا۔

”بھیا بجلی ہوتی نہیں، خوامخواہ وائرنگ پر خرچا کیوں کریں۔“

مرسلہ: افتخار حسین اعوان، مظفر آباد، آزاد کشمیر

''کیا دس لاکھ کم ہوں گے؟''

''رقم زیادہ ہے لیکن ان کی اہمیت کم ہوگی۔ کیونکہ انہیں دو لاکھ مل چکے ہیں۔ ایک ہفتہ میں اور تین لاکھ ملیں گے۔ چاچا چاچی مزید دس لاکھ کسی سے حاصل کرنا چاہیں گے تو ماروی راضی نہیں ہوگی۔ مراد سے بچھڑ جانے پر انہیں لعنت ملامت کرے گی۔''

''تھرڈ مین انہیں پچاس لاکھ کی آفر دے گا۔''

''بہت بڑی رقم ہے۔ ہاں۔ اتنے میں تو اچھے اچھے بک جائیں گے۔ میں پلان کرتا ہوں۔ ایک فرضی رئیس اعظم کے ذریعے پیغام بھیجوں گا۔''

محبوب نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے اگر وہ مراد سے سچا عشق کرتی ہے تو پچاس لاکھ میں وہ عشق پانی ہو جائے گا۔''

پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ تھرڈ مین عمرکوٹ میں آکر چاچا اور چاچی سے سودا طے کرے۔''

معروف جنگی نے ڈرائیور سے کار روکنے کو کہا۔ وہ ڈرائیور کی موجودگی میں کسی تھرڈ مین سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ کار کے رکتے ہی فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن عمرکوٹ کے قلعہ میں ماروی کو پکچرائز کیا جا رہا تھا۔ وہاں سے ذرا دور چاچا چاچی ایک ستون کے پاس بیٹھے پھل کھا رہے تھے۔ بچپن سے ماروی کی پرورش کرنے کا پھل انہیں مل رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھے اور اپنی بھتیجی کو دعائیں دیتے رہتے تھے۔

مراد ایک بہترین لباس پہنے' شانوں پر اجرک ڈالے ماروی کے ساتھ قلعہ کے ایک حصہ سے گزر رہا تھا۔ وہ نئے خوبصورت شاہانہ لباس میں تھی۔ اس تاریخی قلعہ میں ایک شہزادی لگ رہی تھی۔ اگر وہ کمرشل شوٹنگ کامیاب رہتی تو اس شہزادی کو کچھ دنوں کے بعد ٹی وی کی اسکرین پر دیکھا جانے والا تھا۔

جہاں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ وہاں محبوب کی جیپ نہیں جا سکتی تھی اور وہ کلرڈ شیشوں کے پیچھے چھپ کر ہی اپنی محبوبہ کا نظارہ کر سکتا تھا۔ اس وقت مجبوراً اس کی دید سے محروم تھا۔ قلعہ کے احاطے میں ایک ستون کے پاس چاچا اور چاچی کو دیکھ رہا تھا۔

ایسے وقت ایک شخص بہترین سوٹ پہنے ستون کے پاس آیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے پیکٹس اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے کہا۔ ''میرا نام فرید احمد ہے۔ میں رئیس اعظم سکندر بخت کا سیکریٹری ہوں۔ میں نے ابھی معلوم کیا ہے آپ دونوں ماروی کے چاچا اور چاچی ہیں۔''

چاچا نے کہا۔ ''ہاں میں اس کا چاچا جبار ہوں۔ سب مجھے جھمرو کہتے ہیں اور یہ اس کی چاچی منت بی بی ہے۔ ہم اسے منتی کہتے ہیں۔ کیا آپ ہم سے ملنے آئے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''میں سکھر سے آیا ہوں۔ وہاں کے رئیس اعظم نے آپ کے لیے یہ قیمتی تحفے بھیجے ہیں۔''

جھمرو نے پوچھا۔ ''یہ رئیس اعظم کون ہیں؟''

''وہ بہت بڑے سرمایہ دار ہیں۔ ان کا نام سکندر بخت ہے۔ میں ان کا سیکریٹری ہوں۔ ان کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ خود نہیں جانتے کہ کتنی دولت ہے۔ انہوں نے ماروی کے لیے یہ سونے کے زیورات اور بہت ہی قیمتی امپورٹڈ کپڑے بھیجے ہیں۔''

وہ دونوں ان پیکٹس کو کھول کر دیکھ رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔ سیکریٹری نے کہا۔ ''وہ ماروی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں چاہتے ہیں اور شادی سے پہلے آپ کی خدمت میں پچاس لاکھ روپے پیش کریں گے۔''

''پچاس لاکھ روپے؟'' انہوں نے بے یقینی سے سیکریٹری کو دیکھا۔ سیکریٹری نے کہا۔ ''آپ ابھی ہاں کریں۔ شام تک یہ رقم آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔''

ان کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے۔ پچاس لاکھ روپے کھیل تماشا نہیں ہوتے۔ ابھی آنکھوں کے سامنے لاکھوں کے زیورات اور قیمتی کپڑے دیکھ کر یقین ہو رہا تھا کہ ایک ہاں کہنے سے آج شام تک اتنی دولت ملے گی کہ جھگی میں رکھنے کی جگہ نہیں ہوگی۔

چاچا جھمرو نے چاچی منتی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''ماروی مان جائے گی تو ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

چاچی نے کہا۔ ''وہ دیکھو مراد کے ساتھ آ رہی ہے۔ تم مراد کو دوسری طرف لے جاؤ۔ میں ماروی کو سمجھاؤں گی۔''

وہ فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر ان کی طرف گیا۔ پھر ماروی سے بولا۔ ''بیٹی! تم چاچی کے پاس جاؤ۔ وہ تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔ میں مراد سے کچھ باتیں کروں گا۔''

معروف جنگی دور سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ چاچا مراد کو دوسری طرف لے جا رہا تھا۔ ماروی چاچی کے پاس آ گئی تھی۔ سامنے کھلے ہوئے مخملی ڈبوں میں سونے کے زیورات دکھائی دے رہے تھے اور امپورٹڈ کپڑے اسے متوجہ کر رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ''چاچی! یہ کہاں سے آئے ہیں؟''





اس نے سیکریٹری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہمارے لیے سوغات لائے ہیں۔ تو بڑی بھاگوں والی ہے۔ تجھ پر لاکھوں روپے کی برسات ہو رہی ہے۔ اگر تو خدا کی ناشکری نہ کرے تو آج شام تک تجھے پچاس لاکھ روپے ملیں گے۔''

''پچاس لاکھ....؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''اتنے روپے مجھے کیوں ملیں گے؟''

''تیرا رشتہ آیا ہے۔ تو خدا کا شکر ادا کر اور ہاں کہہ دے۔''

ماروی کے تیور بدل گئے۔ اس نے ناگواری سے فرید احمد کو دیکھا پھر کہا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟ کوئی دین ایمان ہے تمہارا؟ مراد میرے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لا رہا ہے۔ مجھے ایسے قیمتی لباس پہنا رہا ہے۔ لاکھوں روپے دے رہا ہے۔ تم لوگوں کو آسمانوں کی سیر کرا رہا ہے۔ پھر بھی ہوس بڑھتی جا رہی ہے۔''

منتی نے کہا۔ ''مراد کے گن گا رہی ہے۔ اس کی چالاکی نہیں سمجھ رہی ہے۔ وہ تجھے استعمال کر کے ہمیں لاکھوں روپے دے رہا ہے۔ اب سچی بات سن۔''

ماروی نے گھور کر چاچی کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ''یہ تجھے نئے کپڑے پہنا کر جگہ جگہ یونہی نہیں گھما رہا ہے۔ چھپ چھپ کر تیری فلم بنائی جا رہی ہے۔ تجھے ساری دنیا ٹی وی پر دیکھے گی۔ یہ مراد تجھے اشتہار بنا رہا ہے۔ اسے کوئی شرم حیا نہیں ہے۔''

وہ گھور کر بولی۔ ''میں ابھی مراد کی کوئی نہیں ہوں۔ تم نے مجھے اشتہار بنانے کی اجازت کیسے دیدی؟ بے شرمی تو تمہاری اور چاچا کی ہے۔ مراد تو وہی کرتا ہے جو تم کہتی ہو۔ تم دونوں کو خوش کر کے ہی اپنا بنانا چاہتا ہے۔''

وہ غصہ سے بولی۔ ''تیرے پاس دولت آتے ہی منہ پھٹ ہو گئی ہے۔ ہمیں بے شرم کہہ رہی ہے۔ بھول گئی' بچپن سے ہم ہی تجھے کھلاتے پلاتے آ رہے ہیں۔''

''پہلے جتنا کھالیا' اسے ایک ہی جھٹکے میں لاکھوں کما کر وصول کر رہی ہو اور ساری زندگی تم دونوں کو کھلاتی پلاتی رہوں گی۔ اس سے زیادہ اور لالچ نہ کرو۔''

پھر وہ سیکریٹری فرید احمد سے بولی۔ ''اے منہ پھاڑے کن رہا ہے۔ تیری سمجھ میں نہیں آیا کہ تیرے لائے ہوئے کپڑے پر تھوک رہی ہوں۔ چل بھاگ یہاں سے...''

وہ زیورات کے ڈبے اور کپڑے اٹھا اٹھا کر اس پر پھینکنے لگی۔ وہ جلدی جلدی انہیں سمیٹ کر شاپر زمیں

## یادداشت

ایک شخص کی یادداشت قابلِ رشک تھی، اسے برسوں پہلے کی بات بھی یاد رہتی تھی بہت سے لوگوں نے اسے آزمایا لیکن وہ تمام شرائط جیت گیا۔ آہستہ آہستہ اس کی شہرت شیطان تک پہنچی۔ ایک دن شیطان اس شخص کے پاس آیا اور اس نے کہا۔ ''انڈا کھاؤ گے'' یہ سن کر اس شخص نے کہا۔ ''ہاں'' مگر شیطان اتنا کہہ کر چلا گیا۔ پھر وقت گزرتا گیا، اس شخص کے بچے جوان ہوئے ان کی شادیاں ہوگئیں اور ان کے بچے بھی بڑے ہوگئے۔ شیطان پھر اس شخص کے پاس آیا اور بولا۔ ''کیسا......؟''

اس شخص نے شیطان کی طرف دیکھا اور کہا ''ابلا ہوا'' شیطان نے جو یہ سنا تو کانوں کو ہاتھ لگاتا ''دادا، دادا'' کہتا بھاگ کھڑا ہوا۔

مرسلہ: قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

## کچھ خاص

☆ اگر خوشی کا ایک در بند ہو جائے تو اللہ تعالیٰ دوسرا در کھول دیتا ہے مگر ہم نہیں دیکھ پاتے وہ کھلا در، کیونکہ ہم بند دروازے کے سامنے رو رہے ہوتے ہیں۔

☆ ہر چیز ہمارے لیے تب تک اہمیت رکھتی ہے ایک حاصل ہونے سے پہلے، دوسرا کھونے کے بعد۔

☆ دوسروں کے احساسات سے مت کھیلو، کیونکہ اگر وہ کھیل تم جیت بھی جاؤ تو یقیناً اس شخص کو ہمیشہ کے لیے کھو دو گے۔

مرسلہ: مہرین ناز، حیدرآباد

****

○ ملائم زبان ہڈی کو توڑتی ہے۔

○ وہ شخص تعریف کا مستحق ہے جو کہ قوت حلم کے ساتھ شدت غضب کو زائل کر سکے۔

○ سچ کونوں میں نہیں رینگتا۔

○ بہترین کی توقع کرو۔ بدترین کے لیے تیار رہو۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

بھرنے لگا۔ معروف تجلی دور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے فون پر محبوب سے کہا۔ ''میں نے جو کہا تھا وہی ہو رہا ہے۔ ماروی نے لاکھوں کے زیورات ٹھکرا دیے ہیں۔ محبوب یہ لکھ لو کہ اسے پچاس لاکھ سے تو کیا پچاس کروڑ سے بھی خریدا نہیں جا سکے گا۔''

محبوب بہت زیادہ پر امید تھا۔ معروف تجلی کی رپورٹ سنتے ہی مایوس ہو گیا۔ کاروباری دنیا میں دولت کی مار سے ناممکن کو ممکن بنا دیا جاتا ہے۔ اس نے جہان عشق میں ایسے ہتھکنڈے آزمائے تھے اور ناکام ہو کر جھنجلا کر رہ گیا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ ''ماروی نادان ہے۔ احمق ہے۔ اسے اپنی زندگی سوارنے کی عقل نہیں ہے۔ جوانی میں پیار کی نادانی کو نہیں سمجھ رہی ہے۔ ٹھوکر کھانے کے بعد پچھتائے گی۔''

معروف نے پوچھا۔ ''چپ کیوں ہو؟ سچا عشق دنیا والوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اسے آزمانے کے بعد تمہاری سمجھ میں آجانا چاہیے۔ سچ کہتا ہوں ماروی نے اتنی دولت کو ٹھکرا کر دل خوش کر دیا ہے۔ یہ ماننا پڑتا ہے۔ غریبوں کے پاس پیار اور ایمان ہوتا ہے۔ سونے چاندی کی ہوس نہیں ہوتی۔''

''میں آپ سے پھر کسی وقت بات کروں گا۔''

محبوب نے فون بند کر دیا۔ ماروی نے اس کی آفر کو ہی نہیں' اسے بھی ٹھکرا دیا تھا۔ ٹھوکر کھانے سے جو تکلیف اور توہین ہوتی ہے۔ اسے وہ بڑے صبر و تحمل سے برداشت کر رہا تھا۔

ادھر ماروی ناراض ہو کر مراد اور چاچا کے پاس آئی۔ پھر چاچا سے بولی۔ ''تم نے اسے باتوں میں یہاں الجھایا ہے تاکہ میں ادھر کسی اور سے شادی کے لیے ہاں کہہ دوں۔ جا میں نے پچاس لاکھ کے رشتے کو ٹھکرا دیا ہے۔''

چاچا تیزی سے اپنی فتی کی طرف جانے لگا۔ ماروی نے مراد سے کہا۔ ''تمہیں بھی شرم آنی چاہیے۔ تم بھی جھوٹ بول رہے ہو۔ میرے ساتھ تماشا کر رہے ہو۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟''

''کیا مجھے دھوکا دے کر اشتہاری فلم نہیں بنا رہے ہو؟''

وہ پریشان ہو گیا۔ فوراً ہی کچھ بول نہ سکا۔ وہ بولی۔ ''تم نے قسم کھائی تھی کہ کبھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے۔''

وہ نظریں چرانے لگا۔ اس نے پوچھا۔ ''بولو قسم کھائی تھی نا...؟ پھر مجھ سے جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟ یہ قیمتی لباس پہنا کر کہہ رہے ہو کہ یہ شادی کا جوڑا ہے۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ یقین کرو ماروی! میں نے تمہیں دھوکا دیتے ہوئے بھی دھوکا نہیں دیا ہے۔''

''ارے واہ... ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دھوکا دیا ہے اور کہتے ہو یہ دھوکا نہیں ہے۔''

''میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ ''اگر میں تم سے کہتا کہ ایک اشتہاری فلم میں ایکٹنگ کرنی ہوگی تو تم راضی نہ ہوتیں۔ کیونکہ سیدھی سادی زندگی گزارنے والی لڑکیاں اداکاری نہیں کرتیں۔''

وہ سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں۔ میں راضی نہ ہوتی۔ اس لیے تم مجھے یہاں دھوکے سے لائے ہو۔''

''پہلے میری پوری بات سنو۔ اگر میں ضد کرتا۔ تم سے کہتا کہ تمہیں اداکاری آئے یا نہ آئے۔ اشتہاری فلم میں کام کرنا ہوگا۔ کیونکہ ہمیں لاکھوں روپے مل رہے ہیں۔ ہماری شادی کا مسئلہ حل ہو رہا ہے۔ تو تم ہی بولو' کیا مجھ سے شادی کرنے اور میری زندگی میں آنے سے تم انکار کر دیتیں؟''

وہ فوراً ہی انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''میں تو تمہاری دلہن بننے کے لیے جان بھی دے سکتی ہوں۔''

''میں جانتا تھا کہ تم میری ضد کے آگے جھک جاؤ گی۔ میں تمہیں یوں دھوکا نہ دیتا۔ تمہیں منا کر یہاں لے آتا۔ پھر تمہیں شکایت نہ ہوتی لیکن ایک بڑا نقصان ہوتا۔

وہ یہ کہ تم راضی ہونے کے بعد کیمرے کا سامنا کرتے ہی جھجکنے اور شرمانے لگتیں۔ تمہاری شرم اور جھجک دور کرنے میں اور تمہیں ماڈلز کے ناز و انداز سکھانے میں مہینوں لگ جاتے۔''

وہ چپ تھی اور قائل ہو رہی تھی۔ مراد نے کہا۔ ''تم جلد ہی ٹی وی اسکرین پر خود کو دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ تم نے کسی طرح کی بھی تربیت حاصل کیے بغیر فطری ناز و انداز سے ایسی ماڈلنگ کی ہے۔ جس میں ایک نیا پن' نیا پرکشش قدرتی انداز ہے۔''

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''میں نے اپنی اور تمہاری بہتری کے لیے تمہیں دو چار دنوں تک دھوکے میں رکھا ہے۔ کیا مجھے دھوکے باز کہو گی؟''

وہ اپنے شانے پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کہا تھا کہ شادی سے پہلے مجھے ہاتھ نہ لگانا۔''

''ارے واہ... ! جہاز میں خود ہی اپنے اوپر ہاتھ رکھنے کو کہا تھا۔ کیا بھول گئیں؟''

''وہ تو مجھے اس وقت ڈر لگ رہا تھا۔''



وہ مسکرائی پھر اس کے قریب آگئی۔ دونوں نے یہ عہد کیا تھا کہ شادی سے پہلے ایک دوسرے کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ماروی نے قریب ہو کر بھی فاصلہ رکھا۔ پھر کہا۔ ''تم بہت اچھے ہو۔ تم نے جو کیا' اچھا کیا۔ مگر اب یہ اشتہاری کپڑے نہیں پہنوں گی۔ انہیں پہن کر لگتا رہے گا کہ فلمی لباس ہے۔ میری شادی کا جوڑا نہیں ہے۔ میں ابھی جا کر اسے اتارتی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''یہ اشتہاری لباس ضرور ہے۔ لیکن تمہارے ہی لیے ہے۔ ابھی اتار دو۔ لیکن شادی کے بعد ضرور پہننا۔ میں سائیں سے بات کرتا ہوں۔ اب تم یہ کام نہیں کر سکو گی۔ کرو گی تو اپنی عادت کے مطابق جھجکنے اور شرمانے لگو گی۔''

اس نے جیب سے فون نکال کر محبوب سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''سائیں! گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ماروی کو معلوم ہو گیا ہے کہ اس کی اشتہاری فلم بنائی جا رہی ہے۔ اب یہ کام نہیں کر سکے گی۔''

محبوب نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ جتنا کام ہو چکا ہے' وہی کافی ہے۔ ایک بات بتاؤ' ماروی تو تم سے ناراض ہو گی۔ تم اس سے اب تک جھوٹ بولتے رہے ہو۔''

''نہیں سائیں! میری ماروی مجھ سے ناراض نہیں ہوتی اور ہوتی ہے تو میں منا لیتا ہوں' وہ مان جاتی ہے۔ پیار کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے سائیں!''

محبوب نے فون بند کر دیا۔ پیار کی وہ عجیب دنیا اسے ملنے والی نہیں تھی۔ اس کے پاس اربوں روپے تھے۔ آئندہ اور کمانے والا تھا لیکن پیار کی ایک ایسی عجیب دنیا آباد نہیں کر سکتا تھا' جس میں ماروی کے نام سے صبح ہوتی ہو اور ماروی کے نام سے راتیں روشن ہو جاتی ہوں۔

وہ کار اسٹارٹ کر کے واپس جانے لگا۔ نہ ماروی خریدی جا سکتی تھی' نہ مراد کسی لالچ میں آکر اسے چھوڑ سکتا تھا۔

محبوب کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ ''اگر میں اپنی تمام دولت' جائداد اور کاروبار مراد علی کو دیدوں اور وہ راضی ہو جائے۔ میری جگہ آکر محبوب علی چانڈیو بن جائے اور میں میمن گوٹھ جا کر مراد علی منگی بن جاؤں۔ تب تو ماروی کا پیار اور اس کا پورا وجود صرف میرے ہی لیے ہوگا۔ وہ مجھے مراد سمجھ کر ہمیشہ مجھ پر جان چھڑکتی رہے گی۔''

آدمی جو سوچتا ہے' وہ نہیں ہوتا اور وہ تو بالکل ہی ناممکن سی بات سوچ رہا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ مراد اپنی ماروی کو چھوڑ کر اس کی اربوں کی جائداد اور کاروبار کا مالک بننا نہیں چاہے گا اور وہ مراد علی منگی بن کر رہنا چاہے گا تو ماروی اس کی کسی بات سے یا کسی حرکت سے پہچان لے گی کہ وہ اس کا یار دلدار نہیں ہے۔ اس کا ہم شکل بہروپیا ہے۔

وہ کیا کرے...... جو چیز حاصل نہ ہو' وہ دن بہ دن ضروری اور بے حد ضروری ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے ریڈیو آن کیا۔ اس وقت موڈ کے مطابق اچھی سی دھیمی سی موسیقی سن کر بہلنا چاہتا تھا۔

ایک اسٹیشن سے بہت ہی دھیمی اور درد بھری موسیقی ابھر رہی تھی۔ کوئی تڑپا دینے والی آواز میں گا رہا تھا۔

میرا یار بھی توں
دلدار بھی توں
خزاں بھی توں
بہار بھی توں

گانے کے بول ایسے تھے کہ وہ ونڈ اسکرین کے پار دکھائی دینے لگی۔ کوئی گا رہا تھا اور محبوب کو یوں لگا جیسے وہ خود ماروی کے لیے گا رہا ہو۔

تجھے چھو لینا' پا لینا پیار نہیں ہے
جو ہوس کا طالب ہو' وہ یار نہیں ہے
تو ملے نہ ملے ترا دھیان رہے گا
تیرا ہی نام مری پہچان رہے گا
میرا دھیان بھی توں
پہچان بھی توں
مشکل بھی توں
آسان بھی توں

اس نے اچانک ہی ہاتھ بڑھا کر ریڈیو آف کر دیا۔ گانے کے بول اسے سمجھا رہے تھے کہ وہ ماروی کو چھو لینے اور پا لینے کی تمنا نہ کرے۔ کیونکہ ہوس کے طالب سچے یار نہیں ہوتے۔

اور ابھی وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ ہوس کا طالب ہے اور اسے سر سے پاؤں تک حاصل کر لینا چاہتا ہے؟

یا سچا یار ہے۔ اسے چھو کر میلا نہیں کرنا چاہتا؟ ارے کون ایسا پیار کرتا ہے؟ کیا وہ کر سکے گا؟

☆☆☆

جس طرح خوشبو دور تک پھیلتی ہے۔ اسی طرح مراد کی دولتمندی کا ذکر گھر گھر پہنچ گیا تھا۔ ایک غریب کے دن پھر گئے تھے۔ باقی غریبوں کی نیندیں تجسس نے اڑا دی تھیں کہ اسے اتنی دولت اچانک کیسے مل گئی؟

وہاں مراد کا باپ اپنی جھگی میں رہ گیا تھا۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، جوان سب ہی اس کے دروازے پر آتے جاتے رہتے تھے۔ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ مراد اور ماروی کے چاچا اور چاچی ساری دولت لے گئے ہیں یا جھگی میں بھی کچھ چھوڑ گئے ہیں؟

جس روز مراد لاڑکانہ گیا۔ اس کے دو دنوں کے بعد تین چور رات کے پچھلے پہر جھگی میں گھس آئے۔ وہ بوڑھا دروازے کے پاس فرش پر سو رہا تھا۔ آہٹ پر آنکھ کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا تو سر پر ایک زور کا ڈنڈا پڑا۔ اس کے دیدے پھیل گئے۔ منہ سے ایک مردہ سی کراہ نکلی۔ ایسی ضرب لگائی گئی تھی کہ بوڑھے کا سر پھٹ گیا تھا۔ وہ فرش پر گرا تو پھر اٹھ نہ سکا۔

جھگی میں دو کمرے تھے۔ وہ تینوں مال تلاش کرنے لگے۔ غریبوں کے گھروں میں سامان ہی کتنا ہوتا ہے۔ ایک کمرے میں ٹوٹی ہوئی چارپائی اور گدھے کا چارا تھا۔ انہوں نے دوسرے کمرے میں ایک پرانے صندوق کو کھول کر دیکھا۔ مراد اپنے باپ کو چھ ہزار روپے دے کر گیا تھا۔ وہ صندوق میں رکھے ہوئے تھے اور سونے کا وہ ہار بھی تھا، جو مراد کی گردن میں پھندا بن گیا تھا۔ وہ اسے محبوب کے حوالے کرنا چاہتا تھا لیکن اچانک اسلام آباد چلا گیا۔ واپس آیا تو موئنجودڑو جانے کی عجلت میں تھا۔ اس ہار کو محبوب تک پہنچانا بھول گیا تھا۔

وہ چوروں کے ہاتھ لگ گیا۔ وہاں اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ نقد چھ ہزار بھی بہت تھے۔ وہ نقدی کے ساتھ برسوں سے پڑا ہوا سونے کا ہار بھی لے گئے۔

دوسری صبح شور اٹھا کہ کسی نے مراد کے باپ کو قتل کر دیا ہے۔ پورا میمن گوٹھ اس کی لاش دیکھنے کے لیے آنے لگا۔ پولیس بھی آگئی۔ اپنے طور پر محلے والوں سے پوچھ گچھ کرنے لگی۔ اس کے بیٹے کے بارے میں پوچھا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ہوائی جہاز سے لاڑکانہ گیا ہے۔ پتا نہیں کب واپس آئے گا۔

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجا گیا۔ لاڑکانہ کی پولیس کو اطلاع دی گئی اور کہا گیا کہ مراد علی منگی پچھلی سات تاریخ کی فلائٹ سے لاڑکانہ گیا ہے۔ اسے اطلاع دی جائے کہ اس کے باپ کو قتل کیا گیا ہے۔ اسے فوراً واپس آنا چاہیے۔

مراد کی روانگی کے دو روز بعد قتل کی واردات ہوئی تھی۔ تیسرے دن لاڑکانہ کی پولیس نے معلوم کیا کہ مراد علی منگی نام کا شخص وہاں آیا تھا۔ دو دنوں تک ایک فیملی کے ساتھ ہوٹل میں رہا۔ پھر تیسرے دن کہیں چلا گیا۔ پولیس کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ شوٹنگ یونٹ کے ساتھ عمرکوٹ گیا ہے۔

وہ پانچویں دن خود ہی واپس آیا تو یہ معلوم کرکے صدمے سے گھر کی دہلیز پر بیٹھ گیا کہ یتیم ہو چکا ہے اور بوڑھے باپ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ تھانیدار نے کہا۔ ”تمہارے باپ کی لاش اسپتال کے مردہ خانے میں ہے۔ تم اسے حاصل کر کے اس کی آخری رسومات ادا کرسکتے ہو۔ اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ قتل کی وجہ کیا ہوسکتی ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”ہماری کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ میں بابا کو چھ ہزار روپے دے کر گیا تھا۔ وہ صندوق کھلا پڑا ہے۔ سامان باہر بکھرا ہوا ہے۔ یقیناً چور آئے تھے۔ انہوں نے صرف چھ ہزار کے لیے میرے بابا کی زندگی چھین لی ہے۔“

تھانیدار نے کہا۔ ”سنا ہے تم لاکھوں روپے کما کر لائے ہو۔ صندوق میں صرف چھ ہزار تو نہیں ہوں گے؟ اور کوئی قیمتی چیز چرائی گئی ہے تو بتاؤ؟“

مراد کو اچانک سونے کا ہار یاد آیا۔ وہ اس ہار کو صرف چوروں سے ہی نہیں، پولیس والوں سے بھی چھپا کر رکھتا تھا۔ کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ گناہ کی کمائی ہے۔ جلالی گوٹھ سے لایا ہے۔ وہاں کے وڈیرے کی بیٹی نے اسے دیا تھا۔

تھانیدار نے پوچھا۔ ”جواب دو۔ کیا صندوق سے اور کوئی چیز چرائی گئی ہے؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں۔ کچھ نہیں۔ صندوق میں ایسا کچھ نہیں تھا، جسے چور لے جاتے۔“

تھانیدار چلا گیا۔ مراد نے فون پر محبوب سے کہا۔ ”سائیں یہاں آتے ہی مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ یہاں کے چور اچکوں نے صرف چھ ہزار چرانے کے لیے میرے بوڑھے بےقصور باپ کو مار ڈالا ہے۔“

محبوب نے کہا۔ ”یہ تم نے بڑی افسوسناک خبر سنائی ہے۔ یہ پولیس کیس ہے۔ تم پریشان نہ ہونا۔ ابھی میرے آدمی وہاں آکر تھانے والوں سے نمٹ لیں گے۔“

وہ بولا۔ ”تھانیدار نے زیادہ پریشان نہیں کیا ہے۔ بابا کو اسپتال کے مردہ خانے سے لانے کا مسئلہ ہے۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارا سارا کام ہو جائے گا۔ میرے آدمی آجائیں تو مجھے اطلاع دینا۔“

”میری ایک عرض ہے۔ ماروی کے جو باقی تین لاکھ روپے ہیں۔ وہ ابھی ادا نہ کریں۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ قاتل ڈاکو ماروی کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“





”تمہارا اندیشہ درست ہے۔ میں نے جو دو لاکھ پہلے دیے ہیں، وہ رقم بھی مجھے لا دو۔ بڑی رقم ہمیشہ بینک میں محفوظ رہتی ہے۔ ماروی کے نام سے بینک میں اکاؤنٹ کھولا جائے گا۔ پھر تم کسی اچھی جگہ مکان لے کر اس کے ساتھ رہو گے۔“

آخری بات کہتے وقت دل میں درد سا اٹھا تھا۔ وہ مراد کو اپنی محبوبہ کے ساتھ کسی مکان میں رہنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ویسے نہ بھی کہتا تو وہ اسی کے ساتھ رہنے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔

وہ عجیب حالات سے دوچار تھا۔ اس میں انسانیت اور شرافت اتنی تھی کہ مراد کی زندگی سنوار رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی رقابت کے جذبے کے تحت ایک منفی خیال پیدا ہوتا کہ مراد نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔

دل میں خدا کا خوف بھی تھا۔ وہ منفی خیالات کو ذہن سے جھٹک دیتا تھا۔ عجیب کشمکش تھی۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ دو دلی کیفیات سے کب تک گزرتا رہے گا؟

شام تک مراد کے باپ کو قبر میں سلا دیا گیا۔ محبوب کے جو ملازم تکفین و تدفین کے لیے آئے تھے انہوں نے مراد کو حیرانی سے دیکھا۔ پہلے تو اسے اپنا باس سمجھ کر سلام کیا پھر یہ دیکھ کر حیران ہوتے رہے کہ محلے کے لوگ اسے مراد کے نام سے پکار رہے تھے اور مقتول بوڑھے کو اس کا باپ کہہ رہے تھے۔

آخر مراد نے کہہ دیا۔ ”بھائیو! میں وہ نہیں ہوں، جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں سائیں محبوب علی کا ہم شکل ہوں۔“

پھر اس نے محبوب سے فون پر کہا۔ ”یہ بات چھپنے والی نہیں ہے۔ آپ کے آدمیوں نے یہاں مجھے دیکھا ہے۔ اشتہاری فلم کی شوٹنگ کے دوران میں بھی پہلے یہی سمجھا گیا کہ میں محبوب علی ہوں۔ پھر وہ شبہ کرنے لگے کہ میں کوئی اور ہوں۔ آپ ہمارے ہم شکل ہونے کی بات چھپا نہیں سکیں گے۔“

کوئی بھی بات ہو، محبوب کا دھیان ماروی کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یہ بات میرے دماغ میں بھی آرہی ہے۔ آئندہ ہم دونوں ایک ساتھ منظر عام پر آئیں گے۔ یہ بتاؤ، ماروی کو معلوم ہوگا کہ تمہارا ایک ہم شکل ہے تو اس کے تاثرات کیا ہوں گے؟ کیا وہ مجھے دیکھنا اور مجھ سے ملنا چاہے گی؟“

”ہاں۔ وہ بہت حیران ہوگی۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو میں اسے آپ کے سامنے لاؤں گا۔“

محبوب نے ایک لمبی سانس لی۔ جیسے ماروی کو اپنے اندر کھینچ رہا ہو۔ پھر اپنی جگہ ذرا سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”مراد.....! اس میں اجازت لینے کی کیا بات ہے۔ جس طرح تم میرے اپنے ہو، ماروی بھی اپنی ہی ہے.....“

ایسا کہتے وقت ماروی اس کے دل میں بھر گئی۔ آخر کسی بہانے اسے کھل کر اپنا کہنے کا موقع مل گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ کھوتے کھوتے پا لیا ہو۔

ادھر مراد نے محسوس کیا، جب وہ کہہ رہا تھا کہ ”ماروی بھی اپنی ہی ہے“۔ تب اس کی آواز میں لرزش تھی جیسے کوئی دل میں کچھ چھپاتے وقت بولتا ہے۔

وہ نادان نہیں تھا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ محبوب نے کیوں اسے ماڈل بنایا ہے۔ نئی ماڈل کو کوئی پچاس ہزار نہیں دیتا۔ جب کہ وہ فراخ دلی سے پانچ لاکھ دے رہا تھا۔ اسی دوران میں مراد کو یہ معلوم ہوا تھا کہ جب محلے میں پانی کا ٹینکر آیا تھا۔ تب سائیں نے چھپ کر ماروی کی مختصر سی متحرک فلم بنائی تھی۔ ہوسکتا ہے۔ اسے چھپ کر دیکھتا بھی رہا ہو۔

وہ زیر لب بڑبڑانے لگا۔ ”میں کیا کرسکتا ہوں۔ ماروی کو دنیا دیکھتی ہے، وہ بھی دیکھ لیتا ہے۔ اسے دیکھ کر جانے کتنے لوگ آہیں بھرتے ہوں گے۔ سائیں بھی آہیں بھرتا ہوگا۔

میں کیا کرسکتا ہوں۔ مجھے کچھ کرنا بھی نہیں ہے۔ یہی بہت ہے کہ مجھے سائیں کی نیت معلوم ہوگئی ہے۔ میں محتاط رہوں گا۔“

وہ سوچتا ہوا ماروی کے دروازے پر آیا۔ چاچی فتی نے کہا۔ ”تو اکیلا ہوگیا ہے۔ گھر میں چولہا نہ جلانا۔ اسلام آباد جانے تک تجھے تینوں وقت ہمارے گھر میں کھانا ہے۔“

وہ ماروی کے ساتھ کھانے کے لیے بیٹھا تو چاچا جمرو نے کہا۔ ”تیرے گھر میں صرف چھ ہزار تھے۔ چوروں نے اسے نہیں چھوڑا۔ ہم نے دو لاکھ چھپا رکھے ہیں۔ دھڑکا لگا ہوا ہے، ڈاکو ہتھیار لے کر آئیں گے تو ہم کیا کریں گے؟ اپنی چاچی کو سمجھاؤ۔ کیا یہ چپ چاپ لٹ جانا چاہتی ہے۔“

فتی نے کہا۔ ”میں تم سے کہہ چکی ہوں فکر نہ کرو۔ میں ایسی جگہ چھپاؤں گی کہ چور کے باپ بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“

ماروی نے کہا۔ ”میری تو سمجھ میں نہیں آتا، ایسی کون سی جگہ ہے، جہاں چور پہنچ نہیں سکیں گے؟“

چاچی فتی نے اس کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔ ”ابھی آدھی رات کے بعد آنگن میں مٹی کھود کر نوٹوں کو

شاپر میں لپیٹ کر چھپادوں گی۔ کسی کو خبر نہیں ہوگی۔"

مراد نے پوچھا۔ "جب ضرورت ہوگی تو پھر مٹی کھود دو گی۔ دو چار سو یا ہزار نکالو گی پھر مٹی برابر کرو گی۔ ہر ضرورت کے وقت یہی کرو گی۔ یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے۔"

"تو پھر تم عقل سے بولو اتنی بڑی رقم اور کہاں چھپائی جاسکتی ہے۔ ابھی اور تین لاکھ ملنے والے ہیں۔"

وہ بولا۔ "وہ تین لاکھ یہاں نہیں آئیں گے۔ میں نے محبوب صاحب سے کہہ دیا ہے، ماروی کے نام سے بینک میں اکاؤنٹ کھلے گا۔ عقل مندی یہی ہے چاچی! اس رقم کو بھی اسی بینک اکاؤنٹ میں جمع ہونا چاہیے۔"

وہ ایکدم سے بھڑک گئی۔ ہاتھ نچا کر بولی۔ "تم کون ہوتے ہو ہماری رقم کو ادھر سے ادھر کرنے والے؟ یہ ہمارا مال ہے۔ ہمارے ہی پاس رہے گا۔"

ماروی نے کہا۔ "چاچی! ہوش میں رہو۔ مراد سے کہہ رہی ہو کہ یہ کون ہوتا ہے؟ جب کہ سب کچھ اسی کے دم سے ہو رہا ہے۔ اسی نے ہمیں لاکھوں روپے کا منہ دکھایا ہے ورنہ ہم نے ہزار دو ہزار سے اوپر کبھی نوٹ نہیں دیکھے تھے۔"

مراد نے کہا۔ "رقم کے لیے جھگڑا نہ کرنا۔ یہ سب ماروی نے کمائے ہیں۔ ماروی کے اکاؤنٹ میں رہیں گے۔"

وہ زمین پر ہاتھ مار کر بولی۔ "میں دو لاکھ تو ہرگز نہیں دوں گی۔ کیا تم ہمیں ننگا بھوکا رکھنا چاہتے ہو۔"

"اللہ کی ناشکری نہ کرو۔ وہ پروردگار ہماری اوقات سے بہت زیادہ دے رہا ہے۔ ہم یہاں سے شہر کے اچھے رہائشی علاقہ میں مکان کرائے پر لے کر رہیں گے۔ ضرورت کے وقت بینک سے رقم نکالی جائے گی۔ جب گھر میری کمائی سے چلے گا تو رقم نکالنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"ابھی شادی نہیں ہوئی۔ ماروی تمہاری نہیں ہوئی اور تم اپنا حکم چلا رہے ہو۔"

ماروی نے کہا۔ "شادی ہو یا نہ ہو۔ میں بچپن سے مراد کی ہوں۔ یہ جو کہے گا، وہی کروں گی۔ بینک میں جاکر کھاتا کھولوں گی تو کوئی مجھے روک نہیں سکے گا۔"

مراد نے کہا۔ "ابا نہ مرتا تو ابھی نکاح پڑھا کر لے جاتا۔ مسجد کے مولوی صاحب کہہ رہے تھے کہ مجھے چالیس دنوں تک کوئی خوشی نہیں کرنی ہے اور چالیس دن گزرنے میں دن ہی کتنے لگیں گے۔ چاچی لعوا نہ کرو۔ نقصان میں رہو گی۔"

جھمرو نے کہا۔ "میں فیصلہ کرتا ہوں۔ ایمان کی بات کہتا ہوں۔ ابھی جھگڑا ختم ہوجائے گا۔"

متی نے گھور کر کہا۔ "زندگی میں کوئی عقل کا کام کیا ہے جو ابھی فیصلہ کرو گے؟ میں نہیں مانوں گی۔"

"تم مانو گی۔ میری بات سن کر ایک پاؤں پر کھڑی ہو جاؤ گی۔ سنو مراد پر ہمارے ایک لاکھ روپے ہیں تھا۔ یہ ادا کرے گا تو ماروی کو لے جائے گا اور سمجھو کہ وہ ایک لاکھ ہمارے پاس آگئے ہیں اور باقی ایک لاکھ جو رہ گئے ہیں، وہ بھی ہم رکھیں گے کیونکہ ہم نے ماروی کو پال پوس کر جوان کیا ہے۔"

متی نے خوش ہو کر جھمرو کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "زندگی میں پہلی بار تم نے عقل کی بات کی ہے اور لاجواب کی ہے۔ یہ دونوں انکار نہیں کرسکیں گے اور میں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔ مرجاؤں گی پر دو لاکھ روپے کسی کے ہاتھ لگنے نہیں دوں گی۔"

ماروی نے مراد کو دیکھا پھر کہا۔ "مجھ کو اس گھر میں چالیس دنوں تک رہنا ہے۔ جھگڑا ختم کرو۔ دو لاکھ چاچی کے پاس رہنے دو۔ ہم اس رقم سے ایک پیسا بھی نہیں لیں گے۔"

چاچی نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ "خوش رہو بیٹی! پیسا تو فساد کی جڑ ہوتا ہے۔ ہمارے دلوں میں محبت ہونی چاہیے۔ ہم تو بس اپنے بڑھاپے کے لیے یہ رقم بچا کر رکھیں گے۔"

مراد نے کہا۔ "اب پیسے کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں تھوڑی دیر ماروی سے اکیلے میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں بیٹے...! کوئی بات نہیں۔ دوسرے کمرے میں یا آنگن میں چلے جاؤ۔"

وہ آنگن میں آکر دو موڑھوں پر بیٹھ گئے۔ مراد نے کہا۔ "پتا نہیں، میں کس دن اسلام آباد چلا جاؤں۔ تم سے یہ پوچھ رہا ہوں۔ اگر میرے جانے کے بعد کوئی میری شکل صورت والا یہاں آجائے تو کیا تم اسے مراد سمجھ لو گی؟"

وہ حیرانی سے بولی۔ "تمہاری شکل صورت والا کہاں سے پیدا ہوجائے گا؟ اور یہاں کیوں آئے گا؟"

پھر وہ چونک کر بولی۔ "ہاں۔ یاد آیا، تمہارے صاحب کے جو آدمی یہاں آئے تھے، ان کی باتیں چاچا چاچی نے سنی ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تم بالکل ان کے صاحب جیسے ہو۔"

"ہاں میں یہی کہہ رہا ہوں۔ ہم دونوں ہم شکل ہیں۔"

"بالکل ایک جیسے تو نہیں ہوں گے۔ آنکھ، ناک، منہ اور پیشانی میں کچھ تو فرق ہوگا۔"

"کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ خدا کی قدرت ہے۔





ہمارے چہرے تو ہیں ہی ایک جیسے، ہمارے قد اور ہماری جسامت بھی ایک جیسی ہے۔ تم دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ میں یہاں نہ رہوں اور وہ آجائیں تو تم دھوکا کھا جاؤ گی۔"

"مجھے نہ ڈراؤ۔ دھوکا کھاؤں گی پھر معلوم ہوگا تو شرم سے مرجاؤں گی۔ اس کمبخت نے ہاتھ بھی لگایا تو اپنی جان دے دوں گی۔"

"انہیں کمبخت نہ کہو۔ بری بات ہے۔ وہ ہمارے محسن ہیں۔ اب تک تو ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہم ان کی مہربانیوں سے آئندہ بھی عیش و آرام سے زندگی گزاریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ان کی عزت کروں گی۔"

"لیکن ایک بات ہے۔ تمہیں دیکھ کر تو سب ہی دل ہار جاتے ہیں۔ شاید ان کا بھی دل تم پر آجائے۔"

"پھر تو کمبخت کہنا چاہیے۔"

"نہیں ماروی! وہ جیسے بھی ہیں، بہت اچھے ہیں۔ تم ہر حال میں ان کی عزت کرو گی۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میں تمہاری محبت ہوں۔ عزت ہوں۔ تمہارے صاحب کو شرم آنی چاہیے۔"

"وہ کوئی ایسی بات نہیں کریں گے، جس کے نتیجے میں انہیں شرمانا پڑے۔ وہ بہت سمجھ دار اور عزت دار ہیں، اور عزت دار اپنی عزت سے ڈرتے ہیں۔"

"تم کچھ بھی کہو۔ سر پہ شیطان سوار ہوجائے تو عزت اور شرافت یاد نہیں رہتی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوگی وہ بہت ہی شریف آدمی ہیں۔ اگرچہ شریف آدمی بھی دل سے مجبور ہوجاتا ہے۔ بہتر ہے، ہم ایسی تدبیر کریں کہ وہ تمہارے قریب نہ آئیں۔ دور سے باتیں ہوجائیں کوئی بات نہیں۔"

وہ ذرا چپ رہ کر بولا۔ "جب کبھی میں آؤں یا صاحب ادھر آئیں تو تم مجھے پہچاننے کے لیے ان سے کہو گی کہ "میں اپنے مراد کو اس وقت پہچانتی ہوں جب وہ مجھ سے ایک بات کہتا ہے۔"

"اور تم مجھ سے کیا بات کہتے ہو؟"

"اگر سچ مچ میں رہوں گا تو تم سے کہوں گا۔ "میری ماروی کسی عمر کے شکنجے میں نہیں آئے گی۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "ہائے! تمہیں مجھ پر کتنا بھروسا ہے۔"

وہ بولا۔ "اگر محبوب صاحب، مراد بن کر آئیں گے تو یہ بات نہیں کہہ سکیں گے۔ انہیں کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ میں تمہارے سامنے آکر کیا کہتا ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی تدبیر ہے۔ تمہاری یہ بات میرے دل میں گھس گئی ہے... "میری ماروی کسی عمر کے شکنجے میں نہیں آئے گی۔"

پھر وہ بار بار یہ بات دہرانے لگی۔ اپنے مراد کی محبت سے سرشار ہونے لگی۔

☆☆☆

زندگی ہنساتی کم ہے۔ رلاتی زیادہ ہے۔ مراد اور ماروی کو لاکھوں روپے نے گھڑی بھر کو ہنسایا۔ اب رونے کی باری آگئی۔

وہ دوسرے دن محبوب علی کی کوٹھی میں جانے کے لیے اپنی جھگی سے نکلا تو دروازے کے باہر تھانیدار چار سپاہیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ "اسے ہتھکڑی پہناؤ۔"

مراد نے گھبرا کر پوچھا۔ "میں نے کیا کیا ہے؟ مجھے ہتھکڑی کیوں پہنا رہے ہو؟"

دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اس کی دونوں کلائیوں میں ہتھکڑی لگا دی۔ تھانیدار نے کہا۔ "تم پر قتل کا الزام ہے۔ تم جلالی گوٹھ کے وڈیرے کی بیٹی کے قاتل ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔ جب میں وہاں سے یہاں آیا تو وہ اپنی حویلی میں زندہ تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے حویلی کی چھت پر دیکھا تھا۔"

وہاں محلے والوں کی بھیڑ لگ رہی تھی۔ تھانیدار نے کہا۔ "تھانے چلو۔ وہاں اپنا بیان دو پھر اپنی صفائی میں جو کہنا ہے وہ عدالت میں کہو۔"

سپاہی اسے کھینچتے ہوئے لے جانے لگے۔ وہ جیب سے فون نکال کر نمبر پنچ کرنے لگا۔ تھانیدار نے فون چھین کر کہا۔ "کیا اپنے باپ کو بلا رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "آپ جانتے ہیں، محبوب علی چانڈیو میرے باس ہیں اور آپ لوگ بڑے آدمیوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ انہیں راضی رکھ کر فائدے میں رہتے ہیں۔"

تھانیدار نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر فون واپس کردیا۔ مراد نے محبوب سے رابطہ ہوتے ہی اسے اپنے حالات بتائے۔ وہ حیرانی سے بولا۔ "اس وڈیرے حشمت جلالی نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ میرا ہم شکل مفرور قاتل ہے۔"

مراد نے کہا۔ "سائیں! یہ دو برس پہلے کی بات ہے۔ میں جلالی گوٹھ چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ اتنے برسوں بعد مجھ پر خوامخواہ قتل کا الزام لگایا جارہا ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ میں ابھی تھانے پہنچ رہا ہوں۔"
رابطہ ختم ہوگیا۔ ماروی پریشان حال دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کے پیچھے منی اور جھمرو بھی تھے۔ محلے کے لوگوں نے تھانیدار سے جو سنا وہی کہہ رہے تھے کہ مراد قاتل ہے۔ اسی لیے ہتھکڑی پہنا کر لے جا رہے ہیں۔

ماروی نے روتے ہوئے پوچھا۔ "مراد! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ میں نے کسی چیونٹی کو بھی نہیں مارا ہے۔ مجھ پر جھوٹا الزام لگایا جا رہا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ گھر جاؤ۔ محبوب صاحب تھانے آ رہے ہیں۔ میں ابھی چھوٹ کر آجاؤں گا۔"

انسپکٹر اور سپاہی اسے تھانے میں لے آئے۔ وہاں وڈیرا حشمت جلالی آرام سے ایک کرسی پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے حواری تھانے کے اندر اور باہر کھڑے ہوئے تھے۔ وڈیرے نے اسے دیکھ کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "کیوں رے کتے! دو برسوں سے ادھر آکر چھپا ہوا تھا۔ سمجھتا تھا' کبھی پکڑا نہیں جائے گا مگر دیکھ لے' ہم حرام زادوں کو کس طرح ان کی ماؤں کی قبر سے بھی نکال لاتے ہیں۔"

مراد نے کہا۔ "سائیں! میں نے آپ کا نمک کھایا ہے لیکن گالی نہیں کھاؤں گا۔ آپ زبان کو قابو میں رکھیں۔ ابھی محبوب علی چانڈیو یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔ میں ان کا خاص نوکر ہوں۔ وہ گالیاں برداشت نہیں کریں گے۔"

اس نے گھور کر مراد کو دیکھا پھر پوچھا۔ "اچھا تو تم اس ایم این اے کے نوکر ہو؟ اور اس نے تمہارے جیسے قاتل بدمعاش کو قانون کی نظروں سے چھپا رکھا تھا۔"

"نہ میں نے کسی کو قتل کیا ہے۔ نہ بدمعاش ہوں اور نہ ہی قانون کے محافظوں سے چھپتا پھرتا ہوں۔ آپ مجھے جھوٹے قتل کے الزام میں پھانس نہیں سکیں گے۔"

"پھانس تو لیا ہے۔ اب پھانسی کے تختے پر بھی پہنچاؤں گا۔"

انسپکٹر اپنی کرسی پر بیٹھا ان کی باتیں دلچسپی سے سن رہا تھا اور دل ہی دل میں حساب کر رہا تھا کہ جب تک یہ کیس تھانے میں رہے گا' اوپری آمدنی بڑھتی رہے گی۔

ایک طرف وڈیرا حشمت جلالی ہے اور دوسری طرف صنعت کار محبوب علی چانڈیو ہے۔ جلالی' مراد کو نقصان پہنچانے کے لیے اور چانڈیو اسے تحفظ فراہم کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے دل کھول کر رقمیں لٹاتے رہیں گے۔

تھوڑی ہی دیر میں محبوب علی چانڈیو اپنی قیمتی کار میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں سب لوگ دو ہم شکل کو تعجب سے دیکھنے لگے۔ حشمت جلالی نے کرسی سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں مصافحہ کیا اور کہا۔ "ہم اسمبلی میں تو ملتے ہی ہیں۔ افسوس آج تھانے میں مل رہے ہیں۔"

محبوب نے کہا۔ "ہم اسمبلی میں ایک ہی پارٹی کے ایم این اے ہوتے ہیں۔ وہاں ایک رائے سے ایک آواز میں بولتے ہیں۔ یہاں تھانے میں آپ میرے لیے اپوزیشن پارٹی کے لیڈر بن کر آئے ہیں۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسمبلی کی طرح یہاں بھی دوستی اور اتحاد رہے تو میرے اس بندے پر قتل کا جھوٹا الزام نہ لگائیں۔"

جلالی نے کہا۔ "الزام جھوٹا نہیں ہے۔ اس نے ہماری حویلی کی عزت پر ڈاکا ڈالا ہے۔ میری بیٹی کے منہ پر تیزاب پھینک کر اسے قتل کیا ہے۔ اس کے خلاف ہمارے پاس پکے ثبوت بھی ہیں اور سچے گواہ بھی۔"

محبوب نے کہا۔ "گواہ خریدے جاتے ہیں اور کاروکاری کے ہتھکنڈے استعمال کر کے بہ آسانی ثبوت حاصل کیے جاتے ہیں۔ آپ نے دو برس پہلے تھانے میں یہ رپورٹ درج کرائی ہوگی کہ مراد علی منگی نے آپ کی بیٹی کے ساتھ منہ کالا کیا تھا۔ آپ نے اور آپ کے غیرت مند بیٹوں نے مراد علی منگی کو قتل کرنا چاہا تو وہ آپ کی بیٹی کو قتل کر کے فرار ہوگیا۔"

حشمت جلالی نے کہا۔ "ابھی میں جواب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ عدالت میں پہنچ کر بولوں گا۔ فی الحال یہ تو معلوم کریں کہ مراد دو برس کے بعد ہمارے شکنجے میں کیسے آیا ہے؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "میں بتاتا ہوں۔ آج سے پانچ دن پہلے چور رات کے وقت مراد کے گھر میں آئے۔ انہوں نے اس کے باپ کو قتل کیا پھر صندوق سے چھ ہزار روپے نکال کر لے گئے۔ اس رقم کے علاوہ سونے کا ایک ہار بھی وہاں سے چرایا گیا۔"

مراد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اتنے برسوں سے چھپایا ہوا ہار گلے کا پھندا بن رہا تھا۔ انسپکٹر نے کہا۔ "لیکن مراد نے ہمیں بیان دیتے وقت اتنے قیمتی ہار کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

پھر انسپکٹر نے مراد سے پوچھا۔ "بولو تم نے جھوٹ کیوں کہا کہ صندوق میں صرف چھ ہزار روپے تھے اور وہاں



چرائی جانے والی کوئی قیمتی چیز نہیں تھی؟"

مراد نے محبوب کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ اس ہار کو صندوق میں کیوں چھپا کر رکھا گیا تھا۔ محبوب نے مراد سے کہا تھا کہ وہ ہار اس کے پاس پہنچا دے۔ لیکن بے پروائی کے باعث وہ صندوق میں رہ کر چور کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

انسپکٹر نے دراز سے وہ ہار نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "چور کی شامت آئی تھی۔ وہ اسے بیچنے کے لیے اس جیولرز کے پاس گیا' جہاں سے حشمت جلالی صاحب زیورات خریدا کرتے ہیں۔ جیولرز نے اس ہار کو پہچانتے ہی اور پولیس کو اور جلالی صاحب کو فون کیا تھا۔"

حشمت جلالی نے کہا۔ "جیولر اور انسپکٹر نے مجھے ہار دکھایا اس کی رسید اب بھی میرے پاس ہے۔ یہ ہار میری بیٹی زلیخا پہنتی تھی اور یہ مراد کی جھگی سے برآمد ہوا ہے۔"

اور اس سے پکا ثبوت کیا ہوگا۔ جیولر نے ہار کی رسید خریدار حشمت علی کو دی تھی۔ وہ دونوں پکے گواہ تھے کہ وہ ہار زلیخا کے لیے خریدا گیا تھا اور وہ تقریباً ایک لاکھ روپے کا بھاری وزن کا ہار مراد کی جھگی سے برآمد ہوا تھا۔

جلالی نے دو برس پہلے ہی چوری کی یہ رپورٹ درج کرائی تھی کہ مراد زلیخا سے زیورات چھین کر اسے ہلاک کرنے کے بعد فرار ہوگیا ہے۔ یعنی اس ہار کے علاوہ اور بھی زیورات اس جھگی میں تھے اور وہ انہیں بیچ کر نقد رقم حاصل کرتا رہا تھا۔

محبوب نے شکست خوردہ انداز میں مراد کو دیکھا پھر انسپکٹر سے کہا۔ "اصل قصہ کچھ اور ہے۔ مراد اور زلیخا کے درمیان جو کچھ ہوا' اسے صرف میں جانتا ہوں اور مراد کی سچائی پر یقین کرتا ہوں۔ فی الحال حالات اور ثبوت اس کے خلاف ہیں۔ میں اس کا مقدمہ لڑوں گا۔ کل صبح ہی میرا وکیل کورٹ سے اس کی رہائی کا ضمانت نامہ حاصل کرے گا۔"

حشمت جلالی نے کہا۔ "اور میں قسم کھا کر آیا ہوں' اس کی ضمانت ہونے نہیں دوں گا۔"

محبوب نے کہا۔ "میں چیلنج نہیں کروں گا۔ مجھے جو کرنا ہے' کر گزروں گا۔"

مراد کی ہتھکڑی کھول کر اسے آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔ محبوب نے سلاخوں کے پاس آکر کہا۔ "آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ وہ ہار تمہارے گلے کا پھندا بن گیا ہے۔ فکر نہ کرو۔ میں تمہیں اس پھندے سے نکال لوں گا۔"

"میں تو بری طرح پھنس گیا ہوں۔ خدا کے بعد آپ ہی کا سہارا ہے۔ میری کسی طرح ضمانت پر رہائی کرائیں۔ میں یہاں سے گھر نہ گیا تو ماروی رو رو کر آدھی ہو جائے گی۔"

آہ ماروی۔۔۔ محبوب نے چشم تصور سے اسے روتے ہوئے دیکھا۔ بے اختیار کہا۔ "میں رونے نہیں دوں گا۔ آنسو پونچھ لو۔"

مراد نے تعجب سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "سائیں! کیا کہہ رہے ہیں؟"

"آں۔۔۔!" وہ سنبھل کر بولا۔ "تم کہتے ہونا' وہ روئے گی میں اسے رونے نہیں دوں گا۔ اس سے کہو آنسو پونچھ لے۔"

"کیسے کہوں؟ میں اندر ہوں۔ باہر نہیں جا سکتا۔"

"میں باہر ہوں۔ وہاں جا کر اسے سمجھاؤں گا۔"

وہ پریشان ہوگیا۔ جلدی سے بولا۔ "نہیں سائیں! آپ اس کے پاس نہ جائیں۔"

محبوب نے حیرانی سے پوچھا۔ "مجھے اس سے ملنے سے منع کیوں کر رہے ہو؟"

مراد نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "وہ۔ وہ آپ کو دیکھ کر سمجھے گی کہ میں ہوں۔ مجھے پا لینے کا دھوکا کھا کر روتے روتے ہنسنے لگے گی۔ جب معلوم ہوگا کہ میں نہیں ہوں تو وہ ہنستے ہنستے پھر رونے لگے گی۔ آپ اس بیچاری کو ابھی نہ الجھائیں۔"

"میں نے اب تک کسی بھی معاملے میں تمہیں نہیں

## مرض

مریض ڈاکٹر سے۔ "ڈاکٹر صاحب! مجھے آواز تو سنائی دیتی ہے مگر کوئی دکھائی نہیں دیتا۔"
ڈاکٹر حیرت سے۔ "ایسا کب ہوتا ہے؟"
مریض۔ "فون پر بات کرتے ہوئے۔"

ڈاکٹر۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ اب آپ کو کھانستے ہوئے بالکل تکلیف نہیں ہو رہی ہے۔ یہ میری دوا کا کمال ہے۔"
مریض۔ "جی نہیں ساری رات کھانسنے کی مشق کرتا رہتا ہوں۔ یہ اس کا اثر ہے۔"

مرسلہ: توصیف احمد، پٹھان کالونی، کراچی

الجھایا ہے۔ اسے بھی نہیں الجھاؤں گا۔ اور ہو سکتا ہے وہ ابھی تم سے ملنے یہاں آئے۔ تم اسے خوش دیکھنا چاہتے ہو۔ میں بھی اسے خوشیاں دینا چاہتا ہوں۔''

حشمت جلالی نے وہاں آ کر ان دونوں کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ میرے شکنجے سے مراد کی گردن نہیں نکلے گی۔ آپ بے شک جائیں۔ اس کی ضمانت لیں۔ قتل کے کیس میں آسانی سے ضمانت منظور نہیں ہوتی۔

آپ اس کا مقدمہ ضرور لڑیں۔ اگر مقدمہ لڑتے کے دوران میں یہ یقین ہو جائے کہ مراد کو سزائے موت ہوگی تو میرے پاس آئیں۔ میری ایک شرط مانیں۔ میں مقدمہ کو کمزور بنا دوں گا۔''

محبوب نے پوچھا۔ ''شرط کیا ہے؟''

''یہ شرط ابھی پوری کی جائے گی تو یہیں تھانے میں معاملہ ختم ہو جائے گا۔ ہم عدالت کا منہ نہیں دیکھیں گے۔''

''آپ کی شرط کیا ہے، بتائیں؟''

حشمت جلالی نے دونوں کو باری باری دیکھا پھر کہا۔ ''کاروکاری میں جب کاری ماری جاتی ہے تو کاری کے رشتے دار کارو کو زندہ نہیں چھوڑتے۔ یہ دستور پرکھوں سے چلا آیا ہے کہ کارو کی سلامتی چاہیے تو کارو کی یعنی مراد کی بہن یا بیٹی کا رشتہ ہمیں دینا ہوگا۔

محبوب صاحب یہ رواج، یہ دستور آپ جانتے ہیں۔ اگر مقدمہ بازی کے بغیر مراد کی سلامتی چاہتے ہیں تو اس کے گھر کی کوئی لڑکی ہماری حویلی میں بھیج دیں۔''

محبوب نے ناگواری سے کہا۔ ''کیا آپ نہیں جانتے کہ مراد کی نہ بہن ہے نہ بیٹی۔''

''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہونے والی ایک بیوی ہے۔''

مراد نے غصہ سے کہا۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ماروی ہمارے گوٹھ میں پیدا ہوئی۔ وہیں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ میں نے اس کی چاچی چاچا سے کہا تھا کہ دس ہزار لیں اور اسے حویلی میں بھیج دیں لیکن وہ بوڑھے راتوں رات گوٹھ سے نکل کر مجھے دھوکا دے کر ماروی کو یہاں لے آئے۔''

محبوب نے غصہ سے کہا۔ ''بہت اچھا کیا۔ اب ماروی کا نام زبان پر نہ لانا۔ وہ کوئی بکاؤ مال نہیں ہے۔''

جلالی نے کہا۔ ''آپ کیوں طیش میں آ رہے ہیں۔ آپ کے لیے مراد ضروری ہے۔ یہ ہمارے دستور کے مطابق کارو ہے۔ میری بیٹی کا قاتل ہے۔ آپ ماروی کے بدلے اس کی جان بچائیں۔''

محبوب نے اچانک ہی لباس کے اندر سے پستول نکال کر اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے وارننگ دی تھی کہ ماروی کا نام بھی زبان پر نہ لانا۔ لیکن تم باتوں سے نہیں لاتوں سے سمجھو گے۔ چلو زندگی بوجھ بن گئی ہے تو لو اس کا نام...''

انسپکٹر نے تیزی سے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''چانڈیو صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں؟ تھانے میں ہتھیار لے کر آئے ہیں؟''

''میرے پاس لائسنس ہے۔ میں اپنی حفاظت کے لیے اسے کہیں بھی لے جا سکتا ہوں۔ آپ اس وڈیرے کو یہاں سے لے جائیں۔ ورنہ ماروی کا نام لیتے ہی مارا جائے گا۔''

مراد حیرانی سے محبوب کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے محض ماروی کی خاطر پستول نکالا تھا۔ وہ ماروی کا سودا ہوتے اور اسے ذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے تیور کہہ رہے تھے کہ حشمت جلالی اس بار اس کا نام لیتے ہی مارا جائے گا۔

انسپکٹر فوراً ہی جلالی کے سامنے آ کر ڈھال بن گیا۔ محبوب سے بولا۔ ''یقیناً آپ کے پاس اس کا لائسنس ہوگا۔ پلیز اسے رکھ لیں۔ یہاں نمائش نہ کریں۔''

پھر اس نے وڈیرے کا بازو تھام کر کہا۔ ''اور آپ جلالی صاحب! میرے ساتھ باہر چلیں۔''

جلالی انسپکٹر کو ڈھال بنا کر وہاں سے جاتے ہوئے بولا۔ ''میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں چانڈیو صاحب! آپ کا دل بے ایمان ہو گیا ہے۔ ماروی ہے ہی ایسی چیز... اس کی خاطر آپ مراد پر مہربان ہو رہے ہیں۔''

وہ بولتا ہوا، محبوب کی نیت کو تولتا ہوا وہاں سے باہر چلا گیا۔ مراد کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی۔ وہ تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ محبوب مہربان ہے مگر اندر سے کچھ بے ایمان ہے۔

ابھی اچانک اندر کی بے ایمانی باہر آ گئی تھی۔ اب وہ کیا کرے؟ اس سے کیا بولے کہ وہ پستول دکھا کر عیاش وڈیرے کو ماروی سے دور نہ کرے؟

یہ تو ماروی کی بھلائی کے لیے تھا۔

وہ تو ماروی کا محافظ تھا۔ آئندہ بھی وڈیرے کو اس کی طرف آنے نہ دیتا۔ وہ حوالات میں رہ کر اپنی جان حیات کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا اور جو بہت کچھ کرنے والا تھا، اسے یہ کہتا کہ میری ماروی سے محبت نہ کرو؟



یہ تو سراسر حماقت ہوتی۔

محبت تو دل کا معاملہ ہے۔ کوئی کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم کسی کو دل سے نہ چاہو۔ وہ پنجرے میں تھا۔ آہنی سلاخوں کو دونوں مٹھیوں میں یوں جکڑ لیا تھا جیسے پنجرا توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

وہ آہنی سلاخوں کو ان کی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ محبوب سلاخوں کے باہر کھڑا اس کی اندرونی کیفیات کو سمجھ رہا تھا۔ دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر محبوب نے کہا۔ ''دل سچا ہو تو زبان کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ ماروی میرے حواس پر چھا گئی ہے۔''

اپنے آقا کی زبان سے یہ سچ سن کر مراد کا دل دھک سے رہ گیا۔ یوں لگا بادشاہ سلامت نے ماروی کو اس کے دل سے نکال کر اپنے دل میں بٹھا لیا ہے اور وہ محکوم بندہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکے گا۔ اس سے فریاد بھی نہیں کر سکے گا۔

محبوب نے کہا۔ ''پہلے یہ دل بے قابو ہوا۔ اب وہ دماغ میں بھر گئی ہے۔ سوتے جاگتے پاگل کرتی رہتی ہے۔ مراد! میں تمہارے سامنے دل کھول کر رکھ رہا ہوں۔ جو سچ ہے وہ بول رہا ہوں۔ تم میرے ایک اور سچ پر یقین کرو۔ میرے دل میں خوف خدا ہے۔ میں اسے تمہاری محبت اور امانت سمجھتا ہوں۔ اور کبھی امانت میں خیانت نہیں کروں گا۔''

مراد نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس نے اس کے دل کو بے قابو کر دیا ہو اور جو اس کے دماغ میں بھر گئی ہو، اسے وہ حاصل نہیں کرے گا اور اسے اپنے محکوم ملازم کی امانت سمجھ کر اس سے دور رہے گا۔

محبوب کہہ رہا تھا۔ ''محبت سب سے ہوتی ہے۔ عشق کسی ایک سے ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ماروی سے صرف تم ہی عشق کر سکتے ہو۔ میں بھی کر سکتا ہوں۔

یہ ضروری نہیں کہ وہ حاصل ہو جائے۔ محبت پا لینے اور چھو لینے کے لیے ہوتی ہے۔ وہ محبت تمہیں ماروی سے ہے۔ مجھے اس سے عشق ہے۔ وہ ملے نہ ملے۔ عشق میں پا لینے کی ہوس نہیں ہوتی۔ میں نہ پا کر اسے اور شدت سے چاہتا رہوں گا۔''

مراد الجھ سا گیا۔ وہ عجیب الجھی ہوئی سی بات کہہ رہا تھا کہ دور سے عشق کرے گا۔ قریب نہیں جائے گا۔ اسے پرائی امانت سمجھے گا۔ کیا کبھی ایسا ہوتا ہے؟

کیا دنیا میں ایسا پیار ہوتا ہے کہ خوبصورت عورت کو حاصل نہ کرے۔ دور سے اس کی پوجا کرتا رہے؟

یہ تو دیکھتا آیا تھا کہ وہ بہت ہی شریف اور غریب پرور ہے۔ وہ زبان کا دھنی ہو سکتا تھا۔ جو کہہ رہا تھا۔ اس پر قائم رہ سکتا تھا۔

مراد نے بے بسی سے کہا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ مجبوراً آپ کی شرافت اور دیانت داری پر بھروسا کر سکتا ہوں۔''

وہ حوالات کی آہنی سلاخوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''خدا کے بعد آپ کو نہیں مانوں گا تو اور کہاں جاؤں گا؟ ماروی کی سلامتی کے لیے اور کس پر بھروسا کروں گا؟

آہ! کیا کروں...؟ میں کیا کروں...؟ مجھے وڈیرے جلالی کی طرف سے بھی پریشانی ہے۔ میں یہاں قید میں رہوں گا تو وہ انتقاماً ماروی کے پیچھے پڑ جائے گا۔''

محبوب نے کہا۔ ''اس کا باپ بھی ماروی کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ میرے مسلح آدمی دن رات دور ہی دور سے اس کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ تم یہ نہ سمجھو کہ مجبوراً تمہارے دور ہو جانے سے وہ بے یار و مددگار ہو جائے گی۔ تمہاری غیر موجودگی میں وہ ایک امانت کے طور پر میری نگرانی میں رہے گی۔''

مراد نے اسے بے یقینی سے مگر احسان مندی سے دیکھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ناخدا تھا۔ بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کو وہی کنارے لگا سکتا تھا۔

انسپکٹر نے آ کر کہا۔ ''جلالی صاحب جا چکے ہیں۔ چانڈیو صاحب...! آپ تو وڈیروں کا مزاج جانتے ہیں۔ وہ دشمنی سے باز نہیں آئیں گے۔ ایک طرف عدالت میں مقدمہ لڑیں گے دوسری طرف مراد کے گھر والوں کو نقصان پہنچانے کے لیے غنڈوں سے کام لیتے رہیں گے۔''

محبوب نے کہا۔ ''میں اس وڈیرے سے نمٹ لوں گا۔''

وہ اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر، انسپکٹر کو دیتے

## اعلیٰ زندگی

اعلیٰ زندگی کی چار نشانیاں ہیں

(1) نیک گفتار

(2) نیک نیت

(3) نیک کردار

(4) نیک بخت

مرسلہ: مہرین ناز، حیدر آباد

ہوئے بولا۔ ”یہ ایک چھوٹا سا نذرانہ ہے۔ یہ کم ہو تو زیادہ ہو جائے گا۔ آپ مراد کو کھانے پینے اور رہنے کی سہولتیں دیں۔

پھر یہ کہ ماروی اور چاچا چاچی جب بھی آئیں، انہیں مراد سے ملنے کی اجازت دیں۔ کل کورٹ کھلتے ہی میں بڑی سے بڑی ضمانت دے کر مراد کو یہاں سے نکال لوں گا۔“

مراد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ محبوب کو کیا سمجھے؟ وہ اپنے اعمال سے ہمدرد اور مہربان تھا اور دل کے معاملے میں رقیب...؟

ویسے وہ خود کو رقیب نہیں سمجھتا تھا۔ نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ناقابل انکار حقیقت ہے۔ ایک معشوق کے دو طلب گار ایک دوسرے کے رقیب ہی ہوتے ہیں۔

محبوب نے صاف طور پر کہا تھا۔ ”تم دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ماروی سے صرف تم ہی عشق کر سکتے ہو۔ میں بھی کر سکتا ہوں... محبت پا لینے اور چھو لینے کے لیے ہوتی ہے۔ وہ محبت تمہیں ماروی سے ہے۔ مجھے اس سے عشق ہے۔ وہ ملے نہ ملے، عشق میں پا لینے کی ہوس نہیں ہوتی...“

اس نے بڑی دیانت داری سے اپنے اندر کی باتیں سنا دی تھیں۔ مراد سمجھتے ہوئے بھی اسے رقیب نہیں کہہ سکتا تھا لیکن دل کہہ رہا تھا کہ وہ ایسا عاشق ہے یا رقیب ہے، جس کی ذات سے ماروی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔

وہ انسپکٹر سے بولا۔ ”مراد کے پاس فون ہے۔ آپ اسے فون رکھنے کی اجازت دیں۔ ہم دونوں جب چاہیں گے ایک دوسرے سے باتیں کر سکیں گے۔“

مراد سلاخوں کو تھامے کھڑا تھا۔ محبوب نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں جا رہا ہوں۔ تم جب چاہو، مجھے کال کرو۔ مجھے آدھی رات کو بھی بلاؤ گے تو دوڑا چلا آؤں گا۔“

”سائیں! میں آپ کے احسانات کبھی نہیں بھولوں گا۔ خدا آپ کو دشمنوں سے اور دنیا کی تمام مصیبتوں سے بچائے۔“

محبوب اس کے ہاتھ کو تھپک کر انسپکٹر کے ساتھ تھانے سے باہر آیا۔ وہاں اس کی کلرڈ شیشوں والی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے انسپکٹر سے کہا۔ ”آپ حشمت جلالی کو کسی بھی طرح کیس یہیں ختم کرنے پر راضی کریں۔ میں آپ کو دو لاکھ روپے دوں گا۔“

انسپکٹر نے خوش ہو کر کہا۔ ”میں نے تھوڑی دیر پہلے اس وڈیرے سے یہی کہا تھا کہ عدالت میں نہ جائیں۔ یہیں کچھ لے دے کر معاملہ طے کرلیں۔ وہ ماروی کی بات کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا...“

محبوب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”پلیز آگے کچھ نہ کہیں۔ میں اس سے کہہ چکا ہوں کہ ماروی کا نام زبان پر لائے گا تو اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اچانک ہی ماروی سامنے آ گئی تھی۔ یوں لگا جیسے دعا قبول ہو گئی ہو۔ وہ بڑی دیر سے سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے دلدار سے ملنے یہاں آئے گی تو اسے روبرو دیکھ سکے گا، اور وہ آ گئی تھی۔

وہ سحر زدہ سا ہو کر دیکھنے لگا۔ وہ کچھ فاصلے پر تھی۔ چاچا چاچی کے ساتھ تھانے کی طرف آ رہی تھی۔ قریب آتے ہی مراد کے ہم شکل کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

پہلی بار دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ وہ تھوڑی دیر تک محبوب کو ایسے دیکھتی رہی جیسے مراد رہائی پا کر حوالات سے باہر آ گیا ہو۔ پھر اس کے بدن پر مہنگے لباس نے اور مہنگی گاڑی نے فوراً ہی سمجھا دیا کہ وہ مراد کو نوکری دینے والا آقا ہے اور اتنا ہی نہیں، اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کا عاشق بھی ہے۔

اس نے ایکدم سے گھبراتے ہوئے شرماتے ہوئے سر پر آنچل رکھتے ہوئے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور کیا کرتی؟ اپنے مراد سے ملنے آئی تھی۔ ملنے سے پہلے اس کی پرچھائیں سامنے آ گئی تھی۔

جتی اور جمرو نے مراد کے ہم شکل کے بارے میں سنا تھا۔ وہ پہلی بار آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جمرو نے پہلی نظر میں دھوکا کھا کر پوچھا۔ ”مراد! تجھے رہائی مل گئی ہے۔ خدا کا شکر ہے۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”یہ جناب محبوب علی چانڈیو صاحب ہیں۔“

ان بوڑھوں کے ہاتھ ایکدم سے بڑی حیرانی سے اپنی پیشانیوں پر آئے۔ وہ سلام کر رہے تھے اور کن انکھیوں سے ماروی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سوال تھا کہ اس کے دل کا کیا حال ہو گا؟

مراد اس کے پاس نہ ہوتے ہوئے بھی پاس ہی تھا۔ محبوب تو گم صم سا تھا۔ منہ پھیرنے والی کو پلکیں جھپکائے بغیر تک رہا تھا۔ اس کی صورت ادھر ہو گئی تھی۔ وہ چھپی چھپی سی تھی اور سامنے بھی تھی اور اس مراد کی تھی جسے حالات نامراد بنا رہے تھے اور محبوب بامراد ہونے اور نامراد ہونے کی درمیانی دہلیز پر کھڑا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں



”ربیکا کو اُچک لیا گیا ہے۔“ جوزف نے یہ کہتے ہوئے سر کو اس طرح جھکائی دی جیسے کوئی باکسر حریف کے زوردار پنچ سے بچنے کے لیے کرتا ہے۔ اس کی چھوٹی سیاہ آنکھیں چوکسی سے لیونارڈو کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

”اچک لیا گیا ہے، سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ لیونارڈو نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ناگواری کے تاثرات اس کے چہرے سے عیاں تھے۔ وہ کسی مووی اسٹار کے

## کوئلے کی دلالی میں ہونے والے کالے ہاتھوں کا انجام

اگرچہ شاطر ہمیشہ دو دھاری تلوار کے مانند وار کرتا ہے مگر... اسی ہوشیاری میں جب اس کی ”ہوش“ سے ”یاری“ ختم ہو جاتی ہے تو ہر تدبیر الٹی ہو جاتی ہے اور پھر سونے پر سہاگا یہ کہ خبر بھی تب ہوتی ہے جب ساری کشتیاں جل کر خاک ہو جاتی ہیں... ایسے میں اس خاک پر آنسو بہانے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

# تاوان

سلیم انور



مانند دراز قامت اور ہینڈسم شخص تھا۔ اس کے سیاہ بال چمکیلے....، آنکھیں چونکا دینے والی نیلی اور لمبی انگلیاں خوش وضع تھیں۔

''کسی نے اسے اغوا کرلیا ہے۔''

''تم مذاق کررہے ہو؟''

''لیونارڈو، میں اپنی طرف سے ایسی کوئی بات نہیں گھڑ سکتا۔'' جوزف نے تکلیف دہ لہجے میں کہا۔ ''ورنہ تم مجھے مار ڈالو گے۔''

''ہاں۔ ویل کوئی بھی میری بیوی کو یوں نہیں لے جاسکتا۔ وہ مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا۔'' لیونارڈو نے کہا۔

''تم اب کیا کرو گے؟'' جوزف نے جاننا چاہا۔

''تمہیں خود پتا چل جائے گا۔ بہرحال یہ بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟''

☆☆☆

ربیکا نے ففتھ ایونیو پر واقع بلومنگ ڈیل شاپنگ مال سے باہر قدم رکھا تو اس کے دونوں ہاتھ بھرے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ننھے ہاتھوں میں ہینڈل والے تین بلومی پیپر بیگ، ایک ہیٹ بکس اور اپنا پرس سنبھالا ہوا تھا۔ بے ڈھب ہونے کے باوجود اسے ہیٹ بکس بے حد پسند تھے۔

وہ جب شاپنگ مال سے باہر نکلی تو اس کے نئے شوفر کی نگاہ اس پر نہیں پڑسکی کیونکہ وہ کار کی ہیڈ لائٹس پالش کرنے میں مصروف تھا۔ اس لیے وہ اس بات سے بے خبر رہا کہ ربیکا کے باہر نکلتے ہی دو اجنبی اسے زبردستی دھکیل کر قریب کھڑی ہوئی ایک وین کی جانب لے جارہے ہیں۔ ان دونوں نے ربیکا کا ایک ایک بازو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

چونکہ ربیکا کے دونوں ہاتھ پیکٹوں سے گھرے ہوئے تھے اس لیے وہ فوری طور پر اپنے بچاؤ کے لیے کسی حکمت عملی سے کام نہیں لے سکتی تھی۔ اس نے اپنے تھیلوں سے ان دونوں پر اندھا دھند ضربیں لگانا شروع کردیں لیکن اپنی تین انچ اونچی ہیل والے جوتوں کی وجہ سے وہ خود کو لڑھکنے سے بچانے کے لیے اپنے دفاع پر زیادہ توجہ نہیں دے پارہی تھی۔

''مجھے چھوڑ دو!'' پھر وہ چیخ پڑی۔

راہ چلتے لوگوں میں سے چند نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا تو دراز قامت صرف مسکرادیا اور بولا۔ ''ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے جارہے ہیں۔''

تب لوگوں نے ان پر سے توجہ ہٹادی اور اپنی اپنی راہ چل دیے۔

ان دونوں نے ربیکا کو پکڑ کر وین کے عقبی حصے میں دھکیل دیا۔

''کیا تم لوگ پاگل ہو؟ مجھے چھوڑ دو!'' ربیکا اب بھی ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔

انہوں نے ربیکا کو ایک نشست پر بٹھا دیا۔ ربیکا نے بیٹھتے ہی اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلوں سے ان پر ضربیں لگانا شروع کردیں۔ ان میں سے ایک تھیلا پستہ قد کے گھٹنے سے ٹکرایا تو اس کی چیخ نکل گئی اور فضا میں چارلس آف دی رٹز کی بھینی بھینی مہک پھیل گئی۔

''اس نے پرفیوم کی بوتل میرے گھٹنے پر پھوڑ دی ہے۔'' پستہ قد کراہنے لگا۔

''یہ رونا دھونا بند کرو!'' دراز قامت نے اسے جھڑک دیا۔ ''یہ بوتل تمہاری کھوپڑی پر بھی پھوٹ سکتی تھی۔''

پھر ان دونوں نے پھرتی کے ساتھ تمام پیکٹ ربیکا کے ہاتھوں سے چھین کر علیحدہ کردیے اور اس کی کلائیوں میں ہتھکڑی پہنادی۔ پھر اس کے دونوں پیر ریشم کی ٹائیوں سے باندھ دیے اور منہ پر ایک کپڑا کس دیا تاکہ وہ کوئی آواز نہ نکال سکے۔ پھر پستہ قد اتر کر سامنے وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر چلا گیا جبکہ دراز قامت وہیں ربیکا کے پاس بیٹھ گیا اور اس کی جانب دیکھ کر بناوٹی ہنسی ہنسنے لگا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ ربیکا سے مخاطب ہوا۔ ''ہائے، میرا نام فرینکی ہے۔ فرنٹ پر جو گاڑی چلارہا ہے وہ ٹونی ہے اور تم ربیکا لیونارڈو ہو۔ ٹھیک؟''

ربیکا منہ میں کپڑا ہونے کی بنا پر کوئی جواب نہ دے سکی اور اسے گھورتی رہ گئی۔

جب وین جارج واشنگٹن برج کے ٹول گیٹ پر پہنچی تو فرینکی نے ربیکا کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ ربیکا اس بات پر یقین کرنے سے قاصر تھی کہ وہ لوگ اسے نیو جرسی لے جارہے ہیں۔

تقریباً نصف گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وین رک گئی۔ ربیکا کے کانوں میں اگنیشن سے چابی نکالنے اور دروازے کھلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ انہوں نے ربیکا کو کھینچ کر وین سے نیچے اتارا اور پھر اسے پکڑ کر کسی سیڑھی سے نیچے اتارنے لگے۔

پھر ان ہاتھوں نے ربیکا کو ایک نرم سی کرسی پر دھکیل دیا اور اس کی آنکھوں کی پٹی کھول دی۔

ربیکا نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کسی مکان کے سیلن زدہ بیسمنٹ میں تھے۔ ٹونی نے آگے بڑھ کر اس تہ خانے کی سیڑھیوں کا دروازہ بند کردیا۔ تہ خانے کی چھت کے ساتھ الگنی پر گیلے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں ایک قدیم واشر رکھا ہوا تھا۔ قریب میں استری کا ایک اسٹینڈ موجود تھا۔ ایک جانب ایک پرانی آئل فرنیس تھی جو اس لحاظ سے مہلک دکھائی دے رہی تھی کہ اس میں سے نکلنے والے پائپ عجیب انداز میں مختلف زاویوں پر بل کھا رہے تھے۔

جو سیڑھیاں اوپری مکان کی جانب جارہی تھیں وہ خستہ حال اور لکڑی کی بنی ہوئی تھیں اور ان کا گرے پینٹ بھی ماند پڑچکا تھا۔

ربیکا کو جس کرسی پر دھکیلا گیا تھا وہ ستانے والی ایک آرام کرسی تھی۔ ٹونی اور فرینکی ان فولڈنگ کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے جو ایک اینامل ٹیبل کے گرد رکھی ہوئی تھیں۔ اس پورے بیسمنٹ میں جو واحد ماڈرن شے دکھائی دے رہی تھی وہ ایک ٹیلی فون سیٹ تھا جو اس میز کے عین درمیان میں رکھا ہوا تھا اور کمرے میں موجود واحد بلب کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔

''اوکے!'' دراز قامت فرینکی نے کہا۔ ''ہم تمہارے شوہر کو فون کرنے جارہے ہیں۔ اگر اس نے تم سے بات کرنا چاہی تو ٹونی تمہارے منہ پر سے کپڑا ہٹادے گا لیکن کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔'' اس کا لہجہ تنبیہی تھا۔

ربیکا نے اثبات میں سر ہلادیا۔

لیونارڈو سے رابطہ کرنے کی کوشش میں ٹونی نے دو مرتبہ رانگ نمبر ملادیے۔ جب لیونارڈو کا نمبر مل گیا اور اس نے فون پر اپنے نام کی تصدیق کردی تو فرینکی نے ٹونی سے ریسیور لے لیا۔

''تمہاری بیوی ہمارے پاس ہے۔'' فرینکی نے کہا۔ ''اسے واپس حاصل کرنے کے لیے تمہیں دس لاکھ ڈالرز ادا کرنا ہوں گے۔ اس بارے میں پولیس کو ملوث کرنے سے باز رہنا ورنہ تمہاری بیوی تمہیں زندہ حالت میں واپس نہیں ملے گی۔ چھ گھنٹے بعد رقم سمیت فون کے پاس موجود رہنا۔ ہم اس معاملے کو ضرورت سے زیادہ طول نہیں دینا چاہتے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک منٹ تک فون پر کچھ سنتا رہا، پھر سر کی جنبش سے ٹونی کو اشارہ کیا کہ وہ ربیکا کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دے۔

جب ٹونی نے ربیکا کے چہرے پر سے کپڑا ہٹادیا تو

فرینکی نے ریسیور ربیکا کے کان پر لگا دیا۔

ربیکا فون پر چیخ پڑی۔ ”فرینکی، ٹونی، نیوجرسی......“

فرینکی نے فوراً ہی ایک جھٹکے سے ریسیور ربیکا کے کان سے ہٹا دیا اور اسے ایک الٹے ہاتھ کا تھپڑ جڑ دیا۔

”یہ تمہارا اپنی بیوی سے بات کرنے کا آخری موقع تھا۔ اب جب تک ہمیں تاوان کی رقم نہیں مل جاتی تم اس کی آواز نہیں سن سکو گے۔“ یہ کہہ کر فرینکی نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور ربیکا کو شعلہ فشاں نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”تم احمق عورت ہو یا کیا ہو؟“

”نہیں، میں کوئی احمق نہیں ہوں۔“ ربیکا نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیتے ہوئے غصے سے کہا تو اس کے سیاہ ریشمی بال ہوا میں لہرا گئے۔ اس کی براؤن آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

ربیکا نازک اندام ہونے کے باوجود ایک پرکشش عورت تھی۔ اس نے دیکھا کہ فرینکی کی نظریں معنی خیز انداز میں سر سے پیر تک اس کے جسم کا جائزہ لے رہی ہیں۔ ”احمق تم ہو جو اس بدتمیز، اجڈ کے ساتھ جڑے ہوئے ہو اور مجھے تم نے باندھ رکھا ہے۔“

”اے عورت، زبان سنبھال کے!“ ٹونی نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ”ہم یہاں تک آ گئے ہیں تو اور آگے بھی جا سکتے ہیں۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے گردن پر چھری پھیرنے کی دھمکی دی۔

”یہ محض تمہارا خیال ہے۔“ ربیکا نے اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نہ صرف تمہارے ناموں سے واقف ہو چکی ہوں بلکہ تمہارے حلیے بھی ذہن نشین کر لیے ہیں۔ تم لوگوں میں کسی کو قتل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔“

”تمہیں صرف ہمارے ابتدائی نام معلوم ہیں اور پلاسٹک سرجری کرنے والوں کی قطار لگی ہوئی ہے۔ ہمیں تمہیں قتل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہم تمہیں اسی طرح باندھے رکھنا چاہتے ہیں اور اسی حالت میں تمہارے شوہر کے پاس پہنچانا چاہتے ہیں جیسا کہ ہم نے اس سے وعدہ کیا ہے۔ یہ سب کچھ جلد ہی نمٹ جائے گا۔ اس دوران اگر تم نے عمدہ رویہ اختیار کیے رکھا تو ہم تمہارے منہ پر سے کپڑا ہٹائے رکھیں گے۔ اگر تم نے چیخنے چلانے کی کوشش کی تو وہ بے سود ہوگی کیونکہ تمہاری آواز یہاں کوئی نہیں سن سکے گا۔ ہم تہ خانے میں ہیں۔ لہٰذا اپنے پھیپھڑوں کی طاقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہم دونوں میں سے ایک ہر وقت تمہارے پاس موجود ہوگا۔“

”مجھے یہ سن کر سنسنی محسوس ہو رہی ہے۔“ وہ غصے سے ان دونوں کو گھورتے ہوئے بولی۔

”تم آخر کس مٹی کی بنی ہوئی ہو؟“ ٹونی نے پوچھا۔ ”تمہیں تو ہم سے خوف زدہ ہونا چاہیے اور ہماری منت سماجت کرنی چاہیے۔“

”پلیز......“ ربیکا نے اس لفظ کو کھینچتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔ میں نے لیونارڈو سے شادی کی ہے۔“ ربیکا کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”تو پھر کیا ہوا؟“

”تو پھر یہ کہ یہ وہ خوف زدہ کرنے والا عمل تھا جو میں نے اپنی زندگی میں کبھی کیا تھا۔ لیکن یہ کارگر رہا اور اب میں کسی کے ڈراوے میں آنے والی نہیں۔“ ربیکا نے جواب دیا۔ وہ جانتی تھی کہ لیونارڈو کسی گروہ سے وابستہ ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس چیز میں مہارت کا حامل ہے۔

فرینکی نے شانے اچکا دیے اور ایک سگریٹ سلگالی۔

”کیا یہ ضروری ہے؟“ ربیکا نے سگریٹ کی جانب اشارہ کیا۔ ”مجھے اس سے الرجی ہے۔“

”اوہ!“ فرینکی نے سگریٹ بجھا کر فرش پر پھینک دی۔

پھر وہ تینوں فرش پر پڑے سگریٹ کے ٹوٹوں پر نظریں جمائے اپنے اپنے خیالوں میں کھو گئے۔

”تم لوگوں نے مجھے ہی کیوں اغوا کیا؟“ ربیکا نے اچانک پوچھ لیا۔

”ہم نے تمہیں بار ہا بلومنگ ڈیل شاپنگ مال سے لدے پھندے نکلتے ہوئے دیکھا تھا تو اندازہ لگایا کہ تم ایک تگڑی اسامی ہو سکتی ہو۔ لہٰذا گزشتہ ماہ موقع پاتے ہی ٹونی تمہارا پرس چھین کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس پرس میں موجود تمہارے ڈرائیونگ لائسنس پر تمہارے گھر کا پتا تحریر تھا۔ ہم نے کچھ دنوں تک تمہارے گھر کی چوری چھپے نگرانی کی تو دیکھا کہ تمہارا شوہر لیموزین یا دیگر قیمتی گاڑیوں میں آتا جاتا ہے۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ اس گھر میں دولت کی ریل پیل ہے۔ پھر تم بھی نازک اندام تھیں جس پر نہ صرف ہم دونوں بہ آسانی قابو پا سکتے تھے بلکہ تمہیں سنبھالنے میں بھی ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی تھی۔ اس لیے ہمیں یہ آئیڈیا عمدہ لگا۔“ فرینکی نے وجہ ترغیب بتانے کے بعد شانے اچکا دیے۔

یہ سن کر ربیکا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔



”میں کچھ چہل قدمی کرنا چاہتا ہوں۔“ فرینکی نے کہا۔ ”ساتھ ہی ہم لوگوں کے کھانے کے لیے بھی کچھ ساتھ لیتا آؤں گا۔ اب اس پر پوری توجہ مرکوز رکھنا، ٹونی۔“

یہ کہہ کر فرینکی تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا باہر نکل گیا۔

فرینکی کے جانے کے بعد ٹونی نے کمرے میں اکڑ کر ٹہلنا شروع کر دیا جیسے ربیکا پر دھونس جمانا چاہ رہا ہو۔ ربیکا نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور نظر انداز کیے رہی۔ وہ اس دوران ٹونی کے سراپے کا بھرپور جائزہ لے چکی تھی۔ وہ نولین کے مانند پستہ قامت تھا۔ وہ بار بار اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا اور اپنے سستے سے چمکدار سوٹ پر سے گرد یوں جھاڑ رہا تھا جیسے تہ خانے میں مٹی اڑ رہی ہو۔ اس کی آنکھوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور اس کی ناک بھی خاصی لمبی تھی۔ ہونٹ بھی بے حد دبلے پتلے تھے۔

پھر ٹونی کا تصور ذہن سے نکالنے کے لیے ربیکا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر بعد فرینکی لوٹ آیا۔ وہ میٹ بال سینڈوچز، چپس اور کوکا کولا کے ٹن ساتھ لایا تھا۔

”آؤ، اسے اٹھا کر یہاں لے آئیں۔“ اس نے ٹونی سے کہا۔ پھر ان دونوں نے ربیکا کو اٹھایا اور اسے فولڈنگ کرسیوں میں سے ایک پر بٹھا دیا۔ ٹونی نے ایک چادر کو بل دے کر رسی سی بنا ڈالی اور ربیکا کی کمر کے گرد لپیٹ کر اسے کرسی سے باندھ دیا۔ ربیکا کی پنڈلیاں بدستور بندھی ہوئی تھیں البتہ انہوں نے ربیکا کے ہاتھوں سے ہتھکڑیاں کھول دیں۔

”اب تم کھانا کھا سکتی ہو۔“ فرینکی نے کہا۔ ”اس کے بعد ہم تاش کھیلیں گے۔“

کھانے کے دوران ربیکا فرینکی کا جائزہ لیتی رہی۔ شکل صورت میں وہ ٹونی سے قدرے بہتر تھا لیکن زیادہ اچھا بھی نہیں تھا۔ اس کے براؤن بال گھنے اور بے ترتیب تھے۔ براؤن آنکھیں دل گداز تھیں۔ ناک اونچی اور کان بڑے بڑے تھے۔

ٹونی نے لنچ کے ریپرز سمیٹ کر میز صاف کر دی اور ایک بوسیدہ سی تاش کی گڈی نکال لی۔ فرینکی نے کہا کہ اسے تھری ہینڈڈ پوکر سے نفرت ہے، لہٰذا انہوں نے اسپیڈز کا کھیل شروع کر دیا۔

ربیکا ہر مرتبہ انہیں اطمینان سے ہراتی رہی۔

جب چھ گھنٹے گزر گئے تو ٹونی نے ربیکا کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور ہاتھ باندھ دیے۔ پھر ٹونی نے لیونارڈو کا نمبر ڈائل کیا اور فون فرینکی کی جانب بڑھا دیا۔

جب لیونارڈو نے دوسری جانب سے فون اٹھایا تو فرینکی بولا۔ ”لیونارڈو، رقم اپنی کار میں لے کر بے یونی میں شکستہ اسٹریٹ پر واقع براؤن ویئر ہاؤس پہنچ جاؤ اور رقم کا بیگ داخلی دروازے کی سیڑھیوں پر رکھ کر پلٹ جانا، پھر کار میں سوار ہو کر اس بلاک کے آخری سرے پر پہنچ کر رک جانا۔ تمہیں تنہا آنا ہوگا۔ رقم چیک کرنے کے بعد تمہاری بیوی تمہیں واپس مل جائے گی، اس لیے وہیں انتظار کرنا، گاڑی لے کر چلے مت جانا۔ اگر ہمیں کسی بھی قسم کا کوئی شبہ ہوا یا تم نے کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا کہ ہم رقم کا بیگ اٹھانے نہیں آئیں گے اور نازک اندام ربیکا زندہ نہیں رہے گی۔ تم سمجھ گئے؟ تمہیں ایک چانس دیا جا رہا ہے۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی چانس نہیں ملے گا۔ اوکے؟“

دوسری جانب سے جواب ملنے پر فرینکی دوبارہ گویا ہوا۔ ”ٹھیک ہے، پینتالیس منٹ میں وہاں پہنچ جاؤ۔“

پھر اس نے شائستگی سے ریسیور نیچے رکھ دیا اور ٹونی کی جانب دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ”اس نے کوئی بحث نہیں کی۔ اب وہ اڑتا ہوا وہاں آئے گا۔“

انہوں نے ربیکا کے ہاتھوں میں دوبارہ ہتھکڑیاں پہنا دیں اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ پھر اسے تہ خانے کی سیڑھیوں پر سے اٹھا کر اوپر لے آئے اور وین میں بٹھا دیا۔ پھر وین اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

ربیکا نے کوشش کی کہ سڑک کے موڑ شمار کر کے یاد رکھ سکے۔ لیکن ٹونی بار بار وین کو گھما رہا تھا۔ ربیکا گنتی یاد نہ رکھ سکی اور پھر اس نے یہ کوشش ترک کر دی۔ البتہ اس بارے میں اسے پختہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ بار بار ایک ہی بلاک کے اطراف میں گھوم رہے ہیں اور غالباً یہ چیک کر رہے ہیں کہ کہیں پولیس ان کی تاک میں تو نہیں ہے۔

بالآخر وین رک گئی اور وہ خاموشی سے انتظار کرنے لگے۔

”وہ رہی کار!“ ٹونی نے سرگوشی کے انداز میں فرینکی کو مخاطب کیا۔

”ہاں اور وہ بالکل ہماری ہدایات کے مطابق عمل کر رہا ہے۔“ فرینکی نے جواب دیا۔

ایک منٹ بعد فرینکی بولا۔ ”اب دھیمی رفتار سے آگے بڑھنا شروع کرو۔“

ربیکا کو وین کا دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے محسوس ہونے لگے۔ ساتھ ہی فرینکی کے بھاری قدموں کی دھمک سنائی دی جو زمین پر کودا تھا۔

پھر پلک جھپکتے میں وہ واپس وین کے اندر آ گیا۔ ساتھ ہی کسی بریف کیس کا کھٹکا کھلنے اور حیرت سے سانس کھینچنے کی آواز سنائی دی۔ پھر کاغذوں کی ہلکی سرسراہٹ کی آوازیں آنے لگیں۔

"پوری رقم اس میں موجود ہے۔" فرینکی نے کہا تو ٹونی نے ایک جھٹکے سے وین آگے بڑھا دی۔ ربیکا فرش پر گرتے گرتے بچی۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وین کی رفتار بے حد کم ہوگئی۔ ساتھ ہی دروازہ ایک بار پھر کھلنے کی آواز ابھری۔ ٹونی نے اسے اپنی طرف کھینچا اور پھر اسے وین سے باہر دھکیل دیا۔ دوسرے لمحے سڑک پر ٹائروں کی چرچراہٹ گونجی اور وین تیز رفتاری سے دور ہوتی چلی گئی۔

ربیکا سڑک پر سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ بدستور پشت پر ہتھکڑیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا، آنکھوں پر پٹی بھی موجود تھی اور پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔

پھر اسی بے بسی کے عالم میں ربیکا کو ایک اور کار کی آواز سنائی دی جو قریب آرہی تھی۔ پھر کار کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

دوسرے لمحے لیونارڈو نے اسے تھام کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ جب لیونارڈو نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا باہر نکالا اور اس کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی ہٹادی تو ربیکا سسکیاں لینے لگی۔ لیونارڈو نے اسے اٹھالیا اور اپنی کار کی پسنجر سیٹ پر لے جاکر بٹھادیا۔ دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چاقو دکھائی دیا جو اس نے نہ جانے کس وقت اور کہاں سے نکال لیا تھا۔

ربیکا ایک لمحے کے لیے سناٹے میں آگئی لیکن پھر اطمینان کا سانس لیا جب لیونارڈو نے اس کے پیروں کی بندش کاٹ دی۔ "ہتھکڑیوں کو کھولنے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔" لیونارڈو نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ربیکا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم ٹھیک تو ہونا؟" لیونارڈو نے پوچھا۔

ربیکا نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

تب لیونارڈو نے اسے اپنے سینے سے چمٹالیا۔ وہ اس کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ "ویل، میں تمہارے بارے میں زیادہ پریشان نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ تم اپنے آپ کو خود سنبھالے رہوگی۔" لیونارڈو نے قدرے فخریہ لہجے میں کہا۔

"لیکن لیونارڈو، دس لاکھ ڈالرز! تم نے اتنی جلدی اتنی بڑی رقم کا انتظام کس طرح کرلیا؟ اور اب ہم اس کے بغیر اپنا گزارہ کس طرح کریں گے؟" ربیکا نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

"میں نے حقیقت میں تمہیں یہ کبھی نہیں بتایا کہ میں کس کاروبار سے وابستہ ہوں۔ ہے نا؟"

"نہیں۔ لیکن میں نے ہمیشہ یہی خیال کیا ہے کہ جو بھی کاروبار ہے وہ جائز دکھائی نہیں دیتا۔" ربیکا نے جواب دیا۔

تب لیونارڈو نے ہلکا سا قہقہہ بلند کیا۔ "واقعی کاروبار جائز نہیں ہے۔ لیکن ہے بہترین کاروبار۔"

"کیا کاروبار ہے؟"

"جعلی کرنسی کا کاروبار۔"

"جعلی کرنسی کا کاروبار!" ربیکا نے قدرے حیرانی سے کہا۔

"ہاں، اور ان دونوں احمقوں کے پاس جعلی نوٹوں کا بریف کیس ہے۔ وہ جعلی نوٹ چلانے کے جرم میں جلد ہی پکڑے جائیں گے اور انہیں جیل ہوجائے گی۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکیں گے کہ انہوں نے یہ جعلی نوٹ کس طریقے سے حاصل کیے تھے۔ اس لیے کہ اغوا کا جرم جعلی کرنسی چلانے کے جرم سے کہیں زیادہ بدتر ہے۔ انہوں نے اپنا ہوم ورک صحیح طریقے سے نہیں کیا تھا۔ میں نے تو اسی وقت جان لیا تھا کہ وہ احمق لوگ ہیں، جب جوزف نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہیں اغوا کر کے لے گئے ہیں۔" لیونارڈو نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔

تب ربیکا بھی ہنس دی۔ "وہ پلاسٹک سرجری کرانا چاہتے ہیں۔ وہ جعلی نوٹوں سے جعلی چہرے بنوانے کی کوشش کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم پولیس کو تو فون نہیں کروگے۔"

"ضرورت ہی نہیں۔" لیونارڈو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی کار کو گیئر میں ڈالتے ہوئے ایکسی لریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

کار تیز رفتاری سے دوڑنے لگی اور فضا میں ان دونوں کے قہقہے گونجتے رہے۔



# چوتھے قیوم

ضیا تسنیم بلگرامی

تاریخ گواہ ہے کچھ خوش نصیب انسانوں کا انتظار دنیا میں ان کی ولادت سے قبل ہی ہونے لگتا ہے کیونکہ جن کے آنے کی بشارت اللہ تعالیٰ خوابوں میں بار بار دے رہا ہو... اور جس کی تائید بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کردی ہو پھر اس سے بڑھ کر دنیا کا خوش نصیب ترین انسان اور کون ہوسکتا ہے۔ آپ کا شمار بھی انہی مقدر والوں میں ہوتا تھا۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ولی کی

کرامات کا احوال

ان کا آبائی وطن سمرقند تھا۔ دادا حجت اللہ نے ہجرت کی اور ہندوستان چلے آئے پھر یہاں سے مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں سفر آخرت اختیار کیا۔ جب وہ ہندوستان میں تھے تو ان کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا اس کا نام ابوالعلی رکھا گیا۔ ابوالعلی نے اپنا بیٹا خواجہ فیضی کے سپرد کردیا کیونکہ خواجہ فیضی ابوالعلی کے والد کے رشتے دار اور راجا مانگ سنگھ کے مصاحب تھے۔ ابوالعلی خواجہ فیضی کی سرپرستی میں پرورش پاتے رہے اور ہندوستان کے نامی گرامی صوفیا میں ان کا شمار ہوا۔

ابوالعلی نے حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ حج کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزار پر حاضری دی۔ مسجد نبوی کے چپے چپے کو اس اعتقاد سے بوسے دیتے رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم اقدس کے کسی عضو نے اس سے لمس کا فیض حاصل کیا ہوگا۔ انہوں نے یہاں بے شمار نمازیں پڑھیں اور اپنے اور اپنی اولاد



کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔

مدینے میں رہتے ہوئے انہیں کچھ ہی عرصہ گزرا ہوگا کہ ہندوستان کے زائرین نے انہیں اپنے ملک واپس چلنے کی ترغیب دی لیکن ابوالعلیٰ کے قدم رکے ہوئے تھے، اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ کسی ہم وطن زائر نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ کب تک یہاں قیام کریں گے؟ واپسی کا ارادہ ہے یا نہیں؟''

ابوالعلیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گنبد خضرا کی طرف محویت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اے مخلص! تم یہ چاہتے ہو کہ جس طرح تم خالی ہاتھ واپس جارہے ہو اسی طرح میں بھی واپس جاؤں۔ سمندر کے ساحل سے یوں ہی واپس چلا جاؤں؟ ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ لیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔''

ہم وطن ساتھی نے پوچھا۔ ''حضرت! آپ نے کیا طلب کیا ہے؟''

ابوالعلیٰ نے جواب دیا۔ ''فتنہ...... میں نے صالح فتنہ مانگا ہے۔''

وہ شخص بھونچکا رہ گیا۔ حیرت سے بولا۔ ''فتنہ...... یعنی کیا مطلب؟ صالح فتنہ؟''

ابوالعلیٰ نے سادگی سے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے فتنہ مانگا ہے۔ صالح فتنہ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اولاد کو فتنہ ہی ارشاد فرمایا تھا۔ میں نے بھی رسول اللہؐ سے دعا مانگی ہے۔ میں صالح اولاد کا طالب ہوں جب تک میری یہ دعا قبولِ بارگاہ نہ ہوجائے، میں یہیں پڑا رہوں گا۔''

ابوالعلیٰ مدینے میں غیر معینہ مدت کے لیے رکے رہے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ طلب صادق ہو تو خدا انسان کو مایوس نہیں کرتا۔ جب رات نصف سے گزر جاتی تو ابوالعلیٰ سجدے میں گر جاتے اور رو رو کر دعائے دلی عرض کرتے رہتے۔

وہ چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ عشا کی نماز کے بعد بھی ابوالعلیٰ مسجد نبویؐ کے ایک ستون سے پشت لگا کر درودِ ابراہیمی کا ورد کرنے لگے۔ انہیں اس درود سے ایک عجیب سی فرحت اور تسکین حاصل ہوتی تھی۔ درود پڑھتے پڑھتے ان کی آنکھ لگ گئی۔ وہ جس حال میں تھے اسے آنکھ لگنا بھی نہیں کہا جاسکتا تھا کیونکہ ان کی ادھ کھلی آنکھیں مسجد کے محراب اور ستون دیکھ رہی تھیں مگر حواس پر قدرت ختم ہوگئی تھی۔ اس عالم میں انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں۔ ''ابوالعلیٰ! ہندوستان واپس جا، تیری دعا قبول ہوئی۔ اللہ تعالیٰ تجھے ایسا بیٹا عطا کرے گا جو تیرا نام روشن کرے گا اور میرا نائب ہوگا۔''

ابوالعلیٰ بیدار ہوئے تو فضا کو معطر محسوس کیا۔ بھینی بھینی خوشبو سے پورا ماحول معطر تھا۔ ابوالعلیٰ نے اس جگہ نماز پڑھی اور رختِ سفر باندھا۔ ان کے ارادت مند اس دن کا انتظار کررہے تھے۔

ہندوستان پہنچنے کے بعد ابوالعلیٰ اپنے ہونے والے بیٹے کی بابت عجیب و غریب خواب دیکھا کرتے۔ انہیں بیداری میں یہ آواز سنائی دیتی کہ ''ابوالعلیٰ! مبارک ہو کہ تو ایک ایسے بیٹے کا باپ ہوگا جس کے کمالاتِ روحانی کا ایک زمانہ اعتراف کرے گا۔''

چنانچہ 5 ذیقعد 1092ھ بروز پیر ان کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ آپ نے اس کا نام خواجہ محمد زبیر رکھا۔ ماں نے اپنے بستر کو بچے کے بول و براز سے محفوظ رکھنے کے لیے تدبیریں اختیار کیں لیکن انہیں بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بچے کو خود احساس ہے کہ خود ناپاک ہو اور نہ بستر ناپاک کرے۔ اس کے پیشاب، پاخانے کا ایک وقت تھا۔ ان اوقات میں اگر ماں کو خیال نہ رہتا تو بچے کو ضبط و احتیاط سے کام لینا پڑتا۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ عزیز و اقارب کے ہجوم میں ماں کو ان کے کپڑے بدلنے پڑتے۔ ماں نے ابھی کرتہ ہی اتارا ہوتا کہ معصوم بچہ ماں کے آنچل میں چھپ جاتا اور یہ اس وقت تک چھپا رہتا جب تک دوسرا کرتہ نہ پہنا دیا جاتا اور پھر یہ بات ہر ایک پر منکشف ہوگئی۔ ننھا زبیر شرم برہنگی سے ماں کی آغوش میں یا آنچل میں دبک جاتا ہے۔

ابھی زبیر کی عمر دو سال تھی کہ انہیں کسی گوشے میں منہمک اور محو بیٹھا ہوا پایا جانے لگا۔ والدین کی بڑی سے بڑی کوشش یہ ہوتی کہ ان کا بیٹا ان کی آنکھوں کے سامنے موجود رہے لیکن یہ بات تقریباً ناممکن ہوگئی۔ کئی بار یہ بھی محسوس ہوا کہ ننھا زبیر گوشۂ تنہائی میں کسی سے ہم کلام رہتا ہے۔ ابوالعلیٰ چونکہ خود بھی بڑے خدارسیدہ تھے اس لیے وہ خوب سمجھتے تھے کہ ان عجیب و غریب حالات اور واقعات کے پیچھے مشیت ایزدی کیا ہے؟ وہ جانتے تھے کہ زبیر کی ولادت سے پہلے جو بشارتیں ملی ہیں یہ سب ان کے مطابق اور موافق ہیں۔ ابوالعلیٰ کے مکان کے سامنے ایک ویران مکان تھا۔ اس کے مکین معلوم نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ ابوالعلیٰ اپنے حجرے سے نکلتے اور اس عبرت کدے کو دیکھتے تو بے ساختہ فرماتے۔ ''اللہ بس باقی ہوس۔''





ایک دن علی الصباح گھر والوں کی آنکھ کھلی تو یہ جان کر پریشان ہوگئے کہ ننھے زبیر میاں اپنے بستر پر نہیں ہیں۔ ماں نے باپ کے حجرے میں جھانک کر دیکھا تو اپنے تہجد گزار خدارسیدہ شوہر کو سربسجود دیکھا پورا حجرہ ننھے زبیر کے وجود سے خالی تھا۔ بے اختیار پوچھا۔ ''کیا آپ میری آواز سن رہے ہیں؟''

ابوالعلیٰ نے بیوی کی آواز سنی مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

بیوی نے کچھ دیر تو جواب کا انتظار کیا مگر پھر بے اختیار حجرے میں داخل ہوگئیں اور بے قراری سے کہا۔ ''میں آپ کو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ دیتی ہوں کہ میری بات توجہ سے سنیے اور اس کا جواب دیجیے۔ ننھا زبیر اپنے بستر سے غائب ہے۔ معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے؟ غم اور فکر سے میرا کلیجا پھٹا جارہا ہے۔''

کچھ دیر بعد ابوالعلیٰ نے مڑ کر بیوی کو دیکھا اور پوچھا۔ ''زبیر گھر ہی میں کہیں ہوگا۔ کیا تم نے اس کو پورے گھر میں اچھی طرح دیکھ لیا؟''

بیوی نے روتے ہوئے کہا۔ ''میں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا ہے میں آپ کو کس طرح یہ یقین دلاؤں کہ زبیر گھر میں نہیں ہے۔''

ابوالعلیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''گھر کے علاوہ وہ کہاں جاسکتا ہے یقیناً تم مغالطے میں ہو۔ وہ گھر کے اندر ہی کہیں موجود ہوگا چلو میں تلاش کرتا ہوں تمہارے ساتھ۔''

یہ کہہ کر ابوالعلیٰ اٹھے اور بیوی کے ساتھ مکان میں چلے گئے۔ انہوں نے بھی گھر کا چپا چپا چھان مارا مگر زبیر کا کوئی پتا نہیں چلا۔ بیوی کی بے قراری میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا لیکن ابوالعلیٰ کے چہرے پر وہی طمانیت تھی جو حجرے میں پائی جاتی تھی۔ انہوں نے بیوی کو تسلی دی۔ ''بی بی! تم مت گھبراؤ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرا رب زبیر کو ہلاکت میں نہیں ڈالے گا۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوگا امن و سلامتی سے ہوگا اور اچھی حالت میں ہوگا۔''

بیوی نے بے چینی سے کہا۔ ''آپ کی باتوں پر میں کس طرح یقین کرلوں؟''

ابوالعلیٰ نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا اب ذرا صبر سے کام لو میں زبیر کی تلاش میں باہر جاتا ہوں۔''

بیوی کی بے چینی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ ابوالعلیٰ جیسے ہی باہر نکلے، انہوں نے ایک بہت بڑے اژدہے کو سامنے کے ویران مکان کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ابوالعلیٰ نے اتنا بڑا اژدہا اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بیوی نے بھی دروازے کی اوٹ سے اس اژدہے کو دیکھ لیا اور چیخ کر شوہر سے کہا۔ ''اجی اژدہے سے ہوشیار۔''

ابوالعلیٰ نے کوئی جواب تو نہیں دیا بس اژدہے کے پیچھے ہولیے۔ بیوی کو غصہ آرہا تھا کہ یہ کیا بات ہوئی؟ یہ تو ننھے زبیر کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے کہ خوفناک اژدہے کے پیچھے ہولیے۔

اژدہا ویران مکان میں داخل ہوگیا۔ اس کے پیچھے ابوالعلیٰ بھی داخل ہوگئے۔ انہوں نے دیکھا ان کے سامنے ایک بڑا سا دالان تھا۔ دالان کی چھت کا کچھ حصہ تو گر گیا تھا اور کچھ لٹکا ہوا تھا۔ اژدہا اس دالان میں داخل ہوگیا۔ ابوالعلیٰ بھی اس کے پیچھے کھنچے چلے جارہے تھے۔ اژدہا دالان سے گزر کر بغیر چھت کی کوٹھری میں داخل ہوگیا۔ اس کی دم اب بھی دالان ہی میں تھی۔ ابوالعلیٰ نہایت ہوشیاری سے دالان کی دیوار پر چڑھ گئے اور اس کے اوپر سے بے چھت کوٹھری کے اندر کا جائزہ لینے لگے۔ انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہاں ننھا زبیر بھی موجود تھا۔ وہ دیوار کے کونے پر نظریں جمائے معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا اور اژدہا زبیر کے پاؤں پر اس طرح لوٹ رہا تھا جس طرح کوئی وفادار کتا اپنے مالک کے قدموں پر لوٹتا اور پاؤں چومتا ہے۔ اس وقت ابوالعلیٰ کا عجیب سا حال تھا۔ ایک کیف ایک نشہ سا پورے وجود میں گردش کررہا تھا۔ انہیں اژدہے سے خوف نہیں آرہا تھا۔ اس وقت انہیں یہ اشتیاق تھا کہ دیکھیے کہ اور کیا کرتا ہے۔

اژدہا کچھ دیر تو زبیر کے قدموں میں منہ ڈالے پڑا رہا پھر اس میں حرکت ہوئی اور اس نے اپنے منہ کو زمین کی سطح سے بلند کرکے دونوں ہاتھوں پر زبان پھیری۔ گویا وہ انہیں بوسے دے رہا تھا۔ زبیر نے اژدہے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

اژدہا ایک بار پھر زبیر کے قدموں میں گر گیا۔ ابوالعلیٰ کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ سامنے کے مکان سے بیوی اپنے شوہر کی واپسی کی منتظر تھیں۔ انہیں جھنجلاہٹ تھی کہ آخر یہ ابوالعلیٰ کو ہو کیا گیا ہے کہ ویران مکان میں گھس گئے۔ وہ زبیر کو کیوں نہیں تلاش کررہے۔

ابوالعلیٰ کو اپنے پیچھے یوں لگا گویا کوئی کھڑا ہے۔ وہ بے چینی سے مڑ کر دیکھنے لگے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ دوبارہ زبیر

اور اژدہے کی طرف رجوع ہوگئے اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ اب وہاں زبیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اژدہا معلوم نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ وہ تیزی سے اترے اور مکان کے باہر پہنچ کر اژدہے کو تلاش کرنے لگے۔ دور اپنے دروازے سے بیوی نے بڑے کرب سے پوچھا۔ ”یہ آسیبی مکان میں گھسے کیا کر رہے ہیں آپ؟ زبیر کو کیوں نہیں تلاش کرتے؟“

ابوالعلی نے پوچھا۔ ”تم نے بڑے اژدہے کو باہر نکلتے تو نہیں دیکھا؟“

بیوی نے جواب دیا۔ ”میں نے اژدہے کو اندر جاتے تو دیکھا تھا باہر نکلتے نہیں دیکھا۔“

ابوالعلی نے کہا۔ ”پھر وہ کہاں چلا گیا، اندر بھی نہیں ہے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ ویران مکان میں دوبارہ داخل ہوگئے۔ بیوی کے غصے اور بے چینی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ آتش زیر پا تھیں کہ آخر ان کے شوہر کو ہو کیا گیا ہے کہ زبیر کے بجائے اژدہے کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں لیکن جب ذرا دیر بعد ابوالعلی زبیر کو گود میں لیے ہوئے اندر سے برآمد ہوئے تو ماں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خالی آسیب زدہ مکان، اس میں ایک بہت بڑے خوف ناک اژدہے کا داخل ہونا اور وہاں زبیر کی پہلے سے موجودگی، ان کا دل خوف اور اندیشے سے تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زبیر کو دیکھ رہی تھیں اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ کہیں زبیر کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔

ابوالعلی زبیر کو لے کر جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے، ماں نے جھپٹ کر گود میں لے لیا اور چہرے کو بار بار دیکھ کر بھینچنے اور پیار کرنے لگیں۔ زبیر معصومیت سے ماں کی صورت دیکھ رہا تھا۔

ابوالعلی پاس ہی کھڑے اس انتظار میں تھے کہ بیوی ان سے کوئی سوال کرے تو وہ اس کا جواب دیں۔ آخر بیوی نے پوچھا۔ ”یہ زبیر ان کھنڈر میں کس طرح پہنچ گیا؟“

ابوالعلی نے جواب دیا۔ ”اس کا صحیح جواب تو خود زبیر دے گا یا خدا کے پاس ہوگا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔“

بیوی نے پوچھا۔ ”یہ اندر کیا کر رہا تھا؟“

ابوالعلی نے جواب دیا۔ ”یہ اندر بغیر چھت کی کوٹھری کے ایک کونے میں کھڑا معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔“

بیوی نے بے تابی سے پوچھا۔ ”وہ بڑا اژدہا بھی تو اندر گیا تھا؟“

ابوالعلی نے جواب دیا۔ ”ہاں گیا تو تھا...... پھر؟“

”وہ اندر کیا کر رہا تھا۔ میرے زبیر کے پاس تو نہیں گیا تھا؟“

”وہ زبیر کے پاس گیا تھا۔ اس نے اندر جاتے ہی زبیر کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور پھر کچھ دیر بعد اس نے زبیر کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ میں یہ منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے آہٹ سی محسوس ہوئی، میں نے اپنے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں دوبارہ زبیر کی طرف گھوم گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اب وہاں اژدہے کا نام و نشان تک نہ تھا۔“

بیوی نے ایک بار پھر اپنے ننھے بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس پر بلا کی طمانیت چھائی ہوئی تھی۔ انہوں نے بے اختیار اپنے بیٹے کو گلے لگا لیا۔

ابوالعلی نے کہا۔ ”کیا میں نے تمہیں یہ یقین نہیں دلایا تھا کہ خدا جو کچھ کرے گا بہتر ہی کرے گا کیونکہ زبیر کی بابت جو بشارتیں مل چکی ہیں ان کے مطابق خدا جو کچھ کرے گا بہتر ہی کرے گا۔“

ماں کا خوشی سے عجیب سا حال ہو رہا تھا۔ وہ انہیں بار بار بھینچ کر بوسے دینے لگیں۔

☆☆☆

زبیر کی عمر چار سال چار ماہ کی ہوئی تو ابوالعلی نے انہیں ایک معلم کے سپرد کر دیا۔ آپ کی تیز طبع نے استاد کو حیران کر دیا۔ ایسا لگتا گویا انہیں سب کچھ ازبر ہے۔ ایک دن استاد انہیں قرآن کی اس آیت کریمہ کا مطلب سمجھا رہا تھا۔ جس میں اللہ کو زمینوں اور آسمانوں کا نور کہا گیا ہے تو زبیر کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا اور یوں محسوس ہونے لگا گویا وہ کسی محنت شاقہ میں مبتلا ہیں۔ ایک ایسا بوجھ جو اٹھائے نہیں اٹھ رہا مگر زبیر اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں پھر پورے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی، وہ کانپنے لگے۔

استاد نے پوچھا۔ ”زبیر! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

زبیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کپکپاہٹ پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ اب ان کے چہرے پر پسینے کے قطرات اس طرح نمودار ہونے لگے جس طرح برف کے برتن کے اوپر، آس پاس پانی کے بے شمار قطرات جمع ہو جاتے ہیں۔ استاد نے ایک بار پھر بے چینی سے پوچھا۔ ”زبیر! کچھ تو بتاؤ یہ تمہارا کیا حال ہے؟“





زبیر نے پھر کوئی جواب نہیں دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بے ہوش ہو کر گر گئے۔

استاد گھبرایا ہوا ابوالعلی کے پاس پہنچا اور انہیں جلدی جلدی سارا حال سنا کر بولا۔ ”حضرت! زبیر کو معلوم نہیں کیا ہو گیا؟“ ابوالعلی نے آنکھیں بند کیں اور کچھ دیر کے لیے سکوت اختیار فرمایا پھر آنکھیں کھول کر ارشاد فرمایا۔ ”جاؤ، زبیر کے پاس واپس جاؤ، اب اسے ہوش آ گیا ہوگا۔“

استاد نے اصرار کیا۔ ”لیکن حضرت! یہ سب کیا تھا، کچھ مجھے بھی تو بتائیے؟“

ابوالعلی نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! ان باتوں کا تعلق علوم باطنی سے ہے آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“

استاد نے کچھ دیر خاموشی سے ابوالعلی کی صورت دیکھی اور مزید کچھ کہے بغیر زبیر کے پاس واپس چلے گئے۔ وہاں زبیر ہوش میں آچکے تھے۔ استاد کی شکل دیکھتے ہی بولے۔ ”استاد محترم! میں بہت تھک گیا ہوں۔ کیا آپ آرام کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے؟“ لیکن استاد کو تو کچھ اور ہی جستجو تھی، کہا۔ ”لیکن صاحبزادے! یہ تو بتائیے آپ کو یہ ہو کیا گیا تھا ابھی؟“

زبیر نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! مجھ پر علوم اور اسرار کا ایک بوجھ ڈال دیا گیا تھا۔ میں اس میں کچلا جا رہا تھا۔ آخر اس کے دباؤ نے مجھے گرا دیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔“

استاد کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہ آیا۔ انہوں نے مزید استفسار نہیں کیا اور خاموشی اختیار کی۔

اس کے بعد یہ کیفیت تب ان پر طاری ہونے لگی جب بھی قرآن پاک کی ایسی کوئی آیت سامنے آتی جس میں معانی اور مطالب کا ایک سمندر پنہاں ہوتا۔ زبیر کا برا حال ہو جاتا اور وہ بے ہوش ہو جاتے لیکن جب بھی ہوش میں آتے زبیر محسوس کرتے کہ ان میں علم و دانش اور روحانی مطالب کا ایک سمندر سما گیا ہے۔

زبیر جب ذرا بڑے ہوئے تو ابوالعلی نے ایک بار پھر حج کا ارادہ کیا اور بیٹے سے کہا کہ۔ ”تمہیں بھی اس سعید سفر میں میرے ساتھ چلنا ہے۔“

زبیر تو گویا اس کے منتظر ہی تھے۔ سفر حج میں باپ کے ساتھ ہو گئے۔ مکہ کا سفر بڑا پرلطف رہا جبکہ دوسروں پر کسلمندی اور تکان نے غلبہ کر لیا تھا۔ طواف کعبہ کے دوران زبیر پر وہی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر گئے۔ اس عالم میں انہوں نے کعبے کو اپنے آس پاس طواف کرتے دیکھا۔

مکے کے بعد ابوالعلی زبیر کو لے کر مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ دیار نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہنچنے کے شوق میں دونوں ہی کا عجیب حال ہو رہا تھا۔ زبیر نے کئی بار باپ سے کہا۔ ”بابا جان! میرا جی چاہتا ہے کہ مکے اور مدینے کے درمیان راستوں کے چپے چپے اور ذرے ذرے کو بوسے دیتا چلوں کیونکہ یہ راہیں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں سے مس ہونے کی وجہ سے روشن اور منور نظر آ رہی ہیں۔“

ابوالعلی نے جواب دیا۔ ”بیٹے! یہ وارداتِ عشق اور کیفیات محبت ہیں۔ یہاں سب کچھ روا ہے۔“

زبیر بے اختیار زمین پر گر کر بوسے دینے لگے۔ انہیں ذرے ذرے سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ کافی عرصہ بعد جب زبیر اپنے باپ کے ساتھ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو ان کا حال تھکے ہارے عاشق جیسا تھا جو دشت و بیاباں کی خاک چھان کر آبلہ پا محبوب کے در تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ گنبد کو دور ہی سے دیکھ کر زبیر کا دل اور زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دونوں باپ بیٹے مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے اور یہاں ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی۔ دونوں کے پاؤں راہ کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے تھے۔ کسی نے انہیں ٹوک دیا اور کہا۔ ”صاحبان! آپ دونوں کو اپنے اپنے پاؤں صاف کر کے مسجد میں آنا تھا، جائیے اب دھو آئیے۔“

ابوالعلی کوئی جواب دینے ہی والے تھے مگر زبیر نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور اس شخص کو خود جواب دیا۔ ”اے شخص! اس گرد و غبار کی قدر و قیمت تو کیا جانے۔ افسوس کہ تو نے تو صرف ٹخنوں کے اوپر جمی ہوئی گرد و غبار کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھا۔ تیری ظاہری آنکھیں ہمارے تلوؤں کے وہ آبلے نہیں دیکھ سکیں جو دیار حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے میں مانع آ رہے تھے اور ہم ان کی پروا کیے بغیر یہاں تک آ گئے۔ یہ چیزیں متاع عاشقاں ہیں لیکن تو ان باتوں کو کیا جانے۔“

وہ شخص کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ اس نوجوان نے کیا کہا اور ان باتوں کا مطلب کیا ہے؟ اس نے کچھ دیر تو زبیر کی صورت دیکھی اس کے بعد کہا۔ ”خیر، اب دھو ڈالو اپنے پاؤں۔“

ان دونوں نے اس شخص کی پروا کیے بغیر نماز شکرانہ ادا کرنا شروع کر دی۔

ابوالعلیٰ زیرِلب رو رو کر عرض کر رہے تھے۔ ”یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! آپ نے جس بیٹے کی خوش خبری دی تھی۔ اس وقت وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہے۔“

اور زبیر رو رو کر کہہ رہے تھے۔ ”یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! مجھے اپنے والدِ محترم سے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے یہیں کسی ستون کے پاس میرے بارے میں بشارت دی تھی۔ اب آپؐ سے درخواست کروں گا کہ مجھے صالح رہنے کی توفیق عطا فرمائیے۔ میں عاجز و ناتواں انسان آخر کس طرح پہاڑ جیسی زندگی کو گناہ اور معصیت سے محفوظ رکھوں گا کیونکہ

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

زبیر گڑگڑاتے رہے اور الحاح وزاری کرتے رہے پھر انہیں یکایک اپنے وجود میں کوئی شے سرایت کرتی محسوس ہوئی جیسے چیز سیال کی طرح رگوں میں دوڑنے لگی اور زبیر کو طمانیت اور سکون نے اپنے حصار میں لے لیا۔ اسی عالم میں انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کے جسم کو ایک شاندار گراں بہا خلعت پہنادی گئی ہے اس خلعت پر سنہری حرفوں میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ خواجہ زبیر نے انہیں بہ غور دیکھا، پڑھا تو پتا چلا کہ پوری خلعت پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی ہوئی ہے۔ اس وقت ان کے آس پاس نہ تو مسجد تھی اور نہ مسجد کی کوئی اور شے۔ وہ معلوم نہیں کس جگہ کھڑے تھے۔ یہ حالت زیادہ دیر قائم نہیں رہی۔ جب آہستہ آہستہ ہوش میں آئے تو خود کو مسجد نبویؐ کے صحن میں کھڑے دیکھا۔ ان کے پاس ہی ابوالعلیٰ کھڑے تھے اور اپنے بیٹے کی حالت پر غور کر رہے تھے۔ انہوں نے یکبارگی اپنے بیٹے کے داہنے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، پوچھا۔ ”بیٹے! زبیر اس وقت تو کہاں ہے؟“

زبیر نے جواب دیا۔ ”باواجان! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں کہاں تھا اور اب کہاں ہوں؟“

ابوالعلیٰ نے پوچھا۔ ”بیٹے! کیا تو نے اپنے جسم پر پڑی ہوئی شاندار اور گراں بہا خلعت فاخرہ نہیں دیکھی؟“

زبیر نے جواب دیا۔ ”دیکھی کیوں نہیں باواجان۔“

ابوالعلیٰ نے پھر کہا۔ ”اور کیا تو نے اس خلعت فاخرہ پر سنہرے حرفوں میں کڑھے ہوئے بسم اللہ کو نہیں دیکھا؟“

زبیر نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے بسم اللہ بھی دیکھی۔“

ابوالعلیٰ نے زبیر کو اپنے سینے سے لگا کر فرمایا۔ ”بیٹے زبیر! یہ سب کیا ہے؟ اس کا کوئی خاص مطلب؟“

زبیر نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”باواجان! میں آپ کے عرفان اور وجدان کے سہارے کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ آپ ہی اس کی وضاحت فرمائیں گے تو میں کچھ جان سکوں گا۔“

ابوالعلیٰ نے کہا۔ ”بیٹے! یہ خلعت منصب قیومیت ہے، جو تمہیں حاصل ہوگا۔“

زبیر نے اپنے والد سے ازراہِ انکسار عرض کیا۔ ”باواجان! یہ حقیقت ہے کہ میرے دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور خیال ہی نہیں آتا۔“

دیارِ عرب سے واپس آئے تو خواجہ زبیر کی عمر اکیس سال ہو چکی تھی۔ ابوالعلیٰ نے اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو اپنے بیٹے کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔ خواجہ زبیر ان پر خصوصی توجہ فرماتے اور آنے والوں کو بہت جلد اندازہ ہو جاتا کہ خواجہ زبیر کی ذات میں کمالات روحانی دوسروں سے کہیں زیادہ موجود ہیں۔

انہی دنوں کابل سے ایک قافلہ آیا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے مختلف بزرگوں کی خدمت میں حاضریاں دیں اور ایسا لگتا تھا جیسے انہیں کسی کی تلاش ہے چنانچہ یہ لوگ ابوالعلیٰ کی خدمت میں بھی پہنچے۔ ابوالعلیٰ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور کشف سے ان کا مدعائے دلی معلوم کیا، فرمایا۔ ”کیا تم لوگ ایک ایسے نوجوان کی تلاش میں نہیں نکلے ہو جو بزرگی اور فضیلت میں اپنے بزرگوں پر سبقت لے گیا اور جس کا ہر عمل سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مثالی نمونہ ہے اور یہ کہ اس نوجوان کی خواب میں بشارتیں مل چکی ہیں اور اسے دیکھ کر تم پہچان بھی سکتے ہو؟“

قافلے والے حیران رہ گئے، بولے۔ ”ہاں، ہمیں ایک ایسے نوجوان بزرگ کی شکل خوابوں میں دکھائی ضرور گئی ہے لیکن ابھی تک وہ ہمیں ملے نہیں ہیں۔“

ابوالعلیٰ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، تم سب ہمارے ساتھ آؤ۔“

قافلے والے ان کے ساتھ ہو لیے۔ ذرا دیر بعد جب یہ سب لوگ خواجہ زبیر کے پاس پہنچے تو انہیں دیکھتے ہی سکتے میں رہ گئے۔ کئی آدمی وارفتگی میں آگے بڑھے اور خواجہ زبیر کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، وہ آپ ہی ہیں جن کی





ی تلاش ہے۔ اپنے ہاتھ ہمارے ہاتھوں میں دیجیے تاکہ ہم آپ سے بیعت ہو جائیں۔“

ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اپنے ہاتھ خواجہ زبیر کے ہاتھوں میں دے دیے اور بیعت ہو گئے۔ یہ لوگ کئی دن آپ کی خدمت میں پڑے رہے اور مواعظ حسنہ سے اپنا ایمان تازہ کرتے رہے۔ آخر ان کے سربراہ آدمیوں نے خواجہ سے درخواست کی کہ کابل تشریف لے چلیں۔ وہاں دوسرے بہت سے لوگ ان کے منتظر ہیں۔

خواجہ زبیر نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ ”میں اپنے باواجان کی اجازت کے بغیر کابل نہیں جا سکتا۔ آپ ان سے اجازت لیں۔ اگر ہاں ہو گئی تو میں کابل ضرور چلوں گا۔“

ان لوگوں نے ابوالعلیٰ سے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ کی بڑی نوازش ہوگی اگر آپ انہیں کابل جانے کی اجازت فرما دیں گے۔“

ابوالعلیٰ نے ارشاد فرمایا۔ ”میں منع تو نہیں کروں گا مگر میں ابھی تک خواجہ زبیر سے دور نہیں رہا۔“

قافلے والوں نے کہا۔ ”حضرت! دونوں صاحب کشف ہیں پھر یہ دوری کا ذکر کیا۔ جب چاہیں گے ایک دوسرے کو دیکھ لیں گے اور روحانی احوال معلوم کر لیں گے۔“

ابوالعلیٰ نے اجازت دے دی، کہا۔ ”میری طرف سے اجازت ہے۔“

خواجہ زبیر کو رخت سفر ہی کیا باندھنا تھا۔ جس حال میں تھے اسی میں کابل روانہ ہو گئے۔ کابل میں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی اور وہاں ان کے مشتاقانِ دید نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آپ نے انہیں اپنے دل نشین اور آخرت سنوار مواعظ سے شاد کام کیا۔ کابل کے لوگوں نے آپ کی اتنی عزت کی اور کچھ اس طرح خدمت میں حاضری دی کہ شاہانِ وقت دیکھتے تو حسد کرتے۔ خواجہ زبیر نے وہاں کئی سال گزار دیے۔

خواجہ زبیر نے ایک اعلان کر دیا کہ ”میں ہندوستان واپس جانا چاہتا ہوں۔“

مریدوں نے انہیں روکنا چاہا اور عاجزی سے درخواست کی۔ ”حضرت! پورا ہندوستان انتشار اور ابتری کا شکار ہے آپ ان حالات میں کہاں جائیں گے۔ یہیں تشریف رکھیں جب حالات معمول پر آ جائیں، چلے جائیے گا۔“

خواجہ زبیر نے جواب دیا۔ ”کمزور میری مدد کا طالب ہے مجھے ہندوستان جانا ہی پڑے گا۔“

مریدوں کے بے پناہ اصرار کے باوجود آپ کابل سے ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب آپ لاہور پہنچے تو معلوم ہوا کہ راوی کے کنارے شہزادہ معظم اور شہزادہ اعظم شاہ ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہیں اور بزورِ شمشیر اس بات کا فیصلہ کرنے پر تل گئے ہیں کہ اب اورنگ زیب کا وارث اور جانشین کون ہے۔

آپ ان دونوں لشکروں سے دور غیر آباد حصے میں ٹھہر گئے تھے۔ ارادت مندوں نے مطلع کیا کہ راستہ مخدوش ہے اور راوی کو عبور کر کے اکبر آباد پہنچنا امرِ محال میں سے ہے۔

آپ نے فرمایا۔ ”میں خود بھی آگے نہیں جانا چاہتا۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اس ملک کا بادشاہ کون ہے، میں یہیں رہوں گا۔“

کسی نے عرض کیا۔ ”اگر یہیں رکنے کا ارادہ ہے تو حضور کو میرے ناقص مشورے پر یہاں سے ہٹ جانا چاہیے کیونکہ یہاں کسی بھی لمحے چھڑ جانے والی جنگ آس پاس تباہی اور بربادی پھیلا سکتی ہے۔ اندیشہ ہے کہ حضور کو اس سے کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔“

خواجہ زبیر نے جواب دیا۔ ”مجھے کوئی گزند نہیں پہنچے گی کیونکہ میں یہاں آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ خدا اپنے جس بندے کو کامیاب کرنا چاہے گا روحانی استعداد کے لیے میرے پاس بھیج دے گا۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”غیب کا حال تو خدا کو معلوم ہے ورنہ بہ ظاہر یہ جگہ بہت مخدوش اور خطرناک ہے۔ اگر آپ یہیں رکنے پر مصر ہیں تو ہم سب بھی آپ کے ساتھ ہی رہیں گے۔“

خواجہ زبیر نے اپنی جھونپڑی سے گھڑسواروں کو ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے دیکھا۔ راوی کے کنارے کنارے حدِ نظر تک خیموں کا شہر سجا ہوا تھا۔ گھوڑوں کے ہنہنانے اور آدمیوں کے بھنبھنانے کی آوازیں ہر وقت آتی رہتی تھیں۔

ایک دن رات کے اندھیرے میں گھوڑوں کی ٹاپیں بالکل قریب سنائی دیں۔ مریدوں کو خوف محسوس ہوا، بولے۔ ”حضرت! ہمیں تو ڈر لگ رہا ہے۔ معلوم نہیں گھوڑے ادھر کیوں آ رہے ہیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”مت گھبراؤ، خدا جو کرے گا بہتر کرے گا۔“

جھونپڑی میں چراغ جل رہا تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں مریدوں کے چہرے صاف نظر نہیں آرہے تھے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں جھونپڑی کے در پر رک گئیں۔ آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا۔ ''دیکھو باہر جاؤ، چند معزز مہمان اندر آنا چاہتے ہیں، انہیں عزت واحترام سے اندر بلا لاؤ۔''

آپ کے جملہ مرید باہر چلے گئے۔ وہاں پانچ گھڑسوار اپنے گھوڑوں سے نیچے کھڑے سرگوشیوں میں باتیں کررہے تھے۔ ایک مرید نے بہ آواز بلند کہا۔ ''حضرات! ہمیں ہمارے پیر نے آپ کی پیشوائی کے لیے بھیجا ہے۔ آپ لوگ اندر تشریف لے چلیں۔''

کسی شخص نے اندھیرے ہی میں بے ساختہ پوچھا۔ ''کیا واقعی سچ سچ؟''

مرید نے عرض کیا۔ ''میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟''

اس شخص نے کہا۔ ''پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگی۔''

اس کے بعد یہ لوگ جھونپڑی میں داخل ہوگئے۔ چراغ کی روشنی میں دیکھنے پر پتا چلا کہ ان میں جو شخص سب سے آگے تھا وہ اپنے لباس اور وضع قطع میں سب سے شاندار نظر آتا تھا۔

خواجہ زبیر اپنی جگہ سے ہلے اور تقریباً اٹھ کر ان کی پذیرائی کی، فرمایا۔ ''معظم شاہ آؤ، میں تو تمہارا انتظار کررہا تھا۔''

معظم شاہ خواجہ زبیر کے قدموں میں بیٹھ گیا، بولا۔ ''حضرت! دنیاوی اسباب نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سارے امرا اور منصب دار دوسری طرف ہیں۔ یہ ذوالفقار خان میری طرف ہے جس کی وجہ سے کچھ سپاہ بھی میرا ساتھ دے رہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے شہزادے نے ایک تنومند جیالے جوان کی طرف اشارہ کیا۔

خواجہ زبیر نے کہا۔ ''بہرحال، ہم تیری اعانت کو آگئے ہیں۔ مت گھبراؤ۔''

شہزادے نے شک وشبے سے کہا۔ ''حضرت! جیسا کہ میں نے عرض کیا دنیاوی اور مادی اسباب بھائی اعظم شاہ کے ساتھ ہیں۔ میں تو آپ کے پاس یہ مشورہ کرنے آیا تھا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں اپنے بھائی اعظم شاہ سے مفاہمت کرلوں اور اس کے حق میں دستبردار ہوکر کنارہ کشی اختیار کرلوں؟''

خواجہ زبیر نے فرمایا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا کے ہاں قلیل اور کثیر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ دنیاوی اور مادی اسباب دوسری طرف سہی لیکن بادشاہت تیرے نام کی جاچکی ہے۔ مایوسی کفر ہے جا مقابلہ کر۔ خدا کامیاب کرے گا۔''

معظم شاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''تم نے بشارت سن لی، اب کیا کہتے ہو؟''

ذوالفقار خان نے جواب دیا۔ ''میں پہلے بھی مایوس نہیں تھا۔ اگر مایوس ہوتا تو مخالفوں میں ہوتا۔''

شہزادے نے آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور جاتے جاتے عرض کیا۔ ''حضور! اب میں اسی وقت حاضری دوں گا جب ہندوستان کا تاج وتخت میرے قدموں میں ہوگا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اب تو جا سکتا ہے۔''

جب شہزادہ اپنے رفیقوں کے ساتھ واپس چلا گیا تو کسی مرید نے ازراہِ شکایت عرض کیا۔ ''حضور! یہ آپ نے شہزادے کو کیسی بشارت دے دی۔ اعظم شاہ کے ساتھ اس کے سارے امرا اور منصب دار ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ان حالات میں اعظم شاہ کو شکست دینا ناممکن ہے۔''

آپ نے جوش میں فرمایا۔ ''اس دنیا میں ناممکن کوئی کام نہیں۔'' مریدوں نے خاموشی اختیار کرلی۔

دوسرے دن علی الصباح دونوں شہزادوں نے ایک دوسرے کو شکست دینے کی خاطر تیاریاں مکمل کرلیں۔ معظم شاہ اپنے لشکر کو لے کر اپنے بھائی اعظم شاہ کے لشکر کی طرف بڑھا۔ دونوں لشکر یوں ٹکرائے گویا سیاہ ہاتھیوں نے ایک دوسرے پر حملہ کردیا ہو۔ خواجہ زبیر نے اپنے جھونپڑے سے لڑائی کا منظر دیکھا اور تا دیر دیکھتے رہے۔ ان کے چہرے پر نہ تو مایوسی تھی نہ اداسی۔ گھڑی بھر بعد اعظم شاہ کے لشکر نے شہزادہ معظم کی فوج کو دبانا شروع کردیا۔ شہزادہ معظم شاہ کی ایک نہ چلنے دی اور پسپائی کی رفتار تیز ہوگئی۔ شہزادہ معظم بالکل مایوس ہوگیا۔ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا ذوالفقار خان کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا ذوالفقار خان؟ ہمارے سپاہی حوصلہ ہار چکے ہیں، ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔''

ذوالفقار خان نے بے تابی سے کہا۔ ''شہزادے! خدا کے لیے اپنی جگہ پر واپس جائیے اور سپاہیوں کے حوصلے بڑھائیے۔''

شہزادہ اپنی جگہ پر واپس چلا گیا اور خواجہ زبیر کی جھونپڑی کی طرف منہ کرکے کہا۔ ''حضرت! آپ تو رات کو یہ فرمارہے تھے کہ فتح میری ہوگی لیکن یہاں کا تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔''





اسی وقت مرید خواجہ زبیر سے کہہ رہے تھے کہ ''حضرت! آپ کی بشارت خاک میں مل گئی۔ معظم شاہ ہار گیا، اعظم شاہ جیت گیا۔''

آپ نے ترشی سے جواب دیا۔ ''کیا بکتے ہو، خاموش رہو۔ جنگ کا ابھی فیصلہ کہاں ہوا ہے جنگ ابھی جاری ہے۔ اس کے نتیجے کا انتظار کرو۔''

کچھ دیر بعد لوگوں نے دیکھا مشرق سے طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ راوی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس وقت اعظم شاہ کی فوج کا منہ طوفان کی طرف تھا۔ طوفانی گردوغبار نے اعظم شاہ کی آنکھوں میں گھس کر تقریباً نابینا کردیا۔ اب جو معظم شاہ کے آدمیوں کو جوش آیا تو وہ بڑی بے دردی سے چڑھ دوڑے اور اعظم شاہ کی سپاہ کو کھیرے، ککڑی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ اسی میدان میں اعظم شاہ کا بیٹا بھی مارا گیا۔ اس سانحے نے اعظم شاہ کی کمر توڑ دی۔ اعظم شاہ کے سپاہیوں نے شکست ہوتے دیکھی تو شہزادہ معظم کے پاس آگئے اور اس سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔

اب معظم شاہ ہندوستان کا بادشاہ بن چکا تھا۔ اس کا سب سے زیادہ طاقتور بھائی اور حریف میدان جنگ میں مارا جاچکا تھا۔ معظم شاہ نے اپنے گھوڑے کا رخ خواجہ زبیر کے جھونپڑے کی طرف کردیا اور یہاں جھونپڑے میں داخل ہوکر خود کو خواجہ زبیر کے قدموں میں گرادیا۔ شہزادے کا مارے خوشی کے برا حال تھا۔ وہ کہتا کچھ تھا اور منہ سے نکلتا کچھ تھا۔

خواجہ زبیر نے شہزادے کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا اور فرمایا۔ ''اب یہ رونا کس بات کا۔ جا بادشاہت کر اور عدل وانصاف سے کام لے۔''

شہزادے نے بہ مشکل عرض کیا۔ ''حضور! اگر آپ کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو آج میں کچھ بھی نہ ہوتا اور شاید میرا بھی وہی انجام ہوتا جو بھائی اعظم کا ہوا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اب یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ جا، راوی کے کنارے ہی رسم تاج پوشی ادا کر اور اپنی بادشاہت کا اعلان کردے۔ یہ تساہل یا تغافل کا وقت نہیں ہے۔''

شہزادہ اٹھا اور عرض کیا۔ ''لیکن میری ایک درخواست ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیے مجھ کو تنہا رخصت نہ کیجیے۔''

خواجہ زبیر نے فرمایا۔ ''نہیں شہزادے! میرا کام ختم ہوا۔ اب میں سرہند چلا جاؤں گا وہاں مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر حاضری دینا ہے۔ بادشاہی اور درویشی کے راستے جدا جدا ہیں۔''

معظم شاہ راوی کے کنارے واپس گیا اور بہادر شاہ کا لقب اختیار کرکے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

آپ سرہند تشریف لے گئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ سرہند والوں نے آپ پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہے۔ چند نیک اور ثقہ آدمیوں نے سرہند والوں کی توجہ خواجہ زبیر کی طرف مبذول کروانا چاہی مگر انہوں نے توجہ دلانے والوں اور خواجہ زبیر دونوں ہی کا مذاق اڑایا۔ خواجہ زبیر کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بہت مایوس ہوئے اور اپنے حامیوں اور ارادت مندوں کو منع فرمادیا کہ ''جو لوگ ہمارے طرفدار یا عقیدت مند نہیں ہیں ان سے الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

ایک دن آپ مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے تشریف لے گئے۔ پہلے ہی سے وہاں بڑا ہجوم تھا۔ خواجہ زبیر کو ذرا سی جگہ مل گئی تو آپ فوراً آگے بڑھ گئے۔ حاسدوں کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور آپس میں طنزاً کہنے لگے۔ ''معلوم نہیں کیسے کیسے لوگ یہاں آجاتے ہیں انہیں کہیں اور جانے کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔''

آپ نے ان سے پوچھا۔ ''کیا میرا آنا آپ کو ناگوار گزرا ہے؟''

ایک سرہندی نے جواب دیا۔ ''جی ہاں، آپ کا آنا ہمیں واقعی ناگوار گزرا ہے۔ کیا ہندوستان میں اس مزار کے علاوہ کوئی مزار نہیں ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''بھائیو! میرے والد ابوالعلی مجدد الف ثانیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اس رشتے سے میں ان کا عزیز ٹھہرتا ہوں لیکن اگر آپ لوگوں کو میری موجودگی گراں گزرتی ہے تو میں چلا جاؤں گا۔''

مزار کے سجادہ نشین کو اندیشہ تھا کہ اگر خواجہ زبیر سرہند میں رہ گئے تو یہ مقبول خاص وعام ہوجائیں گے اور ان کا مزار سونا اور غیر آباد ہوجائے گا اس لیے ان کا یہاں سے چلے جانا ازبس کہ ضروری ہے۔ جواب میں کہا۔ ''ہماری تو یہی خواہش ہے کہ آپ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔''

خواجہ زبیر نے اپنے مریدوں سے پوچھا۔ ''تم لوگوں کا کیا مشورہ ہے؟''

مریدوں نے بیک زبان جواب دیا۔ ''کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں پیر ومرشد۔ ہمیں یہیں رہنا چاہیے اگر اس حال

میں ہم یہاں سے چلے گئے تو یہ لوگ ہماری عدم موجودگی میں یہی کہیں گے کہ ڈر کر چلے گئے، بزدل تھے۔"

آپ نے فرمایا۔ "ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر جھگڑا یا بدمزگی ہو اس لیے میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

ایک مرید نے دبی زبان میں کہا۔ "اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو کہیں نہ جاتا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "کل میں شاہ جہاں آباد چلا جاؤں گا مگر سرہند کے شری اور حاسد لوگوں کی بابت میں ایک خبر چھوڑ جاؤں گا جس سے یہ جلد یا بدیر دوچار ہوں گے اس سے بچ نہیں سکتے۔"

ایک مرید نے پوچھا۔ "حضرت! وہ کیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ لوگ آپس میں لڑیں جھگڑیں گے جس سے ان کی بربادی لازم ہوجائے گی۔"

مریدوں نے بیک آواز میں کہا۔ "اللہ تعالیٰ ان کے حال پر رحم فرمائے۔"

آپ نے حسب وعدہ سرہند چھوڑ دیا اور شاہجہاں آباد چلے گئے۔ وہاں ایک بوسیدہ مسجد میں قیام فرمایا۔ مسجد کی مرمت کی۔ آپ کے ارادت مند اور مرید ساتھ تھے انہوں نے مسجد کے آس پاس بودوباش اختیار کی پھر ان کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی آن بسے اور رفتہ رفتہ مسجد کے آس پاس شاندار آبادی ہوگئی۔

☆☆☆

آپ کے پاس حاضری دینے والوں میں امرا اور رؤسا بھی پیش پیش تھے۔ وہ جب آتے تو معمولی اور غریب مرید اٹھ جاتے اور انہیں بیٹھنے کا موقع دیتے۔ آپ نے اپنے غریب مریدوں کو سختی سے منع کردیا کہ "ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہاں امرا اور غربا کا امتیاز کوئی نہیں۔" اس ہدایت کے بعد امیری اور غریبی کا امتیاز ختم ہوگیا۔

مغل دربار کے وہ امیر جن کا جاہ وجلال زبان زد خاص وعام تھا خواجہ زبیر کے دربار میں آتے تو ان کا جاہ وجلال رخصت ہوجاتا اور وہ خواجہ زبیر کے جلال سے سرنگوں ہوجاتے۔ معظم بہادر شاہ خود بھی ان کا ارادت مند تھا۔ اس کے امرا اور دوسرے منصب دار بھی آپ کے دربار کی چاکری کرنے لگے۔

ایک امیر سینہ پھلائے، گردن اکڑائے آپ کے پاس پہنچا اور بیٹھ گیا، بولا۔ "حضرت! میں نے آپ کی عظمت اور بزرگی کا بڑا چرچا سنا ہے۔ خود جہاں پناہ آپ کے بے حد معتقد ہیں لیکن میں اپنی افتاد طبع سے بہت مجبور ہوں۔ اس وقت تک کسی کو تسلیم نہیں کرتا جب تک میں خود نہ آزما لوں۔"

آپ نے کوئی جواب نہیں دیا اور امیر کی بات سنی ان سنی کردی۔

امیر نے مزید کہا۔ "کیا حضرت نے میری بات نہیں سنی؟"

کسی مرید نے امیر کو جواب دیا۔ "اے نادان شخص! یہاں اس لب ولہجے میں بات نہیں کی جاتی۔"

امیر نے اسے ڈانٹ دیا۔ "تو خاموش رہ۔ میرا مخاطب تو نہیں تیرا مرشد ہے۔"

آپ نے پرجلال چہرہ اوپر اٹھایا اور اسی مرید کو حکم دیا۔ "اس مغرور اور متکبر امیر کو رخصت کردیا جائے۔ یہ درویش کی کٹیا ہے یہاں عجز وانکسار کا سکہ چلتا ہے۔"

امیر نے شکایتاً کہا۔ "حضرت! یہ میرے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ میں ایک حیثیت والا انسان ہوں۔ مجھے کسی معمولی مرید سے نکلوا دینا بڑی بے عزتی کی بات ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "افسوس کہ تو جسے معمولی سمجھ رہا ہے خدا کے نزدیک وہ غیر معمولی ہے۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ تو خود ہی یہاں سے چلا جا۔"

وہ امیر اٹھا اور غصے میں پاؤں پٹکتا چلا گیا۔ آپ نے فرمایا۔ "افسوس کہ جس زمین کو یہ غصے میں روندتا کچلتا جارہا ہے چند دنوں میں اسی کی آغوش میں چلا جائے گا اور زمین اسے کچل کر رکھ دے گی۔" اور ٹھیک چوتھے دن یہ امیر اپنے گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوگیا۔

☆☆☆

ابوالعلیٰ کا وصال ہوگیا اور ان کے مریدوں اور ارادت مندوں نے شاہجہاں آباد کا رخ کیا۔ وہ سب آپ کے اردگرد جمع ہوگئے۔ انہی دنوں ایک متمول شخص کشمیر سے شمال ہند کے لیے چلا۔ اسے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو اسے خدا سے ملا دے۔ اس کوشش میں اس نے بڑے دھوکے کھائے۔ جواہر نما سنگ ریزوں سے ملاقاتیں کیں اور ہر بار کچھ نہ کچھ کھو کر تلاش حق میں لگا





رہا۔ وہ پٹھان کوٹ سے آگے بڑھا تو ایک بزرگ نے اسے روک لیا اور پوچھا۔ "نوجوان! تو کہاں جارہا ہے۔ پریشانیاں تیرے بشرے سے ٹپک رہی ہیں۔ اگر مجھے کسی لائق سمجھتا ہے تو اپنے دکھ درد مجھے دے دے۔ میں انہیں مار بھگاؤں گا۔"

اس شخص نے ان بزرگ کو دیکھا اور پھر ان کی باتیں سنیں تو حیران رہ گیا، اس نے جواب دیا۔ "حضرت! میں کسی مرد کامل کی تلاش میں آوارہ وسرگرداں ہوں۔ معلوم نہیں میں اسے پا بھی سکوں گا یا نہیں۔"

بزرگ نے جواب دیا۔ "اگر میں اس مرد کامل کا پتا بتادوں تو!"

حق کے متلاشی نے جواب دیا۔ "تو میری منزل مل جائے گی اور میں آپ کا زندگی بھر احسان مند رہوں گا اور اگر آپ مجھ سے اس کا معاوضہ چاہیں گے تو میں ہر معاوضہ ادا کرنے کو تیار ہوں جو میری استطاعت اور مقدرت میں ہوگا۔"

بزرگ نے کہا۔ "شاہجہاں آباد چلا جا، وہاں کسی سے بھی ابوالعلیٰ کے بیٹے خواجہ زبیر کا پتا معلوم کرلینا۔ یہ وہ ہے جسے اس عہد کی قیومیت عطا کی گئی ہے گویا خواجہ زبیر قیوم رابع ہیں، ان کے والد قیوم ثالث تھے۔ قیوم ثانی حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند خواجہ معصوم کو بخشی گئی تھی اور قیوم اول خود مجدد الف ثانی تھے۔"

یہ شخص ان بزرگ کو وہیں چھوڑ کر شاہجہاں آباد چل دیا اور خواجہ زبیر کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ کئی دن بعد اس نے خواجہ زبیر کو ان بزرگ کا حال سنایا جن کی ہدایت پر یہ شخص آپ کے پاس پہنچا تھا تو آپ نے فرمایا۔ "یہ بزرگ خود خواجہ خضرؑ تھے۔"

1739ء کے پرآشوب سال میں دہلی خوف اور دہشت کا شکار ہوگئی تھی۔ محمد شاہ رنگیلا کی بادشاہت مغل دبدبے سے محروم ہوچکی تھی اور شاہ درانی دہلی کی طرف بڑھا چلا جارہا تھا۔ جنت الحمقا میں رہنے والے مغل لشکری اور امرا نادر شاہ افشار کا مذاق اڑانے میں مشغول تھے لیکن ان میں بعض مرید ایسے بھی تھے جو مغل بادشاہت اور دہلی کے مستقبل سے مایوس اور فکرمند تھے۔ وہ چوری چھپے خواجہ زبیر کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ "حضرت! ہماری آنکھیں بڑا خون خرابا دیکھ رہی ہیں۔ دعا فرمایئے کہ خدا ہمیں فتنوں اور تباہ کاریوں سے محفوظ رکھے۔"

خواجہ زبیر نے ارشاد فرمایا۔ "لوگو... ! دہلی پر ایک قیامت نازل ہونے والی ہے۔ اپنے اپنے اعمال درست کرلو تاکہ وہ ظلم کو روکنے کی سپر بن جائیں۔"

ایک عاقبت نااندیش امیر نے نادر شاہ اور اس کی فوج کا مذاق اڑایا۔ "حضرت! نادر شاہ ہمارے بادشاہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ خدا ہمارے بادشاہ محمد شاہ کو سلامت رکھے۔ ان کے باپ دادا بھی اس ملک پر حکومت کرتے تھے۔ اب یہ حکومت کررہے ہیں۔ محمد شاہ کے پاس ماضی کا درخشاں ورثہ ہے جبکہ نادر شاہ کے پاس اس قسم کا کوئی ورثہ نہیں۔ یہ گڈریا زادہ سیکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد تھکا ہارا آئے گا تو مارا جائے گا۔ خود مرے گا اور اپنی فوج کو بھی برباد کروائے گا۔"

خواجہ زبیر نے کہا۔ "اے شخص! تو یہ کیسی باتیں کررہا ہے۔ دہلی کی طرف نادر شاہ اور اس کی فوج کی آمد کوئی معمولی بات ہے کیا؟ یہ قہر الٰہی ہے جو عنقریب دہلی پر نازل ہوجائے گا۔ دہلی والے قیامت صغریٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے، تم کس ہوا میں ہو؟"

اسی امیر نے کہا۔ "حضرت! میں آپ کی تردید تو نہیں کروں گا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ یہ حملہ آور تھکان کی وجہ سے اس لائق نہیں رہ جائیں گے کہ ہم سے جنگ کرسکیں۔ آپ دیکھ لیجیے گا ہم لوگ اس کا منہ موڑ دیں گے اور وہ دوبارہ یہاں آنے کی ہمت نہیں کرسکیں گے۔"

خواجہ زبیر نے بے نیازی سے فرمایا۔ "خدا ایسا ہی کرے۔ میں دعاگو ہوں۔"

نادر شاہ یلغار کرتا، آبادیوں کو روندتا، کچلتا دہلی میں داخل ہوگیا۔ مغل فوج خس وخاشاک کی طرح نادری سیلاب میں بہہ گئی۔ اس دوران جبکہ نادر شاہ دہلی کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر مغل بادشاہ کو زیر کرچکا تھا۔ لوگ اس کا انجام جاننے کے لیے بے چینی سے منتظر تھے۔ خواجہ زبیر کے پاس آنے والوں میں اکثریت ان کی تھی جو یہ جاننا چاہتے تھے کہ اب دہلی ہندوستان پر حکومت کون کرے گا۔ مغل بادشاہ یا ایران کا گڈریا نادر شاہ۔ خواجہ زبیر نے واضح لفظوں میں اعلان کردیا کہ حکومت مغل فرماں روا ہی کرے گا مگر دہلی والے سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔ مریدوں کو یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ اگر مغل فرمانروا محفوظ رہ گیا اور دہلی والوں پر عتاب ہوا تو اس میں تباہی اور بربادی کس کس کے مقدر میں لکھی ہوئی نکلے گی۔

نادر شاہ ایک دن سو کر جو اٹھا تو اسے اپنے بستر پر سے ایک خط ملا، اس میں کسی مسخرے نے پوچھا تھا۔

"میں ناچیز اور ایک گمنام شخص ہوں اور نادر شاہ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ دہلی کیوں آیا؟ اگر وہ خدا بننا چاہتا ہے تو نادر شاہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا کو مخلوق کی ضرورت رہتی ہے اس لیے دہلی والوں کو بادشاہ مخلوق سمجھ کر معاف کردے اور گر بادشاہ پیغمبر بن کر آیا ہے تو اس کو امت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دہلی والوں کو اپنی امت ہی سمجھ کر معاف کردے اور اگر نادر شاہ

بادشاہ بننے آیا ہے تو اس کو رعایا درکار ہوگی اس لیے دہلی کو اپنی رعایا ہی سمجھ کر بادشاہ درگزر سے کام لے۔"

نادر شاہ نے اسے پڑھا تو غصے سے اس کا چہرہ لال ہوگیا اور چیخ کر پوچھا۔ "یہ خط کس نے لکھا ہے؟"

سامنے موجود ہر شخص کا چہرہ لٹک گیا۔ نادر شاہ نے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا مگر وہاں پر ہر چہرہ سپاٹ اور لاعلم تھا۔ نادر شاہ نے غصے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہر حال جن صاحب نے بھی میرے بستر پر یہ خط رکھا ہے انہیں میری طرف سے جواب دے دیا جائے کہ نادر شاہ قہر الٰہی بن کر دہلی پر نازل ہوا ہے۔"

اس کے بعد مغل فوج نے نادر شاہ کی فوج میں اڑا دیا کہ ایرانی بادشاہ دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ اس خبر نے ایرانیوں کے حوصلے پست کر دیے اور مغلوں کے حوصلے بڑھا دیے۔

نادر شاہ غصے میں گھوڑے سے اتر پڑا اور سنہری مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی تلوار نیام سے باہر کر لی اور اپنی فوج کو حکم دے دیا کہ جو نظر آئے اسے قتل کر دو اور جب تک میری تلوار نیام سے باہر رہے۔ یہ قتل اور خونریزی جاری رہے۔

اس حکم نے دہلی پر قیامت صغریٰ نازل کر دی اور ہر طرف خون کا دریا بہنے لگا۔ لوگ بھاگ بھاگ کر شاہجہاں آباد پہنچنے لگے لیکن جن کے ایمان کمزور تھے وہ یہاں بھی خوفزدہ نظر آتے تھے۔ وہ بار بار یہی پوچھتے۔ "حضرت! اب کیا ہوگا؟"

خواجہ زبیر جواب دیتے۔ "کچھ نہیں ہوگا ستر ہزار انسان قتل کر دیے جائیں گے مگر بادشاہ محمد شاہ ہی رہے گا۔"

ایک مرید نے پوچھا۔ "حضرت! شاہجہاں آباد پر کوئی مصیبت تو نہیں آئے گی؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میرے آس پاس رہنے والے محفوظ رہیں گے۔"

نادر شاہ نے دہلی کو تین دن رات کے لیے امن و امان سے محروم کر دیا لیکن شاہجہاں آباد کا وہ گوشہ بالکل محفوظ رہا جو خواجہ زبیر کی نگرانی میں تھا۔ کچھ عرصہ بعد نادر شاہ ایران واپس چلا گیا اور دہلی کا نظام حکومت محمد شاہ کے پاس ہی رہنے دیا۔ لوگ خواجہ زبیر کے اور زیادہ قائل ہو گئے اور ان کے اعزاز اور مرتبے میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

☆☆☆

خواجہ زبیر نے ایک زمانے کو فیض پہنچایا اور لوگوں کو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ڈال دیا۔ آخری عمر میں انہیں معدے کی خرابی کی شکایت ہو گئی۔ حکیموں نے جلاب تجویز کیا آپ اس پر کاربند ہو گئے۔

ایک بار عشا کی نماز کے بعد انہیں اپنے پیٹ میں درد محسوس ہوا۔ پہلے تو آہستہ آہستہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد اس میں شدت آتی چلی گئی۔ حکیم بلوائے گئے انہوں نے دیکھا اور دوائیں دیں لیکن دواؤں کا حلق سے اترنا تھا کہ کھانسی شروع ہو گئی پھر جسم میں بخار تپنے لگا۔ صبح ہوتے ہوتے انہیں اپنے سینے میں درد بھی محسوس ہونے لگا۔ مریدوں کا خیال تھا کہ آپ شاید فجر کی نماز نہیں پڑھ سکیں گے لیکن توقع کے خلاف آپ نے فجر کی امامت کی اور ورد و وظائف میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔

کچھ عرصے بعد صحت بھی جواب دینے لگی۔ مریدوں نے عرض کیا۔ "حضرت! اطبا کہتے ہیں کہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "دوستو! وہ دن زیادہ دور نہیں جب میں مستقلاً آرام کر سکوں گا۔"

ایک مرید آپؒ کا مطلب سمجھ گیا، گھبرا کر بولا۔ "حضرت! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ مشیت ایزدی ظاہر کر رہا ہوں۔"

سمجھدار ہوش مند مریدوں نے آپ کی خدمت میں زیادہ تندہی اور جوش سے کام لیا۔ وہ آپ کے پاس گھنٹوں موجود رہتے اور صورت دیکھتے رہتے کیونکہ وہ جان چکے تھے کہ یہ آفتاب بہت جلد گہنا جانے والا ہے۔ اسی دوران رمضان آ گئے۔ خواجہ زبیر نے اس ماہ تین بار قرآن ختم کیا اور بعد میں 29 شوال تک پابندی سے مسجد آتے رہے۔ 29 شوال کے بعد آپ پر بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ آخر ایک دن اشراق کے وقت آپ اپنے خالق سے جا ملے۔

5 ذیقعد، جمعرات کے دن آپ کی لاش مبارک سرہند پہنچا دی گئی اور 12 ذیقعد کو جمعرات ہی کے دن آپ کو دفن کر دیا گیا۔ کہتے ہیں ایسا عاشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور متبع سنت پھر نہیں پیدا ہوا۔

**ماخذات**

خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ سکینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔
سفینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ شاہجہاں نامہ (عمل صالح)، محمد صالح کمبوہ۔
تزک جہانگیری، شہنشاہ جہانگیر۔ انوار اصفیا





# راز

تنویر ریاض

جب دنیا میں ہر چیز کا تضاد موجود ہے تو کوئی راز پھر کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے۔ اسے بھی کبھی نہ کبھی افشا ہونا ہی پڑتا ہے اور وہ جو کسی راز کے مانند جس خفیہ چادر میں چھپا بیٹھا تھا، ان قیامت خیز نظروں سے نہ بچ سکا جو سات پردوں کے پار بھی دیکھ لیا کرتی تھیں کیونکہ... اصولوں کی آنکھیں کھلی ہوں تو قانون اندھا نہیں رہتا۔

سمجھوتوں کی بے ساکھیوں کو توڑنے والے قانون کے

محافظوں کا جارحانہ انداز

جب پولیس لندن میں واقع ڈکنز ہاؤس میوزیم میں پہنچی تو روی وکرم کی لاش چھوٹے سے بیڈروم کے فرش پر بے ڈھنگے انداز میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کا سر دیوار کی طرف تھا۔ آنکھیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں اور گردن پر رسی کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔ ڈیسمنڈ ہنری لاش کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا اور اس کے پیروں کے پاس نارنجی رنگ کی وہ ریشمی ڈوری پڑی ہوئی تھی جو کرم کا گلا گھونٹنے کے لیے استعمال کی گئی تھی۔ پولیس نے اسے گرفتار کرنے میں دیر

نہیں لگائی اور اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی لیکن جب وہ اسے نیچے کھڑی ہوئی پولیس کار کی طرف لے جانے لگے تو وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ میں ایک ٹیچر ہوں۔ تم چاہو تو امریکا میں میرے بورڈنگ اسکول کی پرنسپل کو فون کرکے معلوم کرسکتے ہو۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ لمبے قد والے پولیس انسپکٹر نے کہا۔ ”ہم نے خود دیکھا ہے کہ تمہارے ہاتھ اس کی گردن پر تھے۔“

”میں رسی ہٹا رہا تھا۔“ ہنری نے کہا۔ ”تاکہ اس کے اوسان بحال ہوسکیں۔“

”ہم اس پر بعد میں بات کرسکتے ہیں۔“ انسپکٹر بولا۔ ”فی الحال تمہیں اداکار روی وکرم کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا جارہا ہے۔“

”مجھے پانچ منٹ کی مہلت چاہیے۔ ابھی سب لوگ اس عمارت میں موجود ہیں، صرف پانچ منٹ۔“

”میں ایسا کیوں کروں۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”جبکہ تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو۔“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، میں تمہارا شک دور کرنا چاہتا ہوں۔“

”تم جانتے ہو کہ کس نے اسے قتل کیا ہے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”مجھے صرف پانچ منٹ چاہئیں۔ اس کے بعد سب کچھ واضح ہوجائے گا۔“ ہنری اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے بولا۔

انسپکٹر نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”ٹھیک ہے تمہارا وقت شروع ہوگیا۔“

ہنری نے بے دھڑک ہوکر اس بارے میں سوچنا شروع کردیا۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وکرم کو کس نے قتل کیا ہے لیکن اسے اگلے چار منٹ اور اٹھاون سیکنڈ میں یہ بات معلوم کرنا تھی۔ اس کی آزمائش چھ مہینے پہلے اس وقت شروع ہوئی جب اس کی پرنسپل سوزانے نیکلین نے اسے اپنے دفتر میں بلا کر کہا۔

”کیا تم ایک مہینا لندن میں گزارنا پسند کرو گے۔ تمام اخراجات اسکول برداشت کرے گا۔“

وہ یہ پیشکش سن کر خوش تو ہوا لیکن فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ جانتا تھا کہ یقیناً اس میں کوئی مقصد پوشیدہ ہے۔

”تم بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو۔“ وہ اس کا چہرہ پڑھتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں ایک راز معلوم کرنا ہے۔“

”کیسا راز؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”اس کا تعلق ڈراما نگار چارلس ڈکنز سے ہے۔“

وہ سمجھا کہ شاید اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہے اس لیے تصحیح کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ ڈراما نویس نہیں بلکہ ناول نگار تھا۔“

وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اس نے ساری زندگی تھیٹر سے پیار کیا۔ وہ اپنے کیریئر کے دوران ڈراموں میں کام کرتا اور ان کی ہدایتکاری میں مصروف رہا۔ پہلا ناول شائع ہونے سے پہلے ہی اس کے چار ڈرامے لندن میں کامیاب ہوچکے تھے پھر وہ کیوں عظیم ڈراما نگار نہیں بن سکا، تمہیں یہی معلوم کرنا ہے۔“

ہنری نے محسوس کیا کہ وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہے۔ اس لیے سر کو خم دیتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنی پوری کوشش کروں گا لیکن تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟“

”کیونکہ چارلس ڈکنز کا پرستار اور ہمارا ایک سابق طالب علم اسکول میں نیا آرٹ سینٹر تعمیر کرانے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ ہم اسے ڈکنز کی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں وضاحت سے کچھ بتا سکیں۔“

”میرے خیال میں تو یہ سیدھا سیدھا پیسوں کا معاملہ ہے۔ کیونکہ ڈراما نگار کو عموماً زیادہ پیسے نہیں ملتے۔“

”اس کے لیے یہ وضاحت کافی نہیں ہوگی۔ تمہیں اس پر پوری طرح ریسرچ کرنا ہوگی اور واپس آکر اسے تفصیل سے بتانا ہوگا کہ ڈکنز نے ڈرامے لکھنا کیوں بند کردیے تھے۔ میں تمہاری بہت شکر گزار ہوں گی۔“

جنوری کے مہینے میں اسے یہ سب کچھ سن کر بہت اچھا لگ رہا تھا اور اب جون کی اس منحوس بدھ کو اسے قتل کے شبہے میں گرفتار کیا جانے والا تھا۔ حالانکہ دن کی ابتدا بڑے اچھے انداز میں ہوئی تھی۔

اس نے صبح ساڑھے نو بجے ایک سیب اپنے بریف کیس میں رکھا اور رسل اسکوائر میں واقع اپنے فلیٹ سے ڈفٹی اسٹریٹ کی جانب چل دیا جہاں ڈکنز ہاؤس میوزیم کی شاندار عمارت واقع تھی۔

استقبالیہ پر اس کی ملاقات ایک دبلی پتلی صورت سے ہوئی، اس نے اپنا تعارف کرایا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میرا نام مسز پیریس ہے۔ یقیناً تم ڈائریکٹر سے ملنا چاہو گے؟“

”ہاں مجھے جیمس ڈیڈلاک سے ملنا ہے۔“



وہ اپنا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تم ان سے نہیں مل سکو گے۔ انہیں ملازمت سے برطرف کردیا گیا ہے۔“

”کیا؟“ ہنری کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ گزشتہ تین ماہ سے ڈیڈلاک کو اپنی ریسرچ کے سلسلے میں ای میل کرتا رہا تھا۔

وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”یہاں سے کچھ قیمتی چیزیں غائب ہوگئی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی ملازمت ختم ہوگئی۔“

”کیا اس کے ذمے دار مسٹر ڈیڈلاک ہیں؟“

وہ عورت نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مسٹر ڈیڈلاک کو یقین ہے کہ چور اب بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ تم میری بات لکھ لو مسٹر ہنری کہ جیمس ڈیڈلاک بالکل بے قصور ہے۔“

ہنری کو یہ پریشانی لاحق ہوگئی کہ جن تاریخی دستاویزات کی خاطر وہ یہاں آیا ہے وہ اسے کیسے مل سکیں گی؟ مسز پیریس نے اسے اطمینان دلایا کہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ ”نئے ڈائریکٹر مسٹر اسٹیفن اس وقت کانفرنس میں ہیں لیکن میں انہیں تمہاری آمد کی اطلاع دے دیتی ہوں، اس وقت تک تم ڈکنز کے زیر استعمال اشیا کی نمائش دیکھو۔“

وہ اس کمرے کی جانب چلا گیا جو ڈکنز فیملی کی طعام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہاں مختصر سا فرنیچر تھا اور مقفل شیشے کی الماریوں میں ڈکنز کی دستاویزات مثلاً خطوط، ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودے، تبصرے اور کتابوں کے پہلے ایڈیشن رکھے ہوئے تھے۔ وہ ایک میگزین کو بغور دیکھنے لگا جس کا نام ہاؤس ہولڈ ورلڈ تھا۔

”وہ تقریباً اپنی ہر چیز پہلے رسالوں میں چھپواتا تھا۔“ اس کے عقب سے ایک آواز آئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ بھورے بالوں والا ایک نوجوان شخص تھا لیکن اس نے پندرہ سال کے لڑکے جیسا حلیہ بنایا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور عمر رسیدہ شخص کوٹ پتلون اور جیکٹ میں ملبوس کھڑا ہوا تھا۔ ہنری نے اس کی بڑھی ہوئی توند سے اندازہ لگا لیا کہ وہی میوزیم کا ڈائریکٹر ہے۔

”میرا خیال ہے کہ تم ہی مسٹر فن ہو؟“ یہ کہہ کر وہ نوجوان شخص کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کی جانب بڑھا لیکن وہ شریف آدمی یہ سن کر شرما گیا۔

”میں اسٹیفن ہوں۔“ نوجوان شخص بولا۔ ”اور یہ

## صبر و تحمل

ایک شخص کو سرکاری افسر مقرر کیا گیا تو ایک قریبی دوست نے اس سے ملنے کے بعد نصیحت کی ”افسر بننے کے بعد ایک بات یاد رکھنا کہ صبر و تحمل کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔“

اس شخص نے جواب دیا کہ وہ ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھے گا۔ دوست نے اسے یہ نصیحت تین بار کی۔

جب بھی دوست نصیحت کرتا، وہ جواب میں کہتا۔ ”اچھا! میں ایسا ہی کروں گا۔ مگر جب دوست نے چوتھی بار نصیحت کی تو وہ افسر مشتعل ہوگیا اور بولا۔ ”تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے، جو بار بار یہی نصیحت دہرائے جارہے ہو؟“ دوست نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

دیکھا......! صبر و تحمل سے کام لینا آسان بات نہیں ہے، ابھی میں نے چند بار ہی ایک بات کہی اور تم غصے میں آگئے۔“ یہ بات سن کر دوست افسر سخت شرمندہ ہوا۔

## وہ لوگ...!

☆ کتنے کم ظرف ہوتے ہیں، جو دوسروں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

☆ کتنے اچھے ہوتے ہیں، جو بے غرض دوسروں کے کام آتے اور سچی محبت کرتے ہیں۔

☆ کتنے سنگدل ہوتے ہیں، جو دوسروں کا سکون لوٹ کر خوش ہوتے ہیں۔

☆ کتنے بدقسمت ہوتے ہیں، جو سچائی اور خلوص کی قدر نہیں کرتے۔

☆ کتنے عظیم ہوتے ہیں، جو دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرتے ہیں۔

☆ کتنے کھوکھلے ہوتے ہیں، جن کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے۔

☆ کتنے ایثار پسند ہوتے ہیں، جو دوسروں کی خوشیوں پر اپنی خوشیاں قربان کردیتے ہیں۔

☆ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں، جو اللہ کی خوشنودی کے لیے اس کے بندوں سے پیار کرتے ہیں۔

مرسلہ: محمد محسن فاروقی، ہائی سیکورٹی زون، نیو سینٹرل جیل، ملتان

مسٹر روی وکرم ہیں جو ہمارے لیے کام کرتے ہیں۔"

ہنری کو اپنے اندازے کے غلط ہونے کا بہت صدمہ ہوا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ لاابالی سا لڑکا ڈکنز ہاؤس کا ڈائریکٹر ہوگا اور دوسرا شخص جسے وہ ڈائریکٹر سمجھ رہا تھا کوئی ہندوستانی ہے۔

روی وکرم کی عمر تقریباً پچپن برس ہوگی۔ اس نے ہنری کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔

"امید ہے کہ تم شو دیکھنے ضرور آؤ گے۔" ہنری نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

"آج شام کو مرکزی نشست گاہ میں۔"

"مسٹر وکرم بھٹ ہر ہفتے ڈکنز کے ڈرامے میں کام کرتے ہیں۔" تھیچر فن نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ شو ہر بدھ کی شب مرکزی نشست گاہ میں ہوتا ہے۔"

"معاف کرنا تم مجھے کافی کم عمر دکھائی دیتے ہو۔" ہنری نے تھیچر سے کہا۔

"یہ واقعی جوان ہے۔" روی وکرم بولا۔ "تھیچر تمہاری کیا عمر ہوگی؟"

"اٹھائیس سال۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس سے پہلے کہ تم کوئی مزید سوال کرو میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ ڈرہم میں لیٹریچر پڑھنے کے علاوہ کیمبرج سے ماسٹرز کر چکا ہوں۔"

"گویا میں نے مسٹر ڈیڈلاک سے جو رابطہ کیا تھا وہ سب بے کار ہو گیا۔" ہنری مایوسی سے بولا۔

"اس پریشانی کے لیے معذرت خواہ ہوں، وہ غیر متوقع طور پر آج صبح ہی یہاں سے چلے گئے۔ مجھے افسوس ہے کہ ان سے تمہاری ملاقات نہ ہو سکی۔"

"مسز پیریس مجھے اس بارے میں بتا چکی ہیں۔"

تھیچر نے اس کے سامنے کچھ کاغذات لہرائے اور بولا۔ "یہ وہ ای میلز ہیں جو تم مسٹر ڈیڈلاک کو بھیجتے رہے ہو اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں ڈکنز کے ڈراموں سے دلچسپی ہے۔ کیا تم ریڈنگ روم دیکھنا چاہتے ہو؟" یہ کہہ کر اس نے ہنری کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اسے لے کر ایک آراستہ جدید دفتر میں داخل ہو گیا۔ "ریڈنگ روم تک جانے کے لیے میرے دفتر سے گزرنا پڑتا ہے۔ حفاظتی نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہے۔"

اس نے سامنے والی دیوار کا دروازہ کھول دیا اور وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئے جس کے وسط میں ایک چھوٹی میز اور چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ پرانے طرز کی کیٹلاگ نصب تھی اور اس کے ساتھ ہی چھوٹی سی میز پر کمپیوٹر رکھا ہوا تھا، بقیہ کمرا کتابوں کی الماریوں سے بھرا ہوا تھا۔

"اگر تمہیں اپنی مطلوبہ کتاب ڈھونڈنے میں دقت ہوئی تو مینٹی مارلے تمہاری مدد کر سکتی ہے۔" فن نے کہا "وہ یہاں کی مہتمم ہے۔ بس آنے والی ہی ہوگی۔"

ہنری بصد شوق کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ چند منٹ ہی نہ گزرنے پائے تھے کہ مینٹی بھی آ گئی، وہ سیاہ فام تھی اور اس نے افریقی عورتوں کی طرح اپنے بالوں کو چوٹیوں سے کسا ہوا تھا۔ کانوں میں ایک کے بجائے تین تین بالیاں لہرا رہی تھیں۔

"نائیجیرین!" اس نے شستہ برطانوی لہجے میں کہا۔ "تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مسٹر فن، تم انہیں ریڈنگ روم دکھا سکتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کیبن میں چلی گئی۔

"کچھ کتابیں اوپر کی منزل پر بھی ہیں۔" فن نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اس کیٹلاگ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مطلوبہ کتاب کہاں رکھی ہوئی ہے، مینٹی بامیں وہ تحریر شدہ مسودے بھی تمہیں دکھا سکتے ہیں۔ جو شائع نہیں ہوئے لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ انہیں دیکھنے سے پہلے تم بنیادی معلومات حاصل کر لو۔"

فن نے ایک باکس کی طرف اشارہ کیا جس میں سفید سوتی دستانے رکھے ہوئے تھے اور بولا۔ "کسی بھی کاغذ یا کتاب کو ہاتھ لگانے سے پہلے یہ دستانے پہننا بہت ضروری ہیں۔ بعض اوقات ہماری انگلیوں میں چکنائی جمی رہ جاتی ہے جس سے ان قیمتی دستاویزات کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ڈکنز ایک بڑا ڈراما نویس کیوں نہ بن سکا، کیا تمہیں اس بارے میں کوئی اندازہ ہے؟"

"بہت آسان سی بات ہے۔" تھیچر فن نے کہا۔ "وہ اچھا ڈراما نہیں لکھ سکتا تھا، کیا تم اس سے اختلاف کرتے ہو۔"

"ہاں۔" مینٹی مارلے کی آواز آئی۔ "اس نے بہت اچھے ڈرامے لکھے اور ان میں اداکاری بھی کی۔"

"پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ ڈکنز اچھا ڈراما نگار کیوں نہ بن سکا۔" فن کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

ہنری نے اپنا معمول کچھ اس طرح بنایا کہ وہ روزانہ ایک گھنٹا مطالعہ کرتا اور اس کے بعد میوزیم کے کسی ایک کمرے میں چلا جاتا۔ یہ عمارت چار منزلہ تھی اور اس کی ہر منزل پر دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ سب سے اوپر کی منزل پر دو بیڈ روم تھے جن میں بڑا کمرا ڈکنز اور اس کی بیوی کیتھرائین کے استعمال میں رہتا تھا جبکہ چھوٹے کمرے کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور تھیں۔ اس میں ڈکنز کی سالی میری ہوگارتھ رہا کرتی تھی جس کا سترہ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔

دونوں کمروں کے درمیان ایک تنگ سا ڈریسنگ روم بھی تھا جہاں ہنری کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہاں ایک میز پر ڈکنز کی خاندانی تصاویر رکھی ہوئی تھیں اور اس کے چاروں طرف ریشمی ڈوری باندھ دی گئی تھی جیسے ہی ہنری اس رسی کو پکڑ کر آگے کی طرف جھکا تاکہ میری ہوگارتھ کی تصویر کو قریب سے دیکھ سکے تو میز کے نیچے سے ایک ہاتھ باہر آیا اور اس کی کلائی پکڑ لی، وہ بری طرح بوکھلا گیا، پھر ایک چار سالہ بچے نے میز کے نیچے سے سر نکال کر ایسی آواز نکالی جیسے اسے ڈرا رہا ہو۔ اسی دوران اس کی ماں آ گئی۔ اس نے بچے کو کھینچ کر باہر نکالا اور ہنری سے معذرت کرنے لگی۔ ہنری نے یہی بہتر جانا کہ وہ ریڈنگ روم میں واپس جا کر مطالعے میں مصروف ہو جائے۔

اس کی غیر موجودگی میں وہاں ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی جس کی عمر بہ مشکل بیس سال ہوگی اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور آنکھوں پر چھوٹا سا چشمہ بھی لگا رکھا تھا، اس نے اپنے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور مینٹی سے پانچ قدیم خطوط لے کر ہنری کے سامنے میز پر بیٹھ گئی۔ اس نے ہنری کو دیکھ کر اخلاقاً سر ہلایا اور پہلا لفافہ کھول کر پڑھنے لگی۔ ہنری نے بھی جھینپ مٹانے کے لیے اپنا بریف کیس کھول کر دیکھا جس میں ایک سیب کے سوا کچھ نہ تھا۔ گو کہ اسے امید تھی کہ اس ماہ کے آخر تک یہ بریف کیس مختلف کاغذات سے بھر جائے گا۔

دس منٹ بعد اس نے کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنی اور ایک نوجوان شخص کاؤبوائے جوتے پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ پھولا ہوا اور پسینے میں شرابور تھا۔ ہنری نے اندازہ لگا لیا کہ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں ہے اور وہ دیکھنے میں کسی کالج کا طالب علم نظر آ رہا تھا۔ مینٹی نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا اس کی کوئی مدد کر سکتی ہے۔ اس نے خالص امریکی لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے فوسٹر کی سوانح حیات چاہیے۔"

ہنری کو اس لڑکے کا اکھڑ پن اچھا نہیں لگا۔ سامنے بیٹھی لڑکی نے بھی اسے ناگواری سے دیکھا تو وہ بولا۔ "میں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا ہے۔"

جب مینٹی اس کی مطلوبہ کتاب لینے چلی گئی تو وہ چند لمحوں تک یونہی کھڑا رہا پھر اچانک ہی چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس عمل کے دوران ہنری کا بریف کیس فرش پر جا گرا اور اس لڑکی کے کاغذات بھی بکھر گئے۔ وہ چلاتے ہوئے مینٹی کو بلانے کے لیے بھاگی۔ جب تک ہنری اس لڑکے کو سنبھالتا، وہ ہوش میں آ گیا اور کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے ناشتا نہیں کیا ہے۔" اسی دوران مینٹی بھی آ گئی اور اس نے ہنری کے ساتھ مل کر اس لڑکے کو کرسی پر بٹھا دیا اور وہ لڑکی بھی اپنے بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹنے لگی، جب سب کچھ معمول پر آ گیا تو مینٹی چونکتے ہوئے بولی۔

"اس میں ایک خط کم ہے۔" وہ ایک خالی لفافہ دیکھتے ہوئے بولی، بقیہ چار لفافوں میں خطوط موجود تھے جبکہ پانچویں لفافے میں ایک سادہ کاغذ خط کی شکل میں تہ کر کے رکھا گیا تھا اور اس میں سے ڈکنز کا اصلی خط غائب تھا۔

وہ لڑکی جو ان خطوط کا مطالعہ کر رہی تھی، اچانک ہی خوفزدہ ہو گئی اور اپنی صفائی میں بولی۔ "تم نے مجھے جو لفافے دیے تھے میں نے انہیں کھولا بھی نہیں اور نہ ہی ان میں سے کوئی کاغذ باہر نکالا۔"

"کوئی شخص اس کمرے سے باہر نہیں جائے گا۔" مینٹی مارلے نے تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا پھر اس نے فن کو بلایا اور بولی۔ "یہ سارا منظر بڑی ہوشیاری سے ترتیب دیا گیا ہے اور وہ یہاں انتشار پیدا کرنا چاہ رہے تھے۔ میں نہیں جانتی کہ یہ تینوں اس میں شامل ہیں یا یہ دونوں۔" اس نے باری باری اس لڑکے اور ہنری کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"معاف کرنا۔" ہنری بولا۔ "میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں، براہ کرم فوراً میری تلاشی لے لو۔"

"میں بھی تلاشی کے لیے تیار ہوں۔" وہ لڑکی بولی۔

"اور میں بھی۔" وہ نوجوان لڑکا بولا۔ "میں نے تمہارا خط نہیں لیا۔"

ان تینوں کی تلاشی لی گئی لیکن کسی کے پاس سے وہ خط برآمد نہیں ہوا۔

"ممکن ہے کہ یہ خط بہت پہلے چرا لیا گیا ہو؟" ہنری نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں۔" تھیچر فن نے کہا۔ "صرف دو روز پہلے

برٹش لائبریری کی ٹیم اس خط کا معائنہ کر چکی ہے۔ وہ ڈکنز کی دو سو سالہ سالگرہ پر ایک خصوصی نمائش کرنا چاہ رہے ہیں اور ہمارے پاس چارلس ڈکنز کا یہی ایک خط ہے جو اس نے ایلن ٹرنن کو لکھا تھا۔ اس سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کتنا نادر و نایاب ہے۔ اسے تو قدیم ذخیرہ سے باہر بھی نہیں نکالنا چاہیے تھا۔"

وہ میتھی مارلے پر ناراض ہو رہا تھا جو خود بھی بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے پہلے انکار کر دیا تھا لیکن اس عورت کا اصرار تھا کہ وہ ان خطوط کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہے تاکہ واٹر مارک سے ان کے اصلی ہونے کا پتا چلا سکے۔"

"میں واٹر مارک ہی دیکھ رہی تھی۔" اس عورت نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "اور اگر مجھے کوئی گڑبڑ نظر آتی تو تمہیں ضرور مطلع کرتی۔ ابھی میں نے وہ خط لفافہ میں سے نکالا ہی تھا کہ......" یہ کہتے کہتے وہ رک گئی اور اس نے معنی خیز انداز میں اس لڑکے کو دیکھا۔

تھیچر فن نے تااطلاع ثانی ریڈنگ روم بند کر دیا اور بولا۔ "ہمیں تمام دستاویزات کو دیکھنا ہوگا ممکن ہے کہ یہ حرکت کہیں اور بھی کی گئی ہو۔"

میتھی نے سر ہلا دیا۔ ان کے ذخیرے میں ایسے سیکڑوں خطوط تھے جن کی چھان بین میں کئی دن لگ جاتے۔

"تمام لوگ اپنا سامان یہاں چھوڑ دیں۔ میں پولیس سے ان کا باقاعدہ معائنہ کرواؤں گا۔ براہ کرم اپنے بریف کیس غیر مقفل کر دیں۔"

جب ہنری کمرے سے باہر جانے لگا تو تھیچر فن اسے ایک طرف لے جا کر بولا۔ "مسٹر ہنری، مجھے یقین نہیں ہے کہ تم اس واقعہ میں ملوث ہو لیکن ہمیں اپنا اطمینان بھی کرنا ہے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تم آج رات اس بریف کیس کی وجہ سے یہاں کیوں نہیں رک جاتے۔ تمہیں اس سلسلے میں جو زحمت اٹھانا پڑی۔ اس کے ازالہ کے لیے میں تمہیں روی کے شو کا ٹکٹ دے سکتا ہوں۔"

ہنری اس کے خلوص سے بہت متاثر ہوا۔ اس شام وہ شو میں شرکت کے لیے تیار ہو کر دوبارہ آیا تو میوزیم کے دروازے پر ہی تھیچر فن اور میتھی مارلے نے اس کا استقبال کیا۔

"مسٹر ہنری!" فن اسے دیکھتے ہی بولا۔ اس وقت وہ سیاہ جینز اور سیاہ ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ "مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ تمہارا بریف کیس غائب ہو گیا ہے۔"

ہنری نے بڑی مشکل سے اپنے لہجے کو نرم کیا اور بولا۔ "کیا پولیس نہیں آرہی؟"

"وہ سات بجے کے قریب آئیں گے۔ میں نے وہ بریف کیس اپنی میز پر رکھا اور پانچ بجے میوزیم بند کر کے چلا گیا۔ میری واپسی پونے سات بجے ہوئی تو بریف کیس غائب تھا۔ میں نے بہت تلاش کیا لیکن کہیں نہیں ملا۔"

ہنری کے لیے اپنی حیرت پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ فن سے پہلے جیمس ڈیڈلاک کو محض اس لیے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے کیونکہ میوزیم سے کچھ اشیا غائب ہو گئی تھیں، گویا یہاں پر حفاظتی انتظامات نہ ہونے کے برابر تھے لیکن نوجوان ڈائریکٹر اس کے بریف کیس کی گم شدگی پر خاصا شرمندہ نظر آرہا تھا اس نے سر کو جھٹک کر ان خیالات سے چھٹکارا حاصل کیا اور تماشائیوں میں جا کر بیٹھ گیا جو شو شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی تعداد تین درجن کے قریب ہوگی اور ان میں بھی اکثریت ایسے امریکی طالب علموں کی تھی جو اپنے پروفیسر کے ساتھ برطانیہ آئے ہوئے تھے۔

شو ٹھیک آٹھ بجے شروع ہو گیا۔ ہال میں تقریباً چالیس کے قریب کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ وکرم انیسویں صدی کے دھاری دار سوٹ اور گھنگھریالی وگ لگائے چارلس ڈکنز کا روپ دھارے اسٹیج کے وسط میں کھڑا اپنے حالات زندگی بیان کر رہا تھا کہ کس طرح اس نے بچپن غربت میں گزارا۔ فیکٹری میں مزدوری کی اور لکھنے کا آغاز کن حالات میں کیا۔

"مجھے جرائم سے بھی دلچسپی رہی ہے۔" اس نے ڈکنز کا روپ دھارتے ہوئے کہا۔ "وقفہ کے بعد میں آپ کو کچھ ہولناک واقعات سناؤں گا جس میں نینسی کا قتل بھی شامل ہے۔ میں آپ کو پہلے سے مطلع کر دینا چاہتا ہوں کہ بعض اوقات واقعات کو سن کر کچھ حاضرین دہشت سے بے ہوش ہو جاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے ہنری کو آنکھ سے اشارہ کیا جو پہلی صف میں بیٹھا ہوا تھا پھر وہ تیزی سے لوگوں کے درمیان سے گزر گیا اور اس کے پیچھے دوسرے لوگ بھی اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے۔ ہنری سب سے آخر میں وہاں سے روانہ ہوا، جب وہ دروازے پر پہنچا تو میتھی مارلے نے اس کا

راستہ روک لیا اور اسے ایک پرچا پکڑاتے ہوئے بولی۔ ”روی نے تمہارے لیے یہ خط دیا ہے۔“ ہنری نے اسے پڑھا لکھا تھا۔ ”مجھ سے وقفہ کے دوران اوپر کی منزل پر ملو۔“ نیچے دستخطوں کی جگہ انگریزی کا حرف R بنا ہوا تھا۔

ہنری کو اس پیغام پر خاصا تعجب ہوا، اس کا خیال تھا کہ اداکار وقفہ کے دوران اپنا لباس تبدیل کرتے، میک اپ درست کرتے اور اپنے مکالموں کو دہراتے ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ اپنے آپ کو کیریکٹر تک ہی محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کسی بھی ایسی سرگرمی سے گریز کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا تسلسل متاثر ہوا۔

ہنری نے پہلے دفتر کا رخ کیا لیکن وکرم وہاں نہیں تھا۔ البتہ تھیچر فن ٹیلی فون پر کسی سے باتیں کر رہا تھا لہٰذا وہ سیدھا اوپر کی منزل کی جانب چلا گیا۔ روی وکرم اس چھوٹے سے بیڈروم میں موجود تھا جہاں میری ہوگارتھ کی موت واقع ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک پورے میک اپ اور کاسٹیوم میں ملبوس تھا۔ اس کا سر دیوار کے ساتھ ٹکا ہوا تھا اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کی گردن کے گرد وہی ریشمی ڈوری لپٹی ہوئی تھی جو وہ ڈریسنگ روم میں دیکھ چکا تھا۔ وکرم کی ٹائی کا ایک سرا اس کی بائیں کلائی سے بندھا ہوا تھا جبکہ دوسرے سرے کو ایک سیاہ رنگ کے بریف کیس کے ہینڈل سے باندھ دیا گیا تھا۔ ہنری نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا کہ وہ اسی کا بریف کیس تھا۔

وہ وکرم کی جانب لپکا اور اس کی گردن سے رسی ڈھیلی کرنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اس واردات کو زیادہ دیر نہیں گزری اور وہ وکرم کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ابھی وہ رسی پوری طرح کھولنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز سنی۔

”مسٹر ہنری!“ میبنٹی مارلے دہشت زدہ آواز میں بولی۔ اس کے ساتھ تھیچر فن بھی تھا جو پہلے ہی پولیس کو فون کر چکا تھا۔ پولیس نے وہاں پہنچنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائی۔ انہوں نے سب سے پہلے میوزیم کے تمام داخلی اور خارجی دروازے بند کر دیے اور تمام لوگوں کو عمارت کے باہر جانے سے روک دیا۔ ہنری کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

”مجھے پانچ منٹ دے دو۔“ اس نے پولیس آفیسر سے التجا کی لیکن وہ خود نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ ان پانچ منٹوں میں کیا ثابت کر سکے گا۔

”تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ یہ بریف کیس تمہارا ہی ہے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ہنری نے کہا۔ ”میں مسٹر فن کے کہنے پر اسے یہاں چھوڑ گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ شو ختم ہونے کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”اس کے اندر کیا ہے؟“

”صرف ایک سیب۔“ ہنری نے کہا۔ ”تم خود دیکھ سکتے ہو۔“

جب انسپکٹر نے بریف کیس کھولا تو اس میں سے 1863ء میں شائع ہونے والے تین رسالے برآمد ہوئے، اس کے علاوہ وہ گم شدہ خط بھی موجود تھا جو چارلس ڈکنز نے ایلن ٹرنن کو لکھا تھا۔ ایک کتاب کا پہلا ایڈیشن بھی بریف کیس میں رکھا ہوا تھا جس پر ڈیوڈ کاپر فیلڈ کے دستخط تھے۔ ہنری ان سب چیزوں کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

”یہ کتاب اور رسالے اس سامنے والی الماری سے نکالے گئے ہیں۔“ تھیچر فن نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا تمہارے یہاں سی سی ٹی وی کیمرے نصب ہیں؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”یہ میری پہلی ترجیح ہے لیکن فی الحال ہمارے پاس ایسا کوئی نظام نہیں۔“ فن سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”میں نے یہ چیزیں نہیں چرائیں۔“ ہنری کمزور لہجے میں بولا۔

”تم اس وقت موجود تھے جب یہ خط غائب ہوا تھا۔“

”تم نے اس وقت بریف کیس میں رکھی ہوئی اشیا دیکھ لی تھیں اور ایک سیب کے سوا اس میں کچھ نہیں تھا۔“ پھر وہ تھیچر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”تم نے تو بتایا تھا کہ بریف کیس غائب ہو گیا ہے لیکن یہ تمہارے پاس ہی تھا اور تم نے اس میں یہ تمام چرائی ہوئی چیزیں بھر دیں۔“

”میں ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔“ فن نے کہا۔ ”میں یہاں اس ذخیرے کی حفاظت پر مامور ہوں، لوٹ مار کے لیے نہیں۔“

”کیا تمہارے پیشرو کی ملازمت اسی لیے ختم نہیں ہوئی کہ یہاں سے کچھ دستاویزات غائب ہو گئی تھیں۔“ ہنری نے کہا۔ ”لیکن اس تازہ ترین واقعہ کا ذمے دار اسے نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ وہ یہاں سے جا چکا ہے۔“

تھیچر فن کا چہرہ غصے اور شرم سے سرخ ہو گیا۔ ہنری اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم نے روی وکرم کو مارنے کے بعد لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے یہ چیزیں میرے بریف کیس میں رکھ دی ہوں۔“

”میرے پاس ایسا کرنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔ تم نے خود مجھے وقفہ کے دوران اپنے دفتر میں کسی سے فون پر باتیں کرتے دیکھا تھا۔ روی اس سے صرف چند منٹ پہلے ہی نکل کر اوپر آیا تھا۔“

ہنری نے پولیس انسپکٹر سے مطالبہ کیا کہ بریف کیس پر انگلیوں کے نشانات چیک کیے جائیں بعد میں اسے خیال آیا کہ کوئی بھی شخص سفید دستانے پہن کر بہ آسانی انگلیوں کے نشانات چھپا سکتا ہے ایک لمحہ کے لیے اسے یہ بھی خیال آیا کہ کہیں روی وکرم نے ہی تو یہ چیزیں نہیں چرائی تھیں لیکن فوراً ہی اس نے اسے مسترد کر دیا۔ اگر کوئی شخص وکرم کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیتا تو اسے قتل کرنے کے بجائے الارم بجا سکتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اس نے ان چیزوں کو ہنری کے بریف کیس میں کیوں رکھا۔ کیا وہ اسے استعمال کرنا چاہ رہے تھے۔ ان کا خیال ہوگا کہ ہنری پر کوئی شبہ نہیں کرے گا اور وہ شو ختم ہونے پر بہ آسانی بریف کیس کو باہر لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا اور راستے میں اس سے بریف کیس چھین کر فرار ہونا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

اس نے ایک بار پھر ریڈنگ روم میں پیش آنے والے واقعہ کو یاد کیا اور بولا۔ ”جو شخص دوپہر میں ناشتا نہ کرنے کی وجہ سے بے ہوش ہوا تھا۔ وہ میرے بریف کیس میں رکھا ہوا سیب بھی کھا سکتا تھا، کیا کسی نے اس پر غور کیا کہ وہ وقفہ سے پہلے ہی شو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔“

”میں پورے وقت دروازے پر موجود رہی۔ میرے سامنے کوئی بھی باہر نہیں گیا۔“ میبنٹی نے کہا۔

”ممکن ہے کہ تم کسی وجہ سے کچھ دیر کے لیے وہاں سے ہٹ گئی ہو؟“

”کس لیے؟“ میبنٹی نے کہا۔ ”روی پہلے ایکٹ کے اختتام تک زندہ تھا اور میرے سامنے سب لوگ باہر جا چکے تھے۔ تم سب سے آخر میں نکلے اور اسی وقت میں نے تمہیں وہ خط دیا۔“

ہنری نے سوچا کہ وہ وکرم کے لیے بالکل اجنبی تھا پھر اس نے خط لکھ کر اس سے ملنے کی خواہش کیوں کی؟

”اس نے مجھے خط لکھا اور تم سے کہا کہ وہ خط مجھے پہنچا دو۔ یہ بڑی عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ اس نے مجھے تحریری دعوت نامہ دیا۔ وہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے یہ بات زبانی بھی کہہ سکتا تھا۔“

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ”بہت سے ایکٹر شو کے دوران کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتے کیونکہ اس طرح ان کا کیریکٹر متاثر ہوتا ہے۔“

ہنری لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اسے یہ دلیل وزنی نظر آ رہی تھی۔ انسپکٹر کو اس کی خاموشی ناگوار گزری اور وہ بولا۔ ”مسٹر ہنری، اب تم کیا کہتے ہو؟“

ہنری بولا۔ ”میبنٹی، تم اس سے اتفاق کرو گی کہ وہ خط میرے لیے نہیں تھا۔“ جب وہ کچھ نہ بولی تو ہنری سمجھ گیا کہ اس کا اندازہ درست ہے۔ ”وہ خط تمہارے لیے تھا۔ وکرم تم سے اوپر کی منزل پر ملنا چاہ رہا تھا۔ تم جانتی تھیں کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے لہٰذا تم نے مجھے اوپر بھیج دیا۔“

سب کی نگاہیں ان دونوں پر جم کر رہ گئیں، میبنٹی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بولی۔

”یہ سب کچھ اس طرح نہیں ہوا۔ روی نے یہ خط مجھے چھ ہفتے پہلے لکھا تھا اور آج میں نے اس خط کو استعمال کیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ روی پر حملہ ہونے والا ہے۔ میں صرف اسے شرمندہ کرنا چاہ رہی تھی، میرا مقصد اسے روکنا تھا۔“

”تم اسے کس بات سے روکنا چاہ رہی تھیں؟“ ہنری نے پوچھا۔

میبنٹی نے ایک نظر کمرے میں رکھی ہوئی شیشے کی الماریوں پر ڈالی اور بولی۔ ”روی اکثر ان الماریوں کو کھول کر تاریخی دستاویزات دیکھتا، کتابیں نکالتا اور ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریروں کو چھوتا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے اپنے کیریکٹر کی تیاری میں ان سے مدد ملتی ہے لیکن یہ ایک غیر مناسب طریقہ تھا۔“

”تمہارے پاس ان الماریوں کی چابیاں تھیں اور تم اس کے لیے انہیں کھولا کرتی تھیں۔“ ہنری نے کہا۔

وہ تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں مگر آج کے بعد میں ایسا نہ کرتی کیونکہ مسٹر جیمس ملازمت سے برطرف کر دیے گئے ہیں اور ایک خط بھی غائب ہے۔“

ہنری کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”ان الماریوں میں رکھی ہوئی دستاویزات کا مشاہدہ کرنے کے بعد وکرم کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان میں سے کچھ اصل کاغذات چرا کر ان کی جگہ نقلی دستاویزات رکھ دی گئی ہیں۔ آج اس کا سامنا اس چور سے ہو گیا جس نے اسے قتل کر کے میرا بریف کیس اس کے ہاتھ سے باندھ دیا اور چرائے ہوئے کاغذات اس کے اندر رکھ دیے۔ اس کا مقصد تھا کہ وکرم کے قتل کا الزام مجھ پر آ جائے۔“

"لیکن چور نے یہ الماریاں کس طرح کھولی ہوں گی۔" مینٹی نے سوال کیا۔ "کیونکہ روی کے پاس ان کی چابیاں نہیں تھیں۔"

"اور نہ ہی کسی الماری کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے۔" فن نے کہا تو کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ فن نے مینٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "صرف ہم دونوں کے پاس ہی ان الماریوں کی چابیاں ہوتی ہیں۔"

مینٹی اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "مسٹر جیمس ڈیڈ لاک نے جو چابیاں واپس کی تھیں، وہ کہاں ہیں؟"

فن نے اپنی جیب سے چابیوں کے دو گچھے نکالے اور بولا۔ "وہ سب چابیاں میں صبح سے اپنی جیب میں لیے پھر رہا ہوں۔"

کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی رہی پھر مینٹی بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ میں نے روی کو قتل نہیں کیا۔"

"میرا بھی یہی کہنا ہے کہ میں نے اسے قتل نہیں کیا۔" فن بولا۔

"تم میں سے کوئی بھی اس کا قاتل نہیں ہے۔" ہنری نے کہا پھر اس کے ذہن میں دوپہر کے واقعات گھومنے لگے۔ وہ عورت اس نوجوان شخص کو پہلے سے جانتی ہوگی اور یقیناً انہوں نے وہ خط چرانے کی اسکیم بنائی ہوگی۔ جب اس لڑکے نے بے ہوش ہونے کا ڈراما رچایا تو کسی نے وہ خط ریڈنگ روم میں کہیں چھپا دیا۔ اس نوجوان نے پوری شام یہیں گزاری لیکن وہ عورت بعد میں نظر نہیں آئی۔ اس کا شوہر بانگ دہل یہ دعویٰ کرسکتا تھا کہ اس کی بیوی نے شو نہیں دیکھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ عورت سارا دن گھر میں چھپی رہی ہو اور موقع کے انتظار میں ہو کہ کب وہ اپنی چرائی ہوئی چیزیں وہاں سے لے جاسکتی ہے۔

روی وکرم کے ہال سے باہر آنے اور اس کی لاش دریافت ہونے میں زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگے ہوں گے..... اتنے مختصر وقت میں کسی کے لیے روی کو قتل کرکے سیڑھیوں کے ذریعے بھاگ جانا ممکن نہیں تھا۔ وہاں کوئی اور راستہ نہیں تھا جس کے ذریعے نیچے جایا جاتا۔ لہٰذا جس کسی نے بھی روی وکرم کو قتل کیا وہ ابھی تک اس مکان کی پہلی منزل پر ہی ہوگا۔

"یہ کیا ہے؟" ہنری نے کونے میں بنے ہوئے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"الماری ہے اور میرا خیال ہے کہ مقفل ہے۔" فن نے جواب دیا۔

ایک پولیس والے نے اس کا تالا کھولنے کی کوشش کی لیکن الماری اندر سے خالی تھی۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے جبکہ یہ الماری ہمیشہ مقفل رہتی ہے۔" فن حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"قاتل اسی الماری میں وکرم کے آنے تک چھپا رہا۔" ہنری نے کہا۔

"لیکن اب وہ پراسرار شخص کہاں ہے مسٹر ہنری؟" انسپکٹر نے پوچھا "یہاں اور کوئی الماری نہیں ہے جسے چیک کیا جائے۔ تمہی بتاؤ کہ وہ کون شخص ہے اور کہاں ہے؟"

"قاتل دوسرے کمرے میں ہے۔" ہنری نے بڑے رسان سے جواب دیا۔

"دوسرا بیڈ روم تو خالی ہے۔"

"دوسرے بیڈ روم میں نہیں بلکہ وہ ڈریسنگ روم میں ہے۔ تم میز پر پڑا ہوا کپڑا ہٹا کر دیکھو، وہ وہاں کافی دیر سے چھپا ہوا ہے۔"

دو پولیس والے فوراً ڈریسنگ روم کی جانب لپکے اور کچھ دیر بعد ایک شخص کو ہتھکڑی لگا کر وہاں لے آئے، ہنری نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سر کے بال غائب تھے اور اس نے سفید قمیص کے ساتھ سوٹ کی پینٹ پہن رکھی تھی۔

"جیمس ڈیڈ لاک!" فن حیرت سے بولا۔ اس کے سامنے میوزیم کا سابق ڈائریکٹر کھڑا ہوا تھا۔

"ان لوگوں کا کہنا تھا کہ میری تم سے ملاقات نہ ہوسکی۔" ہنری نے کہا "لیکن تم یہاں سے گئے ہی نہیں تھے۔ تم نے مسز ہیریس کو اپنی بے گناہی کا یقین دلا دیا اور یہ کہہ کر اوپر چلے گئے کہ اصل چور کو تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہو۔"

"لیکن اس نے تو چابیاں واپس کردی تھیں۔" فن نے کہا۔

"اس کے پاس دوسری چابی تھی۔" ہنری نے کہا پھر وہ ڈیڈ لاک سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "تم نے وہ خط کب چرایا تھا؟"

ڈیڈ لاک نے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ہنری کون ہے اور اس سے کس حیثیت میں سوال کررہا ہے غالباً اس نے دوسرے کمرے میں چھپ کر ان کی ساری باتیں سن لی تھیں، ایک لمحہ کے بعد وہ بولا "دو دن پہلے جب برطانوی لائبریری کے لوگ یہاں سے چلے گئے تھے۔"

"اور تم نے اسے کہاں چھپایا؟"



"کہیں نہیں بلکہ میں اسے گھر لے گیا تھا۔"

"تم ایک قیمتی خط گھر لے گئے؟" ہنری نے کہا۔ "لیکن جب چابیاں واپس کرنے آئے تو یہ خط بھی ساتھ ہی لے آئے۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

ڈیڈ لاک نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہنری اس کی خاموشی کو بھانپتے ہوئے بولا۔ "تم سارا دن اس خط کے ساتھ الماری میں چھپے رہے۔ اگر تم یہ خط واپس کرنے کے ارادے سے لائے تھے تو تم نے اسے اپنی جگہ پر رکھنے کی کوشش کیوں نہیں کی، تم یہ کام پانچ بجے بھی کرسکتے تھے جب میوزیم بند ہوجاتا ہے اور اس وقت تمہارے علاوہ وہاں کوئی اور نہ تھا۔"

سب لوگ پوری توجہ سے ہنری کی بات سن رہے تھے۔

"تم نے میرا بریف کیس چرایا اور اس میں ڈکنز کی یادگار اشیا رکھ دیں لیکن اگر تمہارا ارادہ ان چیزوں کو چرانے کا تھا تو تم فوراً ہی بریف کیس سمیت یہاں سے چلے جاتے۔ اس وقت میوزیم میں کوئی نہیں تھا لیکن تم اپنی جگہ پر چھپ کر شام کے شو کے لیے آنے والوں کا انتظار کرتے رہے۔"

ڈیڈ لاک اسے تعریفی انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم واقعی بہت ہوشیار ہو۔" یہ کہہ کر وہ نفرت آمیز انداز میں تھیچر فن کو دیکھنے لگا۔

ہنری نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ "تم یہاں انتقام کی غرض سے آئے تھے۔ تم واقعی روی وکرم سے شدید نفرت کرتے تھے۔ اسی لیے یہاں بیٹھ کر اس کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔"

"ہاں، اسی کی وجہ سے میری ملازمت چلی گئی۔" ڈیڈ لاک بولا۔ "اس نے بورڈ میں میری شکایت کی تھی کہ یہاں سے چیزیں غائب ہورہی ہیں۔ ان کے پاس کوئی واقعاتی شہادت موجود نہ تھی۔ اس کے باوجود مجھے ذمے دار ٹھہرایا گیا۔"

ہنری نے سر ہلایا۔ اس کی نظریں سیب کے بچے ہوئے ٹکڑے پر تھیں جو ابھی تک کمرے کے ایک کونے میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے ڈیڈ لاک سے کہا۔ "تم جیسے شخص سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ سیب کھانے کے بعد اس کا بقیہ حصہ فرش پر پھینک دیا۔"

"میں سمجھا کہ یہ سیب فن کا ہے۔" ڈیڈ لاک نے جواب دیا۔ "اور میرا خیال تھا کہ میں اس کی میز پر سے اس کا بریف کیس لے جارہا ہوں۔"

ہنری اب پوری بات سمجھ چکا تھا، وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "گویا تم مسٹر تھیچر فن کو بھی پھنسانا چاہ رہے تھے اور میرے بریف کیس کو ان کا سمجھ کر اس میں چرائی ہوئی چیزیں رکھ دیں، اس طرح تم ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہ رہے تھے اور تم نے بیک وقت روی وکرم اور مسٹر تھیچر فن سے چھٹکارا حاصل کرنے کا پروگرام بنایا کیونکہ ان میں سے ایک نے تم پر الزام لگا کر نوکری سے نکلوایا اور دوسرا تمہاری جگہ براجمان ہوگیا۔ کیا تمہیں امید تھی کہ اس طرح تم اپنی ملازمت پر بحال ہوجاؤ گے؟"

ڈیڈ لاک اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نہ صرف نوکری پر بحال ہوجاتا بلکہ گورننگ بورڈ مجھ سے معذرت بھی کرتا۔ اس بریف کیس سے برآمد ہونے والی چیزیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھیں کہ میں نہیں بلکہ فن یہاں سے چیزیں چرا رہا تھا۔"

جب یہ کارروائی اپنے اختتام کو پہنچی تو ہنری نے فون پر سوزانے کو اطلاع دی۔ "میں نے معما حل کرلیا ہے۔"

وہ خوش ہوتے ہوتے بولی۔ "جلدی سے بتاؤ کہ ڈکنز نے ڈراموں کے بجائے ناول لکھنے کو کیوں ترجیح دی؟"

"کیونکہ ناول نگار کے طور پر وہ اپنی تحریروں پر پورا عبور رکھ سکتا تھا۔" ہنری نے کہا۔ "ڈراموں میں اداکار اکثر جملے بدل دیتے ہیں یا اسکرپٹ میں ردوبدل کردیتے ہیں۔ جب وہ خود کہانی بیان کررہا ہوتا ہے تو اسے الفاظ، جملوں اور خیالات پر پورا کنٹرول ہوتا ہے لیکن وہی کہانی جب ڈرامے کا روپ دھارتی ہے تو اداکار اسے کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں؟"

وہ اس سے اتفاق کرتے ہوئے بولی۔ "تم نے اتنی جلدی یہ نتیجہ کیسے اخذ کرلیا؟"

ہنری نے اسے سارا واقعہ سنایا اور کہا۔ "جیمس ڈیڈ لاک نے جو اسکرپٹ لکھا تھا، اس کے مطابق بورڈ اس کی نوکری بحال کردیتا بلکہ اس سے معافی بھی مانگتا مگر دو ایکٹروں کی برجستگی کی وجہ سے اس کا ڈراما ناکام ہوگیا۔"

وہ اسے مبارکباد دیتے ہوئے بولی۔ "تم جلدی سے واپس آجاؤ، تمہارے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔"

"میرا بھی کچھ یہی حال ہے۔ اگلی فلائٹ سے واپس آنے کی کوشش کرتا ہوں۔" اس نے فون کریڈل پر رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ کیا سوزانے ہمیشہ سے ہی اس پر اتنی مہربان تھی۔



# دھوپ چھاؤں

ڈاکٹر ساجد امجد

دھوپ چھاؤں زندگی کا ایک رنگ سہی مگر... مکمل زندگی ہرگز نہیں۔ یوں تو دنیا میں ہر چیز بدل جاتی ہے اور بدلنا بھی چاہیے کیونکہ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے جو یکسانیت سے بہت جلد اکتا جاتی ہے لیکن... چاہت فقط ایک ایسا آفاقی جذبہ ہے جس میں بدلاؤ کسی طور قابلِ قبول نہیں اور اگر... خدانخواستہ ایسا ہوجائے تو جیتی جاگتی زندگی اندھیر ہوجاتی ہے۔ جبکہ وہ تو شوبز کی جگمگاتی دنیا میں مکمل گمراہی کا شکار تھی، اسے بھلا اجالوں سے کیا سروکار تھا۔ جس کی نفسیاتی گرہیں محض دنیا کو حیرت میں مبتلا کرنے کے خبط میں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے پر اکساتی رہیں اور ایک وہ دیوانہ تھا جو بار بار ٹھکرائے جانے پر بھی خوابوں کے تاج محل بناتا رہا اور خود خاموشی کے ساتھ اندر سے ٹوٹتا رہا... وہ جو اپنے ہنر کا بے تاج بادشاہ تھا عشق کے دام میں کچھ یوں الجھا کہ موت کی بانہوں میں ہی سکون پایا... اور اس بار چونکنے کی باری اس کی تھی جو دنیا کو چونکانے کے جنون میں مبتلا ہوکر بار بار اپنے دیوانے کے خوابوں کا تاج محل گرادیتی تھی مگر اس بار ویران چہرے کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور جب تمام خواب کرچیاں بن کر اس کے دل میں اتر گئے تو احساس ہوا کہ دنیا میں تبدیلی اچھی ہے مگر چاہت میں بدلاؤ کسی طور قابلِ قبول نہیں ہوتا۔

**اندھی محبت کا سودا کرنے والے ایک جادوگر کی دلگداز داستان**

جادوگر نے اپنی بائیں ٹانگ کو ذرا سا خم دیا۔ ایک آنکھ بند کر کے دوسری کو نشانے پر رکھا۔ ایک انگلی نے حرکت کی۔ روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اس کے کیمرے نے چہرے کو تصویر میں قید کر لیا اور تصویر بھی وہ کہ رنگ باتیں کرے اور باتوں سے خوشبو آئے۔ اسی وقت ایک پری اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا تم وہی ہو جسے سب جادوگر کہتے ہیں؟ تم جس کی تصویر کھینچ لو وہ ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے......''

''لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔''

''کیا تم مجھے امر کر دو گے۔ تمہارے ہاتھ کی ایک جنبش مجھے امر بنا سکتی ہے۔''

''تم جب اسٹیج پر نمودار ہو گی، میں اپنے تمام منتر پڑھ کر پھونک دوں گا۔''

''میں اسٹیج پر کیوں آؤں گی؟''

''جادوگری تو تمہیں بھی آتی ہو گی۔ اپنا مقالہ پڑھ کر لوگوں کو مسحور نہیں کرو گی؟''

''آپ نے غلط سمجھا۔ میرے لفظ اتنے سستے نہیں کہ ہر جگہ لٹاتی پھروں۔ میں تو اس کانفرنس میں صرف اس لیے آئی تھی کہ آپ کے کیمرے میں اپنا سراپا دیکھوں۔''

''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا لیکن میں پرائیویٹ فوٹو گرافر نہیں ہوں۔ ایک میگزین سے وابستہ ہوں اور اسی کے لیے تصویریں بناتا ہوں۔''

''میں بھی تو یہی چاہتی ہوں کہ میری تصویر آپ کے میگزین میں شایع ہو۔ ساری دنیا دیکھے۔ ممی تو دیکھ کر جل ہی جائیں گی۔ بہت کہتی ہیں ادھر مت جاؤ، ادھر مت جاؤ۔ اس لڑکے سے دوستی مت کرو۔ اس کے ساتھ مت گھومو۔ دن پھر گئے مگر اب تک خیالات وہی دقیانوسی ہیں۔ خیر یہ باتیں تو پھر بھی ہوتی رہیں گی۔ اس وقت تو یہ بتایئے آپ میری تصویر بنائیں گے ناں؟''

وہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مہمان خصوصی کی آمد کا شور ہوا اور اس کی آنکھوں کا زاویہ بدل گیا۔ پری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ اپنے ہم پیشہ لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔ اسی بھیڑ کے ہمراہ وہ اسٹیج تک آیا۔ اس کی انگلیاں حرکت میں تھیں۔ روشنیوں سے کھیلتا ہوا وہ اسٹیج تک آیا اور تصویروں کو زندگی دینے لگا۔ اچانک وہ پری نمودار ہوئی اور اسٹیج کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے کیمرے کا رخ اس طرف کیا۔ ایک جھماکا سا پھر ہوا اور اس کے خزانے میں ایک قیمتی موتی کا اضافہ ہو گیا۔

اس جادوگر کا نام ذیشان علی تھا۔ وہ ایک پریس فوٹو گرافر تھا۔ یہ ہنر ایسا نہیں کہ اس کے جاننے والے انگلیوں پر گنے جائیں لیکن اس کا کیمرا تو جادو کا کارخانہ تھا۔ اس لیے اس کی عرفیت ''جادوگر'' ہو گئی تھی۔ لوگ اسے ذیشان کے نام سے کم جانتے تھے جادوگر کے نام سے زیادہ۔

وہ ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ گریجویشن کرنے کے بعد جب اس نے دیکھا کہ نوکریاں اسے دیکھ کر دور بھاگنے لگی ہیں تو اس نے بھی تعاقب میں وقت ضائع نہیں کیا۔ وہ شہر کے مشہور فوٹو گرافر ماسٹر اللہ بخش کی دکان پر پہنچ گیا۔ ماسٹر اللہ بخش کے لیے مشہور تھا کہ وہ کسی کو شاگرد نہیں بناتے۔ وہ کسی انگریز کے ساتھ لندن چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے فوٹو گرافی کی تربیت حاصل کی تھی۔ واپس آنے کے بعد وہ یہ ہنر اپنے سینے میں دبا کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے سینے کا منتر وہی کھول سکتا تھا جسے کھل جا سم سم کا منتر آتا ہو۔ ذیشان علی کو بھی یہ منتر نہیں آتا تھا۔ اس نے دستک دی لیکن جب دروازہ نہیں کھلا تو وہ وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ کئی مہینے اس نے دکان کے سامنے بیٹھ کر گزار دیے۔ ماسٹر اللہ بخش کا دل پسیج گیا۔ انہوں نے پہلے دکان کے دروازے اس پر کھولے اور پھر دل کے دروازے کھول دیے۔

وہ وہاں سے نکلا تو جادو کے تمام منتر سیکھ چکا تھا۔ کچھ استاد نے سکھایا کچھ قدرت نے اس کی مدد کی۔

حسینوں کے خطوط تو اس کے پاس نہیں تھے ''تصویر بتاں'' کا خزانہ اس کے پاس ضرور محفوظ تھا۔ اس نے یہ تصویریں اٹھائیں اور ایک فیشن میگزین کے دفتر پہنچ گیا۔

''میں فوٹو گرافر ہوں۔ ماسٹر اللہ بخش کا شاگرد ہوں۔ یہ میری بنائی ہوئی تصویریں ہیں۔''

''ہم تصویریں خریدتے نہیں ہیں۔''

''میں تصویریں بیچنے نہیں نوکری کے لیے آیا ہوں۔''

''ہمیں کیسے معلوم ہو کہ یہ تصویریں تمہارے ہنر کا اظہار ہیں۔''

''آپ مجھے کوئی پروجیکٹ دے کر دیکھیے۔''

میگزین کے مالک نے وہاں کام کرنے والی ایک لڑکی کو بلایا۔ ''آپ اسے شوٹ کیجیے اور پھر رزلٹ مجھے دکھایے۔''

ذیشان نے یہ چیلنج قبول کیا اور اس کا ایک پوز لیا۔ ان مواقع پر عام طور پر فوٹو گرافر ایک سے زیادہ پوز بناتے ہیں۔ کوئی تو اچھا آئے گا لیکن اس کے پاس جو ٹیکنیک تھی اس میں اس فضول خرچی کی گنجائش نہیں تھی۔





وہ گھر آتے ہی اپنی لیبارٹری میں چلا گیا۔ تصویروں کو وہ خود ہی دھوتا تھا۔ اس عمل میں بھی وہ کسی اور پر بھروسا کرنے کا قائل نہیں تھا۔

دوسرے دن وہ تصویر لے کر میگزین کے دفتر پہنچ گیا تصویر مالک کے سامنے رکھ دی۔ گنجے سر والے مالک نے تصویر کو غور سے دیکھا اور سر کھجانے لگا۔ برسوں کا تجربہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ فوٹو گرافی کا ایسا کمال اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا لیکن کاروباری مہارت یہ اجازت نہیں دیتی تھی کہ جو شخص نوکری مانگنے آیا ہے اس کی بے جا تعریف کر کے اس کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا جائے۔ انہوں نے بہ ظاہر اطمینان کا اظہار کیا اور ذیشان کو نوکری مل گئی۔

انہوں نے تعریف نہیں کی لیکن قدردانوں سے اس کا ہنر پوشیدہ نہ رہ سکا۔ دو چار مہینے بعد ہی وہ پریس کی دنیا میں جادوگر کے نام سے مشہور ہو گیا۔ بھاری تنخواہ پر لوگ اسے اپنے ادارے میں گھسیٹنے کی کوشش کرنے لگے لیکن بہت سے فنکاروں کی طرح اس کے دماغ کا بھی ایک پیچ ڈھیلا تھا۔ اس نے کہیں جانا گوارا نہیں کیا۔

''جس نے مجھے ملازمت پر رکھا ہے وہی نکالے گا تو کہیں اور جاؤں گا ورنہ میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

شہر میں ہونے والی تقریبات کی کوریج اس کی ذمے داریوں میں شامل تھی۔ یہ ایک تھکا دینے والا کام تھا۔ شہر میں تقریبات روز ہی ہوتی تھیں اور اسے وقت بے وقت جانا پڑتا تھا مگر وہ یہ سوچ کر خوش تھا کہ اس نوکری نے اس کے تعلقات بہت وسیع کر دیے تھے۔ بڑے بڑے وزیر اس سے اپنے پرائیویٹ کام لیتے تھے اور اس کی آؤ بھگت میں لگے رہتے تھے۔ بھاری معاوضے کے لفافے بھی اس کے منتظر رہتے تھے۔ اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر کسی اخبار یا میگزین میں چھپ جاتی تھی تو وہ مہینوں موضوعِ بحث بنی رہتی تھی۔

☆☆☆

اس کانفرنس سے واپس آنے کے بعد جب وہ ان تصویروں کو بنانے کے لیے لیبارٹری میں پہنچا تو اس لڑکی کی تصویر بھی سامنے آئی جو تقریب میں اس کے برابر میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اپنی تصویر بنوانے کی ضد کر رہی تھی۔ یہ تصویر اتنی شاندار آئی تھی کہ اس کے شاہکاروں میں سے ایک کہی جا سکتی تھی۔ کچھ تو اس کا چہرہ فوٹو جینک تھا کچھ ذیشان کے جادو کا کمال تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تیرتی ہوئی اداسی، اس کے چہرے پر بکھرا ہوا حزن و ملال، ایک دیوی تھی جو اپنے دیوتا سے بچھڑ کر دور خلاؤں میں کسی کو تک رہی تھی۔

اس نے تصویر یہ سوچ کر بنائی تھی کہ لڑکی کا دل رہ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ وہ اس کے دفتر آ کر یہ تصویر اس سے لے جائے گی لیکن اب سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے اس شاہکار کو نہ صرف اپنے میگزین میں جگہ دے بلکہ اپنے تعلقات کو کام میں لاتے ہوئے اسے مختلف اخباروں کی بھی زینت بنائے۔

تصویر اس کے سامنے رکھی تھی اور وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اس نے اس لڑکی سے جس بے توجہی سے بات کی تھی اب وہ اس کے اتنا ہی قریب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بلیو جینز اور سرخ شرٹ میں کتنی خوب صورت لگ رہی تھی اور دولت مند بھی۔ وہ دولت مند ہوتے ہوئے بھی میری قدردانی میں سراپا نیاز بنی ہوئی تھی۔ یقیناً وہ مجھ میں دلچسپی لے رہی ہو گی۔ تصویر تو شاید محض بہانہ تھا۔ اس کی خوش فہمی نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس میں اس کی عمر کا بھی قصور تھا۔ اس عمر میں ہر نوجوان اسی طرح سوچتا ہے۔ کوئی لڑکی ذرا ہنس کر بات کر لے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ اس پر فدا ہو گئی ہے۔ اسے اب خود پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ اتنی جلدی میں تھا کہ اس لڑکی کا نام تک نہیں پوچھ سکا تھا۔ وہ رہتی کہاں ہے کم از کم یہی معلوم ہو جاتا۔ اس کی تصویر اس کے گھر جا کر دے آتا، راہ و رسم تو بڑھتی۔ اگر وہ اب دلچسپی نہیں لے رہی ہے تو اس وقت لینے لگتی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں کی ڈبیا ستاروں کی روشنی سے منور ہو گئی۔ وہ لڑکی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو؟''

''اور تم؟''

''مجھے یہ سوچنے کی فرصت نہیں۔ مجھے تو اپنی تصویر سے محبت ہے۔ وعدہ کرو تم اسے اپنے میگزین میں شایع کر دو گے۔''

''وہ تو مجھے کرنا ہی ہے۔'' وہ بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر اسے نیند آ گئی۔

وہ صبح دیر سے سو کر اٹھتا تھا لیکن اس دن اس کی آنکھ وقت سے پہلے ہی کھل گئی۔ اس کی ماں کو بھی تعجب تھا کہ وہ آج اتنے سویرے کیسے اٹھ گیا۔ گھر میں تھا ہی کون۔ اس کی ماں تو اس سے بات کرنے کو ترس گئی تھی۔ دیر سے سو کر اٹھتا تھا اور پھر دفتر جانے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دیتا تھا۔ آج ماں کو موقع ملا تھا اس سے جی بھر کر باتیں کرے۔ یہ باتیں کیا وہی ایک پرانا مطالبہ کہ اب ذیشان کو شادی

کر لینی چاہیے۔ ذیشان کا وہی ایک جواب کہ جلدی کیا ہے کرلوں گا۔

دفتر پہنچتے ہی وہ سیدھا ایڈیٹر کے کمرے میں چلا گیا۔ تصویروں کا لفافہ اس نے ایڈیٹر کی میز پر رکھ دیا۔ اس لڑکی کی اکیلی تصویر اس کے ہاتھ میں تھی۔

''یہ کیسی تصویر ہے؟'' ایڈیٹر نے پوچھا۔

''میں اس تصویر کے سلسلے میں آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔ یہ وہ تصویر ہے جسے دیکھ کر لوگ مونا لیزا کی تصویر کو بھول جائیں گے۔ میں آپ سے سفارش کروں گا کہ اسے سرورق پر شایع کریں۔''

''تمہیں معلوم ہے ہمارا سرورق باقاعدہ فروخت ہوتا ہے۔ یہ لڑکی کتنے پیسے دے گی؟''

''اس کی اشاعت میں لڑکی کی مرضی شامل نہیں۔ یہ تو میری خواہش ہے۔ یہ تصویر سرورق پر لگی تو آپ دیکھیں گے کہ پرچے کی ریکارڈ فروخت ہوگی۔''

''ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تمہاری طرح میں بھی یہاں ملازم ہوں۔ میں مالکان کو کیا جواب دوں گا جب وہ پوچھیں گے کہ سرورق کتنے میں فروخت ہوا؟''

''اس کا مطلب ہے مجھے بیگ صاحب سے بات کرنی چاہیے؟''

''ابھی اس تصویر کو رکھیں۔ تین شماروں تک کی بکنگ ہو چکی ہے اس کے بعد میں بیگ صاحب سے خود بات کرلوں گا۔''

''تین شماروں کا انتظار کیا تو اس تصویر کے رنگ پھیکے پڑ جائیں گے۔''

''کیا مطلب، کیا ہاتھ سے بنائی ہے جو رنگ اڑ جائیں گے۔''

''آپ ان باتوں کو نہیں سمجھیں گے۔ میں بیگ صاحب سے خود بات کروں گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی لیکن وہ یہ ضرور پوچھیں گے کہ آپ نے اس تصویر کو چھاپنے کے لیے کتنے پیسے لیے ہیں۔''

''اگر انہوں نے اصرار کیا تو پیسے میں اپنی جیب سے دے دوں گا۔'' وہ ایڈیٹر کے کمرے سے نکلا اور بیگ صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے وہ تصویر انہیں بھی دکھائی اور سرورق پر چھاپنے پر اصرار کیا۔ جواب وہی ملا جو وہ ایڈیٹر کی زبانی سن چکا تھا۔

''اس سرورق کے لیے یہ لڑکی ادارے کو کتنے پیسے دے گی؟''

''بعض چہروں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔''

''مسٹر ذیشان، یہ باتیں کہانیوں میں اچھی لگتی ہیں۔ ہم یہاں کاروبار کرنے بیٹھے ہیں۔ سفارش کا میں ویسے بھی قائل نہیں ہوں۔''

''میں یہ سفارش ادارے کے مفاد میں کر رہا ہوں۔ آپ دیکھیے گا اس تصویر کی وجہ سے یہ شمارہ ہاٹ کیک کی طرح فروخت ہوگا۔''

''لوگ مشہور چہرے خریدتے ہیں، اچھے چہرے نہیں۔ اگر آپ پھر بھی بضد ہیں تو یہ تصویر اپنے پاس رکھیے۔ کبھی سرورق خالی جا رہا ہوگا تو یہ تصویر لگا دیں گے۔''

ذیشان کچھ غصے کچھ مایوسی کے جذبات لیے اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر ایک کاغذ پر اپنا استعفیٰ لکھ کر بیگ صاحب کو بھجوا دیا۔

وہ تیار بیٹھا تھا کہ بیگ صاحب ابھی اسے بلوائیں گے لیکن اس کی توقع کے برعکس ایڈیٹر صاحب اس کے کمرے میں آئے اور اس سے مخاطب ہوئے۔

''یار، تمہارا نام لوگوں نے جادوگر ٹھیک ہی رکھا ہے تم نے تو بیگ صاحب پر بھی جادو کر دیا ہے۔''

''کیوں، کیا بکرے کی آواز نکالنے لگے؟''

''بکرے کی تو نہیں لیکن تمہاری آواز نکال رہے ہیں۔ مجھے حکم دیا ہے کہ تمہاری دی ہوئی تصویر اسی شمارے کے سرورق پر چسپاں کر دی جائے۔'' ذیشان نے تصویر ان کے حوالے کر دی۔

''تصویر کے نیچے یہ عبارت درج کروا دیجیے گا، ادبی کانفرنس کے شرکا میں شامل ایک حسین چہرہ۔''

شمارہ چھپ کر آیا تو اس نے اس کی کئی کاپیاں بے دھیانی میں بغل کا بستہ بنائیں اور موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ جس کی یہ تصویر ہے پرچے کی کاپیاں اس تک بھی تو پہنچنی چاہئیں۔ وہ اپنی تصویر دیکھ کر کتنی خوش ہوگی۔

کچھ دور جانے کے بعد اس کے پاؤں خودبخود بریک پر چلے گئے۔ یہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ اس کا ایڈریس مجھے کب معلوم ہے جو میں اس کے گھر پہنچ جاؤں گا۔ اسے اپنی دیوانگی پر ہنسی آگئی۔

وہ دوبارہ دفتر آگیا۔ اپنے ہاتھ کوئی خود کاٹ لے تو کسی اور کو الزام کیا دینا۔ غلطی میری ہے کہ میں نے اس کا نام تک نہیں پوچھا۔ اس کا ایڈریس میرے پاس ہوتا تو میں یہ میگزین تو اس تک پہنچا دیتا۔ کیا خبر یہ میگزین وہ پڑھتی بھی ہے یا نہیں۔ اگر یہ پرچا اس تک نہیں پہنچا تو میری تو محنت ہی





اکارت چلی جائے گی۔ جنگل میں مور کے مانند ناچتا رہ جاؤں گا۔ میری محنت کا تماشا دیکھنے والا کوئی بھی نہ ہوگا۔

امید کا ایک چراغ اب بھی اس کے دل میں جل رہا تھا۔ کیا خبر کسی بک اسٹال پر رکھے ہوئے اس میگزین پر اس کی نظر پڑ جائے اور وہ میرا شکریہ ادا کرنے میرے دفتر چلی آئے۔

وہ ہر آہٹ پر کان لگائے بیٹھا رہا۔ خوشبو کا کوئی جھونکا اس تک نہیں پہنچا۔ میگزین آئے دو دن گزر چکے تھے۔ اس کا گھر اتنی مسافت پر تو نہیں ہوگا کہ یہاں تک پہنچنے میں دو دن لگیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پرچہ اس کی نظر سے گزرا ہی نہیں۔ پرچہ آئے چار دن گزر چکے اور اس کی کوئی خیر خبر ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

ایک ہزار گز کی کوٹھی میں صرف تین آدمی رہتے تھے۔ چودھری دین محمد، ان کی بیوی بسم اللہ اور بیٹی ہاجرہ جسے سب ڈولی کہتے تھے۔ چودھری دین محمد جانوروں کی کھالوں کے بہت بڑے تاجر تھے۔ یہ بات ڈولی کے سوا شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ چودھری دین محمد ماضی کے دینو قسائی ہیں۔ کسی کی دکان پر قیمہ کوٹنے پر ملازم تھے پھر اپنی چھوٹی سی دکان کرلی۔ آدمی تیز تھے اور خیر سے بے ایمان بھی۔ یہ بات ڈولی کو بھی معلوم نہیں ہوگی کہ انہوں نے جانے کہاں سے ہاتھ مارا اور کھالوں کی تجارت شروع کر دی۔ دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی بن گئے۔ ڈولی نے بچپن کے چند برس کچے گھر میں گزارے تھے مگر ہوش اس کوٹھی میں ہی آکر سنبھالا تھا۔ اسے اپنے بچپن سے نفرت تھی اور ہونی بھی چاہیے تھی۔ اس نے جوان ہوتے ہی امیروں کے طور طریقے اختیار کر لیے تھے۔ دین محمد نے بھی میلی کچیلی لنگی اتار کر سوٹ پہننا شروع کر دیا تھا لیکن اس کی ماں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ خیالات بھی وہی تھے لباس بھی وہی۔ نوکر چاکر ہونے کے باوجود پورے گھر میں خود جھاڑو نکالتی پھرتی تھیں۔ یہاں تک بھی گوارا تھا لیکن ان کے دقیانوسی خیالات نے ڈولی کے دل میں ان کی طرف سے نفرت ڈال دی تھی۔ وہ ضد میں آکر ہر وہ کام کر گزرتی تھی جو اس کی ماں کی برداشت سے باہر تھا پھر دونوں کے درمیان وہ جنگ ہوتی تھی کہ نوکر تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ اس کی ماں اس سے محبت ہی نہیں کرتی۔ وہ اپنی اس محرومی کو دور کرنے کے لیے انتقاماً ایسی حرکتیں کرتی رہتی تھی کہ دوسروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا سکے۔ اس نے نادانستگی میں یہ سمجھ لیا تھا کہ اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ وہ اپنی حرکتوں سے دوسروں کی نظروں میں رہنا چاہتی تھی۔

وہ اپنا بیڈروم بند رکھتی تھی لیکن جس دن میگزین کے سرورق پر اس کی تصویر چھپی اس دن بیڈروم کا دروازہ کھول دیا اور میگزین ایسی نمایاں جگہ رکھ دیا کہ ماں کی نظر نہ پڑتی ہو تو پڑے۔

اس کی ماں صرف ایک دن اس کی کارستانی سے بے خبر رہ سکیں۔ وہ کہیں گئی ہوئی تھی۔ بیڈروم کھلا ہوا تھا۔ انہیں یہ تشویش ہوئی کہ وہ بیڈروم کھلا کیوں چھوڑ گئی۔ مہینوں سے اس کے بیڈروم میں جھانکا بھی نہیں تھا۔ یہ شوق بھی ہوا کہ اس نے اپنے بیڈروم میں کیا کیا چیزیں جمع کر رکھی ہیں۔ وہ اندر گئیں اور جاتے ہی نظر میگزین پر پڑ گئی۔ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن ماتھے سے نیچے دو آنکھیں تو لگی ہوئی تھیں۔ آنکھیں میگزین پر جا کر ساکت کھڑی ہوگئیں۔

''یہ لڑکی خاندان کی عزت اس طرح بھی اچھالنے لگی۔ اس کی تصویریں بازاروں میں بک رہی ہوں گی۔ کیا خبر فلموں میں کام کرنے لگی ہو۔ میں کون سی دیکھنے جاتی ہوں۔ جب میری شادی ہوئی تھی ایک مرتبہ دینو کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھی۔ فلموں میں تو لڑکیاں پرائے مردوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ناچتی ہیں۔ ہاجرہ کیا نہیں کرتی ہوگی۔ آنے دو اس حرافہ کو۔ بے غیرت دینو سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ میں خود ہی اس سے نمٹوں گی۔'' انہوں نے رسالہ وہاں سے اٹھا لیا اور اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ اپنی دانست میں انہوں نے بہت بڑی چوری پکڑ لی تھی۔ وہ تو آج کمرا کھلا رہ گیا ورنہ یہ راز اب بھی نہ کھلتا۔ انہوں نے سوچا اور ڈولی جب تک آ نہیں گئی وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہیں۔

ڈولی گھر میں کیا آئی ایک طوفان اس کے ساتھ چلا آیا۔ اس غریب کو بیڈروم تک جانے کی فرصت بھی نہ ملی کہ ماں کی دہاڑ نے اس کے قدم روک دیے یا وہ خود رک گئی۔ جس موقع کی تلاش میں تھی وہ آگیا تھا۔ وہ اتنی سرکش تھی کہ اگر چاہتی تو ماں کی پکار نظر انداز کرتی اور اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ وہ ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے ماں کے کمرے میں چلی گئی۔

''یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ کیا ہے یہ؟'' اس کی ماں نے میگزین اس کے سامنے رکھ دیا۔

''ممی، یہ ایک رسالہ ہے جس میں خوب صورت لڑکیوں کی تصویریں چھپتی ہیں۔''

''ہزار دفعہ کہا ہے مجھے اماں کہا کر، یہ ممی ٹمی میرے

کانوں کو بالکل بھلا نہیں لگتا۔"
"میری جتنی سہیلیاں ہیں سب کی ممی یا مام ہوتی ہیں اماں تو گنواروں میں ہوتی ہوں گی۔"
"تیری سہیلیاں گئیں بھاڑ میں، تو مجھے اس کا جواب دے کہ تیری تصویر یہاں کیسے آئی؟"
"میرے ایک دوست ہیں انہوں نے کھینچی اور رسالے میں چھپوادی۔"
"تیرے دوست مرد بھی ہیں؟"
"آپ کو تو پتا ہے پیسوں والوں میں یہی ہوتا ہے۔ کئی لڑکے ہیں جو میرے دوست ہیں۔"
"تو فوٹو کھنچوانے اس کے گھر بھی گئی ہوگی۔"
"تو اور کیا سڑک پر بیٹھ کر فوٹو کھنچواتی؟"
"ہائے میں مرگئی۔" انہوں نے اپنے بال نوچ ڈالے۔ "تو پرائے مردوں کے گھر جاتی پھرے اور میں زندہ رہوں۔ کان کھول کر سن لے، اگر تیرے یہی چھن رہے تو میں کسی دن کچھ کھا کر سو جاؤں گی۔ میرے جیتے جی اس گھر میں یہ سب نہیں ہوگا۔ تو فلموں میں کام کرے، پتلونیں پہن کر گھومے اور میں زندہ رہوں، نہ بابا نہ۔"
غضب یہ ہوا کہ شرمندہ ہونے کے بجائے ڈولی نے ہلکا سا قہقہہ لگا دیا۔ بس پھر کیا تھا ایسی ایسی گالیاں کوٹھی میں گونجنے لگیں کہ ملازموں نے کانوں پر انگلیاں رکھ لیں۔
ڈولی فاتحانہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی اور کمرا اندر سے بند کرلیا پھر پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگی۔
"بڑی اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش کرتی ہیں جیسے میری کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اب میں اپنا وجود منوا کر رہوں گی۔"
وہ کچھ دیر کمرے میں رہی، شاور لیا، کپڑے تبدیل کیے اور حلیہ درست کرکے کمرے سے نکل آئی۔ اس مرتبہ وہ کمرا بند کرنا نہیں بھولی تھی۔ اب کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے وہ ماں کو دکھانا چاہتی ہو۔
ماں کی گالیوں کا طوفان تھم چکا تھا۔ گھر میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ اس سے کسی نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں سے آئی تھی اور اب کہاں جارہی ہے۔ اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔ "اس گھر میں میری یہ تو حیثیت ہے کہ کسی کو میری پروا ہی نہیں...... پھر میں کیوں کسی کی پروا کروں۔" وہ پورچ تک پہنچی تھی کہ ڈرائیور بھاگا ہوا آیا۔
"چھوٹی بی بی، مجھے بلا لیتیں۔ کہیے کہاں جانا ہے؟"
"نہیں، تمہاری ضرورت نہیں، میں خود ڈرائیو کروں گی۔"
"مالکن کہتی ہیں میں ہر جگہ آپ کے ساتھ جایا کروں۔"
"میں بچی نہیں ہوں خود چلی جاؤں گی۔ تم آرام کرو۔" وہ گاڑی میں بیٹھی اور ایک جھٹکے سے کوٹھی سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

ذیشان اپنے کمرے میں بیٹھا وات کی بنائی ہوئی تصویروں کی چھان پھٹک کررہا تھا۔ ایڈیٹر صاحب ابھی ابھی اس کے کمرے سے ہوکر گئے تھے۔ اسے آنے والے شمارے کے لیے تصویریں منتخب کرکے دینی تھیں کہ چپراسی نے آکر بتایا کہ کوئی لڑکی اس سے ملنا چاہتی ہے۔
"کون ہے، کیا نام بتارہی ہے؟" ذیشان نے تصویروں پر نظر جمائے جمائے پوچھا۔
"نام تو میں نے نہیں پوچھا۔"
"بندے خدا کے، کوئی ملنے آتا ہے تو اس کا نام تو پوچھ لیتے ہیں۔ جاؤ نام پوچھ کر آؤ اور یہ بھی پوچھنا کہ کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہے۔" ذیشان نے کہا لیکن جب وہ جانے لگا تو ذیشان نے پھر اسے بلالیا۔ "اچھا چھوڑو، کسی خاتون سے اس کا نام پوچھنا اچھا نہیں لگتا، اسے بھیج دو۔" ذیشان نے کہا اور پھر تصویروں پر جھک گیا۔ اس محویت میں اسے یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ وہ لڑکی اندر آچکی ہے۔
آنے والی لڑکی نے جان بوجھ کر میز پر رکھا پیپر ویٹ زمین پر گرایا تو ذیشان نے چونک کر دیکھا۔ جادوگر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ پری اس کے سامنے کھڑی تھی جو اسے تقریب میں ملی تھی اور جس کی تصویر اس نے چھاپی تھی۔ اسے خوش ہونا چاہیے تھا۔ خوش ہوا بھی تھا لیکن اس نے مصنوعی بے رخی اختیار کی۔ ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ تصویروں پر جھک گیا۔
"جادوگر، میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔ تم نے نہ صرف میری تصویر چھاپی بلکہ سرورق پر چھاپی۔"
"وہ تصویر اتفاق سے اچھی آگئی تھی اس لیے ٹائٹل کی زینت بنانی پڑی۔"
"ایک تصویر اور کھینچو گے تو وہ اس سے بھی زیادہ خوب صورت آئے گی۔"
"کسی تقریب میں تم سے ملاقات ہوئی تو ایک تصویر اور کھینچ لوں گا۔"
"تم نے اچھا کیا جو تصویر چھاپ دی۔ ممی کے تن بدن میں ایسی آگ لگی کہ بجھانا مشکل ہوگیا۔ یہی میں چاہتی تھی۔"
"کمال کی لڑکی ہو۔ جب تمہیں معلوم تھا کہ تمہاری والدہ ناراض ہوں گی تو تمہیں رسالہ دکھانا ہی نہیں تھا۔"





"واہ! پھر ان کے جلنے کا تماشا کیسے دیکھتی۔"
"تم نے انہیں جلانے کے لیے تصویر کھنچوائی تھی؟"
"اور نہیں تو کیا، میری ہر چیز انہیں بری لگتی ہے۔ دوہرا ہونے کے بعد گھر سے باہر کیوں تھیں، لڑکوں کو دوست کیوں بناتی ہو، پینٹ کیوں پہنتی ہو، وغیرہ وغیرہ۔"
"میرا جہاں تک اندازہ ہے آپ کا تعلق اپر کلاس سے ہے۔ اس کلاس میں تو یہ سب باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتیں پھر آپ کی والدہ کیوں معترض ہوتی ہیں؟"
"یہ بھی کسی وقت بتادوں گی فی الحال تو کہیں چل کر چائے پیتے ہیں۔"
"کہیں چل کر کیوں، چائے تو یہاں بھی آسکتی ہے۔"
"آپ سے ابھی اور بھی تصویریں لگوانی ہیں، کسی شاندار ہوٹل میں چائے پلانی پڑے گی۔"
"اسے میں رشوت کہوں؟"
"نہیں، میری دوستی کی ابتدا۔"
"میں یہ تصویریں ایڈیٹر کے کمرے میں پہنچا کر ابھی آتا ہوں۔" اس نے تصویریں ایڈیٹر کے حوالے کیں اور ڈولی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اسے یہی گمان تھا کہ وہ اسے اپنی موٹر سائیکل پر لے کر جائے گا لہٰذا وہ اپنی بائیک کی طرف بڑھنے لگا۔
"کیا اس کھٹیچر بائیک پر لے کر جاؤ گے؟"
"کیا کروں مجبوری ہے، غریبوں سے دوستی رکھنی ہے تو یہ کڑوا گھونٹ تو پینا پڑے گا۔"
"پتا ہے، پہلے ہم بھی غریب تھے مگر اب نہیں ہیں۔ میں گاڑی میں آئی ہوں، آپ میرے ساتھ گاڑی میں چلیں۔ جب آپ گاڑی خرید لیں گے تو آپ کے ساتھ آپ کی گاڑی میں بیٹھا کروں گی۔"
وہ اسے لے کر ایک شاندار ہوٹل پہنچ گئی۔ اس کی آمدنی کم ضرور تھی لیکن پیشہ ایسا تھا کہ تقریبات میں شرکت کے بہانے تمام بڑے ہوٹلوں کی رونقوں سے فیض یاب ہوچکا تھا۔ یہ ہوٹل بھی اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔
وہ کچھ دیر اس کے ساتھ گزارنے کے بعد واپس دفتر آیا تو سخت الجھا ہوا تھا۔ اس کی زبانی اس کے گھریلو حالات جو کچھ اسے معلوم ہوئے تھے اس نے اسے پریشانی میں مبتلا کردیا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جن گھروں میں بڑے اپنی مرضی زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں اس گھر کے بچے عدم تحفظ کا شکار ہوجاتے ہیں۔ وہ اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں، پھر وہ خود کو تلاش کرنے میں زندگی گزار دیتے ہیں۔
بااختیار ہوتے ہی ہر وہ کام کرتے ہیں جن سے انہیں روکا گیا تھا۔ وہ دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔ ڈولی کی نفسیات انہی منزلوں سے گزر رہی تھی۔
اسے ان خیالوں سے فرصت ملی تو اس نے وہ لفافہ نکالا جو ڈولی نے اسے ہوٹل میں دیا تھا اور کہا تھا کہ اس میں کچھ تصویریں ہیں جو اس کے کالج میں ہونے والے فیشن شوز میں کھینچی گئی ہیں۔ وہ ان تصویروں کو مختلف اخبارات میں شایع کروادے۔
اس نے ان تصویروں کو ایک ایک کرکے غور سے دیکھا اور چند تصویروں پر "قابلِ اشاعت" لکھ کر انہیں الگ ایک لفافے میں رکھ دیا۔
یہ کام اس کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا۔ اسے دفتر سے اٹھنا بھی نہیں پڑا۔ اس نے مختلف اخباروں کو فون کردیا کہ وہ ایک تصویر بھیج رہا ہے اسے نمایاں کرکے شایع کردو۔ چپراسی کو بلایا اور تصویریں اس کے حوالے کردیں۔
دوسرے دن کے اخبارات ڈولی کی تصویروں سے بھرے پڑے تھے۔ ذیشان کو امید تھی کہ اخبارات دیکھتے ہی ڈولی اس سے ملنے ضرور آئے گی۔ وہ دن بھر دفتر میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آئی۔
دوسرا دن بھی اسی انتظار میں گزر گیا، وہ نہیں آئی۔ ذیشان نے اس کے گھر کا ایڈریس معلوم کرلیا تھا۔ وہ اس کے گھر جاسکتا تھا۔ ڈولی کا موبائل نمبر بھی اس کے پاس تھا۔ فون کرسکتا تھا لیکن اس نے دونوں میں سے کوئی بھی راستہ اختیار نہیں کیا۔ اس نے سوچا وہ اپنے کارنامے کی داد لینے خود کیوں جائے۔ ڈولی کو خود آنا چاہیے۔ فون تو وہ بھی کرسکتی تھی۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے ہے جو کام نکلوانے تک میٹھے بنے رہتے ہیں پھر آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ نہیں، وہ ایسی نہیں ہے۔ کوئی کام پڑ گیا ہوگا ورنہ آتی ضرور، شاید آج آجائے۔ وہ خود ہی سوال کرتا رہا، خود ہی جواب دیتا رہا۔
دو روز گزر گئے، اصولاً اسے ڈولی کا خیال ترک کردینا چاہیے تھا لیکن وہ باتیں اتنی دلچسپ کرتی تھی کہ رہ رہ کر اس کی باتیں اسے یاد آرہی تھیں یا شاید باتوں کا بہانہ تھا، اس کے دل میں محبت کا بیج بویا جاچکا تھا۔
اس دن اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی خودداری کو بالائے طاق رکھ کر اس سے ملنے اس کے گھر چلا جائے گا یا کم از کم فون کرکے تو دیکھے گا لیکن دفتر پہنچنے کے بعد کام میں ایسا مشغول ہوا کہ دوپہر تک اسے ڈولی کا خیال ہی نہیں آیا۔ دوپہر کے بعد جب ذرا فرصت ملی تو اس کا ہاتھ فون کی

طرف بڑھا۔ اسی وقت چپراسی اندر آیا اور ڈولی کی آمد کی خبر سنائی۔ چپراسی کے ساتھ ڈولی بھی اندر آ گئی۔

''میرے جادوگر، تم یقیناً مجھ سے خفا ہو گے؟''

''معلوم بھی ہے پھر بھی پوچھ رہی ہو۔''

''تمہاری خفگی بے جا نہیں ہے لیکن کچھ ایسی بات تھی کہ میں آ نہیں سکی۔''

''فون تو کر سکتی تھیں۔''

''فون پر بات کرتی کیا اچھی لگتی۔ اچھا یہ بتاؤ تم گھر آ سکتے تھے کیوں نہیں آئے، آ جاتے تو مزہ آ جاتا۔ تم نے تو کمال کر دیا۔ ہر اخبار میں میری تصویریں چھپی ہیں۔ اتنا مزہ آیا، ممی تو جل کر کوئلہ ہی ہو گئیں۔ بس بے ہوش ہونے کی کمی تھی۔ دورہ تو پڑ ہی گیا تھا۔''

''تمہیں اپنی ماں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔''

''وہ میری آزادیوں پر پہرے لگائیں گی تو میں یہی کروں گی۔ اس مرتبہ تو ڈیڈی بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ ہمیشہ ممی اور ڈیڈی کے درمیان جنگ ہوتی ہے لیکن اس مرتبہ دونوں ایک ہو گئے۔ جہالت کی بھی حد ہوتی ہے۔ چار تصویریں کیا چھپ گئیں، میں آوارہ ہو گئی۔''

ذیشان ایک مرتبہ پھر سوچنے لگا کہ اس لڑکی کے گھر کا ماحول اسے کہیں کا نہ رکھے گا۔ جس گھر میں والدین لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں وہاں بچے بھی جھگڑالوں ہو جاتے ہیں۔ وہ لڑکی ہے دوسروں سے نہیں لڑ سکتی تو خود سے لڑتی رہتی ہے۔ ایسے کام کرتی ہے جو شاید خود اسے بھی پسند نہ ہوں۔

''کس سوچ میں پڑ گئے؟ یہ بتاؤ اب میری کوئی تصویر کہاں چھپوا رہے ہو؟'' اس نے کہا اور پھر خوشی سے چیخ اٹھی۔ ''ارے ایسا کرتے ہیں تم میری بہت سی تصویریں کھینچ کر رکھ لو۔ جب موقع ملے ایک تصویر کہیں لگوا دو پھر دیکھنا کتنی مشہور ہوتی ہوں۔''

''تمہیں مشہور ہونے کا اتنا شوق کیوں ہے؟''

''ارے مجھے مشہور ہونے کا شوق کہاں ہے۔ میں تو اس لیے مشہور ہونا چاہتی ہوں کہ میری شہرت ہی تو دوسروں کو جلنے پر مجبور کرے گی۔ ممی ڈیڈی کو پتا تو چلے کہ ان کی رسیاں کتنی کمزور ہیں۔''

ذیشان کا باقی وقت اسے سمجھانے میں لگ گیا کہ وہ اپنے والدین کے خلاف کسی انتقامی جذبے سے کام نہ لے۔

''چلو کسی پارک میں چلتے ہیں۔ وہاں چل کر تم میری تصویریں بنانا۔''

''آج رات ہوٹل فیضان میں ایک فیشن شو ہے۔ تم وہاں آ جاؤ، میں تمہاری بہت سی تصویریں کھینچ لوں گا۔''

''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا لیکن مجھے اندر کون جانے دے گا۔ وہاں تو شاید پاس کے ذریعے داخلہ ہو گا۔''

''تم تو میرے ساتھ ہو گی۔ تم آٹھ بجے تک وہاں پہنچ جاؤ، میں تمہیں گیٹ پر ہی مل جاؤں گا۔''

ڈولی نے آج تک کوئی فیشن شو نہیں دیکھا تھا۔ اسے یہ موقع بھی مل رہا تھا اور تصویروں کا لالچ بھی تھا۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل پہنچ جائے گی۔

اس دن جان بوجھ کر ڈرائیور کو ساتھ لے لیا تاکہ واپس آنے کے بعد اس کی ماں پوچھے تو وہ بتا سکے کہ وہ کسی فیشن شو میں گئی تھی۔

اس نے ہوٹل پہنچ کر گاڑی پارک کی تو ذیشان اسے دور سے ہی نظر آ گیا۔ وہ ذیشان کے ساتھ اندر چلی گئی۔ اندر پہنچی تو دنیا ہی اسے دوسری نظر آئی۔ وہ ایسے ہوٹلوں میں کئی بار آئی تھی لیکن اس وقت اسے اپنے آپ پر فخر ہو رہا تھا۔ وہ پریس فوٹوگرافر کے ساتھ آئی تھی۔ انتظامیہ اس کی آؤ بھگت میں لگی ہوئی تھی پھر اسے منصفین حضرات کی پشت پر بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بٹھا دیا گیا۔ یہ کرسیاں مخصوص مہمانوں کے لیے ڈالی گئی تھیں۔

''ذیشان، میں تو یہاں پھنس کر بیٹھ جاؤں گی، تم میری تصویریں کس وقت بناؤ گے؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی تقریب ہے۔ اس کے بعد وقت ہی وقت ہو گا۔''

پروگرام شروع ہوا اور روشنیوں نے رات کو دن بنایا تو ڈولی کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اسے ذیشان کہیں نظر نہیں آ رہا تھا جیسے دھوپ میں آنکھیں دیکھنے کے قابل نہیں رہتیں، بے فکر لڑکیوں کے ہجوم ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے ان میں سے ہر ایک فیشن شو کی ماڈل ہو۔ ممکن ہے وہ اکتا کر اٹھ جاتی کہ مقابلے کی پہلی شریک ماڈل بل کھاتی، لہراتی منصفین کے سامنے سے گزری۔ سیکڑوں کیمرے ایک ساتھ چلے، وہ لڑکی کچھ دور چلی پھر ایک ادائے خاص سے مڑی اور واپس ہوئی۔ منصفین کے سامنے پہنچ کر ایک دلفریب مسکراہٹ ہوا میں اچھالی اور آگے بڑھ گئی پھر دوسری لڑکی قیامت کو ساتھ لیے ہوئے آئی۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ڈولی ان لڑکیوں کو رشک سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی، یہ لڑکیاں درختوں سے اتر کر تو نہیں آ گئیں۔ ان کے بھی ماں باپ ہوں گے، وہ تو ان کی آزادی میں زنجیر نہیں بنتے، ایک میری ماں ہیں...... اس پر قیامت





برپا کر دیں گی کہ میں فیشن شو دیکھنے بھی کیوں گئی تھی۔

شاید ان لڑکیوں کی طرح وقت بھی آزاد تھا، اس تیزی سے گزرا کہ کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ ذیشان مسکراتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔

''اٹھیے محترمہ، نوکری پکی ہو گئی۔'' وہ سحر زدہ سی اس کی ایک آواز پر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

ڈولی اور ذیشان ہر تقریب میں ایک ساتھ دیکھے جا رہے تھے۔ ذیشان جس تقریب کی کوریج کے لیے جاتا ڈولی کو بھی اطلاع کر دیتا۔ ایک دو مرتبہ کی بات ہوتی تو لوگ نظر انداز بھی کر دیتے۔ اسے محض اتفاق بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ ذیشان تو خیر مرد تھا لیکن ڈولی کو احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ اس کی بے احتیاطی نے لوگوں کے شک کو تقویت دی۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ذیشان کی سفارش سے اس کی تصویریں اخبارات کی زینت بنتی رہیں۔

ڈولی کے دل میں اگر کبھی یہ خیال آیا بھی ہو گا کہ وہ بدنام ہو رہی ہے تو تصویروں کے لالچ نے اسے ذیشان سے دور نہ رہنے دیا ہو گا۔ دوسری طرف ذیشان بھی اسے خود سے قریب تر کرنے کے لیے اس کی تصویروں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ اس کی تصویریں دھڑا دھڑ شائع ہو رہی تھیں۔ کسی تقریب میں شرکت کی تصویر، کسی تقریب سے روانگی کی تصویر، کسی تقریب میں عشائیے کی شرکت، کسی تقریب کے عصرانے میں موجودگی، وغیرہ وغیرہ۔

یہ سلسلہ ذیشان جب تک چاہتا چلتا رہتا لیکن ڈولی کی فطرت میں اضطراب تھا۔ وہ ایک صورت حال سے مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ تصویریں دیکھ دیکھ کر دل بھی بھر گیا تھا۔ وہ دوسروں کو چونکانے کا دعویٰ کرتی تھی لیکن اس دن خود چونک گئی جب اس کی ایک قریبی دوست نے ذیشان کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

''آج کل تمہاری تصویریں بہت چھپ رہی ہیں۔''

''دیکھ لو، یہ سب بیوٹی کا کمال ہے۔''

''بیوٹی کا نہیں، ہمیں سب خبر ہے، یہ سب جادوگر مصور کا کمال ہے۔''

''اس کے کیمرے میں واقعی جادو ہے مگر خوب صورت ہم بھی کم نہیں۔''

''تم نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دیا ہے کہ تمہاری تصویروں سے اخبارات بھر گئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ اس فوٹوگرافر کی سفارش کا ہی کمال ہے۔''

''اس ملک میں سفارش کے بغیر کون سا کام ہوتا ہے؟''

''بات سفارش تک ہے یا بات آگے بڑھ گئی ہے۔ اب ہم سے کیا چھپانا۔ سچ بتاؤ، اس سے شادی کب کر رہی ہو؟''

''وہ مخلص بھی ہے، میری جان پہچان بھی اس سے ہو گئی ہے۔ اسے تم میرا دوست بھی کہہ سکتی ہو لیکن اس سے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں اور مجھ میں کتنا سماجی فرق ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ جب شادی نہیں کرنی تو ساتھ گھومنے کا کیا فائدہ۔ اگر تصویریں چھپوانے کا شوق ہے تو کوئی ایسا کارنامہ انجام دو کہ اخبارات تمہاری تصویریں خود چھاپیں۔''

''کیا کارنامہ انجام دوں۔ کہیں چوری کروں اور جان بوجھ کر پکڑی جاؤں؟ خوب تصویریں چھپیں گی۔''

''ایک تو ہر بات کو تم مذاق میں اڑا دیتی ہو۔ کارنامے اور بھی ہوتے ہیں، تقریری مقابلوں میں حصہ لو۔ شاعری شروع کر دو۔ سفارش کے کندھوں پر چڑھ کر تم کب تک زندہ رہوں گی؟''

''اچھا یہ بتاؤ۔'' ڈولی نے پوچھا۔ ''تم نے یہ کیسے جان لیا کہ میں اس فوٹوگرافر کے ساتھ گھومتی پھرتی ہوں؟''

''میرا بھائی پریس سے وابستہ ہے وہ مجھے بتا رہا تھا۔ اس نے تو مجھ سے یہ تک کہا ہے کہ میں تم سے ملنے جلنے سے گریز کروں۔''

''کمال ہے، تم تو ہماری کلاس کی ہو، تمہارا بھائی پھر بھی اتنا دقیانوسی ہے۔''

''اپر کلاس سے ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ناموری اور بدنامی کا فرق ہی مٹا دیں۔ ہمارے گھرانوں میں دوستیاں ہوتی ہیں لیکن برابر والوں میں۔''

اس کی دوست نے نہایت معقول باتیں کی تھیں لیکن ڈولی کی منفی سوچ نے اسے دوسرا ہی رنگ دے دیا۔ وہ یہ سوچنے بیٹھ گئی کہ جب غیروں کو ذیشان سے میرا ملنا جلنا برا لگ رہا ہے تو اگر ممی مجھے ذیشان کے ساتھ دیکھ لیں تو ان پر کیا گزر جائے گی۔ انہوں نے جو دیواریں میرے گرد کھڑی کرنی چاہی تھیں دھڑام سے نیچے گر جائیں گی۔ میں بھی کتنی ذہین ہوں۔ اس نے اپنی پیٹھ خود تھپ تھپائی اور کالج سے نکلتے ہی سیدھی ذیشان کے آفس پہنچ گئی۔

''میں چاہتی ہوں تم میری تصویریں میرے گھر کے پس منظر میں کھینچو۔ میرے ڈرائنگ روم میں، میرے لان میں اور بھی کئی جگہیں ہیں۔''

"اس کے لیے تو مجھے تمہارے گھر جانا پڑے گا۔"

"اگر کوئی ایسا کیمرا ایجاد ہوگیا ہے کہ یہاں بیٹھ کر میرے گھر کی تصویریں کھینچی جاسکتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ مجھے گھر لے جاکر اپنے گھر والوں سے مجھے کیوں جوتے پڑوانا چاہتی ہو؟"

"جناب! مجنوں نے پتھر کھائے تھے تو مجنوں بنا تھا۔"

"مجھے تمہارے والد سے ڈر لگتا ہے۔ اتنی تحقیق تو میں کر چکا ہوں کہ ان کے تعلقات بہت وسیع ہیں۔ اگر انہوں نے فون گھما دیا تو میری نوکری تو گئی۔"

"ذیشان، تم خود کو بے سہارا کیوں سمجھتے ہو؟ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہارے ساتھ ہوں، میں تو صرف اس لیے تمہیں گھر لے جانا چاہتی تھی کہ ممی نفرت ہی سے سہی تمہیں دیکھ لیں۔ شاید کبھی میں تم سے شادی کرلوں تو ممی کو تمہارا حوالہ تو دے سکوں گی۔"

اس نے بڑی چالاکی سے ذیشان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا یا پھر واقعی یہ اس کے دل کی آواز ہو۔ ذیشان رضامند ہوگیا۔

"شام پانچ یا چھ بجے تک میرا انتظار کرنا۔"

"اس وقت تو ممکن ہے ڈیڈی گھر پر ہوں، میں چاہتی ہوں تم ابھی چلو۔"

"ابھی؟"

"ہاں بس گھنٹا بھر کے لیے۔ اٹھ سکتے ہو آفس سے؟"

"اٹھ تو سکتا ہوں مگر......"

"مگر وگر کچھ نہیں، اپنی کھٹارا یہیں چھوڑو اور میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو...... اور ہاں کیمرا ساتھ لے لینا۔" ذیشان نے کندھے پر کیمرا لٹکایا اور ایڈیٹر سے کوئی بہانہ کر کے ڈولی کے ہمراہ آفس کی سیڑھیاں اتر گیا۔ ڈولی کی گاڑی باہر کھڑی تھی جسے وہ خود چلا کر لائی تھی۔

اس وقت تک تو خیر ہوئی کہ اس نے ذیشان کو بہ حفاظت ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

"اس سے پہلے کہ کوئی ہنگامہ کھڑا ہو تم جلدی جلدی میری ایک دو تصویریں بنا لو۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے، کوئی چائے کافی؟"

"وہ بھی مل جائے گی، تمہیں نہیں پتا ممی اگر یہاں آگئیں تو تصویریں رہ جائیں گی۔"

"اچھا تو پھر تم اس بڑی تصویر کے ساتھ کھڑی ہوجاؤ۔" اس نے جلدی جلدی اس کی دو تین تصویریں بنائیں۔

"میں آپ کے لیے کافی منگواتی ہوں۔ اس کے بعد باہر گارڈن میں چل کر تصویریں بنایئے گا۔ وہاں دھوپ بھی ہے شیڈ اچھے آئیں گے۔" ڈولی نے کہا اور باہر نکل گئی۔ وہ کافی کے لیے انٹرکام پر بھی کہہ سکتی تھی لیکن اس کا مقصد تو کچھ اور تھا۔ وہ ملازم کو کافی کا کہہ کر سیدھی ماں کے کمرے میں گئی۔

"میرے ایک مہمان آئے ہیں۔ ابھی فی الحال ڈرائنگ روم میں مت آیئے گا۔"

"اے میں کیوں نہ آؤں۔ میں بھی تو دیکھوں ایسا کون سا مہمان ہے۔"

"آپ اس حلیے میں آئیں گی تو میری بے عزتی ہوگی۔"

"دیکھتی ہوں مجھے کون روکتا ہے۔ تیری سہیلیاں آئیں اور میں نہ ملوں، ارے واہ۔" ڈولی کو جو آگ لگانی تھی لگا دی۔ اسے کیا پڑی تھی کہ ماں کو زبردستی روکتی۔ اسے تو بس اطلاع دینی تھی بلکہ وہ تو خود چاہتی تھی کہ وہ غصے میں بھری ہوئی ڈرائنگ روم میں آئیں۔ ڈولی دوبارہ ڈرائنگ روم میں آگئی۔ ملازم کافی لے کر آگیا۔

ذیشان نے ابھی کافی کا کپ ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ ڈولی کی ماں کمرے میں داخل ہوئیں اور پھر جیسے انہیں سانپ نے ڈس لیا ہو۔ وہ سمجھ رہی تھیں کوئی لڑکی ہوگی جو ڈولی سے ملنے آئی ہے لیکن یہاں تو جیتا جاگتا ایک مرد بیٹھا تھا۔

"تو یہ ہیں تیرے مہمان؟"

"ہاں، ان کا نام ذیشان ہے۔ یہی تو بناتے ہیں میری تصویریں۔"

"میں تجھ سے کہہ چکی ہوں کہ میرے جیتے جی تو مردوں سے دوستی نہیں رکھے گی۔ نکال اسے یہاں سے۔"

"خبردار! میرے مہمان کو کچھ نہ کہیے گا۔"

"تیرے مہمان کی تو ایسی تیسی۔"

وہ نہ جانے کس ارادے سے آگے بڑھی تھیں کہ ڈولی انہیں گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئی۔ اس کے بعد باقی جنگ باہر ہوئی لیکن آوازیں اندر آرہی تھیں۔ آغاز تو تڑاخ سے ہوا اور نوبت گالیوں تک پہنچ گئی۔ اس وقت ایک ملازم بھاگا ہوا آیا۔

"صاحب، آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ بڑی مالکن کو دورہ پڑ گیا ہے۔ وہ اس وقت کچھ بھی کرسکتی ہیں۔ اندر آگئیں تو کوئی چیز آپ کے اٹھا کر مار سکتی ہیں۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

"ڈولی بی بی سے تو پوچھ لوں۔"

اسی وقت اندر سے آواز آئی۔ ڈولی کی ماں کہہ رہی





تھیں۔ "میں ابھی اس مردود کا کیمرا توڑتی ہوں جس سے تو ننگی ننگی تصویریں کھنچواتی ہے۔"

آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ ڈرائنگ روم کے بہت قریب آچکی ہیں۔ اب ذیشان کا یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس نے کیمرا اٹھایا اور دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ ایک ملازم نے اس کی راہنمائی کی اور اسے کوٹھی سے باہر نکال دیا۔

وہ باہر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جائے اور کیسے جائے۔ اپنی بائیک پر تو آیا نہیں تھا کہ اسٹارٹ کرتا اور نکل جاتا۔ یہ کوٹھی ایسی جگہ تھی کہ رکشا، ٹیکسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ پیدل ہی ایک طرف چل دیا۔ کچھ فاصلے پر جاکر ایک ٹیکسی اسے مل گئی۔

دفتر پہنچنے کے بعد وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ گزرے ہوئے واقعات کسی بھیانک خواب کی طرح نظر آرہے تھے۔

"اف میرے خدا! ڈولی کا گھر ہے یا کوئی پاگل خانہ۔ ڈولی جیسی آزاد خیال لڑکی کس طرح اس گھر میں رہتی ہوگی۔" اسے ڈولی پر رحم آنے لگا۔ پوری بات سمجھ میں آگئی، گھر کے ماحول سے یہ بات ظاہر ہورہی تھی کہ ڈولی جو بھی قدم اٹھاتی ہے ماں کو چڑانے کے لیے اٹھاتی ہے۔ ہر وہ کام کرتی ہے جس سے اس کی ماں کو تکلیف پہنچے۔ ابھی تک اس نے کوئی خطرناک قدم نہیں اٹھایا ہے یا غلط ہاتھوں میں نہیں پہنچی ہے لیکن کسی وقت بھی وہ کسی گہرے گڑھے میں گر سکتی ہے۔ مجھ سے وہ واقعی محبت کرنے لگی ہے، اب آئی تو میں اسی محبت کا واسطہ دے کر اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

☆☆☆

ڈولی کے گھر میں یہ ہنگامہ اس وقت تک برپا رہا جب تک چودھری دین محمد گھر نہیں آگئے لیکن یہ سیز فائر وقتی ثابت ہوا۔ اس کی ماں نے اس کے باپ کے ایسے کان بھرے کہ وہ بھی گرجتے برستے ڈولی کے کمرے میں آگئے، پھر وہی مکالمے دُہرائے گئے جو وہ ماں کے سامنے ادا کرچکی تھی لیکن اب ماں کی قوت بڑھ گئی تھی۔ اس طرف دو تھے، اس نے تھک ہار کر یہ وعدہ کرلیا کہ وہ اس آدمی کو دوبارہ اپنے گھر نہیں بلائے گی۔ ایک مرتبہ پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ کمرا بند کر کے بیٹھ گئی۔

اگلے دو دن تک گھر کا ماحول ایسا رہا کہ وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ اتنی غصے میں تھی کہ ذیشان کو فون بھی نہیں کیا۔ ذیشان بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہوگا اس لیے اس نے بھی فون کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ کمرے میں بند تھی لیکن اس کی منفی سوچیں اس کے گرد برابر چکر لگا رہی تھیں۔ اس روز اس کی ماں کمرے میں آئیں اور اسے گلے لگا کر خوب روئیں۔ ہر لڑائی کے بعد یہی ہوتا تھا۔ تناؤ کی کیفیت ختم ہوگئی، دو روز بعد وہ کالج بھی گئی۔

جب سب لوگ اپنی اصل کیفیت پر لوٹ آئے تو ڈولی کو پھر محسوس ہونے لگا کہ سب اس کی طرف سے بے خبر ہو کر اپنے اپنے کاموں سے لگ گئے ہیں۔ اسے ایک ملازم کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی ماں اس کے باپ سے اس کی شادی کی بات کررہی تھیں۔ اس کا استحقاق ایک مرتبہ پھر مجروح ہوگیا۔ میری شادی کی بات مجھ سے کیوں نہیں کی جارہی ہے۔ اس لیے نا کہ میرا وجود کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ مجھے احساس دلانا پڑے گا کہ میں ہوں۔ اس کی منفی سوچوں نے پھر کام دکھانا شروع کردیا۔ اسے اپنی سہیلی کا کہنا یاد آیا۔

"شوق ہے تو کوئی ایسا کارنامہ انجام دو کہ اخبارات تمہاری تصویریں خود چھاپیں۔" وہ اس کارنامے پر غور کرنے لگی جو اسے انجام دینا تھا۔ اسے وہ فیشن شو یاد آیا جس میں وہ ذیشان کے ساتھ گئی تھی۔ جو لڑکیاں فیشن شو میں شریک ہوئی تھیں ان کی کتنی تصویریں چھپ رہی تھیں۔ دوسرے دن کے اخباروں میں ان کی کتنی تصویریں چھپی تھیں۔ کسی فیشن شو میں حصہ لینا بھی تو ایک کارنامہ ہے۔ میں یہ کارنامہ بہ آسانی انجام دے سکتی ہوں۔ اس کا دھیان فوراً ذیشان کی طرف گیا۔ وہ ایسی تقریبات میں جاتا رہتا ہے۔ اس کے تعلقات یقیناً ہوں گے۔ ماڈل بننے کے لیے اس کی سفارش کام آسکتی ہے۔ اس نے سوچا ضرور تھا لیکن پھر فوراً ہی اپنے خیال کی تردید کردی۔ کتنا مزہ آئے گا کہ ذیشان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو اور وہ ماڈل بن جائے۔ اچانک معلوم ہوگا تو اس کے لیے یہ سرپرائز ہوگا۔ وہ تقریب میں آئے گا اور مجھے دیکھے گا تو چونکے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ اسے بھی تو معلوم ہو کہ کوئی کام میں اس کے بغیر بھی کرسکتی ہوں۔

اس نے ذیشان کو فون ضرور کیا لیکن اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ کیا ارادے کررہی ہے۔ ملاقات نہ ہونے کو اس نے اپنے گھر کے حالات سے جوڑ دیا۔

اب وہ یہ سوچنے بیٹھ گئی کہ فیشن شو میں شریک ہونے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرے۔ وہ جانتی تھی کہ سفارش کے بغیر یہاں کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسے اب سفارش کی تلاش تھی۔ وہ اپنی یادداشت کو آواز دیتی رہی کہ شاید اس کے جاننے والوں میں کوئی ایسا آدمی یاد آجائے جو اس لائن سے

تعلق رکھتا ہو یا اپنے تعلقات سے مجھے چانس دلا سکے۔ اپنے جاننے والوں کی فہرست سے نکل کر وہ اپنے ڈیڈ کے دوستوں کا جائزہ لینے لگی۔ ایک نام پر آ کر وہ خوشی سے جھومنے لگی۔ ان کے دوستوں میں ایک صاحب تھے، دلکش ایرانی۔ نام کی انفرادیت ہی سے وہ اسے یاد رہ گئے تھے۔ وہ فیشن شوز منعقد کرواتے تھے اور انہیں ماڈل لڑکیوں کی تلاش رہتی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ ایک مرتبہ آئے تھے تو اس کے ڈیڈی سے اس موضوع پر بات کر رہے تھے بعد میں چودھری دین محمد نے اسے بھی بتایا تھا کہ وہ کیا کاروبار کرتے ہیں۔

"شاندار بوتیک چلاتے ہیں اور دو چار مہینے بعد ایک فیشن شو بھی منعقد کروا لیتے ہیں۔ ماڈل لڑکیوں میں گھرے رہتے ہیں۔ بڑے ہی رنگین مزاج آدمی ہیں۔ مجھے تو اس قسم کے کاموں سے دلچسپی نہیں۔ آ جاتے ہیں تو سن لیتا ہوں۔"

اس نے جلدی جلدی ڈائریکٹری کی مدد سے ان کے آفس کا ایڈریس تلاش کیا۔ اسی وقت نکلی اور ان کے آفس پہنچ گئی۔ اب دیکھنا اگر انہوں نے مجھے ماڈل بنا لیا تو کتنے لوگ ایک ساتھ چونکیں گے۔ اب میں ممی کو بتاؤں گی کہ آزادی کسے کہتے ہیں۔

"بیٹی تم، خیریت تو ہے؟ چودھری صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟"

"انکل سب خیریت ہے۔ آپ اتنا گھبرا کیوں گئے؟"

"گھبرانے کی تو بات ہی ہے، تم کبھی میرے آفس نہیں آئی ہو کوئی کام ہوتا تو چودھری صاحب خود فون کر لیتے۔"

"کام میرا تھا اس لیے میں آ گئی۔"

"بولو کیا کام پڑ گیا تمہیں اپنے انکل سے؟"

"پہلے وعدہ کریں آپ ڈیڈی سے اس کا ذکر نہیں کریں گے۔"

"کام تو بتاؤ بیٹی، میں وعدہ کرتا ہوں تمہارے ڈیڈی سے نہیں کہوں گا۔"

"آپ فیشن شو منعقد کرواتے ہیں ناں؟"

"ہاں۔"

"یہ بتایئے آپ کو کسی ماڈل لڑکی کی تلاش ہے؟"

"یہ تلاش تو ہر وقت رہتی ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ہی تو ہماری فیلڈ ہے مگر تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اس لیے کہ میں چاہتی ہوں کہ ایک چانس آپ مجھے دے کر دیکھیں۔"

"تم مذاق کر رہی ہو یا سنجیدہ ہو؟"

"انکل، آپ خود سوچیں میں مذاق کرنے یہاں تک آتی؟"

"اگر تم سنجیدہ ہو تو میں تمہیں یہ مشورہ دوں گا کہ یہ خیال دل سے نکال دو۔ یہ دنیا جگمگاتی ضرور ہے لیکن اس کے اندر بہت اندھیرا ہے اور پھر تمہارے ڈیڈی کو میں جانتا ہوں، وہ اتنے روشن خیال نہیں ہیں کہ تمہیں اجازت دیں۔"

"مجھے ان کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اتنا بڑا قدم تم ان کی اجازت کے بغیر اٹھاؤ گی؟"

"میرا وجود ایک حقیقت ہے۔ میں جس طرح چاہوں گی زندگی گزاروں۔"

"بھئی، میں یہ رسک نہیں لے سکتا کہ تمہیں چانس دوں اور تمہارا باپ مجھ سے آ کر جھگڑا کرے۔ اس کا کہنا جائز ہوگا کہ میں نے اسے اطلاع تک نہیں دی، اس کی اجازت ہوتی تو الگ بات تھی۔"

"تو میں سمجھوں کہ آپ انکار کر رہے ہیں؟"

"میری مجبوری سمجھو ورنہ یہ کوئی اتنا بڑا کام نہیں تھا۔"

"میں آپ کی مجبوری سمجھتی ہوں انکل۔ شہر میں اور بہت سے لوگ ہیں۔ میں اپنے طور پر کوشش کروں گی۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اتنی دیر میں ملازم کولڈ ڈرنک لے کر آ گیا تھا لہٰذا اسے کچھ دیر کے لیے رکنا پڑا۔ بس اتنی دیر میں دلکش ایرانی کا ذہن کام کر گیا۔

"تم تھوڑی دیر بیٹھو، میں دوسرے کمرے سے ایک صاحب کو فون کرتا ہوں، شاید تمہارا کام بن جائے۔"

ان کے کاروباری ذہن نے انہیں ایک راہ سجھا دی تھی۔ وہ اس کی تکمیل کے لیے دوسرے کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے فون اٹھایا اور زم زم بوتیک کے مالک صفدر مرزا کا نمبر ملا دیا۔

"ہیلو مرزا، میں دلکش بول رہا ہوں۔ میں تمہارے پاس ایک لڑکی بھیج رہا ہوں۔ خوب صورت بھی ہے اور بے پناہ ٹیلنٹڈ بھی۔ ماڈلنگ کا شوق ہے، والدین کی اجازت کے بغیر آئی ہے۔ کل کلاں کو اگر کوئی بات ہوئی تو میرا نام درمیان میں نہ آئے۔ تم یہی کہنا کہ یہ لڑکی خود تمہارے پاس آئی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب ایک لڑکی تم نے میرے پاس بھیجی تھی تو دس ہزار کی رقم تم نے لے لی تھی۔ میں اس کے پندرہ ہزار لوں گا۔ کہو تو ابھی بھیج دوں؟"

بحث و تکرار کے بعد بارہ ہزار میں سودا طے ہو گیا۔ دلکش ایرانی پھر ڈولی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"میں نے ایک صاحب سے بات کر لی ہے، یہ کارڈ ہے





ان کا۔ ان سے مل لو لیکن میرا نام درمیان میں نہ آئے۔ بس یہ کہنا کہ تم اپنی مرضی سے خود ان کے پاس آئی ہو۔"

"وہ آپ کی سفارش کے بغیر کیسے میری بات سنیں گے؟"

"میں نے فون کر دیا ہے انہیں ایک لڑکی چاہیے بھی ہے۔" اس نے کارڈ لے لیا اور صفدر مرزا سے جا کر مل لی۔

"ہم پہلے شو میں آپ کو کوئی پے منٹ نہیں کریں گے۔ اگر آپ کی پرفارمنس اچھی رہی تو پھر آپ پر ترقی کے دروازے کھل جائیں گے۔ کیا خیال ہے؟"

"مجھے پیسوں کی ایسی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔ میں تو اپنے شوق کے لیے اس شعبے میں آنا چاہتی ہوں۔"

"جو لڑکیاں پیسوں کے لیے نہیں شوق کی خاطر آتی ہیں وہ ضرور ترقی کرتی ہیں۔ میں بھی تمہارا مستقبل تابناک دیکھ رہا ہوں۔ آپ چونکہ نئی ہیں اس لیے ضروری ٹریننگ لینی ہوگی۔ آپ کو ہفتے میں تین دن یہاں آنا ہوگا۔ ایک مہینے کے بعد ہم آپ کو پبلک کے سامنے پیش کریں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"آپ کو ایک تحریر بھی لکھ کر دینی ہوگی کہ آپ اپنی مرضی سے یہاں آئی ہیں۔ کسی نے آپ کو بھیجا نہیں ہے۔" ڈولی کو کوئی اعتراض کیوں ہوتا، سچی بات بھی یہی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے یہاں آئی تھی۔ اس نے اپنی تحریر اپنے دستخطوں کے ساتھ صفدر مرزا کے حوالے کر دی۔

"کل آپ کی ٹریننگ کا پہلا دن ہوگا۔"

"جی بہتر۔" اسے ایک مہینے کی سزا کاٹنا تھی، اس کے بعد ہی وہ اپنے کارنامے کی پہلی سیڑھی طے کر سکتی تھی۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اتنے لمبے عرصے کے لیے وہ ذیشان سے ملنا جلنا بالکل ہی ترک کر دے۔ وہ ذیشان سے ملتی رہی لیکن اپنے کارنامے کی پہلی قسط اسے پڑھنے نہیں دی۔ وہ دل ہی دل میں اس کی شکر گزار ضرور تھی کہ اس کی بنائی ہوئی تصویریں اس کے بہت کام آئی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر ہی صفدر مرزا کو یقین ہو گیا تھا کہ بطور ماڈل وہ اس کے بزنس کے لیے کتنی سودمند ثابت ہوگی۔

اس کی شکر گزاری ہی تھی کہ وہ ذیشان کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ذیشان بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ تصویروں کی فرمائش نہیں کر رہی ہے۔ اس سے وہ یہی سمجھا کہ اب وہ اس سے پرخلوص ہو کر مل رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہر شام یا تو کسی تقریب میں گزرتی تھی یا کسی ہوٹل میں۔

وہ تواتر سے ملاقاتوں کے بعد اچانک غائب ہو گئی۔ ذیشان اب اس کے طلوع ہونے اور غروب ہونے کا عادی ہو چکا تھا۔ عجیب موڈی لڑکی ہے یا تو اتنا ٹوٹ کر ملے گی یا ایسی غائب ہو جائے گی۔ اس نے کئی مرتبہ فون کیا۔ وہ فون پر بھی نہیں ملی۔ ایک مرتبہ کے تجربے کے بعد اس کے گھر جانے کی ہمت نہیں تھی۔

ایک روز وہ آفس میں پہنچا تو ایک فیشن شو کی کوریج کا دعوت نامہ اس کی میز پر رکھا تھا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ایسے کئی دعوت نامے آتے تھے۔ وہ کہیں جاتا تھا کہیں نہیں جاتا تھا۔ ان دنوں تو وہ ویسے بھی ڈولی کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے بے دلی سے لفافہ ایک طرف رکھ دیا۔ "آج کی شام تو میں گھر پر ہی گزاروں گا، کہیں جانے والا نہیں۔" یہ معمولی لفافہ غیر معمولی اس وقت بن گیا جب اسے ایڈیٹر نے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"آپ کو صفدر مرزا کی جانب سے بھیجا جانے والا دعوت نامہ مل گیا؟"

"ہاں، ابھی دیکھا تو ہے۔"

"وہاں آپ کو جانا ضرور ہے۔"

"شاید نہ جا سکوں۔ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"بیگ صاحب نے خاص طور پر کہلوایا ہے کہ آپ وہاں ضرور جائیں۔ سنا ہے صفدر مرزا کسی نئی لڑکی کو انٹروڈیوس کروا رہے ہیں اور چاہتے ہیں اس کا بھرپور فوٹو سیشن ہو۔"

"جی چلا جاؤں گا۔"

اس نے کہنے کو کہہ تو دیا تھا لیکن دل میں اب بھی یہی تھا کہ نہیں جائے گا۔ یوں بھی ملازمت کے وقت اس نے یہی طے کیا تھا کہ یہ اس کی مرضی پر منحصر ہوگا کہ وہ کس تقریب میں جاتا ہے کس میں نہیں۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ بیگ صاحب نے اسے بلوا لیا۔ انہوں نے بھی اس دعوت نامے کا ذکر کیا۔

"بھئی وہاں جانا ضروری ہے۔ میں صفدر مرزا سے وعدہ کر چکا ہوں۔ یوں بھی وہ ایک سیاسی شخصیت ہیں ان سے میں بگاڑ نہیں سکتا۔ ایڈیٹر صاحب بتا رہے تھے کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میری درخواست ہے کہ اس کے باوجود تم ان کے پروگرام کی کوریج کرو۔ کل بے شک چھٹی کر کے آرام کر لینا۔"

"آپ کہتے ہیں تو ضرور چلا جاؤں گا۔"

بیگ صاحب میگزین کے مالک تھے اور پھر درخواست کر رہے تھے۔ ان کی بات وہ کیسے ٹال سکتا تھا۔

وہ ہوٹل پہنچا تو امیر زادوں کی لمبی لمبی گاڑیاں اس کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ فیشن ایبل لڑکیاں جوق در جوق اندر جارہی تھیں۔ یہ سب کچھ اس کے لیے نیا نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں یہ سب اسے نیا نیا لگ رہا تھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل پارکنگ میں کھڑی کی اور صحافیوں کے لیے بنائے ہوئے گیٹ سے اندر چلا گیا۔ اسے شاید کچھ دیر ہوگئی تھی۔ پروگرام شروع ہونے والا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کیمرا سنبھالا، ریل چیک کی اور اسٹیج کے قریب پہنچ گیا۔

ماڈلز نے ایک ایک کرکے منصفین کے سامنے سے گزرنا شروع کیا۔ ذیشان کے جادوگر ہاتھ حرکت میں آئے اور تصویریں قید ہونے لگیں۔ اچانک جادوگر پر خود جادو ہوگیا۔ اس کے ہاتھ کام کرنا بھول گئے۔ نہایت قابل اعتراض لباس میں ملبوس ایک لڑکی لہراتی، بل کھاتی نمودار ہوئی۔ وہ اسے کیسے نہ پہچانتا۔ یہ ڈولی تھی، کیمرے کی آنکھیں جھپک جھپک کر رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ بٹن دبانا بھول گئے تھے پھر جیسے اسے ہوش آگیا۔ اسے ڈیوٹی تو کرنی ہی تھی۔ اس نے بہ مشکل بٹن دبایا۔ پھر اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ ڈولی کس وقت مڑی کس وقت چلی گئی۔ ایک ایک کرکے لڑکیاں آتی رہیں۔ وہ کیمرے کا بٹن دباتا رہا۔

پروگرام ختم ہوا اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ان مناظر کی تصویریں بڑی ضروری تھیں لیکن اس کا کیمرا شاید کام کرنا ہی بھول گیا تھا۔

رزلٹ اسی وقت اناؤنس ہونا تھا۔ اس لیے اسے رکنا پڑا۔ وہ بے حد الجھا ہوا تھا۔ ''ڈولی نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ وہ اس مقابلے میں حصہ لے رہی ہے۔ اس کی دوستی محض دکھاوا تھا۔ ذرا بہتر چانس ملا اور وہ مجھے بھول گئی۔ اس نے فون پر اطلاع تک دینا گوارا نہیں کیا۔ میں اگر یہاں نہ آیا ہوتا تو کل کے اخباروں ہی سے مجھے خبر ہوتی۔'' اسی لمحے اسے یہ بھی احساس ہوا کہ وہ ڈولی کے لیے صرف دوستی کے جذبات نہیں رکھتا، کوئی اور جذبہ بھی کارفرما ہے ورنہ اسے اس لباس میں دیکھ کر تکلیف کیوں ہوتی۔

اس کی سوچیں ابھی اور نہ جانے کہاں کہاں پرواز کرتیں کہ رزلٹ اناؤنس ہونے لگا۔ منصفین نے اعلان کیا۔ ڈولی کی پرفارمنس غیر معمولی تھی۔ وہ پہلے نمبر پر آئی تھی۔ پہلی پرفارمنس اور ایسی شاندار۔ کسی نے یہ سنا ہی نہیں کہ دوسرے اور تیسرے نمبر پر کون سی لڑکیاں آئی ہیں۔ صحافیوں اور فوٹو گرافروں نے ڈولی کو گھیر لیا۔ کیمرے چل رہے تھے، صحافی اس سے اس کے خیالات جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

''آپ اس وقت کیسا محسوس کر رہی ہیں؟''

''اس کامیابی کے بعد آپ کے کیا ارادے ہیں؟''

''آپ بطور ماڈل گرل اپنا کیریئر جاری رکھیں گی؟''

''اپنی اس کامیابی کا کریڈٹ آپ کس کو دیتی ہیں؟'' ذیشان کے کانوں تک اس کا یہ جواب آیا۔

''اس کا کریڈٹ میری محنت اور شوق کو جاتا ہے۔''

ذیشان سوچ رہا تھا کہ اس موقع پر وہ اس کا نام ضرور لے گی کہ ذیشان جادوگر میری پہلی سیڑھی تھا جس نے میرے شاندار کلوز اپ لیے اور اخبارات میں شایع کروا کر مجھے مشہور کیا اور میرے اندر کے شوق کو ابھارا۔ اس کے برعکس اس نے سارا کریڈٹ خود لے لیا تھا۔

ذیشان بھول ہی گیا کہ وہ فوٹو سیشن کے لیے آیا ہے۔ اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ اس نے سوچا کہ وہ کچھ دیر اور یہاں ٹھہرا رہا تو چیخ چیخ کر کہے گا۔ ''یہ لڑکی جھوٹ بولتی ہے، اس کو بنیاد میں نے فراہم کی۔ اس کی آتش شوق کو میں نے بھڑکایا ہے۔ آج یہ جو کچھ ہے میری وجہ سے ہے۔'' وہ الٹے قدموں بھیڑ سے نکل آیا۔ تقریب ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ذیشان ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ ڈولی کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

وہ اپنی تصویریں خود بناتا تھا لہٰذا گھر پہنچتے ہی لیبارٹری میں گھس گیا۔ اس نے ریل دیکھی تو ڈولی کی صرف دو تصویریں تھیں۔ اس وقت تک غصہ تو کم ہو ہی چکا تھا اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے زیادہ تصویریں کیوں نہیں بنائیں۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ صحافیوں کے سوالات کے جواب دے رہی تھی۔ اس کے تو ایسے تعلقات تھے کہ وہ تقریب کے اختتام پر اس کا کلوز اپ بھی بنا سکتا تھا۔ ''اب اگر وہ آئی اور اپنی تصویروں کی بابت معلوم کیا تو میرے پاس صرف دو تصویریں ہوں گی۔ بیگ صاحب کو کیا جواب دوں گا۔ انہوں نے تو کہا تھا کہ جتنی ریلیں چاہوں وہاں خرچ کردوں۔'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔

اس کا میگزین ہفتہ وار تھا اور ابھی شمارہ آنے میں پورے چار دن باقی تھے۔ اس نے اپنے ایک دوست کو فون کیا جو ایک اخبار کا فوٹو گرافر تھا اور اس تقریب میں موجود تھا۔

''یار، میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ میں ڈولی کی تصویریں نہیں بنا سکا۔ تم نے جتنی تصویریں بنائی ہوں کل نہیں تو پرسوں تک مجھے بھیج دو ورنہ میری نوکری پر بن جائے گی۔''

دوسرے دن وہ آفس نہیں گیا۔ فون کردیا کہ وہ بیمار ہے، تصویریں بھی نہیں دھو سکا ہے۔ جب آئے گا تو



تصویریں ساتھ لے آئے گا۔

دوسرے دن ڈولی کی تصویریں اسے مل گئیں۔ وہ دفتر کی انتظامیہ کی نظروں میں سرخرو ہوگیا تھا۔ حقیقت کا کسی کو علم نہیں ہوسکا۔ یہ تصویریں اس کے میگزین میں شایع ہوگئیں۔

ڈولی کی تصویریں کئی دنوں سے اخباروں کی زینت بن رہی تھیں لیکن ڈولی، ذیشان سے ملنے نہیں آرہی تھی۔ ایک زمانہ وہ تھا جب ایک تصویر کے لیے اس کے پیچھے پھرا کرتی تھی اور اب یہ بتانے بھی نہیں آرہی تھی کہ اب ذیشان کی مدد کے بغیر اس کی تصویریں چھپ رہی ہیں۔ ذیشان کو غصہ بھی تھا اور پچھتاوا بھی۔ غصہ یہ تھا کہ ڈولی نے اس کی دوستی کی قدر نہیں کی، پچھتاوا یہ تھا کہ اس نے ڈولی کو اتنا آگے بڑھنے دیا۔ اس نے پہلے ہی اظہار محبت کیوں نہیں کردیا۔ وہ تو میرے تعلق کو محض دوستی سمجھ رہی ہوگی مگر دوستی کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔

لڑکی کیا تھی دھوپ چھاؤں تھی۔ کبھی غائب ہوجاتی تھی کبھی نمودار ہوجاتی تھی۔ پورے پندرہ دن کے لیے غائب ہوگئی اور پھر اچانک اس کے دفتر میں تھی۔

''خفا ہو؟'' ڈولی نے اس کے بے اعتنائی دیکھ کر کہا۔

''خفا تو اپنوں سے ہوا جاتا ہے۔ میرا تم پر حق کیا ہے جو میں خفا ہوجاؤں۔''

''ارے ارے، تم تو بہت ہی خفا ہو۔''

''خود غور کرو، کتنے دن بعد آئی ہو۔''

''ذیشان، تمہیں معلوم ہے میرے گھر کے کیا حالات ہیں۔ ایک ذرا سی ماڈلنگ کیا کرلی گھر میں زلزلہ آگیا۔ اس مرتبہ ڈیڈی سے جنگ ہوئی۔''

''فون تو کرسکتی تھیں؟''

''میں دیکھنا چاہتی تھی تمہیں بھی میرا خیال آتا ہے یا نہیں۔ مجھ سے ملنے تم بھی آسکتے تھے۔''

''ایک مرتبہ آکر بہت عزت ہوئی تھی جواب ہوتی۔''

''فون تو کرسکتے تھے؟''

''تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم ماڈلنگ کرنے والی ہو؟''

''میں تو تمہیں چونکانا چاہتی تھی۔ سچ بتاؤ تم چونکے یا نہیں؟''

''چونکا ضرور لیکن مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم ماڈلنگ کروگی۔''

''تم بھی میرے باپ کی طرح دقیانوسی ہوگئے جو ماڈلنگ کو برا سمجھتے ہو۔''

''برا سمجھنے کی بات نہیں ہے۔ یہ لائن واقعی بری ہے، تم اچھی بھی ہو تو لوگ تمہیں برا کہیں گے اور صفدر مرزا تو بہت ہی بدنام ہے۔''

''ذیشان تم میری فطرت کو اچھی طرح جانتے ہو۔ میں اس لائن میں زیادہ دن ٹھہروں گی نہیں۔ بس ذرا شہرت ہوجائے، تصویریں چھپ جائیں، جلنے والے جل مرجائیں تو میں دنیا کو چونکانے کے لیے کہیں اور پرواز کرجاؤں گی۔''

ذیشان اس کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ ہوچکا تھا۔ وہ زیادہ دن واقعی اس فیلڈ میں نہیں رہے گی۔ اس کا غصہ واقعی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

☆☆☆

ڈولی اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکی۔ وہ ماڈلنگ کی دنیا میں برابر آگے بڑھتی رہی۔ اتنا آگے بڑھی کہ یہ میدان اسے چھوٹا لگنے لگا۔ اب اس کے تعلقات اتنے ہوگئے تھے کہ وہ اپنے لیے نئے راستوں کا انتخاب کرسکتی تھی۔ اس کی کئی دوست لڑکیاں تھیں جو ماڈلنگ کرتے کرتے ٹی وی کے اشتہاروں میں نظر آنے لگی تھیں۔ فیشن شوز تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں منعقد ہوتے تھے جہاں مخصوص لوگ ہی آتے تھے۔ ٹی وی اشتہار تو ہر گھر میں دیکھے جاتے ہیں۔ جو نہ بھی دیکھنا چاہے وہ بھی دیکھتا ہے۔ اسے مشہور ہونے کا یہ آسان راستہ نظر آیا۔ اس نے کوششیں شروع کردیں۔ اب کوئی مضائقہ نہیں تھا اگر وہ اپنے اس ارادے کا اظہار ذیشان سے کردیتی۔

''ذیشان تم یہی چاہتے ہو ناں کہ میں فیشن شوز میں حصہ نہ لوں۔''

''میں نے تو اپنی رائے کا اظہار کردیا تھا۔ اب آگے تمہاری مرضی۔''

''مجھے خود بھی پسند نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ خود کو مصروف رکھنے کے لیے ٹی وی کے اشتہاروں میں کام کروں۔''

''تم خود کو مصروف رکھنے کے لیے شادی کرلو۔''

''اس وقت میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''شادی مذاق نہیں ہے۔''

''تو ٹھیک ہے میری ممی نے کئی امیر زادوں کو نظر میں رکھا ہوا ہے، کسی سے بھی شادی کرلوں گی۔''

''مجھ میں اور تم میں معاشرتی فرق ضرور ہے لیکن محبت درمیان میں ہو تو یہ فرق مٹایا جاسکتا ہے۔''

''یہ فرق اتنی آسانی سے نہیں مٹ پائے گا۔ محبت میں تم سے کرتی ہوں، میرے ماں باپ نہیں لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ میں انہیں مجبور کردوں گی۔ اس وقت تک مجھے اپنی مرضی پر چلنے دو۔''

"تم بھی چاہتی ہو ناں کہ تم کسی ٹی وی اشتہار میں کام کرو۔"

"ہاں اگر تمہاری بھی مرضی ہو۔"

"میں اپنے تعلقات استعمال کر کے دیکھتا ہوں۔"

وہ جس پیشے سے وابستہ تھا اس میں ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں سے واسطہ پڑتا ہی رہتا تھا۔ اس نے ڈولی کی چند نئی تصویریں بنائیں اور ڈولی کو لے کر ایک ایجنسی چلا گیا جو ٹی وی کے لیے اشتہار بنانے میں شہرت رکھتی تھی۔ اس ایجنسی کے مالکان نے ذیشان کو اپنے ہاں بلانے کے لیے بہت کوشش کی تھی۔ ذیشان نے انکار کر دیا تھا لیکن اب وہ اس شرط پر ان کی آفر کو قبول کرنے کے لیے تیار تھا کہ وہ ڈولی کو اپنے اشتہاروں کے لیے بک کر لیں۔ وہ اپنے اور ڈولی کے درمیان معاشرتی فرق کو اسی طرح مٹا سکتا تھا کہ اس پر زیادہ سے زیادہ احسان کر کے اس کے دل میں جگہ پیدا کرے۔

وہ اپنی موجودہ نوکری سے بہت خوش تھا لیکن اس نے ڈولی کی خاطر قربانی دے دی۔

ڈولی ٹی وی کے اشتہاروں میں نظر آنے لگی۔ وہ سفارش سے آئی ضرور تھی لیکن وہ خود بھی باصلاحیت تھی۔ چنگاری کی طرح چمک کر نہیں رہ گئی بلکہ اب کوئی اشتہار ایسا نہیں تھا جس میں وہ نظر نہ آتی ہو۔ اسے لوگ پہچاننے لگے تھے خصوصاً بچے اور عورتیں اس پر فدا تھے۔ لوگ راہ چلتے اسے آٹوگراف لینے کے لیے روک لیتے۔

ذیشان کے لیے یہ بات قابل فخر تھی کہ اس قدر مقبولیت کے باوجود ڈولی نے اسے فراموش نہیں کیا ہے۔ لوگ اس کے ساتھ دو باتیں کرنے کو ترستے ہیں اور وہ اس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ اکثر رات کا کھانا وہ ایک ساتھ ہی کھاتے تھے۔

یہ فخر ہی اس کے لیے بہت تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے بس کچھ رکاوٹیں ہیں انہیں دور ہونا ہے۔ پوری پریس کی دنیا ان کے معاشقے سے واقف تھی۔ اس کے دوست اکثر یہ ذکر چھیڑ دیتے تھے اور اسے فخر ہوتا تھا کہ ایسی مشہور ہستی کے ساتھ اس کا نام لیا جا رہا ہے۔ وہ ہنس کر کہتا۔ "ابھی تو صرف ساتھ گھومنے پھرنے تک کی بات ہے، عنقریب ہم شادی کر لیں گے۔"

ایک صحافی نے ایک روز ہمت کر کے ڈولی سے یہ سوال کر ہی لیا۔ "آپ مشہور فوٹوگرافر ذیشان جادوگر کے ساتھ دیکھی جا رہی ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ بہت جلد اس سے شادی کرنے والی ہیں؟"

ڈولی نے جو جواب دیا وہ اس صحافی کی توقع کے بالکل ہی خلاف تھا۔

"نہایت مضحکہ خیز بات کی آپ نے۔ لوگ مشہور ہستیوں کا امیج خراب کرنے کے لیے بے سروپا باتیں گھڑ لیتے ہیں۔ ذیشان سے میری دوستی ہے۔ میں ان کے ساتھ گھومتی پھرتی بھی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان سے شادی بھی کر لوں گی۔ شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے اور ان کے درمیان بہت وسیع سماجی گیپ ہے۔"

صحافی نے کچھ اور پوچھنا چاہا لیکن ڈولی نے اسے جھڑک دیا۔ "میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ ایسی ویسی باتوں کا جواب دیتی پھروں۔"

"ذیشان صاحب تو خود کہتے ہیں......"

"وہ جو کہتے ہیں میں ان سے خود پوچھ لوں گی۔ آپ زحمت نہ فرمائیں۔"

ذیشان ان دنوں ڈولی کی البم تیار کر رہا تھا۔ اس کی جو تصویریں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں ان سب کو یکجا کر رہا تھا۔ تمام دوستوں کو بھی کہہ رکھا تھا کہ ڈولی کی تصویر جہاں دیکھیں اسے مطلع کر دیں۔

ڈولی کا انٹرویو اس کی تصویر کے ساتھ ایک اخبار کی زینت بنا تو کسی دوست نے یہ اخبار ذیشان تک پہنچا دیا۔ اس نے یہ انٹرویو پڑھنا شروع کیا۔ عام سے سوالات تھے عام سے جوابات۔ ایک سوال میں اپنا نام دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

"لوگوں کا خیال ہے کہ آپ بہت جلد ذیشان سے شادی کرنے والی ہیں؟"

"نہایت مضحکہ خیز بات کی آپ نے۔ لوگ مشہور ہستیوں کا امیج خراب کرنے کے لیے بے سروپا باتیں گھڑ لیتے ہیں۔ ذیشان سے میری دوستی ہے۔ میں ان کے ساتھ گھومتی پھرتی بھی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان سے شادی بھی کر لوں گی......"

"میں صرف مخلص آدمی ہوں، صرف اس کا دوست ہوں۔ شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوچتی ہے وہ میرے بارے میں۔ محبت کا دعویٰ کرتی رہی ہے لیکن اب مشہور ہو گئی تو اسے سماجی فرق یاد آ گیا۔ کتنی بے درد ہے وہ۔ اتنی بڑی بات صحافیوں کو گواہ بنا کر کہہ دی۔ میں نے اسے بام عروج پر پہنچایا اور اب میں کسی قابل نہیں رہا۔"

"ہیلو راؤ صاحب، ماڈل گرل ڈولی اس وقت کہاں ملے گی؟"

دوسری طرف سے بتایا گیا۔ "ابھی ان کا شیڈول دیکھ کر بتاتا ہوں...... وہ اس وقت ہاکس بے کی سمندری

موجوں سے لڑ رہی ہوں گی۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ وہ اس وقت اپنے یونٹ کے ساتھ ہاکس بے پر شوٹنگ کے لیے گئی ہوئی ہیں۔"
"بس مجھے یہی معلوم کرنا تھا۔"
ذیشان نے اس وقت موٹر سائیکل سنبھالی اور ہاکس بے پہنچ گیا۔ ایک گوشۂ تنہائی میں دو پہاڑیوں کے درمیان اسے ڈولی کو تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی۔
"اوہو، آج تو تم بھی مشہور اداکارہ ڈولی کے کرشمے دیکھنے آ گئے؟"
"میں کرشمے دیکھنے نہیں آیا تم سے بات کرنے آیا ہوں۔"
"یہ کوئی موقع ہے بات کرنے کا۔ مجھے تم سے بات کرنے کے علاوہ بھی بہت سے کام ہیں۔"
"اب میں اتنا غیر اہم ہو گیا۔"
"سیٹ پر میرا انتظار ہو رہا ہے، ہم کل ملیں گے۔"
"مجھے تمہیں صرف یہ بتانا ہے کہ میں نے تمہارا انٹرویو پڑھا تھا۔"
"پڑھ لیا، کیسا لگا؟"
"تمہارے انٹرویو نے بہت سوں کو چونکا دیا ہو گا۔"
"یہی میں چاہتی بھی تھی۔ یہ بتاؤ تم چونکے کہ نہیں؟"
"سب سے زیادہ میں ہی تو چونکا ہوں۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے میری حقیقت مجھ پر ظاہر کر دی۔ مجھے بتا دیا میری اور تمہاری سماجی حیثیت میں بہت فرق ہے۔ مجھ سے تمہاری شادی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔"
"اس میں غلط کیا ہے؟"
"اگر یہ فرق جتانے کے لائق تھا تو دوستی کیوں کی تھی؟"
"دوستی کسی سے بھی کی جا سکتی ہے۔"
"دوست تو تمہارے بہت سے ہوں گے۔ محبت کا دعویٰ تو تم مجھ سے کرتی ہو۔"
"میں نے محبت سے انکار نہیں کیا۔"
"کیا محبت میں یہ فرق دیکھے جاتے ہیں؟"
"محبت میں نہیں دیکھے جاتے لیکن شادی میں دیکھے جاتے ہیں۔ لوکیشن پر میرا انتظار ہو رہا ہے باقی باتیں پھر کر لیں گے۔ ہم روز ملتے ہی ہیں۔" اس نے کہا اور سیٹ کی طرف چل دی۔ ذیشان کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح موٹر سائیکل پر بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔
گھر پہنچتے پہنچتے وہ نڈھال ہو گیا۔ اچانک ایسے صدمے سے دوچار ہوا تھا کہ سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ کچھ کہنے کی سکت کیا ہوتی سوچنے کی ہمت نہیں تھی۔ شام ہوتے ہوتے اس کا بدن بخار کی شدت سے تپنے لگا۔ اس کی ماں یہی سمجھ رہی تھی کہ تھک کر سو گیا ہے۔ وہ اسے جگانے آئی تو گھبرا کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔
"ذیشان، تجھے تو بہت تیز بخار ہے۔"
"ہاں اماں، سمندر کے کنارے چلا گیا تھا وہاں کچھ ایسی ہوا چلی کہ بدن جلنے لگا۔"
"ہمت کر کے ڈاکٹر کے پاس چلا جا، بہت تیز بخار ہے تجھے تو۔"
"ارے اماں موسمی بخار ہے اتر جائے گا۔"
"تیری مرضی بھیا۔ میری بات کبھی سنی ہے جو اب سنے گا۔"
وہ منہ لپیٹ کر پڑ گیا۔ رات تو جوں توں گزر گئی لیکن صبح ہوتے ہی ڈاکٹر کو گھر بلانا پڑ گیا۔ کوئی خطرے کی بات تو تھی نہیں صرف بخار تھا۔ ڈاکٹر نے دوائیں تجویز کیں اور چلا گیا۔ وقتی طور پر فائدہ بھی ہو گیا لیکن بخار نے تو جیسے گھر ہی دیکھ لیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے طبیعت سنبھل جاتی پھر نڈھال ہو کر بستر پر گر جاتا۔
وہ پندرہ دن مسلسل آفس نہ جا سکا۔ اس دوران وہ برابر خود کو نصیحتیں کرتا رہا۔ کسی خود غرض کے لیے خود کو گھلانے کا کیا فائدہ۔ وہ اگر دوستی کا ہی لحاظ کر لیتی تو فون ضرور کرتی۔ اسے معلوم ضرور ہوا ہو گا کہ میں بیمار ہوں۔ میرے آفس سے گھر کا پتا بھی مل سکتا تھا۔ وہ مجھے دیکھنے آ سکتی تھی۔
کب تک چھٹیاں لیتا رہتا۔ چلنے کی سکت نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ آفس چلا گیا۔ پندرہ دن کی ڈاک جمع ہو گئی تھی، اس نے دل بہلانے کے لیے ایک ایک کر کے ڈاک کو کھولنا شروع کر دیا۔ ایک اخبار آیا رکھا تھا۔ اس نے چاہا کہ اخبار کو ایک طرف رکھ کر صرف خطوط دیکھے لیکن لفافے پر درج ایک سطر نے اس کا ارادہ بدل دیا۔
"ڈولی کی جانب سے برائے مطالعہ۔"
اس نے اخبار کھولا کہ ایسی کون سی خبر ہے جو ڈولی نے اس کے مطالعے کے لیے بھیجی ہے۔ اخبار کھولتے ہی اس کی نظر ڈولی کی تصویر پر پڑی۔ سرخی جمی ہوئی تھی۔
"ڈولی کا انکشاف۔"
اسے تجسس ہوا کہ ایسا کون سا انکشاف ہے۔ وہ پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا یہ انکشاف واقعی انکشاف سے بھرپور تھا۔ اس نے سفاک سچائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے باپ دین محمد کے ماضی کو کریدا تھا۔ "میرا باپ ماضی کا





ویٹر قسائی ہے۔" اپنی ماں کے بارے میں لکھا تھا۔ "وہ ذہنی مریضہ ہیں۔" ایک انکشاف یہ بھی کیا تھا کہ وہ عنقریب اپنا گھر چھوڑ دے گی۔
یہ باتیں نئی بھی تھیں، دلچسپ بھی اور حیران کن بھی لیکن چونکا تو وہ اس وقت جب سوال کرنے والے نے سوال کیا۔
"سنا ہے آپ ذیشان سے شادی کرنے والی ہیں؟"
ڈولی نے جواب دیا۔ "اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے۔ میں کسی بھی وقت ذیشان سے شادی کر سکتی ہوں۔ اس کی مہربانیوں ہی سے میں یہاں تک پہنچی ہوں۔"
عجیب لڑکی ہے، کبھی مایوس کرتی ہے اور کبھی امیدوں سے دامن بھر دیتی ہے۔ اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ وہ آگے پڑھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اگر وہ غصے میں نہ ہوتا تو یہی سمجھتا کہ یہ آنسو خوشی کے ہیں۔ اس نے فون ملایا۔
"راؤ صاحب، ذرا شیڈول دیکھ کر بتاؤ، ڈولی اس وقت کہاں ہو گی؟"
"وہ تو شوٹنگ کے لیے شہر سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ تین دن بعد لوٹیں گی۔"
"شہر سے باہر کوئی مقام تو ہو گا۔"
"انہوں نے منع کر دیا تھا اس لیے ہم کسی کو نہیں بتا سکتے کہ وہ کہاں ہیں۔"
"میں کسی میں نہیں آتا۔ وہ میری دوست ہے اور پھر میری کولیگ ہے۔ ہم دونوں ایک ہی ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے وابستہ ہیں۔"
"سوری، شہریار صاحب بھی اس کے ساتھ ہیں۔ سمجھ رہے ہیں ناں۔ یہ کوئی خاص شوٹنگ ہے۔ شہریار صاحب نے خود مجھے حکم دیا تھا کہ کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ میں ان کا ملازم ہوں اور آپ بھی۔ ان کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔"
"یہ گالی آپ مجھے نہ دیں۔ میں آج سے ان کا ملازم نہیں ہوں۔ جس ادارے میں رہ کر ادارے کے سیکریٹس مجھے معلوم نہ ہو سکیں وہاں کام کرنے کا کیا فائدہ۔ میں استعفیٰ لکھ کر ابھی منیجر کو بھجوا رہا ہوں۔"
اس نے استعفیٰ لکھا اور گھر آ گیا۔ اسے نوکریوں کی کیا کمی تھی۔ اخبار کے مالکان کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ ذیشان نے استعفیٰ دے دیا ہے، اس کے پاس فون آنے لگے۔ اس نے یہ بھی انتظار نہیں کیا کہ استعفیٰ منظور ہوتا ہے یا نہیں، اس نے ایک اخبار جوائن کر لیا۔
ابھی اس نئی نوکری پر آئے اسے دو دن ہوئے تھے کہ ڈولی اس سے ملنے آ گئی۔ ذیشان نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اس سے نہیں ملے گا لیکن اگر ڈولی دھوپ چھاؤں تھی تو خود اس کی کیفیت بھی یہی تھی۔ وہ بار بار فیصلہ کرتا تھا کہ ڈولی اور اس کا کوئی جوڑ نہیں وہ اب ڈولی سے نہیں ملے گا اور پھر ملتا تھا۔ اس میں کچھ قصور اس کے اس جذبے کا بھی تھا جسے وہ محبت کہتا تھا لیکن زیادہ ہنر ڈولی کا تھا کہ جب اندھیرا بڑھتا تھا وہ ایک چراغ جلا دیتی تھی۔ پچھلے دنوں ایک انٹرویو کے ذریعے اس نے ایک چراغ جلا دیا تھا لیکن اس چراغ کی روشنی دیکھنے خود نہیں آئی تھی۔ ذیشان کو اس بات کا غصہ تھا۔ وہ خود ملنا چاہ رہا تھا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ شہریار صاحب بھی اس کے ساتھ شوٹنگ پر گئے ہیں تو اس کے دل میں شک کی دراڑ پڑ گئی اور وہ استعفیٰ دے کر اس اخبار میں آ گیا۔ یہی شک اس کے دل میں اس وقت بھی تیر کی طرح پیوست تھا۔
"شہریار صاحب سے اجازت لے کر آئی ہو یا یونہی چلی آئیں؟"
"لندن جانے کی فرصت نہیں تھی ورنہ وہاں جا کر ضرور پوچھتی۔"
"اچھا تو تمہیں شوٹنگ سے فارغ کر کے خود لندن چلے گئے، شوٹنگ لندن میں تھی۔ تم آ گئیں وہ وہیں رہ گئے۔"
"تم مذاق کر رہے ہو یا سنجیدہ ہو؟"
"میں اتنا سنجیدہ کبھی نہیں ہوا تھا۔"
"تو پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پچھلے ایک مہینے سے لندن میں ہی، اپنی بیوی کے علاج کے سلسلے میں۔"
"یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔"
"تمہیں معلوم تھا۔" ڈولی نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "ٹیلی فون پر شہریار صاحب سے جھگڑا ہوا اور تم نے استعفیٰ دے دیا۔"
"یہ کہانی تمہیں کس نے سنائی ہے؟"
"تم کیا سمجھتے ہو، راؤ صاحب نے مجھے کچھ نہیں بتایا ہو گا؟"
"راؤ صاحب نے مجھے یہ بتایا تھا کہ تم شوٹنگ پر ہو اور شہریار صاحب بھی تمہارے ساتھ ہیں۔"
"اور تم نے یقین کر لیا۔ ان سے پوچھتے تو شوٹنگ کہاں ہو رہی ہے۔"
"انہوں نے کہا تھا کہ شہریار صاحب نے منع کر دیا ہے کہ لوکیشن کسی کو نہ بتائیں۔"

ڈولی کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئی کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ راؤ صاحب نے کیوں غلط بیانی سے کام لیا اور پھر جیسے اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔

''اس کا مطلب ہے اس مرتبہ چونکنے کی باری راؤ صاحب کی تھی۔''

''چونکنے کی باری؟''

''ہاں، میرا بھیجا ہوا اخبار تمہیں ملا تھا؟''

''ملا تو تھا اور میں نے پڑھا بھی تھا۔''

''تم چونکے بھی ہو گے کہ میں نے تمہارے بارے میں کس رائے کا اظہار کر دیا۔ میں نے کہا تھا میں کسی بھی وقت ذیشان سے شادی کر سکتی ہوں۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ یہ تم نے سنسنی پھیلانے کے لیے کہا تھا یا تمہارے دل کی آواز تھی؟''

''چونکانے کے لیے ہی سہی لیکن میں واقعی تم سے شادی کرنے والی ہوں۔ جلنے والے بہت ہوتے ہیں۔ راؤ صاحب نے نہ چاہا ہو گا کہ میں تم سے شادی کروں۔ انہوں نے تمہارے دل میں شک ڈالنے کے لیے شہریار صاحب کو میرے ساتھ نتھی کر دیا۔ تم جھانسے میں آ گئے اور استعفیٰ دے ڈالا۔ میں تو کہتی ہوں شہریار صاحب کے آنے کا انتظار کرو اور ایجنسی دوبارہ جوائن کر لو۔''

''نہیں، عقل مندی اسی میں ہے کہ تم جس ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے لیے کام کرتی ہو میں وہاں کام نہ کروں ورنہ ایسے واقعات مزید پیش آتے رہیں گے۔''

''میری پروا مت کرو۔ میں شوبز کی دنیا سے تنگ آ چکی ہوں۔ اتنی مصروفیت اب برداشت نہیں ہوتی کہ تم سے ملنے کے لیے وقت نہ نکال سکوں۔ میں نے یہ لائن اس لیے اختیار کی تھی کہ ممی سے بدلہ لے سکوں۔ اب انہوں نے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ ڈیڈ نے بھی چپ سادھ لی ہے۔ جب کوئی ہنگامہ ہی برپا نہ ہو تو میرے ہنگامہ کرنے کا کیا فائدہ۔''

''تو پھر تمہارا یہ فیصلہ اٹل ہے؟''

''بس ایک دو اشتہار اور ہیں وہ کر لوں پھر مجھے دنیا دیکھتی رہ جائے گی اور میں تمہارے ساتھ کسی دور دراز مقام پر چھٹیاں منانے نکل جاؤں گی۔''

ذیشان کا سارا غصہ رفوچکر ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا کہ اس نے ڈولی کے متعلق کیا کیا خیال دل میں باندھ لیے تھے۔ وہ واقعی اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ مجھ سے ملنے کا وقت ہی اس کے پاس نہیں ہو گا۔ وہ مجھ سے واقعی محبت کرتی ہے ورنہ میری خاطر چمک دمک کی دنیا کیوں چھوڑتی۔

ایک خبر نے اسے پھر چونکا دیا۔ ابھی اس کے خیالات باسی بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک اخبار میں خبر آ گئی۔ ''مشہور ماڈل گرل مس ڈولی ٹی وی ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کریں گی۔''

پہلے تو وہ سمجھا کہ مشہور لوگوں کے بارے میں اخبار من گھڑت خبریں شائع کر دیتے ہیں لیکن اس خبر کی تصدیق اس وقت ہو گئی جب وہ خود یہ خوش خبری سنانے آئی اور اپنی مجبوریوں کے بارے میں طویل تقریر کر ڈالی۔

''پروڈیوسر خود چل کر میرے پاس آیا تھا۔ اس نے جو کہانی سنائی وہ میری زندگی سے مطابقت رکھتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ کردار کوئی اور کرے اور پتا ہے جو اس ڈرامے کا ہیرو ہو گا جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں بے تاب رہتی تھی، اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا تھا، لہٰذا میں انکار کیسے کرتی۔''

''تمہاری تو پھر وہی مصروفیت ہو جائے گی۔''

''بس ایک ڈرامے کی بات ہے یہ بھی کوئی ایسی مصروفیت نہیں ہو گی۔ ہم ملتے رہیں گے۔''

کم از کم یہ وعدہ اس نے ضرور پورا کیا۔ وہ ڈرامے کی ریہرسل اور شوٹنگ کے دوران ذیشان سے برابر ملاقاتیں کرتی رہی۔ ایک مرتبہ وہ دونوں پھر ایک ساتھ دیکھے جانے لگے تھے۔ ایک مرتبہ پھر ذیشان کو خود پر فخر ہونے لگا تھا۔ وہ جب اس کے ساتھ نکلتا تھا، ڈولی کے پرستار ڈولی کو گھیر لیتے تھے۔ وہ جس ہوٹل میں بیٹھتے تھے، ہوٹل کا منیجر تک ڈولی سے آٹوگراف کے لیے درخواست کرتا تھا۔ لڑکیاں تو جیسے اس کی دیوانی تھیں۔ اب ایسی تصویریں بھی شائع ہو رہی تھیں جن میں وہ اور ڈولی ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔

اس کا ڈراما نشر ہوا تو جیسے اس کی شہرت کو پر لگ گئے۔ اب اس کا گھر سے باہر نکلنا بھی محال ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ تو یہ ہوا کہ اس نے ایک جگہ گاڑی پارک کی اور کچھ خریدنے کے لیے ایک جنرل اسٹور کی طرف بڑھی۔ لوگوں نے اسے پہچان لیا۔ ایک بھیڑ جمع ہو گئی، لوگوں نے اسے اتنا پریشان کیا کہ اسے اسٹور میں پناہ لینی پڑی۔ پولیس کو مداخلت کرنی پڑی تب جا کر وہ اپنی گاڑی تک پہنچی۔ اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ برقع پہننا شروع کر دیا۔

اس کی یہ مقبولیت رنگ دکھائے بغیر نہ رہ سکی۔ فلم سازوں نے اس کے گھر کے چکر کاٹنے شروع کر دیے لیکن اس کی ماں نے ان کی ایسی تواضع کی کہ گھر کا راستہ بھول گئے۔





وہ اپنے ڈرامے کی آخری قسط کا آخری سین شوٹ کروانے کے لیے ٹی وی اسٹیشن آئی ہوئی تھی۔ وہ اسٹوڈیو میں تھی کہ اسے ایک تعارفی کارڈ ملا۔ یہ مشہور فلم ساز اظہر درانی کا کارڈ تھا۔ یہ نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ درانی صاحب نے لاتعداد کامیاب فلمیں بنائی تھیں۔ اسے خود پر فخر ہونے لگا۔ اتنا بڑا فلم ساز اس سے ملاقات کا متمنی تھا اور پروڈیوسر کے کمرے میں بیٹھا گھنٹوں سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کہلوا دیا کہ وہ فارغ ہوتے ہی ان سے ملاقات کرے گی۔

اسے مزید ایک گھنٹا لگ گیا۔ وہ پروڈیوسر کے کمرے میں پہنچی تو اسے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ درانی صاحب اب بھی اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ بہت تھک گئی تھی لیکن اسے یہ اچھا معلوم نہیں ہوا کہ ملاقات کو کل پر ٹال دے۔ پروڈیوسر کی موجودگی میں بات کرنا مناسب بھی نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ درانی صاحب کچھ ہچکچا رہے ہیں۔ وہ انہیں لے کر ایک خالی کمرے میں چلی گئی۔

''درانی صاحب، میں معذرت چاہتی ہوں آپ کو انتظار کرنا پڑا۔''

''میں شوٹنگ کے معاملات سے واقف ہوں۔ اس میں دیر لگ جاتی ہے۔ غلطی میری ہے، مجھے فون کر کے آنا چاہیے تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر آپ نے فون پر انکار کر دیا تو پھر مشکل ہو جائے گی کیونکہ میں رات کی فلائٹ سے لاہور واپس جا رہا ہوں۔''

''فرمائیے، آپ کو مجھ سے ایسا کیا کام پڑ گیا؟''

''بات نہایت مختصر کروں گا۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔ میں ایک نئی فلم شروع کرنے والا ہوں۔ اس فلم کی ہیروئن کے لیے میری نظر آپ پر پڑی ہے۔ یہ کنٹریکٹ رکھا ہے، اس پر سائن کر دیں۔''

''بات یہ ہے درانی صاحب کہ میں خود کو چھوٹے پردے کے لیے موزوں سمجھتی ہوں۔ جو شہرت مجھے ایک ڈرامے نے دے دی ہے فلم اس سے زیادہ کیا دے گی۔''

''یہ سوچنا آپ کا کام نہیں ہے۔ میرا برسوں کا تجربہ کہتا ہے کہ آپ بڑی اسکرین کے لیے بنی ہیں۔ آپ ایک فلم کریں گی تو فلموں کی لائن لگ جائے گی۔''

''میں کراچی میں رہتی ہوں اور آپ فلم لاہور میں بنا رہے ہیں۔ میرے لیے مشکل ہو جائے گا۔''

''لاہور میں آپ کے شایانِ شان رہائش میری ذمے داری ہو گی۔ آپ اپنی فیملی سمیت لاہور شفٹ کر سکتی ہیں۔''

''آپ کو شاید معلوم نہیں میرے والدین اس معاملے میں میرا ساتھ دینے کے قطعی روادار نہیں ہوں گے۔''

''آپ ہوٹل میں بھی رہ سکتی ہیں، جب چاہیں اپنے والدین سے ملنے کراچی آ جائیں۔''

''اتنا بڑا فیصلہ میں سوچے سمجھے بغیر نہیں کر سکتی۔''

''میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات۔ یہ چیک بک رکھی ہے۔ جتنا معاوضہ چاہیں آپ اپنے ہاتھ سے لکھ دیں۔ میں اس میں سے ایک پیسا بھی کم نہیں کروں گا۔ آپ کو فلم سے ملنے والی شہرت کا اندازہ نہیں ہے۔ میری کوئی فلم آج تک فلاپ نہیں ہوئی اور پھر اس میں تو آپ ہیروئن ہوں گی۔''

ڈولی نے کچھ دیر سوچا اور چیک بک پر اپنی پسند کی رقم درج کر دی۔ درانی صاحب نے ایک نظر رقم پر ڈالی اور کنٹریکٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔ ڈولی نے اس پر بھی سائن کر دیے۔

''آپ اپنی سہولت دیکھ کر جلد سے جلد لاہور آ جائیں۔ باقی معاملات وہاں طے ہو جائیں گے اور فلم شروع کر دی جائے گی۔''

''آپ مجھے ایک ہفتہ دیں اور چیک پر ایک ہفتے بعد کی تاریخ ڈال دیں۔''

''مجھے آپ پر بھروسا ہے۔''

''مگر مجھے خود پر بھروسا نہیں ہے میں اپنا ارادہ بدل بھی سکتی ہوں۔ اس لیے آپ کے پاس ایک ہفتہ ہونا چاہیے۔''

درانی صاحب کا منہ اتر گیا لیکن انہوں نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ ڈال کر چیک اس کے حوالے کر دیا۔

''مجھے امید ہے کہ آپ اپنا ارادہ نہیں بدلیں گی۔''

''میرا ابھی یہی ارادہ ہے۔'' درانی صاحب رخصت ہو گئے اور وہ گھر آ گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ ذیشان کے پاس بیٹھی تھی۔

''ذیشان، اس ڈرامے کی مقبولیت کے بعد فلم ساز میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ میں فلم میں کام کروں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ڈولی، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی مصروفیات کم کر دو گی۔ ٹی وی ڈرامے تک میں نے انتظار کیا۔ اب تم دنیا کو چونکانے کا بندوبست کرو اور مجھ سے شادی کر لو۔ فلمی دنیا ویسے بھی اچھی نہیں۔ یہاں بدنامی کے سوا ملتا ہی کیا ہے۔ تم کب تک خبروں کی زینت بنتی رہو گی۔ میں کب تک اپنی والدہ کو دلاسے دیتا رہوں گا۔ وہ شادی کے لیے ضد

کر رہی ہیں۔"

"فلموں کو میں بھی پسند نہیں کرتی۔ اسی لیے میں نے کسی فلم ساز کو ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے شہرت مل چکی، دولت کی بھی کمی نہیں پھر میں کیوں فلم کے بکھیڑوں میں پڑوں۔ تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ اب میں شادی کر لوں۔ دنیا تو اس سے بھی چونک ہی جائے گی۔"

"کسی دن میری ماں کو بھی چونکا دو۔ میرے ساتھ گھر چلو۔"

"ارے ہاں، اتنے دن سے یہ خیال ہی نہیں آیا۔ کل نہیں تو پرسوں میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر ضرور جاؤں گی۔ جاتے وقت اپنے چند صحافیوں کو بتا دینا۔ چند خبریں اس حوالے سے بھی اخباروں میں آ جائیں گی۔"

بات مذاق میں ٹل گئی۔ وہ اسے اپنے ساتھ ضد کر کے ساحل سمندر پر لے گئی۔ دونوں وہاں بیٹھ کر مستقبل کی پلاننگ کرتے رہے۔ رات کا کھانا انہوں نے باہر کھایا۔ گھر دیکھنے کے بہانے وہ اسے گھر چھوڑ کر اپنے گھر چلی گئی۔

ذیشان اتنا خوش کبھی نہیں ہوا تھا جتنا اس رات ہوا۔ بستر پر بڑی دیر تک لیٹا رہا۔ نیند تھی کہ قریب آنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ یہ غم کی نہیں خوشی کی بے چینی تھی۔ خوشی کی بے چینی وہ ہوتی ہے جب آدمی سوتے میں بھی جاگتا رہتا ہے۔ یہی حالت اس کی تھی۔ اتنی بڑی اداکارہ سے جب اس کی شادی ہوگی تو اخبارات ضمیمے شایع کریں گے۔ کیسی کیسی شخصیات اس شادی میں شریک ہوں گی۔ ڈولی ٹھیک کہتی ہے۔ جلنے والے کیسا کیسا جلیں گے۔ وہ جاگتے میں بھی سوچتا رہا۔ سوتے ہوئے بھی یہی خیالات اس کے ساتھ ساتھ رہے۔

جب سے اس نے اخبار میں نوکری کی تھی دوپہر کے بعد ہی دفتر جاتا تھا۔ دن چڑھے سو کر اٹھا اور دفتر چلا گیا۔ اخباری رپورٹروں سے کون سی بات چھپی رہتی ہے۔ وہ ابھی دفتر پہنچا ہی تھا کہ رپورٹر نے خبر لاکر دے دی۔

"ڈولی، اظہر درانی کی فلم سائن کرنے لاہور روانہ ہوگئی۔"

"تمہاری یہ خبر غلط ہے۔"

"میں نے اچھی طرح تصدیق کر لی ہے بلکہ ہمارے لاہور کے نمائندے نے اظہر درانی سے خود اس کی تصدیق کی ہے۔"

ذیشان نے پھر بھی یقین نہیں کیا۔ نمائندے کے جانے کے بعد اس نے ڈولی کو فون کیا۔ اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ وہ دن بھر کوشش کرتا رہا، اس سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ اس نے تنگ آ کر ٹی وی کے اس پروڈیوسر کو فون کیا جس کے ڈرامے میں ڈولی نے کام کیا تھا۔ اس نے جو تفصیلات بتائیں انہیں سن کر ذیشان کو یقین ہوگیا کہ خبر میں کچھ نہ کچھ حقیقت ہے۔ ایک مرتبہ پھر اسے یقین ہوگیا کہ وہ دوسروں کو چونکانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ یہ اس کا مشغلہ ہے جو اس کی نفسیات کا حصہ بن چکا ہے۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ یہ کیسی محبت ہے۔ اس نے مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا اور اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ وہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہے اور میں بن رہا ہوں۔

اخبارات تو ایسی چٹپٹی خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ دوسرے ہی دن لاہور کے نمائندے نے خبر بھیج دی کہ ڈولی فلاں ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ اتنے بج کر اتنے منٹ پر اظہر درانی اس سے ملنے آئے تھے اور وہ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر کہیں گئی تھی۔

اس حوالے سے روز خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اخباری نمائندوں کا دعویٰ تھا کہ اس نے کئی فلمیں سائن کر لی ہیں۔ وہ اب بھی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے لیکن اس کے لیے کسی کوٹھی کی تلاش جاری ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ وہ لاہور میں مستقل قیام کرے گی۔

ذیشان اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ کسی دن اس کا فون آئے گا اور ادھر سے آواز آئے گی۔ "ذیشان میں ڈولی بول رہی ہوں۔"

ڈولی نے شاید سم بدل لی تھی۔ ذیشان کے لیے اس کی یہی حرکت تکلیف دہ تھی۔ اگر کسی مجبوری نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر ہی دیا تھا تو اسے خود فون کرنا چاہیے تھا۔

ایک دن ڈولی کے باپ کا ایک بیان اخبار میں چھپا۔ انہوں نے اس بیان میں کہا تھا کہ ان کی بیٹی کو ورغلانے والا ذیشان ہے۔ اسی کے کہنے پر اس نے فلم انڈسٹری کا رخ کیا ہے۔ وہ عنقریب اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے۔

حال تو یہ تھا کہ وہ اس سے رابطے تک میں نہیں تھی اور الزام اس پر یہ آ رہا تھا۔ چودھری دین محمد کی دھمکی سے وہ گھبرا ضرور گیا تھا لیکن ڈولی کوئی بچی نہیں تھی کہ ورغلانے کا الزام ذیشان پر آتا۔ ذیشان نے دو چار وکیلوں سے بھی بات کر لی۔ انہوں نے بھی یہی تسلی دی کہ وہ مطمئن رہے۔

چودھری دین محمد کی طرف سے کوئی کارروائی تو نہیں ہوئی لیکن خبریں اس تواتر سے شایع ہوئیں کہ انہیں بھی معلوم ہوگیا کہ ڈولی اور ذیشان کے درمیان کچھ معاملات ہیں۔ چند اخباروں نے ایسے مضامین بھی شایع کیے جن میں ڈولی

کی بے وفائی کو موضوع بنایا گیا تھا اور یہ لکھا گیا تھا کہ جس شخص نے ڈولی کو ڈولی بنایا، ڈولی اسی کو بھول گئی۔ آج کل دونوں میں دوری ہے۔ مطلب پرست ڈولی شہرت ملتے ہی ذیشان کو بھول گئی۔

یہ مضامین ڈولی نے بھی پڑھے اور ذیشان سے وضاحت لیے بغیر اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ یہ مضامین ذیشان اپنے دوستوں سے لکھوا رہا ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی ہوگا تو ان مضامین کے بعد اس نے ضروری نہیں سمجھا کہ وہ ذیشان سے رابطہ کرے۔

صحافت کی دنیا میں ذیشان کے دشمن بھی کم نہیں تھے۔ ایک معمولی سے اخبار میں کسی فرضی نام سے ایک مضمون شائع ہوا، اس میں ......... یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ڈولی کو بنانے میں ذیشان کا کوئی ہاتھ نہیں۔ وہ ایک پیشہ ور فوٹو گرافر ہے۔ ڈولی کی تصویریں اگر بناتا تھا تو اپنی ڈیوٹی انجام دیتا تھا۔ اگر اس کے احسانات ڈولی پر ہوتے تو ڈولی اس کا شکریہ ضرور ادا کرتی۔ ذیشان یہ بھی کہتا پھرتا ہے کہ ڈولی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک انٹرویو میں کہہ چکی ہے کہ ذیشان سے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ایک مضمون اس کے جواب میں بھی آگیا جس میں لکھنے والے نے یہ لکھا کہ ڈولی ایک انٹرویو میں یہ کہہ چکی ہے کہ وہ کسی بھی وقت ذیشان سے شادی کرسکتی ہے۔

مضامین کا یہ سلسلہ تادیر چلتا رہا۔ ذیشان کے دوستوں نے کہا بھی کہ وہ بھی ایک مضمون لکھے اور حقیقت کا انکشاف کرے لیکن اس نے اس جنگ میں کودنا مناسب نہیں سمجھا۔

ڈولی اس لڑائی سے بے نیاز فلم کی تیاری میں مشغول تھی۔ ذیشان کو تو جیسے وہ بھول ہی گئی تھی۔ ذیشان نے بھی اسے فراموش کردیا تھا اور اپنے زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

اس کی پہلی فلم ریلیز ہوئی تو دھوم مچ گئی۔ فلمی اخبار اس کی تصویروں سے بھر گئے۔ اب صحافی بھی اس اسکینڈل کو بھول چکے تھے جو کبھی ذیشان کے ساتھ مشہور ہوا تھا بلکہ جھوٹ یا سچ اب تک اخبارات یہ لکھ رہے تھے کہ وہ ان دنوں ایک نئے اداکار شاہ میر کے ساتھ دیکھی جارہی ہے۔

وہ اپنی دوسری فلم کی شوٹنگ کے لیے کراچی آئی ہوئی تھی اور ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ذیشان کے اخبار کا ایڈیٹر تگ ودو میں لگا ہوا تھا کہ ڈولی انٹرویو کے لیے وقت دیدے۔ اس نے اس سلسلے میں ذیشان سے بات کی۔

"ڈولی سے ماضی میں تمہاری دوستی رہی ہے، وہ تمہیں ابھی بھولی تو نہیں ہوگی۔ تم سفارش کردو کہ وہ کچھ وقت ہمیں دیدے۔"

"ایڈیٹر صاحب، ماضی میں وہ میری دوست ضرور رہی ہے لیکن وہ اتنے دنوں سے کراچی میں ہے۔ مجھے فون کرسکتی تھی، مجھ سے ملنے آسکتی تھی۔ میں اچھا لگوں گا اسے ٹیلی فون کرتے ہوئے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں چاہتا ہی نہیں کہ اس سے کوئی رابطہ رکھوں۔"

"اگر ہم اس سے وقت لینے میں کامیاب ہوگئے تو فوٹو سیشن کے لیے تو آپ کو ہی جانا ہوگا۔"

"فوٹو سیشن میری ڈیوٹی ہے میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔ اگر ڈولی نے انکار نہیں کیا تو میں اس کی تصویریں بنانے ضرور جاؤں گا۔"

اس کی بات معقول تھی۔ انٹرویو کے لیے وقت لینا اس کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ تصویریں بنانے سے وہ انکار نہیں کررہا تھا۔

ایڈیٹر نے کسی نہ کسی طرح ڈولی سے وقت مانگ لیا۔ فلم انڈسٹری میں آنے کے بعد یہ پہلا انٹرویو تھا جو وہ اس اخبار کو دینے والی تھی۔ اس نے اس شرط پر انٹرویو کرنے کی ہامی بھری تھی کہ اس سے کوئی ذاتی سوال نہیں کیا جائے گا۔

ذیشان وعدہ کرچکا تھا کہ وہ انٹرویو کے دوران تصویریں بنانے سے انکار نہیں کرے گا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے دو ساتھی صحافیوں کے ہمراہ ڈولی کے ہوٹل جانا پڑا لیکن اس کی حالت عجیب تھی۔ ڈولی کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات یاد آرہے تھے۔ اس کی بے وفائی پر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس نے راستے میں کئی بار سوچا کہ وہ راستے ہی سے لوٹ جائے۔ انکار کردے، نوکری چھوڑنا پڑے تو نوکری بھی چھوڑ دے، کہیں اور نوکری مل جائے گی پھر وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے نوکری کیوں چھوڑے۔ اسے بھی تو معلوم ہو کہ میں اس کے بغیر خوش ہوں۔ میں اس سے ملنے نہیں اپنی ڈیوٹی کرنے آیا ہوں۔

اس کے ساتھ آئے ہوئے دونوں صحافی اس کی حالت سے بے خبر نہیں تھے۔ ان کی سرگوشیاں بھی جاری تھیں۔ دونوں کا خیال یہ تھا کہ ذیشان نے اس پر کتنے ہی احسانات کیے ہوں لیکن اب وہ اتنی بڑی اداکارہ بن چکی ہے کہ ذیشان کو پہچانے گی بھی نہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے دیکھ کر انٹرویو دینے سے ہی انکار کردے۔ کوئی بہانہ کرکے اٹھ جائے۔

ان کی گاڑی... ہوٹل کی پارکنگ میں داخل ہوئی۔ اندیشوں کے بوجھ سے تینوں کے قدم بوجھل تھے۔ ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے ان لوگوں کی آمد کی اطلاع ڈولی تک پہنچادی تھی اس کے باوجود انہیں انتظار گاہ میں بیٹھ کر خاصی دیر انتظار کرنا پڑا۔ حکم باریابی ہوا تو وہ تینوں اس کے کمرے میں چلے گئے۔ وہ ایک کرسی پر نہایت پُروقار انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ذیشان کے دو ساتھی آگے تھے اور وہ پیچھے۔ ڈولی نے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ جو دو صحافی پہلے داخل ہوئے تھے ان سے باتیں کرنے لگی۔ ذیشان کی رگوں میں خون جمنے لگا۔ ایسی بے اعتنائی، ایسی بے وفائی۔ کوئی اجنبی شناسا ہوتا ہے تو اس کی بھی خیریت معلوم کرلیتے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر اس کا جی چاہا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے لیکن یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ وہ مجھے نہ دیکھے میں تو اسے دیکھ رہا ہوں پھر یہ موقع ملے نہ ملے۔ وہ کتنی حسین ہوگئی ہے اور پُروقار بھی۔

"آپ لوگوں کو میری شرط بتادی گئی ہے؟"

"کیسی شرط میڈم؟"

"آپ مجھ سے کوئی ذاتی سوال نہیں کریں گے۔"

"ایڈیٹر صاحب نے ہمیں بتادیا تھا۔"

"تو پھر شروع کریں۔" اس نے کہا اور اسی وقت اس کی نظر ذیشان پر پڑی یا اس نے یہ ظاہر کیا کہ اس نے ذیشان کو ابھی دیکھا ہے۔

"ذیشان، تم آئے ہو ان کے ساتھ۔ میں نے تو تمہیں دیکھا ہی نہیں۔"

"تم نے مجھے پہچان لیا؟"

"تم کمزور ہوگئے ہو لیکن اب ایسا بھی نہیں کہ تمہیں نہ پہچانوں۔ صحافیوں کے سامنے کہہ رہی ہوں کہ تم میرے محسن بھی ہو اور دوست بھی۔"

"دوستی ایسی ہوتی ہے کہ کراچی میں ہو اور فون تک نہیں کیا۔"

"میری مصروفیت کا تمہیں اندازہ نہیں ہے، تمہی فون کرلیتے۔"

"میں نے بہت فون کیے، تم نے تو شاید سم ہی بدل لی ہے۔"

"لوگ اتنا پریشان کررہے تھے کہ میں نے سم بدل لی۔ تمہیں ہوٹل کا تو معلوم تھا، یہاں آجاتے۔ تم پر کوئی پابندی ہے؟ خیر اب آگئے ہو تو خوب جی بھر کر باتیں ہوں گی۔"



دونوں صحافی ذیشان سے اس کی بے تکلفی دیکھ کر حیران تھے۔ اس سے زیادہ حیران وہ اس وقت ہوئے جب ڈولی نے انٹرویو دینے سے انکار کردیا۔

"آپ لوگ جاسکتے ہیں، اب یہ انٹرویو کل ہوگا۔ اس وقت تو میں ذیشان سے باتیں کرنے کو ترجیح دوں گی۔"

"میڈم، مالکان یہ سمجھیں گے کہ ہم نے آپ کو ناراض کردیا۔"

"اپنے ایڈیٹر سے کہیے مجھے فون کرلے۔" وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ ذیشان بیٹھا رہ گیا۔ کمرے کا دروازہ بند ہوگیا۔ دروازے پر لگا "ڈونٹ ڈسٹرب" کا بورڈ ملاقاتیوں کو مایوس کررہا تھا۔

"اب تم جی بھر کے میری تصویریں اتارو۔ یہ تصویریں جب ایک ایک کرکے تمہارے اخبار میں چھپیں گی تو تمہارے مالکان تمہاری ایک رات کی غیر حاضری کو قطعی محسوس نہیں کریں گے۔"

"یہ بھی تو سوچو جب ایک رات تمہارے ساتھ کمرے میں بند رہوں گا تو کیسا اسکینڈل بنے گا اور میں کس کس کو جواب دیتا پھروں گا۔"

"یہ بھی تو سوچو کہ لوگ چونکیں گے کیسے، خاص طور پر ڈیڈی جنہوں نے مجھے ورغلانے کا الزام تم پر لگایا تھا۔"

وہ صبح اس کے کمرے سے نکلا تو اس کا کیمرا ڈولی کی تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ اخبارات ان خبروں سے بھرے ہوئے تھے کہ ڈولی نے انٹرویو ملتوی کرکے ذیشان کے ساتھ رات گزاری۔

اس کے ساتھ ہی یہ معلوم ہوا کہ ڈولی لاہور کے لیے پرواز کرگئی۔ انٹرویو ہمیشہ کے لیے ملتوی ہوگیا۔ ذیشان ڈولی کی نادر تصویریں لانے میں کامیاب ہوگیا جو اس کے اخبار کی زینت بنتی رہیں۔

وہ پھر اس طرح غائب ہوگئی تھی کہ نہ فون کررہی تھی نہ فون اٹھا رہی تھی۔ اس کی خبریں صرف اخبارات سے مل رہی تھیں۔ اخباروں ہی سے یہ معلوم ہوا کہ وہ کسی فلم کی عکس بندی کے لیے بیرونِ ملک روانہ ہوگئی ہے۔ وہ ملک میں تھی تو کب مجھ سے مل رہی تھی پھر میں یہ شکوہ کیوں کروں کہ وہ مجھے بتائے بغیر ملک سے باہر چلی گئی۔

ذیشان کے ذہن میں ایک مرتبہ پھر سناٹا گونجنے لگا۔ یہ سناٹا اس وقت ٹوٹا جب اس کی طرف سے ایک پارسل اسے موصول ہوا۔

"یہ چند تصویریں ہیں جو میرے بیرونِ ملک

دورے کی یادگاریں ہیں انہیں اپنے اخبار میں چھپوا دو، میں کراچی آئی تو تم سے ضرور ملوں گی۔"

سناٹا پھر پھیل گیا۔ ایک طویل سناٹا۔

چند ماہ بعد اسے خبر ملی کہ وہ کراچی آئی ہوئی ہے اور ایک کروڑ پتی بزنس مین کے گھر ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ اس کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ وہ مجھ سے کتنی قریب ہے اور میں اس سے کتنا دور ہوں۔ اسی عالم دیوانگی میں ایک دن اس نے کیمرا اٹھایا، بائیک اسٹارٹ کی اور دولت مند بوڑھے کی کوٹھی پر پہنچ گیا جہاں ڈولی ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ اس بوڑھے کروڑ پتی کو نہیں جانتا تھا لیکن اس گھر میں جو مہمان ٹھہری ہوئی تھی، وہ اس کی دوست تھی۔ یہی فخر تھا جو اسے وہاں تک لے آیا تھا۔

"میرا نام ذیشان ہے۔ میں مس ڈولی سے ملنے آیا ہوں انہیں جا کر بتاؤ کہ ذیشان آیا ہے۔"

"یہاں کوئی ماڈل نہیں رہتی۔" گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے کہا۔

"وہ یہاں رہتی نہیں ہے، ٹھہری ہوئی ہے۔"

"کہہ دیا نا یہاں کوئی ماڈل نہیں۔"

"تمہیں شاید اس کا نام معلوم نہیں۔ وہ بہت بڑی اداکارہ ہے۔ بس اسے میرا نام بتا دو وہ خود مجھے بلالے گی۔"

"تم خود پاگل ہو یا مجھے پاگل بنا رہے ہو۔ یہ سیٹھ سلیمان کی کوٹھی ہے کوئی فلم اسٹوڈیو نہیں کہ یہاں کوئی اداکارہ ہوگی۔ آج کل ڈاکے بہت پڑ رہے ہیں، لوگ کسی بہانے سے کوٹھیوں میں داخل ہوتے ہیں اور لوٹ مار کرتے ہیں۔ تم بھی انہی میں سے ایک معلوم ہوتے ہو۔ تم یہاں سے جاتے ہو یا پولیس کو بلاؤں۔"

چوکیدار کے شور مچانے پر چند ملازم اور بھی آگئے۔ ان کا کہنا بھی یہی تھا کہ ڈولی نام کی کوئی لڑکی یہاں نہیں ٹھہری ہوئی۔ جب سب لوگوں نے انکار کیا تو ذیشان خود بھی سوچنے لگا کہ شاید اسے غلط اطلاع ملی ہے۔ ڈولی یہاں نہیں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ مایوس ہو کر گیٹ سے ہٹ گیا۔ چوکیدار نے دروازہ بند کرلیا۔ ذیشان نے ضروری سمجھا کہ اس کوٹھی کو اپنے کیمرے میں محفوظ کرلے۔ ہوسکتا ہے ڈولی کے یہاں قیام کو خفیہ رکھا گیا ہو۔ اگر کسی وقت یہ خبر سچ ثابت ہوئی تو یہ تصویریں سچ ثابت ہوسکتی ہیں۔ وہ مختلف زاویوں سے اس کوٹھی کی تصویریں بنانے لگا۔

وہ تصویریں بنا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ کوٹھی کا مین گیٹ کھلا۔ ایک گاڑی باہر نکل رہی تھی۔ ایک بوڑھا آدمی جو یقیناً سیٹھ سلیمان تھا، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور اس کے برابر میں ڈولی بیٹھی تھی۔ وہ اسے آنکھیں بند کر کے پہچان سکتا تھا۔ وہ یقیناً ڈولی تھی۔ گاڑی کچھ دیر کے لیے گیٹ کے سامنے رکی تھی۔ سیٹھ سلیمان چوکیدار سے کچھ بات کر رہا تھا۔ ذیشان کو موقع مل گیا۔ وہ تیزی سے فرنٹ سیٹ کی طرف بڑھا تاکہ ڈولی سے بات کرسکے۔ چوکیدار اسے دیکھتے ہی اس پر جھپٹ پڑا۔

"ڈھیٹ، تم پھر آگیا۔ بی بی صاحب کو قتل کرنا چاہتا ہے۔" سیٹھ سلیمان بھی گاڑی سے اترا لیکن اس سے پہلے ہی ڈولی نے شیشے اتار لیے۔

"اسے چھوڑ دو، یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔" چوکیدار نے گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔

"ڈولی، یہ پریس کا آدمی ہے۔ اس نے اگر تصویریں بنالیں تو خوامخواہ اسکینڈل بنے گا۔" سیٹھ سلیمان نے چیخ کر کہا۔

"یہ صرف فوٹوگرافر نہیں ہیں، میرے محسن ہیں۔" وہ بھی گاڑی سے نیچے آگئی تھی۔ "یہ تم نے کیا حماقت کی، مجھے فون کرلیا ہوتا۔"

"ڈولی تم میرے ساتھ کیا مذاق کر رہی ہو۔ تم کراچی میں ہو کیا مجھے فون نہیں کرسکتی تھیں۔ تم نے تو اپنے قیام تک کو خفیہ رکھا ہے۔"

"ذیشان، گلیمر کی اس دنیا میں قدم رکھ کر میں تو عذاب میں مبتلا ہوگئی ہوں۔ کسی سے کیا ملوں تم سے بھی نہیں مل سکتی۔ میں تو فلم ساز کے اشارے پر چلنے والی کٹھ پتلی ہوں۔ یہ دنیا جتنی چمکیلی نظر آتی ہے اس سے زیادہ اندھیری ہے۔ کتنے اچھے دن تھے جب ہم آزاد تھے۔ اب تو ہم قید میں ہیں۔ میں بہت جلد پچھلے دنوں کو آواز دوں گی۔ ابھی تو میں جا رہی ہوں۔ تم میرے پاس شام کو آنا پھر بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔"

اس نے شام ہونے کے انتظار میں دن کاٹا اور شام ہوتے ہی ڈولی سے ملنے چلا گیا لیکن معلوم ہوا کہ وہ لاہور چلی گئی ہے۔ چوکیدار اسے پہچان گیا تھا اس لیے غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ وہ واقعی چلی گئی تھی۔ اس کی تصدیق بعد میں اسے بھی ہوگئی تھی۔

اسے غصہ تھا تو یہ کہ اس مرتبہ چوکیدار نے غلط بیانی نہیں کی تھی لیکن ڈولی کی طرف سے غلط بیانی ہوئی تھی۔ اسے جب معلوم تھا کہ وہ لاہور چلی جائے گی تو شام کو بلایا ہی کیوں تھا۔ اگر اسے پردہ ہی رکھنا ہوتا تو سیٹھ سلیمان کے





سامنے اسے پہچانتی کیوں اور اسے اپنا محسن کیوں کہتی۔ وہ مجھے تکلیف میں بھی دیکھنا نہیں چاہتی اور تکلیف پہنچاتی بھی ہے۔ محبت کا اظہار بھی کرتی ہے اور غیروں کی طرح سلوک بھی کرتی ہے۔

اس کے کانوں میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ "میں بہت جلد پچھلے دنوں کو آواز دوں گی۔" اس کا مطلب ہے وہ فلم لائن سے گھبرا گئی ہے۔ یہ شاید اس کی آخری فلم ہوگی۔ اسی لیے وہ جلد بازی میں لاہور چلی گئی ہے۔ جلدی جلدی کام نمٹا کر واپس آجائے گی۔

اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ فلم مکمل ہوتے ہی وہ کراچی آگئی۔ فلم کی نمائش ہوئی تو ہر طرف دھوم مچ گئی۔ ڈولی کی اداکاری کی ایسی تعریفیں ہو رہی تھیں کہ ذیشان کا سیروں خون بڑھ گیا۔ وہ اس لیے بھی خوش تھا کہ وہ کراچی میں تھی اور اپنے گھر رہ رہی تھی۔ ذیشان سے اس کی ملاقاتیں بھی ہو رہی تھیں۔

اس فلم کی بے پناہ کامیابی نے پوری فلم انڈسٹری کو اس کے دروازے پر لاکر کھڑا کردیا تھا۔ فلم ساز آگے پیچھے گھوم رہے تھے کہ وہ کسی طرح ان کی فلم سائن کرلے لیکن وہ ہر ایک کو انکار کر رہی تھی۔ فلمی اخبار اس کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ زیادہ تر صحافی یہ لکھ رہے تھے کہ وہ معاوضہ بڑھانے کے لیے اپنی ضد پر قائم ہے اور یہ ظاہر کر رہی ہے کہ جیسے وہ فلمیں کرنا ہی نہیں چاہتی ہو۔

آخر ایک دن اس نے پریس کانفرنس کر کے سب کے خیالات غلط ثابت کردیے۔ اس پریس کانفرنس میں ذیشان بھی موجود تھا۔

ڈولی نے اعلان کیا کہ وہ چونکہ شادی کرنے والی ہے اس لیے فی الحال کوئی فلم سائن نہیں کرسکتی۔

یہ ایسا اعلان تھا کہ صحافیوں کو سانپ سونگھ گیا۔ سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک صحافی نے سوال کیا۔

"آپ کس سے شادی کر رہی ہیں، اس کا نام بتا سکتی ہیں؟"

"جب وقت آئے گا تو آپ کو خود معلوم ہوجائے گا۔" ڈولی کا جواب تھا۔

"ہم نے سنا ہے آپ فوٹوگرافر ذیشان سے شادی کرنے والی ہیں؟"

"میرا جواب پھر وہی ہے کہ وقت آنے پر آپ کو خود معلوم ہوجائے گا۔"

"آپ کی شہرت عروج پر ہے۔ اس وقت آپ کا شادی کرنا خودکشی نہیں ہوگا؟"

"میں نے جتنا کام کرلیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔"

"آپ شادی کب تک کر رہی ہیں؟"

"عنقریب۔" اس نے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

صحافی اندازے لگا رہے تھے کہ وہ کس سے شادی کرسکتی ہے۔ کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ اگر جانتا تھا تو ذیشان۔ وہ اس سے کہہ کر گئی تھی کہ وہ بہت جلد پچھلے دنوں کو آواز دے گی۔ وہ اب اپنا وعدہ پورا کر رہی ہے۔ فلم لائن چھوڑ کر مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں تیاریاں کرنے لگا۔

وہ شادی کر رہی ہے مگر کس سے؟ ایک ہفتے بعد ہی اخباروں میں خبریں آگئیں کہ اس نے اپنے باپ کی عمر کے آدمی سیٹھ سلیمان سے شادی کرلی۔ یہ وہ بزنس مین ہے جس کے گھر کچھ عرصہ پیشتر ڈولی نے قیام کیا تھا۔

ذیشان کے پاس اس کے صحافی دوست اس طرح آرہے تھے جیسے تعزیت کے لیے آرہے ہوں۔ وہ پتھر کا بت بنا بیٹھا تھا۔ کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس نے سیٹھ سلیمان سے شادی کرلی ہے۔ ایک ایسے آدمی سے جو بوڑھا کھوسٹ ہے۔ ڈولی کے پاس دولت کی کمی نہیں پھر وہ یہ شادی کیوں کرے گی۔

دو دن گزرے تھے کہ شادی کی تصویریں اخباروں میں آگئیں۔ اس سے اگلے دن ڈولی کا بیان شائع ہوگیا۔ اب شک کی گنجائش نہیں تھی۔ صحافیوں نے ڈولی کو پُراسرار شخصیت لکھنا شروع کردیا تھا۔

ذیشان اس صدمے کو زیادہ دیر برداشت نہ کرسکا۔ اسے نروس بریک ڈاؤن ہوا اور اسپتال پہنچ گیا۔ اخبار کی نوکری میں اس کا میڈیکل فری تھا ورنہ اس کا جانبر ہونا مشکل ہوجاتا۔

وہ اسپتال سے گھر آگیا تھا لیکن اس کی حالت سنبھلی نہیں تھی۔ وہ ڈولی کی بے وفائی کا ذائقہ کئی مرتبہ چکھ چکا تھا لیکن وہ اس کی پیشہ وارانہ مجبوریاں تھیں۔ اس مرتبہ تو اس نے شادی کرلی تھی۔ یہ اس کی مجبوری نہیں ہوسکتی۔ اس مرتبہ صرف ذیشان نہیں ٹوٹا تھا اس کے خواب بھی ٹوٹ گئے تھے۔

اب وہ اس کی دوست نہیں کسی کی بیوی تھی۔ اب اس سے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لوٹنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ذیشان مایوسی کی تصویر بن کر رہ گیا۔ وہ دفتر جانے ضرور لگا تھا لیکن ڈولی اس کے لیے بھولا بسرا خواب بن کر رہ گئی تھی۔

اس نے اپنی قوت ارادی کو مضبوط کیا اور طے کرلیا

کہ اب وہ اپنی ماں سے اپنی شادی کی بات کرے گا۔ زندگی جیسی قیمتی شے کسی کی خاطر برباد کرنے کا کیا فائدہ۔ وہ ابھی خود کو مضبوط کر ہی رہا تھا کہ ایک دن ڈولی اس سے ملنے اس کے گھر آ گئی۔

''میں نے تم سے دفتر میں ملنا اس لیے مناسب نہیں سمجھا کہ فوراً کوئی الٹی سیدھی خبر چھپ جائے گی۔''

''تمہیں یہاں بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم اب کسی کی بیوی ہو۔''

''تمہاری دوست پہلے ہوں۔''

''مجھے تم پر یہی فخر ہے کہ تمہاری فطرت میں آوارگی نہیں۔ شادی کے بعد مجھے دوست کہنا اور مجھ سے ملنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔''

''میں تم سے محبت کرتی ہوں ذیشان، اس بڈھے کھوسٹ سے نہیں۔''

''تم مجھے پاگل کر دو گی۔ یہ کیسی محبت ہے۔ محبت مجھ سے کرتی ہو شادی کسی اور سے کر لی۔''

''خود سوچو، اگر تم سے شادی کر لیتی تو اتنی خبریں بنتیں...... اور اب دیکھنا، جب میں اس سے طلاق لوں گی تو دیکھنا تمہاری برادری کتنی چونکے گی۔''

''تم اب یہ کارنامہ بھی انجام دو گی؟''

''تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ میں طلاق لے کر شاید تم سے شادی کر لوں۔''

''تمہاری ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں کیا سوچ رہی ہوں شاید تمہیں سمجھا سکوں۔''

اب دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ڈولی سمجھ رہی تھی کہ وہ اس سے ناراض ہے۔ کیوں ناراض ہے، یہ بھی اسے معلوم تھا۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر ڈولی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ذیشان نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے بھی کچھ نہیں کہا اور چلی گئی۔ اس انداز سے بچھڑنا ظاہر کرتا تھا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔

ذیشان نے ظاہر نہیں کیا تھا لیکن طلاق کا ذکر کر کے ڈولی نے اس کی آتش شوق کو بھڑکا دیا تھا۔ وہ اسے اشاروں میں یہ امید دلا گئی تھی کہ سیٹھ سلیمان سے طلاق لے کر وہ ذیشان سے شادی کر لے گی۔

☆☆☆

اخباروں میں خبریں آ رہی تھیں کہ ڈولی نے سیٹھ سلیمان سے طلاق مانگ لی ہے۔ ایک مرتبہ وہ پھر خبروں میں داخل ہو گئی۔ عدالت کی کارروائی کی خبریں روز اخباروں میں شائع ہو رہی تھیں۔ بالآخر اسے طلاق مل گئی۔

اب صحافی یہ تجزیہ کر رہے تھے کہ سیٹھ سلیمان اسے فلموں میں کام کرنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے اس لیے اس نے طلاق لے لی اور اب وہ یقیناً دوبارہ فلموں میں کام کرے گی۔ فلم سازوں کے علاوہ اگر کسی کو اس طلاق کی خوشی تھی تو وہ ذیشان تھا۔ اسے امید ہونے لگی تھی کہ اب وہ اس سے شادی کر لے گی۔

طلاق کے بعد وہ کسی کی بیوی نہیں رہی تھی لہٰذا ملنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ وہ اس سے ملنے اس کے گھر جانے لگا کیونکہ وہ عدت میں تھی لہٰذا باہر نکلنے سے گریز کر رہی تھی۔ عجیب بات یہ بھی تھی کہ اس کی ماں اب بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔ اب کسی سے اس کا ملنا جلنا انہیں ناگوار نہیں لگتا تھا۔ ذیشان کو اب امید ہو گئی تھی کہ اگر وہ اس سے شادی کے لیے کہے گی تو اس کے والدین اعتراض نہیں کریں گے۔ وہ عدت میں تھی اس لیے وہ شادی کے لیے نہیں کہہ سکتا تھا۔ عدت میں تو پردہ بھی ہوتا ہے لیکن اس پردہ کا عمل نہیں کر رہی تھی۔ کسی اور سے نہیں ملتی تھی ذیشان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتی تھی۔

اخباری رپورٹر برابر خبریں لگا رہے تھے کہ عدت کے بعد وہ ذیشان سے شادی کرنے والی ہے۔ خود ذیشان سے پوچھا جاتا تو وہ مسکرا کر چپ ہو جاتا تھا۔ خبریں گھڑنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی۔ عدت ختم ہوئی تو ڈولی نے ایک مرتبہ پھر سب کو چونکا دیا کہ وہ فلموں میں کام کرے گی۔

''تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب فلمیں چھوڑ دو گی۔''

''میں اب بھی وعدہ کر رہی ہوں کہ یہ فلم میں تم سے شادی کے لیے کر رہی ہوں۔''

''مجھ سے شادی کے لیے؟''

''ہاں، میں تم سے شادی کراچی میں رہ کر نہیں کر سکتی۔ میرے ماں باپ تم سے شادی پر تیار نہیں ہوں گے۔ تم بھی میرے ساتھ لاہور چلو میں فلم کے بہانے لاہور جاؤں گی اور وہاں تم سے شادی کر لوں گی۔''

''میں والدہ کے بغیر شادی کیسے کر سکتا ہوں۔''

''اب تو وہ بھی میری ماں ہیں۔ تم میرے ساتھ لاہور چلو۔ میں وہاں تمہاری نوکری کا بندوبست کر دوں گی۔ تم اپنی والدہ کو بھی وہیں بلا لینا۔ تمہارا کرایے کا گھر ہے، کوئی فرق نہیں پڑے گا کراچی میں رہو یا لاہور میں۔ کچھ دنوں بعد ہم کراچی لوٹ آئیں گے۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لے

جارہی تھی۔ اس لیے اسے یقین آگیا کہ وہ یقیناً اس سے شادی کرلے گی۔

اس نے والدہ سے کہا کہ وہ دفتر کی طرف سے اسے لاہور بھیجا جارہا ہے۔ ”وہاں جاکر میں مکان کا بندوبست کرتا ہوں پھر تمہیں بھی بلالوں گا۔“

وہ ڈولی کے ساتھ لاہور چلا گیا۔ ڈولی نے یہاں ایک شاندار مکان بنوالیا تھا۔ وہ ڈولی کے ساتھ رہنے لگا۔ یہ فخر اسے بار بار ہوتا تھا کہ ڈولی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ ترستے ہیں اور وہ اس کے ساتھ رہ رہا ہے۔ وہ بہت کم گھر میں رہتی تھی لیکن جتنا وقت بھی ملتا تھا وہ اس سے باتیں تو کرسکتا تھا۔

اس روز کسی وجہ سے شوٹنگ نہیں ہورہی تھی۔ ڈولی گھر پر ہی تھی کہ اس کا فلم ساز اس سے ملنے آیا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جس کا نام ریاض لطیف تھا۔ یہ ایک نکلتی ہوئی عمر کا آدمی تھا۔ معلوم یہ ہوا ڈولی جس فلم میں کام کررہی ہے اس کی کہانی اور مکالمے اسی ریاض لطیف نے لکھے ہیں۔

ان دونوں سے ذیشان کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ باتوں باتوں میں ذیشان کی ملازمت کا ذکر بھی نکل آیا۔ فلم ساز نے نہایت بے تکلفی سے ذیشان کے شانے پر ہاتھ مارا۔

”جناب، میرا کام تو ہوگیا۔ مجھے ڈولی بیگم کے لیے ایک سیکریٹری کی تلاش تھی۔ کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ ڈولی کی یادداشت اس کی متحمل نہیں ہورہی ہے۔ میری فلم کے ساتھ ساتھ یہ ریاض لطیف صاحب کی فلم بھی شروع کرنے والی ہیں۔ ان کے فونز اٹینڈ کرنے ہیں، شوٹنگ کی تاریخیں یاد دلانی ہیں۔ لوگ ان سے ملنے آتے ہیں، کس سے ملنا ہے کس سے نہیں ملنا ہے، یہ سب آپ کے کام ہوں گے۔ آپ ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں آپ سے اچھا سیکریٹری اور کون ہوگا۔ تنخواہ وغیرہ یہ طے کرکے مجھے بتادیں گی۔ تنخواہ دینے کا پابند میں ہوں گا۔“

اسے کہیں تو نوکری کرنی تھی۔ اس سے اچھی نوکری اور کون سی ہوتی کہ اسے ہر وقت، یہاں تک کہ سیٹ پر بھی اسے ڈولی کے ساتھ رہنا پڑرہا تھا۔ اس نے ہامی بھرلی۔ جو تنخواہ ڈولی نے اسے بتائی وہ اخبار کی نوکری سے تین گنا زیادہ تھی جبکہ کھانے پینے اور رہائش پر اس کا ایک روپیہ بھی خرچ نہیں ہورہا تھا۔ یہ البتہ تھا کہ ڈولی نے ایک مرتبہ پھر وعدہ خلافی کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ اس کی آخری فلم ہوگی لیکن اس نے ایک فلم اور پکڑلی تھی۔ ڈولی نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کردیا کہ دونوں فلمیں تقریباً ساتھ ساتھ ختم ہوں گی اس لیے یہی سمجھ لو کہ میں ایک فلم کررہی ہوں۔ اس کے بعد ہم آزاد ہوں گے۔ تم جب بھی والدہ سے ملنا چاہو گے ٹکٹ میں دوں گی۔ ویسے بھی دونوں فلموں کی کہانی کچھ ایسی ہے کہ زیادہ تر شوٹنگ کراچی میں ہوگی۔ تم اپنی والدہ سے ملتے رہو گے۔ سال کے اندر اندر دونوں فلمیں تیار ہوجائیں گی۔

وہ اس کا سیکریٹری بن کر ہر وقت اس کے ساتھ رہنے لگا اور خوش تھا کہ ڈولی کی قربت نصیب ہے۔ ڈولی بھی اس کی دلداری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھی۔ وہ اس طرح اس کی دیکھ بھال کررہی تھی، اس طرح اس کی ضرورتوں کا خیال رکھ رہی تھی جیسے کوئی اپنے زخموں کی نگہداشت کرتا ہے کہ کہیں ٹھیس نہ لگ جائے۔ گویا آبگینوں والا معاملہ تھا۔

ایک دن ڈولی نے اس سے کہا کہ وہ کراچی جاکر اپنی والدہ سے مل آئے۔ دوسری فلم شروع ہوجائے گی تو پھر اسے فرصت نہیں ملے گی۔ اس نے ایک مہینے کی تنخواہ بھی ایڈوانس دے دی کہ اپنی ماں کو دے آئے۔

وہ کراچی چلا گیا۔ ماں کو یہ تسلی بھی دے آیا کہ بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔ وہ عنقریب انہیں اپنے پاس لاہور بلالے گا۔

وہ ایک ہفتے بعد کراچی سے لاہور آیا تو یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ ریاض لطیف کا آنا جانا بہت بڑھ گیا ہے لیکن اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا کیونکہ دونوں میں کاروباری تعلق تھا۔ دوسری فلم جس میں وہ کام کررہی تھی ریاض لطیف ہی بنارہے تھے۔ ڈولی سے اپنی کہانی پر بات کرنے، لوکیشن طے کرنے اور بہت سے معاملات پر بات چیت کرنے آتے تھے۔ البتہ ایک بات اسے بہت بری طرح محسوس ہورہی تھی۔ ریاض لطیف اپنی ان نشستوں میں ذیشان کی موجودگی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ جب بھی ان کے درمیان بیٹھتا، ریاض لطیف کے ماتھے پر بل پڑجاتے اور ڈولی اسے وہاں سے جانے کا اشارہ کردیتی۔

”یہ ریاض لطیف مجھ سے اتنے بدظن کیوں ہیں۔ میں تمہارا سیکریٹری ہوں، انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں تمہارا دوست ہوں۔“

”تم ان کی باتوں کا برا مت مانو۔ وہ ذرا وہمی ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تم ہماری باتیں کہیں باہر جاکر کسی کو بتادو گے۔ یہ بڑی خطرناک انڈسٹری ہے، لوگ مکالمے چرالیتے ہیں، گانے اڑالیتے ہیں۔ ریاض لطیف بہت زیادہ راز داری برت رہے ہیں۔ میرے سوا کسی کے سامنے منہ نہیں کھولتے۔“





”وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ تم مجھے سب کچھ بتادو گی۔“

”انہیں نہ جانے کیوں مجھ پر اتنا بھروسا ہوگیا ہے کہ سمجھتے ہیں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“

ریاض لطیف ڈولی کو نہایت قیمتی تحفوں سے نواز رہے تھے۔ جواب میں ڈولی کا رویہ بھی بدل گیا تھا۔ اب وہ ان کی تعریفیں کرتی نہیں تھکتی تھی۔ ان کی دولت کے قصیدے پڑھتی رہتی تھی۔

”وہ اپنے حلیے سے نہیں لگتے لیکن نہایت دولت مند ہیں۔ فلم ختم ہوجائے پھر وہ مجھے ورلڈ ٹور پر لے جائیں گے۔ تم بھی ساتھ چلو گے۔“

”میرا وجود انہیں برداشت نہیں ورلڈ ٹور پر میرا ساتھ کیسے برداشت کریں گے؟“

”ابھی تو وہ اس لیے احتیاط برتتے ہیں کہ ان کی فلم کے راز باہر نہ چلے جائیں۔ جب فلم ختم ہوجائے گی تو انہیں یہ دھڑکا نہیں رہے گا پھر میں ان سے تمہیں ساتھ لے جانے کی بات کرسکتی ہوں بلکہ سمجھو کرلی ہے۔ ٹور سے واپس آتے ہی میں دنیا کو چونکادوں گی۔ ڈولی کا موجودہ سیکریٹری اس کا شوہر ہوگا۔ ہوسکتا ہے تم سے دوری کی زنجیر بیرونِ ملک ہی کے کسی شہر میں کاٹ کر پھینک دوں۔“

ذیشان نے ڈولی کی مجبوریوں کے سامنے ایک مرتبہ پھر سرِ تسلیم خم کرلیا اور کوشش کرنے لگا کہ ریاض لطیف کے سامنے نہ جائے، سیٹ پر بھی جاتا تو الگ تھلگ بیٹھ کر وقت گزارتا تھا۔

یہ وقت گزاری بھی ریاض لطیف کو گراں گزر رہی تھی۔ انہوں نے ایک روز ڈولی سے کہہ ہی دیا کہ اس شخص کو اپنے ساتھ کیوں لگائے پھرتی ہوں۔ اسے واپس کراچی بھیج دو۔ ڈولی نے لاکھ کہا کہ وہ اس کی نوکری چھڑوا کر لاہور لائی ہے لیکن وہ بضد تھے۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ فلم ادھوری چھوڑ دیں گے۔ اگر وہ ان کا نقصان چاہتی ہے تو اسے اپنے پاس رکھ لے۔ ڈولی نے ذیشان کو مشورہ دیا کہ وہ کراچی واپس چلا جائے۔

”ڈولی تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تم میرے ساتھ کیا سلوک کررہی ہو۔ تمہیں اندازہ ہے کہ میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا ہے۔ کتنا برباد ہوا ہوں تمہاری خاطر۔ کتنا رویا ہوں، کتنا مذاق اڑا ہے میرا۔ اب کہہ رہی ہو واپس چلا جاؤں۔ مجھے قسطوں میں کیوں ماررہی ہو۔ ایک ہی دفعہ کیوں نہیں مار ڈالتیں۔ مجھے مار ڈالو۔ میں اپنا خون معاف کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

یہ پہلا موقع تھا جب اس نے ڈولی پر اپنا حق جتایا تھا اور وہ بھی اتنے جذباتی انداز میں کہ ڈولی کے آنسو بھی بے قابو ہوگئے۔ اس نے آگے بڑھ کر ذیشان کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہے تھے۔ جب دلوں کا غبار اچھی طرح دھل گیا تو ڈولی نے زبان کھولی۔

”ذیشان مجھے معاف کردو۔ میں تمہارے سوا کسی سے محبت نہیں کرتی لیکن میری مجبوریوں کو بھی سمجھو۔ میرے ماں باپ آپس میں ہی لڑتے رہے اور میں جوان ہوگئی۔ میں محبت کے نام سے ڈرتی ہوں لیکن تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہیں میری محبت کی قسم مجھے ایک موقع دے دو۔ اس وقت میری بات مان لو۔ میں یہ فلم ختم ہوتے ہی تمہارے پاس ہوں گی۔“

”محبت تو نام ہی دل رکھنے اور بات ماننے کا ہے۔ میں یہ بھاری پتھر بھی تمہاری خاطر اٹھالیتا ہوں۔“

اس نے سامان سمیٹا اور کراچی چلا آیا۔ اس کی ماں اس کے آنے سے بہت خوش ہوئی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ جس کے لیے اتنی خوش ہے وہ اپنی ہنسی لاہور میں ہی چھوڑ آیا ہے۔ اس کی ماں اس کی حالت دیکھ کر افسردہ تھی۔ وہ بے چاری یہی سمجھ رہی تھی کہ اس کے بیٹے کو نوکری چھوٹنے کا دکھ ہے۔

”ہمیں کون سے فاقے ہورہے ہیں۔ آرام سے بیٹھ اور نوکری ڈھونڈتا رہ۔ تیرے ہاتھ میں تو ہنر ہے، کہیں نہ کہیں نوکری مل ہی جائے گی۔“ اسے جیسے کسی نے یاد دلادیا ہو کہ اس کے ہاتھ میں ہنر ہے۔

”اماں، اب میں نوکری نہیں کروں گا۔ اپنی دکان کھولوں گا، اپنا کاروبار۔“

”اس سے اچھی کیا بات ہوگی۔ کسی کی چاکری سے بہتر ہے کہ آدمی اپنا کام کرے۔“

اس نے ایک چھوٹی سی دکان لے لی۔ ”ڈولی فوٹو اسٹوڈیو“ کا بورڈ آویزاں کیا اور کیمرا لے کر بیٹھ گیا۔ ڈولی کی جتنی تصویریں تھیں دیواروں پر چسپاں کردیں۔ کچھ تصویروں کے خوب صورت فریم بنوائے اور دیواروں پر لٹکادیے۔ اس کی فوٹو گرافی کی دور دور تک دھوم تھی لہٰذا جلد ہی اس کی دکان پر رش لگ گیا۔ کچھ ڈولی کی تصویریں دیکھنے آتے تھے، کچھ اپنی تصویریں کھنچوانے۔ اس کا کاروبار چل نکلا تھا لیکن وہ خوش نہیں تھا۔ وہ تو اس دن کا منتظر تھا جب ڈولی ان تصویروں سے نکل آئے اور جیتی جاگتی دلہن بن کر اس کے گھر پہنچ جائے۔

جو لوگ اس کے پس منظر سے واقف نہیں تھے اس کا شمار ایسے لوگوں میں کرتے تھے جو دل ہی دل میں

اداکاراؤں پر مرنے لگتے ہیں اور ان کی تصویریں دیکھ دیکھ کر بہلتے رہتے ہیں جبکہ جو لوگ اس سے واقف تھے اس کی حالت پر رحم کھاتے تھے اور دوسروں کو بتاتے تھے کہ صاحب، یہ کوئی معمولی فوٹوگرافر نہیں ہے اس کی بنائی ہوئی تصویروں نے ڈولی کو امر بنا دیا ہے۔ آج ڈولی جس مقام پر ہے اسے یہاں تک پہنچانے والا یہی شخص ہے۔ اب بے وفائی کے زخم کھا کر اس دکان میں آبیٹھا ہے۔

دن پر دن گزرتے رہے۔ وہ اپنے صحافی دوستوں سے ملتا جلتا رہتا تھا تاکہ ڈولی کے بارے میں معلومات ملتی رہیں۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ریاض لطیف کی فلم ختم ہوتے ہی وہ کراچی آجائے گی۔ فلم ختم ہوئی یا نہیں؟ ایک دن اس کا ایک صحافی دوست یہ خبر لایا کہ ڈولی، ریاض لطیف کے ساتھ ورلڈ ٹور پر گئی ہوئی ہے۔

”اس نے کہا تو تھا کہ وہ جائے گی لیکن فلم ختم ہونے کے بعد، کیا فلم ختم ہوگئی؟“

”فلم ادھوری چھوڑ کر گئی ہے۔“

”ہوسکتا ہے اس فلم کو یادگار بنانے کے لیے اس فلم کی شوٹنگ بیرونِ ملک کی جارہی ہو۔“

”جہاں تک ہماری معلومات ہیں فلم کا یونٹ ساتھ نہیں گیا ہے۔ ڈولی اور ریاض لطیف گئے ہیں یعنی صرف سیر و تفریح مقصد ہے۔“

”آپ لوگوں کو کچھ معلوم تو ہوتا نہیں ہے بس یونہی خبریں اڑا دیتے ہیں۔ وہ ریاض لطیف کے ساتھ اکیلی کیوں جائے گی، اس نے تو کہا تھا وہ مجھے ساتھ لے کر جائے گی۔“

”یار ذیشان تم بھی بڑے بھولے ہو۔ ڈولی نے اس سے پہلے کوئی وعدہ وفا کیا ہے جو اب کرتی۔“

”خبردار! اگر ڈولی کے خلاف ایک لفظ بھی کہا۔ وہ وعدہ خلاف نہیں ہے۔ اس کی کچھ مجبوریاں ہیں جو آڑے آجاتی ہیں، وہ اب بھی شوٹنگ پر گئی ہوگی۔ تم لوگ ریاض لطیف کو نہیں جانتے۔ وہ ہر کام بڑی رازداری سے کرتے ہیں۔ انہوں نے یونٹ کو پہلے بھیج دیا ہوگا بعد میں وہ ڈولی کے ساتھ گئے ہوں گے تاکہ کسی کو معلوم ہی نہ ہوسکے کہ وہ بیرون ملک کس مقصد سے جارہے ہیں۔ دیکھنا جب فلم ختم ہوجائے گی تو وہ مجھے اپنے ساتھ ورلڈ ٹور پر لے کر جائے گی۔ ریاض لطیف بھی ساتھ ہوں گے۔ بہت اچھے آدمی ہیں بس ذرا وہمی ہیں۔ وہ بھی کاروبار کے معاملے میں۔“

اس کے دوست اس کی حالت پر اور زیادہ رحم کھانے لگے اور یہ سوچنے لگے کہ اس کی توقعات کی عمارت جب دھڑام سے زمین پر گرے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔

اس نے دوستوں کی خبر کو جھٹلا ضرور دیا تھا لیکن اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ وہ دوستوں کو لاجواب کرنے کے لیے لاہور چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس خبر کی تصدیق ہوگئی۔ فلم نامکمل تھی اور ڈولی، ریاض لطیف کے ساتھ ورلڈ ٹور پر تھی۔ وہ اندیشوں میں گھرا ہوا واپس آگیا۔ دو دن بعد دکان کھولی اور کسی سادھو کی طرح دھونی رما کر ڈولی کی تصویروں کے سامنے بیٹھ گیا۔

وہ سیر و تفریح کے لیے ہی گئی ہے تو واپس بھی آجائے گی۔ فلم مکمل کرے گی اور پھر کراچی آجائے گی۔ اس نے اسی دن دو تصویروں کو جوڑ کر ایک تصویر بنائی۔ ڈولی دلہن بنی ہوئی تھی اور وہ اس کے برابر کھڑا تھا۔

اس تصویر کی تعبیر یہ نکلی کہ صرف پندرہ دن بعد ایسی ہی ایک تصویر اخباروں میں چھپی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ دلہن بنی ڈولی کے ساتھ جو شخص کھڑا تھا وہ ذیشان نہیں ریاض لطیف تھا۔ ڈولی نے ورلڈ ٹور کے دوران آسٹریلیا پہنچ کر ریاض لطیف سے شادی کرلی تھی۔ ذیشان نے اخبار میں یہ تصویر دیکھی تو قہقہے لگاتا ہوا دکان سے باہر نکل آیا اور اخبار کے پرزے کرکے ہوا میں اچھال دیے۔ کچھ دیر صحافیوں اور اخباروں کو گالیاں دیتا رہا پھر اپنی دکان کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”ذیشان، اندر کیوں نہیں جاتے۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟“

”اندر ڈولی بیٹھی ہے۔ اب میری نہیں اس کی باری ہے۔ وہ میرا انتظار کرے میں تو دور چلا گیا۔“ رات ہوئی تو اس نے دکان کو یونہی کھلا چھوڑا اور گھر چلا گیا۔ ماں نے اس کی حالت دیکھی تو پریشان ہوگئی۔ وہ اسے سمجھاتی رہی اور وہ قہقہے لگاتا رہا۔

دوسرے دن پھر دکان کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ اس کی یہ حالت چند دن رہی پھر آہستہ آہستہ اس کی وحشت میں کمی آنے لگی جیسے اس نے اپنی دیوانگی اپنے اندر اتار لی ہو، جیسے اسے صبر آگیا ہو۔ اس نے ڈولی کی تمام تصویریں جلا ڈالیں۔

وہ باقاعدگی سے دکان پر بیٹھنے لگا لیکن ہنسنا بھول گیا تھا۔ اب وہ ایک ایسا آدمی تھا جو اپنے کام سے کام رکھے ہوئے تھا۔ ایسا کبھی کبھی اس پر دورہ بھی پڑ جاتا تھا۔ کوئی تصویر بنوانے آیا اب اگر طبیعت ٹھیک ہوئی تو بنا دی ورنہ دور ہی سے ایسی ڈانٹ پلائی کہ آنے والا بھاگنے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔ باہر بورڈ لگا دیا تھا۔ ”یہاں عورتوں کی تصویریں



نہیں بنائی جاتیں“ شاید کسی عورت کی تصویر کھینچتے ہوئے اسے لگتا ہو کہ وہ ڈولی کی تصویر کھینچ رہا ہے۔

وہ ذیشان جادوگر کہلاتا تھا لیکن اب لوگ اسے ذیشان خبطی کہنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ ذیشان غائب ہوگیا اور خبطی رہ گیا۔

بچوں نے اس کی دکان پر لکھ دیا تھا ”خبطی فوٹوگرافر“

☆☆☆

بہت دن کے سناٹے کے بعد ایک وحشت زدہ خبر نے اخباروں کی فروخت کو بڑھا دیا۔

”فلم اسٹار ڈولی کے نئے شوہر ریاض لطیف قتل کردیے گئے۔ وہ اپنی گاڑی میں جارہے تھے کہ دو موٹر سائیکل سواروں نے انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا۔“

اگلے دن اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والی خبر شایع ہوگئی۔ ”فلم اسٹار ڈولی گرفتار۔ پولیس کو شبہ ہے کہ ریاض لطیف کے قتل میں ڈولی کا ہاتھ ہے۔“

اگلے چند دنوں تک اس خبر کے علاوہ اخباروں کے پاس کوئی موضوع نہیں تھا۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوچکا تھا۔ ڈولی کو ضمانت پر رہا کردیا گیا تھا لیکن پولیس کو اختیار دے دیا تھا کہ وہ جب چاہے تفتیش کے لیے ڈولی کے گھر جاسکتی ہے یا ڈولی کو طلب کرسکتی ہے۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ لاہور کی پولیس کراچی آئی اور ذیشان کو گرفتار کرلیا۔ اس پر یہ الزام تھا کہ وہ کچھ عرصہ پہلے لاہور آیا تھا اور ریاض لطیف کے بارے میں معلوم کررہا تھا۔ تفتیش کے دوران یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ذیشان ڈولی سے محبت کرتا تھا۔ اسے ریاض لطیف کے ساتھ ڈولی کا گھومنا پھرنا پسند نہیں تھا۔ وہ ڈولی کے ساتھ رہتا تھا۔ ریاض لطیف ہی نے اسے کراچی واپس بھیج دیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کا بدلہ لینے کے لیے اس نے ریاض لطیف کو قتل کروایا ہو۔

اسے عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ عدالت نے اسے سات روزہ ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کردیا۔ پولیس نے اس سے تفتیش شروع کردی۔ بعد کی خبروں سے معلوم ہوا کہ اس پر تشدد بھی کیا گیا تھا۔ ایک مہینے تک سماعت ہوتی رہی۔ نہ پولیس اس سے کچھ اگلوا سکی تھی نہ عدالت کسی نتیجے پر پہنچ سکی اور بالآخر اس کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے اسے بے قصور قرار دے دیا گیا۔ وہ کراچی آیا تو پہلے سے زیادہ خاموش ہوگیا تھا۔

ڈولی بہ دستور اپنے گھر میں نظربند تھی۔ اس کے بیانات میں کچھ ایسا تضاد تھا کہ اس کے قصوروار ہونے کا یقین ہوتا جارہا تھا۔ اسے بے قصور کہنے والے بھی بہت تھے اور قصوروار کہنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔

ایک مشہور سیاست داں اس کیس میں بہت دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے ڈولی سے ملاقات بھی کی تھی اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے ڈولی کی رہائی کے لیے بھی کوشش کررہا تھا۔ اخبارات کے ذریعے یہ خبریں بھی باہر نکل ہی آئی تھیں۔

مقدمے کی سماعت روزانہ کی بنیاد پر ہورہی تھی۔ اس سیاسی شخصیت نے ڈولی کی رہائی کے لیے دو چار مظاہرے بھی کرا ڈالے تھے۔ ریاض لطیف کے لواحقین بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے کہ کسی طرح ڈولی کو قصوروار ثابت کردیا جائے۔ ریاض لطیف سماجی حلقوں میں بڑا مقبول تھا لہٰذا کئی سماجی تنظیمیں اس کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ دونوں طرف عدالت پر دباؤ ڈالا جارہا تھا۔ مقدمہ نہایت دلچسپ ہوگیا تھا۔

تقریباً چھ ماہ بعد عدالت نے عدم ثبوت کی بنا پر ڈولی کو اس مقدمے سے نکال دیا اور اس واقعے کو ٹارگٹ کلنگ کا واقعہ قرار دے کر کیس ختم کردیا۔ ڈولی کو پھر ایک عدت کاٹنی تھی۔

ذیشان کو پھر امید ہوگئی کہ ڈولی کراچی آئے گی اور اس سے ملے گی۔ وہ منہ سے تو کچھ نہیں بولا لیکن اس نے ڈولی کی چند تصویریں جو جلنے سے بچ گئی تھیں دوبارہ اپنے اسٹوڈیو میں لگالیں اور قدرے خوش نظر آنے لگا۔ یہ ایک بڑی تبدیلی تھی جو اس میں آئی تھی۔ کچھ دنوں سے تو اس نے اپنے اسٹوڈیو میں جھنڈیاں بھی لگالی تھیں، نہ جانے کیوں؟

☆☆☆

فلم سازوں نے ڈولی کی طرف سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اب وہ ایک مشہور سیاسی شخصیت کے ساتھ دیکھی جارہی تھی۔ دونوں بے حد احتیاط برت رہے تھے لیکن اخباری نمائندوں کو کہیں نہ کہیں سے بھنک پڑ ہی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ تو لاہور کے ایک اخبار نے یہ لکھ دیا کہ وہ دونوں مری کے ایک ہوٹل میں دیکھے گئے ہیں۔ یہ شخصیت وہی تھی جس نے مقدمے کے دوران ڈولی کی مدد کی تھی۔

ایک مرتبہ اخبار میں ایک تصویر شایع ہوئی جس میں انہیں شاپنگ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر پر کسی نے کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا اس لیے کہا جاسکتا تھا کہ تصویر درست ہے۔

اس قسم کی خبریں اور اِکا دُکا تصاویر اخبارات کی زینت بننے لگیں تو تبصرہ نگاروں کو بھی حوصلہ ہوا اور انہوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کردیا کہ ڈولی عنقریب اس سیاسی

شخصیت سے شادی کرنے والی ہے۔
یہ تبصرے ابھی شایع ہو رہے تھے کہ ڈولی نے اچانک کراچی آکر صحافیوں کو چونکا دیا۔ صحافی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے لیکن وہ اتنی رازداری سے کراچی پہنچ گئی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کراچی کے صحافیوں کو تو اس وقت خبر ہوئی جب اس نے اپنے گھر پر پریس کانفرنس کی اور اس میں صحافیوں کو مدعو کیا۔
اس نے اس پریس کانفرنس میں اپنی ریٹائرمنٹ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ وہ آئندہ کسی فلم میں کام نہیں کرے گی۔ اس نے یہ اعلان بھی کیا کہ وہ سیاست میں آنے کا ارادہ کررہی ہے۔ وہ آئندہ الیکشن میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑے گی اور اسمبلی میں پہنچ کر حقوق نسواں کی جنگ لڑے گی۔
صحافیوں نے سوالوں کی بوچھار کردی۔ زیادہ تر سوالات اس کے مقدمۂ قتل کے بارے میں تھے۔ بعض صحافیوں نے اس سیاسی شخصیت کے بارے میں پوچھا جس کے ساتھ وہ گھومتی پھرتی نظر رہی تھی۔ ایک صحافی نے ذیشان کے بارے میں بھی سوال کرڈالا۔
''آپ دوسروں کی کیا خدمت کریں گی، آپ نے تو اپنے محسن ذیشان ہی کو فراموش کردیا جو اس وقت ایک نجی اسپتال میں بے یارو مددگار ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔'' صحافی نے اس اسپتال کا نام بھی لیا تھا۔
صحافیوں کو سخت تعجب ہوا جب ڈولی نے اس سوال کا جواب تک دینا گوارا نہیں کیا اور صرف یہ کہہ کر اٹھ گئی۔ ''بہت افسوس ہوا۔'' سوالوں کی گونج اس کا تعاقب کرتی رہی اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے کمرے میں پہنچتے ہی اس اسپتال میں فون کیا اور ذیشان کی خیریت دریافت کی۔
''ذیشان کو فوری طور پر پرائیویٹ روم میں منتقل کردو اور اس کی بہترین نگہداشت کی جائے۔ اس کے علاج پر خرچ ہونے والی رقم میں ادا کروں گی۔''
صبح ہوتے ہی وہ اسپتال پہنچ گئی۔ معلوم ہوا اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ غنودگی میں ہے۔
''کچھ دیر انتظار کرلیں، وہ جاگ جائے گا تو آپ کی ملاقات کروادی جائے گی۔'' تقریباً ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد اس نے پھر اصرار کیا۔
''مجھ سے ملاقات کے بعد اس کی آدھی بیماری ختم ہوجائے گی۔ آپ مجھے کمرے میں جانے دیں۔'' ڈاکٹروں نے اسے اجازت دے دی۔
وہ کمرے میں گئی تو وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ کمزور اتنا ہوگیا تھا کہ ڈولی تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ چند ہڈیاں تھیں جو بستر پر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، پھر اس کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔
''ذیشان، میرے جادوگر اٹھو، دیکھو بدنصیب ڈولی تم سے ملنے آئی ہے۔''
ذیشان نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ ہلکا سا تبسم اس کے ہونٹوں پر ابھرا اور اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ ڈولی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
''ذیشان! تم مجھ سے اسی لیے خفا ہو نا کہ میں نے تم سے شادی نہیں کی؟ جانتے ہو کیوں......؟ اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتی تھی۔ میں تم سے شادی کرکے محبت کھونا نہیں چاہتی تھی۔ ذیشان میں نے آنکھ کھولتے ہی اپنے ماں باپ کو لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری نفسیات میں یہ بات کہیں بیٹھ گئی تھی کہ شادی نام ہی لڑنے جھگڑنے کا ہے۔ میں شادی کرکے تم سے جھگڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنی ماں سے نفرت کے باوجود مجھے ان پر رحم آتا تھا۔ جب وہ ڈیڈی سے لڑتی تھیں تو ان کے آنسو میرے دل پر انگاروں کی طرح گرتے تھے۔ جب میں جوان ہوئی تو میں نے سوچ لیا کہ مردوں سے انتقام لوں گی۔ ان سے شادی کروں گی اور خود رونے کے بجائے انہیں رلاؤں گی۔ میں تمہیں نہیں رلاسکتی تھی ذیشان، مجھے تم سے محبت ہے۔ تم میرے انتقام کی فہرست میں آتے ہی نہیں تھے۔ میں اس لیے تمہیں بار بار مایوس کرتی رہی کہ تم مجھ سے مایوس ہوکر کہیں نہ کہیں شادی کرلوگے۔ میں تمہیں کھودوں گی لیکن تمہاری محبت تو میرے پاس رہے گی۔ تم بڑے ضدی نکلے ذیشان۔ اپنی کیا حالت بنالی، اگر تمہاری یہی ضد ہے تو میں تم سے شادی پر تیار ہوں۔ تم بولتے کیوں نہیں، بولو تو سہی۔ تم کہو تو میں اس کمرے میں قاضی بلالیتی ہوں۔ یقین کرو میں اس مرتبہ تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔''
اس مرتبہ چونکنے کی باری ڈولی کی تھی۔ وہ جو بار بار زندگی کے کئی موڑ پر اس کی آس بندھاتی اور اگلے پڑاؤ پر اس کی آس کی ڈوری توڑ دیتی...... مگر وہ جو اس کا دیوانہ تھا رسی میں گرہ لگا کر پھر سے ڈوری جوڑ لیتا...... پھر سے خواب دیکھتا اور وہ بکھر جاتے...... اس کے تاج محل کو گرادیتی...... اس بار وہ ایسے چونکی کہ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس کے اعصاب شل ہوگئے جب ذیشان کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔
وہ ڈولی کی دسترس سے بہت دور چلا گیا تھا۔